The ZAMANA. JULY 1939 Regd. No. A 211.

مہتمم: دیا نراین نگم، بی۔ اے

نمبر ۱	جولائی سنہ ۱۹۳۹ء	جلد ۷۲

فہرست

تصاویر: ۱۔ بندرابن کی برسات (رنگین) ۲۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ اور رانی کے تین اسکان

زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا

نمونہ سات آنے

قیمت سالانہ پانچ روپیہ

زمانہ کے پُرانے فائل

دفتر ہذا میں ۱۹۲۶ء سے پُرانے فائل موجود ہیں۔
زمانہ کے تشنگانِ ادب خوب واقف ہیں کہ شمالی ہند کا یہ قدیم ترین اور مشہور رسالہ چھتیس ۳۶ سال سے اُردو زبان وادب کی کسقدر انہماک وسرگرمی سے خدمت کررہا ہے۔ اس کے نقادانہ مضامین اور گرانمایہ نظمیں ملک کے بڑے بڑے نقادوں سے خراج تحسین حاصل کرچکی ہیں۔ زمانہ کے پُرانے فائل لائبریریوں میں رکھنے کے قابل چیز ہیں۔ صرف چند فائلیں باقی رہ گئی ہیں۔ خریداروں سے حسب ذیل رعایت کی جائیگی۔

۱۔ بارہ ۱۲ سال کے مکمل سٹ کے خریدار سے ۲۶ روپیہ

۲۔ چار ۴ سال کے خریدار سے تین ۳ روپیہ فی فائل

۳۔ ایک سال کے خریدار سے ۳/۸ علاوہ محصول

نوٹ:۔ آرڈر کے ہمراہ چوتھائی قیمت پیشگی بھیجنا چاہیئے۔ فائل ۱۹۲۶ء میں "جوبلی نمبر" باقی نہیں ہے ۱۹۲۳ء میں ستمبر کا پرچہ موجود نہیں ۱۹۰۷ء سے ۱۹۲۵ء تک مختلف پرچے بھی آرڈر آنے پر مل سکتے ہیں

منیجر زمانہ کانپور سے طلب فرمایئے

تصحیح ہمیں افسوس ہے کہ پروف ریڈر کی غلطی سے زمانہ بابت ماہ جون میں مندرجہ ذیل غلطیاں رہ گئی ہیں ناظرین کرام تصحیح فرمالیں:۔

صفحہ ۴۵۰ سطر ۱۹ و ۲۰ "ہندوستانی مزدوروں..... استحال" کے بجائے "ہندوستانی مزدوروں کی قانون کے پردے میں پُرفریب مراجعت واستحصال" ہونا چاہیئے۔

صفحہ ۴۵۲ سطر ۷ میں لفظ "برابر" زائد ہے۔

صفحہ ۴۵۳ سطر ۱۷-۱۸ "روز بروز زیادہ سے زیادہ مکمل" کے بجائے "سے آزاد" پڑھیئے۔

یادگار پریم چند

مشہور رسالہ زمانہ کانپور

(کا)

"پریم چند نمبر"

جسمیں

منشی پریم چند کے پُرانے دوستوں اور اُردو کے بہترین انشاپردازوں اور شاعروں کے چونتیس ۳۴ مضامین نثر اور تیرہ نظمیں ہیں

(اور)

منشی پریم چند کی زندگی اور ادبی کارناموں کا ایک جامع ومکمل مرقع پیش کیا گیا ہے

منشی جی کی تصانیف کی فہرست آپکا عکس تحریر اور مختلف اوقات کی آٹھ ہاف ٹون تصاویر بھی ہدیہ ناظرین کی گئی ہیں

حجم خالص مضامین ۲۵۶ صفحات تصاویر و ٹائٹل علاوہ

قیمت ڈیڑھ روپیہ (عہ) محصولڈاک ۳/

المشتہر

منیجر زمانہ کانپور، یو۔ پی

MALARIA AND DEATH

ملیریا اور موت

چلچلاتی دھوپ میں ایک غبار آلود سڑک پر دو شخص چلے جا رہے تھے، انہیں سے ایک کا نام ملیریا اور دوسرے کا موت تھا۔ ملیریا کی صورت بھونڈی تھی اور موت خستہ اور تھکی ہوئی معلوم ہوتی تھی چلتے چلتے دونوں ایک گاؤں میں پہونچے ملیریا نے ایک بھیانک اور ڈراونے لب و لہجہ میں پہلے دیہاتی سے جو گاؤں میں نظر پڑا یوں کہا۔

"ہم ابھی اس گاؤں کا گشت کرتے ہوئے آ رہے ہیں"

"کئے جاؤ" گاؤں والے نے ایک طنزیہ لہجہ میں کہا۔"

ان دونوں خوفناک شخصوں نے وہی کیا جو گاؤں والے نے کہا تھا۔ لیکن آدھ گھنٹہ بھی نہ گذرنے پایا تھا کہ وہ گاؤں سے نکلکر آگے کو روانہ ہو گئے۔

ملیریا۔ (ٹھنڈی سانس لیکر) "افسوس! اب میرا دور دورہ پوری طرح ختم ہو گیا۔ اور اب میرا زہر بالکل بے اثر ہو گیا ہے"

موت (مسکراکر) "ہاں! مجھے بھی کچھ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ کیا آپ مجھے اندھا سمجھتے ہیں؟ دیکھا نہیں کہ پچھلے گاؤں میں تمھارے زہر نے ایک آدمی پر بھی اثر نہیں کیا۔ حالانکہ اب ہر سال کروڑوں آدمی آپ کے شکار ہوتے ہیں۔ اور برطانوی ہند میں دس لاکھ سے زیادہ آدمی بیمار ہو جاتے ہیں۔ مگر پہلے اس سے بہت زیادہ شکار ملتا تھا۔ اب کیا ہو گیا ہے"

ملیریا (غمگین لب و لہجہ میں) "آہ! میں عرض کرتا ہوں۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ میرے کام میں کوئی روک ٹوک نہ تھی کوئی شخص بھی میرے طریقہ عمل سے واقف نہیں تھا اور اسی لئے کوئی شخص مجھے مغلوب بھی نہ کر سکتا تھا مگر اسکے بعد جو لوگ میرا شکار ہوتے تھے انھوں نے سنکونہ دریافت کر لیا۔"

موت:۔ "پھر کیا نتیجہ ہوا؟"

ملیریا:۔ "ہوتا کیا! بس خاتمہ کا آغاز ہو گیا۔ کیونکہ سنکونہ کے درخت سے کونین نکال لی گئی۔ اور اب تو حالت اس سے بھی زیادہ خراب ہو گئی ہے۔ کیونکہ میرے بدترین دشمنوں کو معلوم ہو گیا ہے کہ اپنا قلیس مچھر میرے حاون ہیں"

موت (ہنس کر) "اس سے مجھے کیا تعلق؟"

ملیریا (گھبراکر) "اجی جناب! اتنا ہی نہیں ہوا۔ بلکہ مجلس اقوام کے ملیریا کمیشن نے تجویز کیا ہے کہ ملیریا سے بچنے کے لئے بخار کی فصل میں چھ گرین کونین روز کھائی جائے، اور ملیریا سے شفا پانے کے لئے پانچ سات روز تک پندرہ بیس گرین کونین روزانہ استعمال کی جائے۔ اس کا مقابلہ کون کر سکتا ہے، اس طرح وہ تمام دنیا کا علاج کونین سے کر سکیں گے، تو بندہ کا خاتمہ ہو جائے گا۔"

موت (پیشانی صاف کرتے ہوئے ہمدردانہ لہجہ میں) "میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتی۔"

اپنے تاریک خیالات میں غرق دونوں منحوس شخص دنیا کا سفر کرتے رہے۔

ہندوستان کے ایک مشہور معالج کی ایجاد!
دنیا کے اندر ایک
حیرت انگیز نئی چیز
ہمارا قومی خزانہ
"امرت دھارا"
آجکل ہندوستان کے لاکھوں آدمیوں کو کئی امراض سے محفوظ رکھتی ہے!
امرت دھارا کیا ہے؟
امرت دھارا ہندوستان کے مشہور معالج پنڈت ٹھاکر دت شرما ویدکی ایک انمول ایجاد ہے۔ انھوں نے اسے خود اپنی پریکٹس میں جملہ امراض پر استعمال کیا ہے اور پوری کامیابی کیساتھ بنی نوع انسان کی خدمت کی ہے اسکی بدولت انھوں نے سارے ہندوستان میں شہرت اور توقیر بھی خوب حاصل کی ہے۔
امرت دھارا سے کیا کیا فائدے ہیں؟
یہ ماں کے دودھ کی طرح ہر حالت میں جسم کو فائدہ پہونچاتی ہے۔ یہ ایک اچوک ہتھیار ہے۔ جو انسان کے ہاتھ میں رہ کر کسی معالج کی مدد کے بغیر ہی بہت سی امراض کا قلع قمع کر دیتا ہے۔ اسے ہر ایک بال بچے دار کیلئے گھر کا معالج کہا جائے تو کچھ مبالغہ نہیں ہوگا۔
مختلف امراض کے جراثیم کو ہلاک کرنے، دردوں کو بھگانے میں یہ زبردست طاقت رکھتا ہے اور ہر ایک بیماری کی ایک مجرب دوا ہے۔ قیمت فی شیشی دو روپے آٹھ آنہ۔ نصف ایک روپیہ چار آنہ۔ نمونہ ۸؍
"امرت" نام کی کتاب مفت منگائیے!
شکریہ کا خط
شریمان پنڈت جی!
پنڈت ہیرانند شاستری ایم۔اے
امرت دھارا آپکے گھر کا حکیم
امرت دھارا فارمیسی۔ لاہور

زمانہ کے بہترین مصنفین کا ادبی و پولیٹکل لٹریچر
سیاسی دُنیا میں زبردست ہلچل مچانیوالے اطالوی ڈکٹیٹر
مسولینی کی خودنوشت سرگذشت
مسولینی کی پالیسی سے آپ متفق ہیں یا نہیں۔ تاہم وہ ایک پکا قوم پرست ہے۔ اسکی زندگی کے حالات آپکو وطن کی محبت کے لئے راستہ دکھلاتے ہیں۔ دُنیا کے ہر مہذب ملک نے اسے اپنی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ ہم اس کتاب کے پڑھنے کی سفارش کرتے ہیں۔ کاغذ چھپائی اند جلد نہایت دیدہ زیب ہے پبلشرز بجا طور پر اسکی اشاعت پر فخر کر سکتے ہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ ہمارے ناظرین ضرور اپنی لائبریری میں اس کتاب کا اضافہ کریں گے
قیمت ریویو رسالہ ریت لریلی جون ۱۹۳۹ء
سوانح حیات
سیاسیات
آئینہ ہندوستان
سوویٹ روس
پولیٹکل اکانومی
پیغام آزادی
قوم کی آواز
فطرت نگار سدرشن
قدرت کے کھیل
افسانہ عدیم المثال منشی پریم چند
غبن - پردہ مجاز
خواب و خیال وغیرہ وغیرہ
پبلشرز: میسرز لاجپت رائے اینڈ سنز تاجران کتب لوہاری گیٹ لاہور

بندرابن کی برسات

زمانہ

جلد ۷۳ — جولائی ۱۹۳۹ء — نمبر ۱

اُردو ـ ہندی یا ہندُستانی

(از مسٹر منوہر لال کپور طالب چکوالی ـ بی ـ اے، ایل ایل ـ بی)

غور و فکر کے عادی ہندوستانی دماغوں کے لئے اِس وقت زبان کا مسئلہ ایک پریشان کن معمہ بنا ہوا ہے۔ نئی نئی اُلجھنیں، نئی نئی اُپجیں اور نئی نئی مشکلات پیدا ہو رہی ہیں۔ ملک کے بہترین دماغ اس کا حل تلاش کرنے میں مشغول ہیں، مگر یہ گتھی کچھ ایسی اُلجھی ہوئی ہے کہ اس کا سلجھانا ممکن نہیں تو غیر اغلب ضرور نظر آتا ہے۔

اِس مسئلے پر مختلف حضرات نے مختلف نقطۂ نگاہ سے روشنی ڈالی ہے۔ ریڈیو پر متعدد اصحاب کی تقریریں ہوئیں، بعض صوبجاتی حکومتوں نے بھی اس کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی، مہاتما گاندھی نے بھی توجہ کی، اور "زمانہ" میں اِس اہم ترین مسئلہ پر کئی قابلِ دید مقالے شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن صاف گوئی معاف کی جائے تو یہ حقیقت ناقابلِ تردید ہے کہ ابھی ہم اِس مسئلہ کے حل سے اتنے ہی دُور ہیں جتنے کہ پہلے بلکہ شاید اس سے بھی کچھ زیادہ دُور چلے گئے ہیں، اور اگر اس کے حل کے تلاش کا سلسلہ اسی طرح جاری رہا تو کیا عجب ہے کہ ہم "کعبہ" کی بجائے "ترکستان" پہونچ جائیں۔

اب تک اِس مسئلہ پر جو کچھ لکھا یا کہا گیا ہے وہ چند غلط مفروضوں پر مبنی ہے۔ عرصۂ دراز کی غلامی کی بدولت ہماری ذہنیت بھی غلامانہ ہو گئی ہے، اور آزاد خیالی یا کسی مسئلہ پر آزادانہ غور و خوض کی عادت ہم میں باقی نہیں رہی ہے۔ بعض مفروضے صرف اپنی قدامت کی وجہ سے ہمارے گلے کا ہار بن گئے ہیں

اور بعض مفروضے مقدر و معروف ہستیوں کے منظورِ نظر ہونے کے باعث ہمارے دل و دماغ پر حکمراں ہیں۔ اور آزادانہ طور پر سوچنے کی اجازت نہیں دیتے۔ اِن غلط مفروضوں کی بنیاد پر جو عمارت کھڑی کی جائیگی وہ یقیناً اعتماد کے قابل نہ ہوگی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ تمام بحث و مباحثے، تقریریں و تحریریں اور مقالے وغیرہ اِن ظالم مفروضوں کو درست مان کر معرضِ وجود میں آرہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تمام غور و فکر کے باوجود ہم غلط راستہ پر چل کر ایسے چکر میں پڑ گئے ہیں جس سے نکلنا ممکن نظر نہیں آتا۔ اس مضمون میں ہماری غرض و غایت ایک سہل اور قدرتی حل کے متعلق چند خیالات پیش کرنے کی ہے۔ ناظرین اگر صدیوں کے پُرانے مفروضوں کو نظرانداز کرکے دماغ کو قدرتی طور پر سوچنے کا موقعہ عطا کریں گے تو یقین ہے کہ وہ انھیں نتائج پر پہونچیں گے۔

اِس سلسلے میں سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ کیا تمام ہندوستان یا بھارت ورش کے لئے ایک زبان ہونا ضروری ہے؟ کیا تمام ملک کی ایک زبان ہونا ملکی یک جہتی و اتحاد کا لازمی پیش خیمہ ہے؟ عام طور پر یہ فرض کرلیا جاتا ہے کہ جب تک تمام ملک کی زبان ایک نہ ہو ملکی اتحاد یا مکمل آزادی نصیب نہ ہوگی۔ یہ خیال ایک مفروضہ کی شکل اختیار کرچکا ہے، لیکن شاید ہی کوئی دوسرا خیال اس قدر غلط اور نقصان رساں ثابت ہوا ہو۔ کانگریس نے اسی طرح ہندو مسلم اتحاد کے متعلق بھی غلط طریقہ اختیار کر رکھا ہے۔ "اتحاد کسی قیمت پر" اور کسی خاص جماعت کی نازبرداری سے حاصل نہیں ہوسکتا اور اگر ہو بھی جائے تو ایسا اتحاد دیرپا ثابت نہ ہوگا۔ اس مضمون میں اس موضوع پر بالتفصیل لکھنے کی گنجایش نہیں، لیکن ہندوستان کی سیاسی تاریخ اس بات کا ایک سے زیادہ مرتبہ بیّن ثبوت مہیا کرچکی ہے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ اس غلط پالیسی کی وجہ سے حقیقی ہندو مسلم اتحاد ایک اُمید موہوم بن کر رہ گیا ہے۔ راقم کا صدقِ دلی سے عقیدہ ہے کہ اگر اس غلط پالیسی پر عمل نہ کیا جاتا تو حقیقی ہندو مسلم اتحاد بہت نزدیک ہوگیا ہوتا اور یقیناً ہم اس کی بدولت مکمل آزادی کی منزلِ مقصود کے بہت نزدیک پہونچ گئے ہوتے۔

ہندوستان کو ایک ملک سمجھنا ہی غلطی ہے۔ رقبہ، وسعت اور آبادی وغیرہ کے لحاظ سے یہ چھوٹا سا برِّاعظم ہے۔ اتنے بڑے خطۂ زمین کے حصولِ آزادی کے لئے یہ لازمی قرار نہیں دیا جاسکتا کہ تمام ملک میں ایک ہی زبان استعمال کی جائے۔ مختلف صوبوں میں مختلف زبانیں ہونگی۔ بھلا ۴۰ کروڑ بندگانِ خدا جو ہمالیہ سے راس کماری اور کوئٹہ سے کلکتہ تک خطۂ زمین پر آباد ہیں اور مختلف [illegible] سے ہیں، ایک ہی زبان کیسے بول سکتے ہیں؟ آب و ہوا زبان کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتی۔ اس

یہ نظریہ کہ اڑتیس کروڑ نفوس ایک اور صرف ایک ہی زبان استعمال کریں طلسم خانۂ خیال سے نکل کر کبھی عملی شکل اختیار نہیں کرسکتا۔

اس ملک کے مختلف خطوں میں جنھیں سیاسی حیثیت سے مختلف صوبجات کا نام دیا گیا ہے مختلف زبانیں رائج ہیں اور رہیں گی، ان کا لٹریچر، ساہتیہ اور بولی ٹھولی سب الگ ہوگی ہاں ایک ایسی زبان کی ضرورت سے جو بین الصوبجاتی زبان کا کام دے سکے انکار نہیں ہوسکتا مگر یہ خیال کہ کسی خاص صوبہ کی مروجہ زبان اپنی موجودہ شکل میں ایسی مشترکہ ملکی زبان کا کام دے سکتی ہے قرین قیاس نہیں۔ یہ خیال صریحاً غلط ہے مگر یہی خیال مختلف مروجہ زبانوں کی باہمی زور آزمائی کا سبب بن گیا ہے۔

چند کوتاہ اندیش و خودبین ادیبوں نے ۔ عرصہ سے یہ فضا اس درجہ مکدّر کر رکھی ہے کہ اس میں غیر ضروری طور پر وہ گرمی اور وہ کشمکش پیدا ہوگئی ہے جو وطنی اغراض اور ادبی مفاد کے قطعاً خلاف ہے۔ خدا ان حضرات کو عقل سلیم و نگاہِ بے تعصب عطا کرے کہ یہ مسئلہ جو اس وقت ایک ٹیڑھی کھیر ثابت ہو رہا ہے شرمندۂ حل ہو جائے۔

اُردو ہندی کا جھگڑا ایک مدت سے چل رہا ہے، اس پر بھی عجب انداز میں بحث ہو رہی ہے اُردو کی پیدائش سے ابتدا کی جاتی ہے اور اس کے پانے پوسنے کا سہرا مسلمان حضرات کے سر باندھا جاتا ہے، ہاں دبی زبان میں چند ہندو اہل کمال کا نام بھی لے لیا جاتا ہے تاکہ اُردو کے ہندو پرستاروں کی ہمدردی قائم رہے یا ان کی دلشکنی نہ ہو۔ اُردو کے پرستار اُردو کو تمام ہندوستان کی مسلمہ زبان قرار دینا چاہتے ہیں۔ نظام گورنمنٹ کو تو اُردو کا عشق اس درجہ مسحور کر چکا ہے کہ وہ اپنی کثیر التعداد رعایا کی مادری زبان کو اُردو پر قربان کرنے کی پوری کوشش کر رہی ہے۔

اسی طرح ہندی کے مدّاح چاہتے ہیں کہ ہندی یا برج بھاشا بھارت ورش کی مشترکہ زبان تصور کی جائے۔

جب سے یہ کشمکش شروع ہوئی ہے مسلمان حضرات جو عموماً اُردو کے پرستار ہیں، اردو کو عربی فارسی کے غیر مانوس الفاظ و ثقیل تراکیب سے گرانبار کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر سر اقبال مرحوم کی اُردو کو مفرس و معرب کرنے کی کوشش سب سے زیادہ کامیاب ثابت ہوئی ہے اور گو وہ اُردو شاعری کے نئے دَور کے پیغمبر ہیں لیکن زبان کے اعتبار سے اُنھوں نے اُردو کے ساتھ بہت بڑی

زیادتی کی ہے جس نے اس کے مشترکہ ملکی زبان ثابت ہونے کی راہ میں سخت رکاوٹ ڈال دی ہے۔ ان کے کلام میں جوش، پیغامِ عمل، تخیل، بلند پروازی، ندرت، فلسفہ سب کچھ ہے مگر انھوں نے اُردو کی سلاست کو فارسی عربی الفاظ کے جا بیجا استعمال سے بُری طرح گھائل کر دیا ہے، اور اُن کے ناعاقبت اندیش معتقدین نے اپنی اندھا دھند تقلید سے اردو ہندی اختلاف کی خلیج کو وسیع تر بنا دیا ہے۔ اِدھر ہندی والے بھی سنسکرت کے غیر مانوس الفاظ زیادہ سے زیادہ تعداد میں استعمال کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ مگر دونوں فریق یہ نہیں سمجھتے کہ اُن کی کوششیں اُن کی زبان کو ملکی زبان بننے کے نااہل بنا رہی ہیں۔

اُردو اور ہندی کے علاوہ دوسرے صوبوں کی زبانیں بھی خم ٹھونک کر میدان میں آرہی ہیں۔ جنوبی ہندوستان کی زبانیں شمالی ہند کی زبانوں (اُردو اور ہندی) کے اس دعوی ہمہ گیری کے سخت خلاف ہیں، اور مدراس وغیرہ میں تو اس کے خلاف سخت ایجیٹیشن جاری ہو گیا ہے۔

بہرحال یہ خیال کہ کسی بحث کے ذریعہ یا کسی کانفرنس کی قرارداد کے زور پر کسی خاص زبان کو ملک بھر کی مسلمہ زبان بننے کا امتیاز حاصل ہو سکتا ہے سراسر بے بنیاد اور محض لغو ہے۔

اِس میں کلام نہیں کہ جوں جوں بین الصوبجاتی کاروباری اور معاشرتی تعلقات بڑھتے جائیں گے (جیسے کہ آجکل بڑھ رہے ہیں) اور جوں جوں ذرائع آمد و رفت، سفر و قیام، سیر و سیاحت ترقی پذیر ہونگے، لوگوں کو ایک دوسرے کا مافی الضمیر سمجھنے کے لئے زیادہ سے زیادہ ایسے الفاظ کی ضرورت اور تلاش ہوگی جو مختلف صوبوں کے لوگ سمجھ سکیں۔ اور یہی مشترکہ زبان کی بنیاد ہوگی، اور خواہ ہم مانیں یا نہ مانیں اس زبان کی بنیاد پڑ چکی ہے۔ چنانچہ رفتہ رفتہ ہماری مشترکہ زبان کی عمارت اِسی بنیاد سے اُٹھے گی۔ بالکل اسی طرح جیسے مغلوں اور اہل ہند کے باہمی تعلقات اور اختلاط سے اُردو کی پیدائش ہوئی ہے۔ ہندوستان کی مشترکہ زبان بھی مختلف صوبوں کے لوگوں کے باہمی تعلقات اور میل جول سے بن رہی ہے، اس کا نام آپ جو چاہیں رکھیں یہ زبان عوام کی زبان ہوگی جس سے اس وسیع ملک کی بڑی بھاری اکثریت اپنا کام چلائے گی۔

بعض حضرات یہ سوچتے رہتے ہیں کہ اس نئی زبان کا پیوند اُردو، عربی، فارسی سے لگانا چاہیئے یا ہندی و سنسکرت وغیرہ سے، مگر کیا یہ ان حضرات کے بس کی بات ہے؟ کیا زبان کے بارے میں کوئی صاحب ہٹلرانہ اختیارات استعمال کرنے کے مجاز ہیں؟

موجودہ زمانہ میں تمام دنیا کی زبانیں آسان سہل اور صاف ہو رہی ہیں۔ انگریزی میں تو یہ تحریک امریکہ کے عملی مفکروں کی دُور اندیشی نے عرصہ سے جاری کر رکھی ہے۔ الفاظ کا تلفظ اور املا بھی سہل ہو رہا ہے، اور زبان بھی سادہ سلیس اور مختصر ہو رہی ہے۔ شاید اب وہ زمانہ آرہا ہے کہ جو زبان بولی جائے گی وہی لکھی جائیگی اور وہی ادبی زبان سمجھی جائیگی۔ ممکن ہے کہ ہمارے بعض مستند ادیبوں کو یہ بات ناگوار ہو، لیکن یہ بات ہو کر رہیگی اور انھیں آنے والے حالات کے مطابق ہونا پڑے گا۔

افسوس ہمارے ملک کے ادیب عہدِ ماضی کے دھندلے چراغ کی روشنی میں رہتے، پرانی لکیر کے فقیر بنے اور فرسودہ طرز پر سوچنے کے ایسے عادی ہو چکے ہیں کہ آجکل وہ محض غلط مفروضوں کی بنا پر نئی نئی اُلجھنیں پیدا کر رہے ہیں، ورنہ کون نہیں جانتا کہ اب عام بول چال میں عربی، فارسی کے حلق شگاف الفاظ کی گنجائش نہیں، اور نہ سنسکرت کے غیر مانوس مردہ الفاظ کی ضرورت ہے۔ زبان روز بدن بلکہ لحظہ بلحظہ آسان ہوتی جاتی ہے۔ صوبجات کے باہمی اختلاط سے خود بخود ایک مشترکہ زبان پیدا ہو رہی ہے، جو آئندہ ہماری مُلکی زبان ہوگی۔

ادب، ساہتیہ، کلچر کہنے کے لئے خوب چیزیں ہیں، مگر ان کا مفہوم اس عملی دنیا میں جس کو آپ مادہ پرستی کا دور کہہ سکتے ہیں اور سے اور ہوا جا رہا ہے۔ یہ محض ہماری خود غرضیاں ہیں جو ہم کو صحیح غور و خوض سے باز رکھتی ہیں۔ جن لوگوں نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ اُردو کی خدمت میں گزارا ہے، یا جن کے بزرگوں نے تمام عمر اُردو کی محنت اور عرقریزی سے خدمت کی ہے وہ قدر دانی کا فقدان دیکھکر بھی جو زیادہ تر مذہبی تعصبات کی بنا پر ہے اس راستہ سے باز رہنے کا خیال دل میں نہیں لاتے ہیں۔ اُردو شاہی زبان تھی، حکومت کے رعب و اقتدار یا روزی کی ضروریات سے مجبور ہوکر ہندوؤں نے اُردو کو اپنایا اور اس میں کمالات دکھائے، لیکن تاریخ اُردو لکھنے والوں نے ان سے بے مثال ادبی بے انصافی کی اور شاید وہ اسی سلوک کے مستحق تھے لیکن اسلامی حکومت کے زوال کے بعد ہندوؤں کا اُردو پر دم بھرنا اُن کی روایتی سادہ لوحی یا فریبِ نظر کا کرشمہ ہے۔ جس طرح انگریزی میں دادِ کمال دینا انگریزی زبان کو ہندوستانیوں کی زبان نہیں بنا سکتا، اُسی طرح اُردو بھی ہندوؤں کی زبان نہ بن سکی۔ یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ بعض حضرات انگریزی کو ہندوستان کی مشترکہ زبان بنانے پر مستعد نظر آتے ہیں مگر یہ خیال بھی ناممکن العمل ہے۔ انگریزی جیسی مشکل زبان صرف اسی وجہ سے ہماری ملکی زبان نہیں بن سکتی

کہ ہماری زبانیں آپس میں لڑ جھگڑ رہی ہیں، تاحال ہم کسی متفقہ فیصلہ پر نہیں پہونچ سکے ہیں واقعی انگریزوں کے چلے جانے کے بعد انگریزی کی حیثیت اُردو سے بھی بدتر ہو جائے گی اس لیے اس غیر ملکی زبان کا ہندوستانی عوام کی مشترکہ زبان بننے کا خیال سراسر خام ہے۔

دراصل جب تک مذہب کو سیاسیات سے علٰحدہ نہیں کر دیا جاتا، ہندوستانی سیاسی حیثیت سے طفلِ مکتب ہی رہیں گے اور اُن کے خیال میں پختگی اور عمل میں استواری آنا ناممکن ہے۔ بہرحال مذہبی جنون مسئلہ زبان کو پیچیدہ سے پیچیدہ تر بنا رہا ہے ورنہ ہر اہلِ نظر دیکھ سکتا ہے کہ مستقبل کی مشترکہ ملکی زبان جو تمام ہندوستان میں بولی اور سمجھی جائیگی پیدا ہو چکی ہے اور عملی زندگی کے گہوارے میں پرورش پا رہی ہے۔ اس کا نام چاہے "ہندستانی" رکھا جائے یا اُسے کسی اور نام سے یاد کیا جائے، درحقیقت نام میں کیا دھرا ہے؟ اگر جاپان کی مشترکہ زبان "جاپانی" چین کی "چینی" امریکہ کی "امریکن" کہلاتی ہے تو ہند کی مشترکہ زبان کو "ہندی" کہنے میں کوئی اعتراض ہونا چاہیئے۔ اگر برج بھاشا یا کھڑی بولی کو بعض حضرات "ہندی" کہہ دیتے ہیں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اہلِ ہند کی زبان کو "ہندی" نہ کہا جائے۔ بہرحال نام کا اتنا اختلاف نہیں ہوگا جتنا طرزِ تحریر کا۔ تحریر میں اُردو حروفِ تہجی آ۔ ب۔ پ استعمال ہوں یا برج بھاشا کے کا۔ کھا۔ گا (क-ख-ग) یا انگریزی کے اے۔ بی۔ سی (A.B.C) اس میں شک کی گنجائش نہیں کہ برج بھاشا کے حروفِ تہجی سہل ترین اور مکمل ترین ہیں، ٹائپ اور پریس کی سہولتیں انگریزی جتنی میسر ہیں، لیتھو کی محتاج نہیں۔ ہمیں اس پر طویل بحث مطلوب نہیں کیونکہ دنیا بھر کے محققین ان نتائج پر پہونچ چکے ہیں اور اگر اہلِ ہند بھی بے تعصب ہو کر ان نتائج کو جو حقیقت پر مبنی ہیں بلاتامل قبول کر لیں تو یہ مسئلہ فوراً حل ہو سکتا ہے، ورنہ رفتہ رفتہ جلد یا دیر میں مُلک کی فضا تعصب کے گرد و غبار سے صاف ہو جائیگی تو ہندوستان کی مشترکہ ملکی زبان کے لئے یہی حروفِ تہجی استعمال ہونگے۔

جذباتِ حیات

(از عمر حیات صاحب حیات ایچ۔ پی (آنرز))

دوا کے کام نکلیں کیا دُعا سے — دوا دے رہبرِ کامل دوا دے

مرا سب نیک و بد ہے تجھ پہ روشن — ہنسا دے یا مجھے رونا سکھا دے

کسے ہے، ایک حالت پر قناعت — مری قسمت بڑھا دے یا گھٹا دے

نہ ہو سرسبز گر نخلِ تمنا — مٹا دے یہ مری ہستی مٹا دے

(نگاہ ناز سے)

(از حضرت روش صدیقی)

مسندِ ناز سے کیوں اُٹھ کے چلے آئے ہو
زندگی بخش گماں دیکھ رہا ہوں تم کو
میں کہاں جلوہ نشاں دیکھ رہا ہوں تم کو

یہ گھٹائیں، یہ ہوائیں یہ شب تیرہ و تار
جیسے ہر لحظۂ آفاق ہو محشر بکنار
غرقِ ظلمت مرا کاشانۂ وحشت آثار
ہائے اس وقت کہاں دیکھ رہا ہوں تم کو

کیا محبت بھی سفیرِ غمِ منزل نہ ہوئی
غفلتِ تمکنت آموز نے روکا نہ تمھیں
شعلۂ نازِ جہاں سوز نے روکا نہ تمھیں
ہائے عشقِ ادب افروز نے روکا نہ تمھیں
کیا کہیں خاکِ وفا راہ میں حائل نہ ہوئی
پائے نازک پہ تصدقِ کششِ دل نہ ہوئی

جیسے تم ہو، کوئی اس طرح حسیں ہوتا ہے
شاید ایسا تو محبت میں نہیں ہوتا ہے
ہر خموشی سے نمایاں خلشِ بیتابی

غم نما ہر شکن پیرہن شب خوابی
اشکِ گلرنگ سے آنکھوں کی فضا عنابی
حسنِ معصوم بھی یوں سوگ نشیں ہوتا ہے

ہائے اس حالِ پریشاں کا سبب بھی کچھ ہے
کیا مجھے شاکیِ آلامِ جہاں سمجھا تھا
کیا مرے ضبط کو نسبطِ گذراں سمجھا تھا
کیا مرے درد کو بے تاب تواں سمجھا تھا
اشک ہائے سر داماں کا سبب بھی کچھ ہے
اس گہر باریِ مژگاں کا سبب بھی کچھ ہے

اب تمھیں نکہتِ گیسوئے پریشاں کی قسم
ہو گوارا تو مرے چاکِ گریباں کی قسم
تم مجھے معتکفِ کنج وفا رہنے دو
ربطِ عشق کو محرومِ صدا رہنے دو
آہ! یہ بارشِ الطاف و عطا رہنے دو
تمھیں اپنے روشِ بے سر و ساماں کی قسم

رباعیات

احساس کا ہر ناز اٹھانا ہی پڑا
سر خاکِ مذلت پہ جھکانا ہی پڑا
معلوم کئے ہزار اسرارِ حیات
ہستی کا مگر فریب کھانا ہی پڑا

تعریف نہ کر رفیقِ جانی میری
پامال بہت ہے زندگانی میری
یہ مجھ میں شرافت جو نظر آتی ہے
بنیاد ہے اس کی ناتوانی میری

مثنوی کا پُرانا اور نیا انداز

از حضرت احسن مارہروی

اُردو کی شاعرانہ تصانیف میں سب سے پہلے مثنوی کا پتہ ملتا ہے جس کے آغاز کا پتہ نویں صدی ہجری کے آخر اور دسویں صدی ہجری کے اول سے گجرات اور دکن میں چلتا ہے۔ ہر زبان اپنے ابتدائی زمانہ میں سہل اور عام فہم بول چال سے شروع ہوتی ہے۔ کوئی پیچ پیچ اور اُلجھی ہوئی ترکیبیں نہیں ہوتیں۔ جس انداز اور جس ترکیب سے عوام بولتے ہیں اُسی طرح شعرا اپنے کلام کو موزوں کر دیتے ہیں۔ اُردو زبان کی ابتدا گجرات یا دکن سے ہوئی جہاں مرہٹی، تلنگی اور ٹامل وغیرہ زبانیں رائج تھیں۔ اُس زمانہ کے جو نمونے ملتے ہیں وہ آجکل کے لئے بالکل اجنبی ہیں۔

نمونوں کی تفصیل سے پہلے ضرورت ہے کہ مختصراً مثنویوں کے معیاری انداز کو سمجھ لیا جائے۔

کسی مثنوی کی خوبی کا اندازہ کرنا ہو تو یہ دیکھنا چاہئے کہ امورِ ذیل کا کہاں تک خیال رکھا گیا ہے اور شاعر کو اُن سے عہدہ برآ ہونے میں کہاں تک کامیابی ہوئی ہے۔

سب سے مقدم شرط یہ ہے کہ جس داستان کے مُرقع کو دیکھنا ہے۔ اُس میں کہاں تک حسنِ ترتیب پایا جاتا ہے۔ شاعر کو کسی تاریخی واقعے میں جو مسالا ہاتھ آتا ہے وہ چند اجزائی، خام اور غیر مرتب واقعات ہوتے ہیں۔ اب دیکھنا چاہئے کہ اُس نے اس کا خاکہ کیونکر قائم کیا اور واقعات میں کس طرح ترتیب پیدا کی کس واقعے سے آغاز کیا جن ضمنی واقعات سے گذرتا ہوا اصل واقعے تک پہونچا اُن میں کس قسم کی ترتیب اور کتنی مناسبت ہے، کس طرح اُن کی کڑیاں ایک دوسرے سے ملتی ہیں۔ کن کن واقعات پر زور دیا ہے، کن کو اُبھارا ہے، کن کو دُھندلا رکھا ہے، موقع بہ موقع تخیل سے کس طرح کام لیا ہے، اخلاقی نتائج پیدا کرنے کے لئے جو فرضی باتیں پیدا کرلی ہیں اُن میں کس طرح تناسب پیدا کیا ہے جس سے یہ معلوم ہو کہ قصداً ایسا نہیں کیا بلکہ بات میں بات پیدا ہو گئی ہے، جذبات سے اپنے اپنے محل پر کیا کیا اثر ڈالا ہے، اگر ان تمام مرحلوں سے شاعر عہدہ برآ ہو، تو وہ حسنِ ترتیب میں کامیاب سمجھا جائے گا۔

مثنوی میں سیکڑوں اشخاص کا تذکرہ ہوتا ہے۔ مرد، عورت، بچے، جوان، بوڑھے، نوکر، آقا، امیر،

غریب، سوداگر، عالم، جاہل وغیرہ وغیرہ اشخاص کے اخلاق، خُوبو، طرز، انداز، مزاج، طبیعت، گفتگو، بول چال مختلف ہوتی ہے۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ جس شخص کا بیان کرے اُس کی تمام امتیازی خصوصیت قائم رکھے۔ بچے کا بیان اس طرح کرنا چاہئے کہ اس کی بات بات میں بچپن کی ادائیں پائی جائیں۔ نوکر کا واقعہ لکھا جائے تو اس کے اخلاق و عادات، بول چال، طرز و انداز سے نوکری اور محکومی کی بُو آتی ہو۔ ایک شریف کا بیان ہو تو سخت سے سخت حوادث میں مبتلا ہونے پر بھی اُس کی شرافت کے جوہر نظر آئیں۔ غرض کہ ہر شخص کا کیرکٹر اسی طرح بیان کیا جائے جو اُس کے حالات سے مطابقت رکھتا ہو۔

مثنوی کے لئے واقعہ نگاری بھی ایک بڑا وصف ہے، جس کا کمال یہ ہے کہ جس چیز کا بیان کیا جائے اس طرح کیا جائے، جس طرح ایک ماہرِ فن کرتا ہے یعنی اس کی تمام اصلی خصوصیتیں بیان کی جائیں۔ اکثر شعراء جب دو پہلوانوں کی لڑائی باندھتے ہیں تو زمین اور آسمان کو ملا دیتے ہیں۔ لیکن یہ نہیں بیان کرتے کہ دونوں کس طرح بڑھے، کیونکر وار کیا اور کیا کیا داؤں پیچ کئے۔ تلوار کے کیا کیا ہاتھ نکالے، نیزے کے بند کیونکر باندھے، کمان کیونکر چڑھائی، تیر کس طرح جوڑا، ڈھال کیونکر سر پر لی وغیرہ وغیرہ۔ شاعر جب کسی بات کو واقعہ کی حیثیت سے لکھے تو اگرچہ وہ فرضی ہو، لیکن اُس کا فرض ہے کہ بیان میں کوئی ایسی بات نہ آئے جس سے واقعہ ناممکن یا مشکوک ہو جائے۔ یہ نقص مختلف اسباب سے پیدا ہوتا ہے۔ کبھی تو جو واقعہ بیان کیا جاتا ہے حقیقتاً ناممکن ہوتا ہے۔ مثلاً یہ واقعہ کہ جب رستم چلتا تھا تو گھٹنوں تک زمین میں دھنس جاتا تھا۔ کسی خاص موقع پر ایسا ہونا ناممکن نہ ہو، لیکن قوت کی زیادتی اور زور کی وجہ سے ناممکن معلوم ہوتا ہے، یا مثلاً یہ واقعہ کہ کیکاؤس نے عقابوں کے ذریعے آسمان پر چڑھنا چاہا۔ کیکاؤس کے جو حالات اور واقعات مذکور ہیں، اُن سے وہ اِس قدر احمق ثابت نہیں ہوتا کہ ایسی بیہودہ کوشش کا ارادہ کرتا۔ غرض واقعہ نگار کا یہ سب سے مقدم فرض ہے کہ واقعے کو اس صورت میں ظاہر کرے کہ دِل میں اُتر جائے۔

مثنوی کے ان اصول و ضوابط اور معیار و امتیاز کی پابندیاں ضروری ہیں مگر اکثر شعراء فارسی بھی شاعرانہ تخیلات کی رو میں مُبالغہ کی دلدل میں پھنس کر بھٹک گئے ہیں۔ اُردو جس نے فارسی کی پیروی میں پہلا قدم اُٹھایا ہے اس میں بھی اکثر ایسے ہی نمونے نظر آتے ہیں جن پر بے راہ روی کا الزام عائد ہوتا ہے۔

پُرانی اُردو مثنویاں جن کا صاف اور سُتھرا نمونہ سراج اورنگ آبادی سے شروع ہوتا ہے۔ بہترین اوصاف کے ساتھ ایسے مصائب بھی پیش کرتی ہیں، جن کو اصول و ضوابط کے لحاظ سے نہ ہونا چاہئے تھا۔ لیکن یہاں زمانہ کی اُفتاد اور ہر عہد کے ماحول اور گرد و پیش کے واقعات و اثرات کو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہئے۔ ڈیڑھ دو صدی پہلے کے شعرائے اُردو نے جو کچھ کہا وہ اپنے زمانہ کے مذاق کے مطابق کہا، جس کو اُن سے

پہلے ایرانی کہتے آئے تھے اور بلا اختلاف تمام ہندوستان میں پسند کیا جاتا تھا۔ خلاصہ یہ ہے کہ پرانے مثنوی گو جنھیں سراج اورنگ آبادی، میر تقی میر، میر حسن، پنڈت دیا شنکر نسیم، تلق، مومن اور نواب مرزا شوق زیادہ مشہور و معروف ہیں، وہ سب اُسی پرانی روش پر چلے جس میں عاشقانہ رنگ آمیزی کی کثرت، فرضی تخیل کی افراط، رعایت لفظی کی بھرمار اور استعارہ و مبالغے کے طومار سے دفتر کے دفتر سیاہ کئے گئے تھے۔ اب اُن پرانے انداز کی مثنویوں کے نمونے سنائے جاتے ہیں اور سلسلہ قائم رکھنے کے لئے پہلے گجراتی اور دکنی شعراء کے صاف صاف دو دو ایک ایک شعر سن لیجئے۔

(۱) مثنوی قطب مشتری مصنفہ وجہی متوفی ۱۰۴۸ھ

شہنشہ مجالس کے ایک رات | وزیراں کے فرزند تے سب منگات
لگے مطرباں گانے یوں ساز سوں | کہ ڈہرتی ہلے مست آواز سوں

(۲) مثنوی سیف الملوک مصنفہ غواصی متوفی ۱۰۳۵ھ

ہوئے جمع جنگی ہزاراں تمام | قوی مور خونخوار امیراں تمام
بڑا رن پڑا سخت رگڑا ہوا | کھیں نیں سا سویوں جھگڑا ہوا

(۳) مثنوی پھول بن مصنفہ ابن نشاطی متوفی ۱۰۶۶ھ

مرا تھا باپ سوداگر ختن کا | نہ تھا پروا اسے کچھ مال و دھن کا
بڑا تھا بہوت سب سوداگراں میں | اتھا مشہور سالم بندراں میں

(۴) مثنوی علی نامہ مصنفہ نصرتی متوفی ۱۰۸۱ھ

اسی رات ارسطوئے دوراں کے یہاں | دکن کے سب اعیان تھے میہماں
سنوارے تھے کئی انجمن دل نشین | نشیمن میں ہر روح راحت گزیں

ان دکنی نمونوں کے بعد اُن پرانی مثنویوں کے نمونے سنئے جو اورنگ زیب عالمگیر کے عہد سے شروع ہو کر چودھویں صدی ہجری کے اول تک جاری رہے بلکہ اس کے بعد اگر کسی نے اُن کے تتبع میں مثنوی کہی ہے تو اس انداز میں کہی ہے۔

(۵) مثنوی بوستانِ خیال مصنفہ سراج اورنگ آبادی، متوفی ۱۱۷۷ھ

میں کہتا ہوں اول سے سب ماجرا | جو کچھ مجھ پہ گذرا ہے تا انتہا
مجھے نوخطی تھی جس ایام میں | مقید نہ تھا میں کسی دام میں
نیا ان دنوں شعر کا شوق تھا | گل و باغ کی سیر کا ذوق تھا

جدھر جاؤں میں کیا غنی کیا غریب　　مرے ساتھ رہتے تھے اکثر نجیب

اس عہد میں دکنی زبان کی شُستگی اور بندشوں کی پختگی صرف اورنگ آباد کے لئے مخصوص تھی جیسا کہ سراؔج کے شعروں سے ثابت ہے۔ دوسرے دکنی صوبوں میں اُس وقت بھی پُرانی دکنی غالب تھی۔ جیسا کہ ان مثالوں سے معلوم ہوگا۔

شاہ حسین ذوقؔی متوفی سنہ ۱۱۰۹ھ سب رس کے منظوم ترجمے میں کہتے ہیں:۔

مگر یہ حسنِ دل کا خوش سرشتہ　　لبھایا من کو میرے ہو فرشتہ

اگرچہ اس سرشتے سے اول بھی　　گندے ہیں ہار ملّا شیخ وجہی

اسی عہد کے شاہ بیر اللہ محرومؔی یوں کہتے ہیں:۔

زباں اور نظر دونوں مل یار ہو　　چلے ہیں تماشے کو اک ٹھار ہو

اب دہلی اور لکھنؤ کی مثنویوں کے پُرانے نمونے سُنئے:۔

مثنوی دریائے عشق، مصنفہ میر تقی میرؔ متوفی سنہ ۱۲۲۵ھ

ایک جا اک جوانِ رعنا تھا　　لالہ رخسار و سرو بالا تھا

تھا طرحدار آپ بھی لیکن　　رہ نہ سکتا تھا اچھی صورت بن

ناگہ اک کوچے سے گزار ہوا　　آفت تازہ سے دوچار ہوا

ایک غرفے سے ایک مہ پارہ　　تھی طرف اُس کے گرم نظارہ

پڑ گئی اس پہ اک نظر اُس کی　　پھر نہ آئی اُسے خبر اُس کی

مثنوی سحر البیان عرف بدرِ منیر مصنفہ میر حسنؔ متوفی سنہ ۱۲۱۲ھ

ہوا ناگہاں اس کا اک جا گزر　　سُہانا سا ایک باغ آیا نظر

سفید ایک دیکھی عمارت بلند　　کہ تھی نور میں چاندنی سے دوچند

وہ چھٹکی ہوئی چاندنی جابجا　　وہ جاڑے کی آمد وہ ٹھنڈی ہوا

یہ عالم جو بھایا تو کوٹھے پہ آ　　اُترا اپنے گھوڑے سے اور سر جھکا

لگا جھانکنے اس مکاں کے تئیں　　کہ دیکھوں یہاں کوئی ہے یا نہیں

جو دیکھا تو آیا کچھ ایسا نظر　　کہ سب کچھ گیا اُس کے جی سے اُتر

مثنوی گلزار نسیم، مصنفہ پنڈت دیا شنکر نسیمؔ. متوفی سنہ ۱۲۶۰ء

کرتی تھی جو بھوک پیاس بس میں　　آنسو پیتی تھی کھا کے قسمیں

جامے سے جو زندگی کے تھی تنگ　　　کپڑوں کے عوض ملی تھی رنگ
پوچھا اسے آدمی پری [illegible]　　　انساں ہے پری ہے [illegible]
کیا نام ہے اور وطن کدھر ہے　　　ہے کون سا گل چمن کدھر ہے

مثنوی قول غمیں، مصنفہ مومن متوفی ۱۲۶۸ھ

مومن زار کہ تھا گرم [illegible] بیاں　　　شورش میں [illegible] تھا شعلہ فشاں
دل کے آتش سے جلا خاک ہوا　　　بجھ گیا شعلہ بھڑک کر دل کا

مثنوی طلسم الفت، مصنفہ قلق لکھنوی متوفی ۱۲۹۷ھ

کیا کہوں تم سے حال دل کیا ہے　　　کچھ مرے دل میں درد ہوتا ہے
ارے جی سنسنایا جاتا ہے　　　کو کلیجہ سے نکلا جاتا ہے

یہ ہیں پرانے انداز کے نمونے جن میں مثنویت کی حیثیت سے مثنوی بدر منیر کو فوقیت حاصل ہے۔

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد جتنے مثنوی گو شعراء گذرے ہیں ان میں مثنوی نواب مرزا شوق لکھنوی کی زبان باوجود عریاں اور فحش ہونے کے بہترین اور دلکش زبان ہے، مولانا حالی لکھتے ہیں :۔

"شوق کی مثنویوں کو ایک خاص حد تک بدر منیر پر ترجیح حاصل ہے۔ قدیم الفاظ اور محاورات سے، جو اب متروک ہوگئے ہیں اور بھرتی کے الفاظ سے پاک ہے۔ ان میں [illegible] کا بیان، زبان کی گھلاوٹ، روزمرہ کی صفائی، قافیوں کی نشست اور مصرعوں کی برجستگی کے لحاظ سے بمقابلہ بدر منیر بہت بڑھا ہوا ہے۔ ان میں مردانے اور زنانے محاوروں کو اس طرح برتا ہے کہ نثر میں بھی بے تکلفی سے آج تک کسی نے نہیں برتا۔"

اس کے چند مہذب اور سنجیدہ اشعار سنئے :۔

جائے عبرت سرائے فانی ہے　　　مورد مرگ ناگہانی ہے
کل جہاں پر شگوفہ و گل تھے　　　آج دیکھا تو خار بالکل تھے
جس چمن میں تھا بلبلوں کا ہجوم　　　آج اس جا ہے آشیانۂ بوم
بات کل کی ہے نوجوان تھے جو　　　صاحب نوبت و نشان تھے جو
آج وہ ہیں نہ ہے مکاں باقی　　　نام کو بھی نہیں نشاں باقی
ہر گھڑی منقلب زمانہ ہے　　　یہی دنیا کا کارخانہ ہے
صبح کو طائران خوش الحان　　　پڑھتے ہیں کل من علیہا فان

موت سے کس کو رستگاری ہے — آج وہ کل ہماری باری ہے
ہم بھی گر جان دیدیں کھا کر سم — تم نہ رونا ہمارے سر کی قسم

یہ سب مثنویاں تیرھویں صدی ہجری سے پہلے کی ہیں۔ چودھویں صدی ہجری میں زبان کے ساتھ ساتھ خیالات و حالات نے بھی بہت پلٹے کھائے، اور مبالغے، دور از کار استعارات و تشبیہات کو بیکار سمجھا گیا۔ مذاق کی اس تبدیلی میں مغربی تعلیم کا پورا اثر ہوا۔ جن باتوں کو اچھا سمجھا جاتا زمانہ اس کو برا کہنے لگا۔ شاعری میں ان تکلفات کو فضول کہا گیا۔ جس کو ابتدائے شاعری سے سب سراہتے آتے تھے۔ لفظی رعائتوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا اور اس کی جگہ صرف معنوی خوبیاں پیدا کرنے کا خیال قائم ہوا وہ تمام مثنویاں جن میں حمد و نعت، ساقی نامہ اور مختلف تمہیدیں ضروری سمجھی جاتی تھیں یک قلم موقوف ہوگئیں۔ اخلاقی، فطری، قومی اور تاریخی مضامین کو مستقل عنوانوں کے ساتھ کہنا شروع کیا۔ قصے کہانی کے دفتر الٹا دیئے گئے۔ اور مناظر قدرت پر زور طبع دکھایا جانے لگا۔ اس مذاق کی ابتدا ۱۸۷۴ء سے پنجاب میں شروع ہوئی اور مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا حالی نے پہلے پہل اسکے نمونے پیش کئے۔ جنکی مثالیں یہ ہیں:

مثنوی معرفت الٰہی، از آزاد، متوفی ۱۹۱۵ء۔

آؤ آزاد بیٹھے کیا ہو خموش — فصل گل آئی ہے بجوش و خروش
کیا پڑے کنج غم میں ہو بیکار — گل و گلشن کی چل کے دیکھو بہار
لطف صحبت بہم غنیمت ہے — میاں آزاد دم غنیمت ہے
چل کے دیکھو ذرا چمن کی سیر — گل و گلزار و یاسمن کی سیر
گرچہ بہر عوام کالانعام — لطف گلگشت ہو گیا بدنام
پر کرو دل میں تم جو اپنے غور — ہے ہر اک امر کا علاحدہ طور
نیک و بد پر اگر نظر ہے شرط — قصہ کا اپنے بھی اثر ہے شرط
سیکڑوں چیزیں اس جہاں میں ہیں — کہ بری خلق کے گماں میں ہیں
صرف ہووے گر اسمیں حسن خیال — تو ہو پھر نقص اس کا عین کمال

مثنوی حب وطن، از مولانا حالی، متوفی ۱۹۱۴ء

اے وطن اے مرے بہشت بریں — کیا ہوئے تیرے آسمان و زمیں
رات اور دن کا وہ سماں نہ رہا — وہ زمیں اور وہ آسماں نہ رہا
تیری دوری ہے مورد آلام — تیرے چھٹنے سے چھٹ گیا آرام

کانٹے کھاتا ہے باغ بن تیرے — گل ہیں نظروں میں خار بن تیرے

مٹ گیا نقش کامرانی کا — تجھ سے تھا لطف زندگانی کا

جو کہ رہتے تھے تجھ سے دور سدا — اُن کو کیا ہوگا زندگی کا مزا

ہوگیا یاں تو دو ہی دن میں یہ حال — تجھ بن اک اک پل ہے اک اک سال

سچ بتا تو سبھی کو بھاتا ہے — یا کہ بھ سے ہی تیرا ناتا ہے

کیا زمانے کو تو عزیز نہیں — اے وطن تو تو ایسی چیز نہیں

نئے انداز کی مثنویوں کا آغاز اگرچہ پچاس ساٹھ برس پہلے ہوچکا ہے مگر اس وقت سے ابتک یہی دور چل رہا ہے اور نئی پود انھیں پچاس سالہ درختوں سے قلمیں لے لے کر اپنی اپنی چمن بندیاں کر رہی ہے اور انھیں کو قبولیت عام کی سند حاصل ہو رہی ہے۔ نئے دور کے زیادہ نمونے اس لئے پیش نہیں کئے گئے کہ اس زمانے میں تمام اہل مذاق مجھ سے زیادہ آگاہ ہیں۔

HEROES & HEROINES OF ISLAM

I & II

لندن کی مشہور و معروف میسرس میکملن کمپنی نے ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں اپنی شاخیں کھولنے کے بعد مشرقی دلچسپی کی کتابیں اور رسالے بھی شائع کرنے شروع کئے ہیں۔ چنانچہ وہ بہت سی مشرقی کتابوں کے خلاصے چھوٹی چھوٹی کتابوں کی صورت شائع کر چکے ہیں، جو عام طور پر بہت مقبول ہوچکی ہیں۔ اب فرم مذکور نے ایک نئی کتاب "مشاہیر اسلام" کے نام سے شروع کی ہے جس کی پہلی اور دوسری جلدیں ہمارے پاس ریویو کیلئے آئی ہیں پہلی کتاب میں پیغمبر اسلامؐ کی مختصر مگر دلچسپ سوانحعمری ہے اور دوسری کتاب میں اُن کے جانشین حضرت ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ کے حالات درج ہیں۔ یہ کتابیں نہایت سلیس و عام فہم انگریزی زبان میں لکھی گئی ہیں اور انگریزی خوان بچے بھی نہایت آسانی سے پڑھ اور سمجھ سکتے ہیں۔ دونوں کتابیں بہت دلچسپ اور سبق آموز ہیں۔ اور اُن کے مطالعہ سے پیغمبر اسلامؐ اور اُن کے خلفاء کے حالات پر بخوبی روشنی پڑتی ہے۔ اُن کا ٹائپ بھی جلی ہے اور کاغذ بھی نفیس و دبیز ہے۔ سرورق میں کعبہ کا فوٹو۔

قیمت فی جلد چار چار آنہ ملنے کا پتہ:۔ میکملن اینڈ کو لیمٹیڈ بمبئی۔ کلکتہ، مدراس، لندن۔

فکر و نظر
(حضرت نجم آفندی)

مولانا حالی کی یاد*

از حضرت وصل بلگرامی

یہ اُس زمانہ کی بات ہے، جب مولانا حالی کی شہرت عام ہو چکی تھی اور میں بیتاب تھا کہ اُنھیں دیکھوں اور اُن کی گفتگو سنوں۔ غالباً مارچ ۱۹۰۵ء کا زمانہ تھا۔ میں لاہور سے واپس ہو رہا تھا۔ پانی پت میں میرے ایک خاص ملنے والے تھے، جن کا عرصے سے اصرار تھا کہ میں کسی طرح پانی پت آؤں اور اُن کا مہمان بنوں۔ اُسی کے ساتھ مولانا حالی سے ملنے کا شوق، اِن سب چیزوں نے مل کر مجھے پانی پت اُترنے پر مجبور کیا چنانچہ سب سے پہلے میں نے اپنے میزبان سے یہی خواہش ظاہر کی کہ مجھے جلد سے جلد مولانا حالی سے ملا دیں۔ معلوم ہوا کہ وہ اُن کے مکان سے قریب ہی رہتے ہیں۔ انصاریوں کا محلہ انھیں کے مورث اعلیٰ خواجہ عبد اللہ انصاری کے نام سے پانی پت میں مشہور ہے۔ جو غیاث الدین بلبن کے زمانہ میں یہاں آکر آباد ہوئے تھے۔

غرض میں پہلی فرصت میں اپنے میزبان کے ساتھ مولانا حالی کی زیارت کے لئے روانہ ہو گیا۔ آپ کے مکان پر پہونچا۔ دروازے پر اتفاق سے ملازم یا کوئی دوسرا شخص ایسا موجود نہ تھا۔ جو اطلاع کرتا۔ میرے میزبان نے کہا کہ مولانا تشریف رکھتے ہیں۔ وہ سنیئے اُن کی آواز آ رہی ہے۔ میں نے اِس سے پہلے نہ کبھی مولانا کو دیکھا تھا۔ اور نہ کبھی اُن کی آواز سنی تھی۔ یہ آواز ایک گفتار تھی جو مردانہ لہجے میں ہو رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی دوسری آواز بھی سنائی دی، جس سے کسی خاتون کا لہجہ اور زبان معلوم ہوتی تھی۔ مجھے کسی حیثیت سے وہاں ٹھہرنا نہ چاہیئے تھا اور میں نے واپس چلنے کا ارادہ بھی کیا، مگر میرے میزبان نے مجھے روکا۔ اب وہ آوازیں پھر کانوں میں آنے لگیں اور وہ مکالمہ سننا پڑا۔ دونوں آوازوں میں ضعف تھا، کمزوری تھی۔ مگر ایک ایسی دلچسپی اور دلکشی تھی جو بہت زیادہ اور خواہ مخواہ متوجہ کر رہی ہے۔ مردانہ گفتگو کیا تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی عبارت لکھوا رہا ہے۔ سلاست زبان اب بھی نہیں بھولی۔ حالی کی نثر کا نمونہ کسی کی زبان سے سن رہا تھا۔ دوسری گفتگو میں بھی اس طرز کا اثر موجود تھا۔ ابھی چند ہی منٹ گذرے ہوں گے کہ اندر سے

---

* مضمون لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے ۱۳ر دسمبر ۱۹۳۵ء کو براڈ کاسٹ کیا گیا ہے۔ اب قابل مصنف نے اسے ڈائرکٹر صاحب لکھنؤ کی اجازت سے ہدیۂ ناظرین کیا ہے، جس کے لئے ہم دونوں صاحبوں کے شکرگذار ہیں۔ ا۔ ز

ایک لڑکا آیا، اور ہم لوگوں کو دیکھکر پوچھنے لگا کہ آپ کیا چاہتے ہیں؟ میرے میزبان نے منشار ظاہر کیا۔ وہ اندر گیا؛ اور چند منٹ کے بعد ہم لوگوں کو بُلانے گیا۔ مولانا نے ہم لوگوں کو دیکھ کر کھڑا ہونا چاہا۔ میں نے اُن کو بٹھا دیا۔ اُس وقت مزاج ناساز تھا اور کمزوری بھی کافی موجود تھی۔ زمین کے فرش کی نشست تھی۔ سلام کے بعد ہم لوگ بیٹھ گئے۔ میرے میزبان کو وہ پہلے ہی سے جانتے تھے۔ میرا نام، پتہ، نشان پوچھا۔ معلوم ہوا کہ وہ میرے نام سے بھی واقف ہیں اور میری نظم و نثر کا نمونہ بھی اُن کے ملاحظہ سے گذر چکا ہے۔ پھر تو مولانا نے اسقدر مُسرت کا اظہار فرمایا کہ بیان سے باہر ہے۔ یہ لمحے، یہ ساعتیں، یہ گھڑیاں عُمر بھر یاد رہیں گی۔ جو وقت گذرا، علمی و ادبی گفتگو میں گذرا۔ میرے اصرار پہ کئی غزلیں، کئی رُباعیاں اور کچھ متفرق اشعار سُنائے۔ یہ شعر کبھی نہیں بھولے گا ؎

جہاں میں حالؔی کسی پہ اپنے سوا بھروسا نہ کیجئے گا　　　یہ بھید ہے اپنی زندگی کا بس اسکا چرچا نہ کیجئے گا

کافی عرصہ تک نشست رہی۔ میں اُٹھنا چاہتا، مولانا اپنے کمال اخلاق سے روک لیتے تھے۔ آخر رخصت ہونا پڑا۔ اُس کے بعد پھر کبھی ظاہری ملاقات نہ ہو سکی۔ لیکن اس شناسائی سے زیادہ وہ شناسائی ہے جس کو باطنی شناسائی کہتے ہیں اور یہ جب سے میں نے صحیح معنی میں ہوش سنبھالا ہے، اُسوقت سے ہوئی، روز بروز بڑھتی گئی۔ آج بھی ہے اور تا عمر رہے گی۔

درحقیقت حالؔی کی ہستی ایسی ہستی تھی کہ اگر تمام مُلک اُس کو بُھلانا بھی چاہے تو کسی طرح نہیں بھلائی جا سکتی۔

حالؔی کا پورا نام خواجہ الطاف حسین ہے۔ ۱۸۳۷ء میں اپنے آبائی وطن پانی پت میں پیدا ہوئے، ابھی کمسن ہی تھے کہ والدہ دُنیا سے رخصت ہو گئیں۔ اور جب ۹ برس کے ہوئے تو اُنکے والد راج ایزد بخش انصاری بھی ان کو چھوڑ کر چل بسے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں ان کی تعلیم و تربیت کا کیا انتظام ہو سکتا تھا۔ لیکن جو کچھ بھی ہو سکا۔ اُس سے ان کی صحیح فطرت نے پُورا فائدہ اُٹھایا۔ اُنھوں نے میر ممنون دہلوی کے بھتیجے سید جعفر علی سے جو فارسی کے ایک بے مثل ادیب اور اُستاد تھے، فارسی کتابیں پڑھیں۔ اور عربی کی تعلیم مولوی حاجی ابراہیم حسین انصاری سے پائی۔

جب یہ سترہ ۱۷ سال کے ہوئے تو ان کی شادی ایک متمول گھرانے میں ہو گئی۔ لیکن تعلیم کا شوق [illegible] قائم رہا۔ اِدھر اُدھر نظر دوڑائی تو دہلی کے سوا اور کوئی مرکز علم و ادب کا نظر نہ آیا۔ یہ وہاں چلے گئے۔ اور [illegible] سال قیام کیا۔ پھر پانی پت واپس آ گئے۔ اور ایک سال کے بعد ضلع حصار کی کلکٹری میں ایک [illegible] سی جگہ پر ملازمت اختیار کر لی۔ لیکن ۱۸۵۷ء کے قیامت خیز انقلاب نے یہ جگہ چھڑا دی اور وطن واپس آنا [illegible]۔

حالؔی دُنیا کی بہت سی منزلوں سے گذر چکے تھے۔ لیکن علم کا شوق اب تک دل میں چٹکیاں [illegible]

جب غدر کے اثرات کم ہو گئے تو ایک خاص ذریعے سے پنجاب گورنمنٹ بکڈپو لاہور میں ملازم ہو گئے۔ یہ جگہ اُن کے مذاق کے بالکل موافق تھی، یعنی جو کتابیں انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کی جاتی تھیں، اُن کو دُرست کر کے مروجہ زبانِ اُردو کے قالب میں ڈھالنا حالی کا کام تھا۔ اس کام نے آپ کے علمی مذاق کو ایک حد تک بدل دیا اور آپ پر آہستہ آہستہ مغربی اندازِ بیان اثر کرنے لگا۔ لاہور کے زمانہ قیام میں بھی آپ کو دلی کی یاد ستاتی رہی۔ فرماتے ہیں ؎

رلاتی ہے صبا اکس کو تیری یاد　　نہ میں بلبل نہ میرا گھر چمن ہے
کروں تجھ سے بیاں کچھ درد فرقت　　مگر جوشِ سخن تہہ در دہن ہے
ہے لاہور میں آکر یہ سمجھا ہے　　یہی دنیا یہی دارالمحن ہے
یہاں بیگانگی ہے اسقدر عام　　کہ بلبل نا شناسائے چمن ہے
مجھے تنہا نہ سمجھیں اہلِ لاہور　　تصور میں مرے اک انجمن ہے
مری خلوت میں ہے ہنگامۂ بزم　　خموشی میں مری ذوقِ سخن ہے
نہ لینے دیگا جنت میں بھی آرام　　یہی گر جذبۂ حُبِ وطن ہے

اتفاق سے اُسی زمانہ میں دہلی کے ایک اسکول میں آپ کو جگہ مل گئی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ سر سید علیگڈھ میں ایک تعلیمی ادارے کے قیام کی کوششیں کر رہے تھے۔ حالی اس کام میں سر سید کے شریک کار اور مشیر تھے انھیں دنوں میں سر آسمان جاہ مدار المہام سلطنتِ دکن علی گڈھ تشریف لائے۔ سر سید نے حالی کا بھی تعارف کرایا۔ ان کی علمی خدمتوں کا ذکر کیا۔ اور خاص الفاظ میں ان کی سفارش کی۔ سر آسمان جاہ نے خوش کر چھتّر روپیہ ماہوار کا ایک علمی وظیفہ مقرر کر دیا، جو بعد کو سو روپیہ کا ہو گیا۔

اِسکول کی ملازمت نے حالی کے لئے علمی دروازے کھول دیئے تھے۔ دہلی میں اُس وقت غالب کا طوطی بول رہا تھا۔ چنانچہ حالی نے بھی انھیں کے آگے زانوئے شاگردی تہہ کیا۔ اور اپنے اُستاد کے ساتھ اکثر دہلی کے مشاعروں کی رونق بنتے رہے۔ غالب کہا کرتے تھے کہ حالی اگر تم شاعری کا ذوق نہ رکھتے یا شعر نہ کہتے تو بڑا غضب کرتے۔ شاگرد کے بعض اشعار سے گھنٹوں لطف اُٹھایا کرتے تھے۔

غالب کی شاگردی اور شیفتہ کے فیض صحبت نے حالی کو ایک باکمال شاعر بنا دیا تھا۔ اور حالی اپنے زمانہ کے شعرا کے رنگ میں نہایت عمدہ شعر کہتے تھے۔ لیکن آپ کی طبیعت پر ایک اور رنگ غالب ہو گیا تھا جو چپکے چپکے اپنا اثر کر رہا تھا۔ یہی رنگ اور اثر ایک زمانہ میں آکر مسدس اور دوسری طرز جدید کی نظموں کا ذمہ دار بنا۔ کرنل ہالرائڈ جو محکمۂ تعلیمات کے ڈائرکٹر تھے، حالی کے لئے بہت مفید ثابت ہوئے۔ انھوں نے

ایک خاص قسم کے شاعرے کی بنیاد ڈالی۔ مختلف شعراء کو مختلف عنوانات دیدیئے جاتے تھے اور وہ اُن پر طبع آزمائی کرتے تھے۔ اس قسم کے شاعروں نے حالی کو مشقِ سخن کا بڑا عمدہ موقع دیا۔ چنانچہ اُن کی مشہور نظمیں برکھا رُت، نشاطِ اُمید، مناظرۂ رحم و انصاف اور حُبِ وطن وغیرہ انھیں شاعروں میں پڑھی گئیں۔ سر سید کی صحبت کا اثر بھی حالی کی شاعری پر بہت پڑا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۷۹ء میں اُن کا مشہور مسدس "مدوجزرِ اسلام" شائع ہوا۔ شروع شروع میں ہر طرف سے اس پر اعتراضات کی بوچھار شروع ہوگئی۔ لیکن جوں جوں اعتراضات بڑھتے گئے۔ مسدس کی مقبولیت بھی بڑھتی گئی اور ہر طرف حالی کی شاعری کا چرچا ہونے لگا۔

سچ تو یہ ہے کہ حالی کے پہلو میں ایک زندہ اور بےچین دل تھا۔ مگر لوگوں کی بے اعتنائی نے اُسے مردہ کر دیا تھا۔ اور قوم کی غفلتوں سے افسردگی چھا گئی تھی۔ چنانچہ ایک شاعرے میں غزل کی فرمائش پر لکھتے ہیں:

ہوئی رخصت جوانی کی بہار آخر حیف	طبع رنگین تھی مےِ عشق کی جب متوالی
اپنی روداد تھی، جو عشق کا کرتے تھے بیان	جو غزل لکھتے تھے ہوتی تھی سراسر حالی
اب کہ الفت ہے، نہ چاہت، نہ جوانی، نہ اُمنگ	سر ہے سودا سے تہی عشق سے دل ہے خالی
گر غزل کہیئے، تو کیا کہیئے غزل میں آخر	نہ رہی چیز، وہ مضمون سمجھانے والی
آپ بیتی نہ ہو جو وہ ہے کہانی بے لطف	گرچہ ہوں لفظ فصیح اور زبان ٹکسالی
ہاں مگر کیجیئے، کچھ عشق کا غیروں کے بیان	لائیے بارغ سے اوروں کے لگا کر ڈالی
کھینچیئے وصلِ صنم کی کبھی فرضی تصویر	کیجیئے دردِ جدائی کی کبھی نقالی
تاکہ بھڑکائے جوانوں کے دل آتش کی طرح	وہ ہوا جس سے دماغ اپنا ہوا ہے خالی
پر یہ ڈر ہے کہیں اپنی بھی دہی ہو نہ مثل	قحبہ چوں پیر شود پیشہ کند دلالی

ایسی حالی نے اور بہت سی نظمیں کہی ہیں۔ جن کے عنوان اصلاحی ہیں، مثلاً آزادی کی قدر، قحط الرجال، بےتمیزیِ ابنائے زمان، اسراف وغیرہ۔ اس قسم کی نیچرل نظمیں بہت مقبول ہوئیں لیکن ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو حالی کی شاعری کو تسلیم نہ کرتا تھا۔ اسمیں شک نہیں کہ حالی کی نظموں نے شاعری کی دُنیا بدل دی، حالی کی طبیعت میں غالب کا رنگ آخر تک غالب رہا۔ لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ اُنھوں نے غزل میں نام نہیں پیدا کیا۔ اگر نظموں کو چھوڑ کر ہم اُن کی غزلوں کو دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ حالی میں ایشیائی شاعری کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔ چنانچہ قدیم رنگ میں کہتے ہیں ؎

اُن کے جاتے ہی یہ کیا ہوگئی گھر کی صورت	نہ وہ دیوار کی صورت ہے، نہ در کی صورت

کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بلبل　　کل نہ پہچان سکے گی گلِ تر کی صورت

اپنی جیبوں سے رہیں سارے نمازی ہشیار　　اک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت

شوق میں اس کے مزا، درد میں اُسکے لذت　　ناصحو! اُس سے نہیں کوئی مفر کی صورت

داغ کا رنگ ملاحظہ ہو:-

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں　　اب ٹھہرتی ہے دیکھئے جا کر نظر کہاں

یارب اس اختلاط کا انجام ہو بخیر　　تھا اُس کو ہم سے ربط مگر اس قدر کہاں

اب وہ اگلا سا التفات نہیں　　جس پہ بھولے تھے اب وہ بات نہیں

لیکن جب طبیعت اس رنگ سے سیر ہو گئی، تو پھر اس طرح منھ موڑ لیا کہ لوگوں نے لاکھ مشاعروں میں بلایا مگر نہ جانا تھا نہ گئے، اب جو رنگ طبیعت پر غالب تھا، وہ مجاز سے ہٹ کر حقیقت تک پہنچ گیا تھا۔ پہلے تخیل کی بلند پروازیاں، استعاروں کی شوخیاں بھی کلام میں تھیں لیکن اب عالمگیر حقیقتیں غزلوں میں نظر آنے لگیں۔ ان کے یہاں میر کی خستہ دلی موجود ہے لیکن دھیمی دھیمی۔ غالب کی پیچیدگی سلاست میں تبدیل ہو گئی ہے، دل افسردہ ہو گیا ہے۔ آہیں نکلتی ہیں لیکن ٹھہری ہوئی۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہیں، لیکن تھمے ہوئے۔ اور جو کچھ کہتے ہیں اُس میں تاثیر کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے چند شعر ملاحظہ ہوں:-

گو جوانی میں تھی کج رائی بہت　　پر جوانی ہم کو یاد آئی بہت

زیر برقعہ تو نے کیا دکھلا دیا　　جمع ہیں ہر سو تماشائی بہت

آ رہی ہے چاہِ یوسف سے صدا　　دوست یاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت

کر دیا چپ واقعاتِ دہر نے　　تھی کبھی ہم میں بھی گویائی بہت

گھٹ گئیں خود تلخیاں ایام کی　　یا گئی کچھ بڑھ شکیبائی بہت

ہم نہ کہتے تھے کہ حالیؔ چپ رہو　　راست گوئی میں ہے رسوائی بہت

دہلی کے ایک مشاعرے میں ایک غزل پڑھی جس میں واہ واہ کے بجائے سامعین کے دلوں سے آہ نکل رہی تھی۔ اس کے چند اشعار آپ بھی سن لیں:-

تذکرہ دہلیِ مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ　　نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانا ہرگز

ڈھونڈھتا ہے دلِ شوریدہ بہانے مطرب　　درد انگیز غزل کوئی نہ گانا ہرگز

صحبتیں اگلی مصور ہمیں یاد آئیں گی　　کوئی دلچسپ مرقع نہ دکھانا ہرگز

لیکے داغ آئیگا سینے پہ بہت اے سیاح　　دیکھ اس شہر کے کھنڈر میں نہ جانا ہرگز

چپّے چپّے پہ ہیں یاں گوہر یکتا تہ خاک　دفن ہوگا کہیں اتنا نہ خزانا ہرگز
کبھی اے علم و ہنر گھر تھا تمھارا دلّی　ہم کو بھولے ہو تو گھر بھول نہ جانا ہرگز
شاعری مرچکی اب زندہ نہ ہوگی یارو　یاد کر کر کے اُسے جی نہ کڑھانا ہرگز
غالب و شیفتہ و نیّر و آزردہ و ذوق　اب دکھائیگا یہ شکلیں نہ زمانا ہرگز
مومن و علوی و صہبائی و ممنون کے بعد　شعر کا نام نہ لے گا کوئی دانا ہرگز
داغ و مجروح کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں　نہ سُنے گا کوئی بلبل کا ترانا ہرگز
رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیر و زبر　اب نہ دیکھو گے کبھی لطف شبانا ہرگز
بزم ماتم تو نہیں بزم سخن ہے حالی　یاں مناسب نہیں رو رو کے رلانا ہرگز

کہنے کو اِس کو غزل کہہ لیں مگر اس کا ہر شعر ایک مرثیہ ہے، غزل کے ساتھ ساتھ مولانا کی رباعیاں بھی تاثیر میں ڈوبی ہوئی ہوتی تھیں۔ عمر خیام کی رباعیوں کی طرح حالی کی رباعیوں کا بھی انگریزی اور دیگر زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

قصیدے میں تو عام طور پر ممدوح کی بیجا مدح سرائی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا، لیکن حالی کا وہ قصیدہ جو حضور نظام کے تخت نشینی کے وقت پڑھا گیا تھا ملاحظہ ہو۔ حالی کہتے ہیں ؎

ملک مرتبت میر عثمان علی خاں　مبارک تمھیں مسند شہریاری

بس ملک مرتبت کہہ کر فرض مداحی سے سبکدوش ہو گئے ہیں، اور اس کے بعد خاص نصیحت ہے، فرماتے ہیں ؎

مبارک ہو تم کو وہ دشوار منزل　جہاں چپّے چپّے پہ ہے ذمہ واری
مبارک بزرگوں کی میراث تم کو　جنھوں نے کہ جھیلی ہیں کڑیاں یہ ساری
اب ان کی جگہ آپ کو ہے اُٹھانا　خدا کی امانت کا یہ بوجھ بھاری
جو بے بس ہیں دینا ہے اُن کو سہارا　جو بے یار ہیں اُن کی کرنی ہے یاری
نکمّے جو ہیں اُن کو کامی بنانا　بڑھانا دل اُن کا جو ہیں کاروباری

دل سے نکلی ہوئی آوازوں کو نظم کیا ہے۔ مناجات بیوہ، چُپ کی داد، قصیدہ الغیاث اسکی روشن مثالیں ہیں یہاں تک آپ نے حالی کو شاعر کی حیثیت سے ملاحظہ کیا۔ لیکن بہ حیثیت نثار آپ اگر حالی کو دیکھینگے تو اُن کی نثر نگاری شاعری سے کسی طرح کم نظر نہ آئے گی بلکہ کچھ بڑھی ہوئی۔ اور کون ہے جو حیات سعدی، مقدمہ دیوان حالی، اذکار غالب، حیات جاوید وغیرہ سے واقف نہیں۔

غرض حالی کیا بہ حیثیت شاعر، کیا بہ حیثیت ناصح، کیا بہ حیثیت معلم، کیا بہ حیثیت مصنف دو درجہ

رکھتے تھے جو دوسروں کو کم نصیب ہوا۔

میں تو یہ کہوں گا کہ حالی آدمیت اور انسانیت میں شاعر ہونے سے زیادہ قابل ذکر تحسین ہیں۔ وہ ایک منکسر المزاج مرنجان ومرنج آدمی تھے۔ جس سے بات کرتے نہایت نرم اور شیریں لہجے میں بات کرتے۔ منہ میں پھول جھڑتے تھے۔ ہر شخص کے عیب کی پردہ پوشی کرتے، اور خود کسی کی غیبت نہ کرتے۔ اپنے یہاں تعلیم کے سخت حامی تھے۔ اہل علم، اہل فن اور نیک لوگوں کی بہت قدر کرتے تھے۔

آخر عمر میں جو لوگ اُن سے ملے ہیں، انھیں اندازہ ہوگا کہ حالی کتنا زبردست انسان تھا۔ اپنی یا اپنی شاعری کی تعریف سُنتے شرماتے تھے اور ہمیشہ اپنے کو ایک ناچیز سمجھتے۔ یہی انکسار اُنکے کمال کی دلیل ہے حالی ایک شاعر اور مصنف کی حیثیت سے جس مرتبے کے شخص تھے۔ اس کا اعتراف ہر شخص نے کیا ہے۔ لیکن ایک نقاد سمجھ سکتا ہے کہ ان کے شاعرانہ کمال کا راز صرف یہ ہے کہ وہ انسان ہونیکی حیثیت سے غیر معمولی خصوصیات کے مالک تھے۔

ہرچند وہ ستتر سال زندہ رہے اور عمر طبعی کو پہونچ کر ۱۹۱۴ء میں آج ہی کی تاریخ یعنی ۳۱ دسمبر کو دُنیا سے رخصت ہو گئے۔ لیکن چونکہ ان کی تصنیف اور شاعری کا حقیقی شباب ان کے بڑھاپے ہی میں شروع ہوا تھا۔ اس لئے ان کی موت یقیناً قبل از وقت ہوئی اور ملک ان برکات سے محروم ہو گیا جو صرف حالی کے دل ودماغ کا نتیجہ ہو سکتے تھے۔

باقیات

از حضرت باقی صدیقی

ہجوم غم سے نکلنے کی کوئی راہ نہیں — مدام گردش دنیا ہے کہ گاہ نہیں
گناہ کرنے کو دل چاہتا تو ہے لیکن — مری نگاہ میں جچتا کوئی گناہ نہیں
ترا جہان کشادہ سہی مگر یارب — مرے جنوں کو تو ملتی کہیں پناہ نہیں
مرے خمیر میں وحشت کا رنگ شامل ہے — کہ درد دل مرا شرمندۂ نگاہ نہیں

مجھے کچھ اس طرح باقی فریب دیتی ہے
مری نگاہ بھی گویا مری نگاہ نہیں

کیمٹی آبشار

(از پرنسپل رام پرشاد ناشاد ایم اے)

تو آبشار نہیں موتیوں کا جھومر ہے
عروسِ قدرتِ حق کی جبیں کا زیور ہے

عیاں یہ قدرتِ حق کا عجیب منظر ہے
بندھی پہاڑ کے سر پر سفید جھالر ہے

زمین ڈوبی ہوئی ہے پہاڑ کے جل میں
کہ اک عروس ہے لپٹی حیا کے آنچل میں

یہ قطرے پانی کے ہیں یا گہر چمکتے ہیں
کہ ہیرے بکھرے زمیں پر ہیں جو دمکتے ہیں

بھرا ہوا مئے عرفاں سے جام ہے تیرا
جہاں میں بیکشِ سرشار نام ہے تیرا

جہان کے لئے گویا پیامِ مستی ہے
جو تیری ہستی ہے اک بیخودی کی ہستی ہے

نہیں کا راز ہے مضمر ترے ترنم میں
جھلک ہے حسنِ فلک کی ترے تبسم میں

ہے عکس انجم گردوں کا تیرے پانی میں
ہے مہر و مہ کا تماشا تری روانی میں

خوشی کا ساز بجاتا ہے راگ گاتا ہے
کسی عروس کے گویا سہاگ گاتا ہے

پہاڑ سے تو زمیں پر اچھل کے آیا ہے
تو اپنے گھر سے بتا کیوں نکل کے آیا ہے

تو آج سے نہیں روزِ ازل سے بہتا ہے
فلک کے راز کی باتیں زمیں سے کہتا ہے

تو جاوداں ہے تجھے خوفِ انقلاب نہیں
تو لاجواب ہے تیرا کہیں جواب نہیں

گلوں سے کوہ کے دامن کو بھر دیا تو نے
نہال کوہِ مسوری کو کر دیا تو نے

گھرگھرستی کی اُلجھنیں[1]

از خواجہ محمد شفیع دہلوی

یہ ایسا موضوع ہے جس پر اظہارِ خیالات کے لئے بال بچہ دار ہی زیادہ موزوں ہیں۔ پر مشکل یہ ہے کہ گھر گرہستی کی اُلجھنوں سے واقف کار اس معاملہ میں خیالات کا اظہار کھلے ڈلے نہیں کر سکتے۔ ہر لفظ پر زبان لڑکھڑاتی ہے اور بال بچوں کا ڈر حکم زبان بندی نافذ کرتا ہے۔ اسلوبِ زبان کا لحاظ رکھتے ہوئے میں نے بال بچوں کا ڈر کہہ دیا۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ بچوں کا ڈر اتنا نہیں جتنا بچوں کی ماں کا ڈر غالب ہوتا ہے۔ آدمی سوچتا ہے کہ یہاں دماغ سوزی کرو۔ گھر جاکر دل جلاؤ۔ کون اس جھنجھٹ میں پڑے۔ سموئی ہوئی باتیں بناؤ نہ حقیقت سے پہلو بچاؤ نہ بیوی سے بگاڑو۔

اگر اس موضوع پر گل افشانیاں سُننی ہوں تو کسی ایسی محفل میں جائیے جہاں صرف مرد ہوں۔ اور صنفِ دیگر کا دُور تک گذر نہ ہو۔ ہاں اتنا خیال رہے کہ حاضرینِ محفل میں کسی کی بیوی کا بھائی بھی موجود نہ ہو۔ اس لئے کہ بڑے بوڑھے کہہ گئے ہیں "ساری خدائی اک طرف جورو کا بھائی اک طرف"۔

بات یہ ہے کہ جب میاں صاحب تقریر فرماتے ہیں تو اگر گھر میں ریڈیو ہوا تو فبہا، ورنہ کہیں نہ کہیں سے مانگے تانگے کا منگایا جاتا ہے یا کرایہ پر آتا ہے۔ تمام پڑوسنیں جمع ہوتی ہیں۔ کُنبہ رشتہ میں بلاوے جاتے ہیں۔ چاء پانی کا انتظام ہوتا ہے اور گھر اچھا خاصا شادی کا گھر بن جاتا ہے۔ گھر والی بیوی یعنی مقرر کی اہلیہ ایک عجب انداز سے جو تاب بیان نہیں لا سکتا سب کے بیچ میں ہو بیٹھتی ہیں اور ادھر اُدھر کی باتیں شروع کرتی ہیں۔ چاہتی ہیں کہ کوئی اور تقریر کا ذکر چھیڑے اور اُن کے میاں کی قابلیت پر تبصرہ ہو۔ رسماً ریڈیو کھول دیا جاتا ہے لیکن بیگم صاحب کی نظر گھڑی پر لگی رہتی ہے۔ ادھر آواز آئی کہ اب سوا آٹھ بجے ہیں اور سب گھر کر ریڈیو کے قریب ہو بیٹھے۔ گھر والی بیگم نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ تمام نوکر چاکر دم بخود ہوگئے مہمان بیویوں نے اپنے اپنے بچوں کی طرف نیلے پیلے دیدوں سے دیکھا۔ مدعا یہ کہ خبردار جو آواز نکالی۔ جب تک تقریر ہوتی رہی سب گوش برآواز سکتہ کے عالم میں بیٹھے سُنا کئے۔ تقریر ختم ہوئی سُننے والوں

---

[1] ڈائرکٹر صاحب آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن دہلی کی عنایت سے ہم اس مضمون کو ہدیۂ ناظرین زمانہ کر رہے ہیں۔ ا-ز

نے فراغت کا سانس لیا۔ اب میاں کا انتظار ہونا شروع ہوا۔ نوکر جو چشم براہ گلی کے نکڑ پر بیٹھا تھا دوڑا آیا اور اطلاع دی۔ میاں آتے ہیں، بیگم صاحبہ ذرا سمٹ سمٹا پٹاری آگے رکھ ہو بیٹھیں۔ چھپنے والی بیویاں پردہ میں ہو گئیں۔ گھر میں قدم رکھتے ہی پرانی بڑھیا ماما نے کہا: "اے میاں ابھی تو تم خیر سے مشین میں بول رہے تھے ابھی یہاں آن پہونچے۔"

قصہ مختصر ان حقیقتوں کو جاننے والا مرد کب یہ جرأت کر سکتا ہے کہ بیوی بنّو کی مرضی کے خلاف گھر لو زندگی پر ایک لفظ بھی زبان پر لا سکے۔

جب مجھ سے کہا گیا کہ گھر گھرستی کی اُلجھنوں اور بال بچوں کی جھنجھٹوں پر آپ لوگوں سے کچھ باتیں کر لو تو خیال آیا کہ یا ایمان نگل جاؤں یا کم از کم ایک ہفتہ کے لئے گھر سے نکل جاؤں۔ ایمان حلق میں اٹک گیا اور گھر چھوڑنا ناممکن نظر آیا۔ سوچا کہ جب اُستاد غالب نہ چھوڑ سکے اور پابجولاں بُلائے گئے پھر تو کس شمار قطار میں ہے۔

خیر آمدم بر سر مطلب۔ آپ نے اکثر کوچہ و بازار میں اچھے خاصے بھلے مانسوں کو جاتے دیکھا ہوگا کہ ایک بچہ انگلی پکڑے ہے، ایک گود میں اور ایک کندھے پر۔ جھومتے جھامتے، موٹر کے ہارن کی پروا نہ کرتے بیچ سڑک پر چلے جاتے ہیں۔ اِس کے علاوہ آپ میں سے جو صاحب ذوق برسات کے موسم میں اوکھلے یا مہرولی گئے ہونگے وہ یہ منظر نہیں بھول سکتے کہ ایک صاحب سفید پوش آگے آگے گود میں بچہ لئے چلے جا رہے اور ڈیڑھ درجن کے قریب عورتیں اُن کے پیچھے۔ کسی بچہ کے رونے کی آواز آئی اور وہ پلٹے۔ گود کا بچہ اُس کی ماں کو دیا۔ روتے ہوئے بچہ کو خود لیا اور کچھ ایسی عجیب و غریب آوازیں نکالیں کہ ابھی بچہ کے آنسو سوکھنے نہ پائے تھے کہ ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ دوسرے راہگیر اُن کی طرف دیکھ کر ہنستے ہیں۔ یہ مردِ خدا اپنے بینڈ بجاتے، لاؤ لشکر لئے چلے جاتے ہیں۔ اس کو بھی جانے دیجئے، جو اصحاب عید بقرعید کی نماز میں شریک ہوئے ہونگے اُن کو ایک نہ ایک مرتبہ یہ سابقہ ضرور پڑا ہوگا کہ دائیں جانب جو صاحب ہیں، اُن کے ساتھ تین برس کا لڑکا ہے اور بائیں جانب والے کے ساتھ ڈھائی سال کی لڑکی [illegible] شروع ہوئی اور ڈھائی برس کی لڑکی نے لڑکے کے باپ کی جوتی اُٹھائی۔ صاحبزادہ باوا جان کی [illegible] یہ دست درازی کب برداشت کر سکتے تھے۔ غرض ان دونوں میں چھینا جھپٹی، جوتی پیزار شروع [illegible] باوا جان سجدہ میں ہیں اور اولاد خشوع و خضوع کر رہی ہے۔ جب سلام پھیرا۔ آگے پیچھے [illegible] لعنت ملامت کی۔ پر اُن کے کان پر جوں نہ چلی۔ اپنی اپنی اولاد کی انگلی پکڑ سیدھے ہوئے [illegible] قسم ہے جو شادی کرنے اور گھر گھرستی کی زندگی بسر کرنے کے لئے پیدا ہوتی ہے۔

آپ نے اکثر سُنا ہوگا کہ اگر اچھی بیوی مل جائے تو جیتے جی کی جنت ہے ورنہ دوزخ۔ ہم اس کے چنداں قائل نہیں۔ ہمارے خیال میں ازدواجی زندگی کی جنت و دوزخ بہت کچھ مرد کی طبیعت پہ منحصر ہے۔ درحقیقت قدرت نے دو قسم کے جانور پیدا کئے ہیں۔ ایک اہلی اور دوسرے وحشی۔ اہلی وہ جانور کہلاتے ہیں جو پالتو کئے جاسکیں۔ اور وحشی اُن کو کہتے ہیں جن کی خلقت میں رام ہونا نہیں۔ یہ خصوصیات حیوانوں کی جسمانی طاقت اور قدوقامت سے متعلق نہیں۔ بڑے سے بڑے جثہ والے جانور اہلی ہو سکتے ہیں۔ مثلاً گائے، بھینس، اور چھوٹے سے چھوٹے قدوقامت والے وحشی ہوتے ہیں۔ جیسے کوا۔ وحشی کو آپ سونے چاندی کے پنجرہ میں بند کر دیجئے۔ اس کی آسائش کا پورا انتظام کیجئے پھر بھی وہ وحشی ہی رہیگا۔ علاوہ ازیں اہلی کو جائے رہائش سے کوئی سروکار نہیں۔ اسے غریب کے کیسے ہی تھان پر باندھ دیجئے، وہ مگن رہیگا۔ بعینہٖ یہی کیفیت مردوں کی ہے۔ بعض آدمی اہلی ہیں اور بعض وحشی۔ آخر الذکر کو اچھی سے اچھی بیوی دے دیجئے۔ اُس کی جبلی وحشت اُسے چین نہ لینے دیگی۔ اور اہلی ہر حال میں ازدواجی زندگی میں خوش رہے گا۔ اس لئے کہ وہ اسی فضا کے لئے تخلیق کیا گیا ہے۔

جو مثالیں ہم نے پہلے دیں وہ اہلی قسم کے مردوں کی تھیں۔ اب وحشیوں کا حال سُنئے۔ اُن کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ جن میں شرافت کا شائبہ نہیں اور دوسرے وہ جو شریف ہیں۔ پہلے ہم غیر شریف وحشیوں کا ذکر کریں گے۔

میاں کارخندار تہبند باندھ، بوسکی کی قمیص پہن گھر سے چلنے کو تیار ہی تھے کہ بیوی نے دبی زبان سے کہا۔ دیکھنا پان نہیں ہیں۔ بس اس غریب کا یہ کہنا تھا کہ میاں صاحب بگڑ گئے۔ بولے "تو بڑی ڈھیٹ ہے، سو واری کہہ چکا ہوں۔ مجھے جاتیوں کو نہ ٹوکا کر۔ سویرے ہی سویرے میرا مجاز بگاڑ دیا۔ پیسے دیدئے، سب کچھ کر دیا پھر چین نہیں۔" بیوی نے کہا "لانے والا کوئی نہیں تھا۔ میں نے تو اس مارے تم سے کہا تھا۔" اب میاں کارخندار آئیں تو جائیں کہاں۔ جو جو منہ میں آیا۔ اس غریب کو سنایا۔ آخر میں بولے "تیرے باوا نے مجھے تیرے جہیز میں نوکر بنا کر دیا ہے۔ یاد رکھو، حلقوم میں سے زبان اینچ لوں گا"۔ خوب برس برسا میاں صاحب تہبند سنبھالتے سیدھے اکھاڑے ہولئے۔ وہاں جا یاروں سے پیچ شروع کر دی۔ اب اُن کی بلا سے بیوی بدنصیب اپنے نصیبوں کو بیٹھی روتی رہے۔

اس سے یہ نہ سمجھئے گا کہ غیر شریف صرف غریبوں ہی میں ہوتے ہیں امیروں میں بھی ایسے حیوانوں کی بکثرت مثالیں ملتی ہیں۔ بارہا دیکھا گیا ہے کہ نواب صاحب گھر میں قدم ہی نہیں رکھتے۔ دیوانخانہ سجا رکھا ہے جہاں یار دوست جمع رہتے ہیں۔ شعر وہ چٹ نوالہ حاضر ہر وقت حاضر۔ بال بچوں کی طرف سے بالکل بیخبر

وقعت عیش وطرب ہیں۔ کوئی بچہ بیمار ہو اُن کی بَلا سے۔ بیوی کو کپڑا درکار ہو تو اُن کی بیزار ہے۔ مہینہ کے مہینہ جب تنخواہ بٹی۔ نواب صاحب کندھے پر رومال ڈال تھیلی ہاتھ میں لئے حویلی میں تشریف لائے۔ نوکروں کی تنخواہ، بچّوں کا جیب خرچ، خانہ داری کی مقررہ رقم بیگم کو سنبھلوا باہر آ گئے۔ اب پھر مہینہ بھر بعد دیدار ہوں گے۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ روپیہ دیدیا۔ اور تمام فرائض سے سبکدوش ہو گئے۔ حالانکہ حقیقت اِس کے خلاف ہے بیوی روپیہ کی اتنی طلبگار نہیں ہوتی، جتنی دلداری کی خواستگار۔ فارغ البال طبقہ میں اِس قسم کی خال خال نہیں اکثر مثالیں ملیں گی۔ ایک زمانہ تھا جب کہ بال بچّوں کی طرف التفات انگشت نمائی کا باعث ہوتا تھا۔ ہم چشم بُری نظر سے دیکھتے اور احباب زن مُرید کہہ کر پکارتے تھے۔

اب ذرا شرافت زدہ وحشیوں کا حال سُنیئے سینما، تھیٹر، مشاعرہ۔ احباب کی صحبتوں میں سے رات کے ایک دو بجے گھر میں گھُسنے کے عادی۔ تمام دن باہر رہنے کے خوگر۔ ماں باپ اُن کی صورت کو ترس جائیں، صاحبزادہ رات کے آدھی بجے گھر میں گھسے پڑ کر سو گئے۔ ابھی صبح اُٹھنے نہ پائے تھے کہ یاروں میں سے کوئی نہ کوئی آن دھمکا مُنہ ہاتھ دھو اُس کے ساتھ ناشتہ کر پھر چلدیئے۔ اب اگر رات کے بارہ ایک بجے گھر آجائیں تو غنیمت سمجھو۔ باپ کو یہ حرکات ناگوار ہیں۔ کبھی مُنہ پر لاتے ہیں تو ماں سمجھا دیتی ہیں۔ تم کچھ نہ کہنا جوان بچّہ ہے میں اپنی جگہ سمجھا دونگی اور کیا بتاؤں مجھے تو اُس کے گھر میں بیٹھنے سے وہم آتا ہے۔ اللہ اُسے تندرست رکھے۔ وہ تو دُور، پار جب کبھی بیمار ہی پڑتا ہے تو گھر میں بیٹھتا ہے۔ نہیں تو اپنے پھرتا ہی رہتا ہے۔ اللہ اُسے چلتا پھرتا جیتا جاگتا رکھے۔ کسی دن اگر صاحبزادہ نے اماں کے ساتھ کھانا کھالیا تو وہ نہال ہو گئیں۔ بولیں میاں، آج پندرہ دن بعد تم نے ہمارے ساتھ کھانا کھایا ہے۔ بیٹا دِل میں شرمندہ ہوا۔ اور کہا " اماں کیا بتاؤں، مجھے چھوڑتے ہی نہیں۔ پر آج سے انشاء اللہ تمھارے ساتھ کھانا کھایا کروں گا" کچھ دن کوشش کر کے کہیں بھی ہوا بھاگا آیا۔ کہ میں اپنی اماں کے ساتھ کھانا کھاؤنگا۔

اب ان صاحبزادہ کی ہوگئی شادی۔ بہت ناک رگڑی، بہت ہاتھ پیر مارے۔ پر کسی نے ایک نہ سُنی۔ اور باندھ بوندہ بیاہ دیا۔ دوسرے دِن یار دوست مبارکباد دینے آئے اور لو۔ لے لو میاں تم ہم سے تو گئے کچھ روز احباب نے لحاظ کیا کہ نئی نئی شادی ہوئی ہے اس کے پاس زیادہ نہ جاؤ۔ ولے تابکہ ؎

چھٹتے ہی چھٹتی ہے بشر کی عادت　　　عادت اور وہ بھی عمر بھر کی عادت

ایک رات کسی دوست کے ہاں میاں کو دیر ہو گئی۔ کھانا وہیں کھالیا۔ بارہ بجے کے قریب گھر پہنچے تو معلوم ہوا کہ بیوی نے ابھی کھانا نہیں کھایا ہے۔ دریافت کرنے پر جواب ملا کہ آپ کی راہ دیکھ رہی تھیں۔ کو بُلایا۔ کھانا گرم کروا، بیوی کو کھلایا۔ ساتھ دینے کی غرض سے بیوی کے اصرار پر، ہاتھ دھو خود بھی شریک

جب نوکر چاکر چلے گئے تو سمجھایا۔ "دیکھو اگر مجھے دیر ہو جایا کرے تو تم کھانا کھا لیا کرو۔"

اُنھوں نے دبی زبان سے ذرا شرما کر جواب دیا۔ "آپ کے بغیر ہمارے حلق سے نہیں چلتا۔" اُس وقت تو بیوی کو سمجھا دیا۔ پر کچھ عرصہ بعد باہر کھانا چھٹا۔

ایک رات میاں ڈیڑھ بجے گھر تشریف لائے۔ دیکھا تو بیوی بڑی بارے گن رہی ہیں۔ بولے "میری آہٹ سے تمھاری آنکھ کھل گئی؟" جواب ملا۔ "میری آنکھ لگی ہی نہیں تھی۔" "آخر یہ کیوں؟" "کچھ نیند اُڑ سی گئی۔" رفتہ رفتہ دیر کا آنا بھی گیا۔

مختصر بیانی سے یہ نہ سمجھیے گا کہ یہ سب عادتیں بہ آسانی چھوٹ گئیں۔ انمیں سے ہر ایک۔ عادت کا چھٹنا گو ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

ایک روز میاں کو ڈنر پر جانا تھا اور بعد میں تھیٹر کا بھی پروگرام۔ بیوی کو اُن کے میکے بھیج دیا۔ اب جو ہمارے چھیلا ڈریس سوٹ پہنے کھڑے ہوئے تو کالی جرابیں ندارد۔ سارے سوٹ کیس دیکھ ڈالے، تمام صندوق اُلٹ پھینکے، پر جرابیں نہ ملنی تھیں نہ ملیں۔ بیوی کو موٹر بھیجی گئی کہ آکر جرابیں برآمد کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان صاحب کے تمام کپڑے ان کی آنکھوں کے سامنے بکھرے رہتے تھے۔ کیفیت یہ تھی کہ رات کو سوٹ وغیرہ کرسیوں پر پڑ جاتے تھے اور خود بدولت پلنگ پر۔ صبح کو کپڑے کرسیوں سے پلنگ پر آجاتے تھے اور کرسیاں بیٹھنے اُٹھنے کو خالی ہو جاتی تھیں۔ اگر کبھی کوئی اس حرکت پر اعتراض کرتا، تو کہہ دیتے تھے۔ "میاں تم کیا جانو۔ مال عرب پیش عرب۔" اب جب سے بیگم صاحبہ تشریف لائیں تو ہر ایک چیز قرینہ سے رکھی جانے لگی۔ پر اگر خیر سے بیگم صاحبہ گھر میں نہ ہوں تو اُنکو کوئی چیز مل نہیں سکتی۔

موٹر کے ہارن کی آواز سُن کر میاں تو گرفتہ پر بزرہ جھاڑ شفقت کے اظہار پر تیار ہو گئے۔ بیوی ساڑھی سنبھالتی بوکھلائی ہوئی گھر میں گھسیں۔ اونچی ایڑی کا جوتا تھا۔ چوکھٹ پر پیر مُڑ گیا۔ اور ایک "اوئی" کی آواز اُن کے کان میں آئی۔ اور "ماما اصیلیں بسم اللہ بسم اللہ" کہتی چاروں طرف سے دوڑتی دکھائی دیں۔ بوکھلا کر کمرہ سے نکلے تو دیکھا کہ بیگم صاحبہ ٹخنہ پکڑے زمین پر بیٹھی ہیں۔ غصہ فو چکر ہوا۔ آنا جانا بالائے طاق۔ تیل لے مالش کرنے ہو بیٹھے۔

بیگم بولیں "کیسی بھول ہوئی میں جرابیں نکال کر نہیں گئی۔ آپ کو بڑی تکلیف ہوئی۔" میاں نے کہا۔ "لعنت بھیجو تم تکلیف پر۔ یہ بتاؤ کچھ ٹخنہ ٹھیک ہوا یا نہیں؟"

کچھ دن بعد اللہ نے آس اولاد دی۔ ایک رات آنکھ جو کھلی، تو بیوی غائب۔ دوسرے کمرہ میں کچھ آواز سُنائی دی۔ غور کیا تو معلوم ہوا کہ بیگم صاحبہ بچہ کو بہلا رہی ہیں اور کہتی جاتی ہیں ؏

"سوجا میرے لال سوجا۔ ابا کی آنکھ کھل جائے گی تو بری بات ہے۔ شرافت نے اجازت نہ دی کہ بیوی بچہ کو بہلائے اور یہ پڑے سنا کریں۔ اب یہ چھیلا جو بچہ کی پرچھائیں سے بھاگتے تھے۔ بھانجا بھانجی کو کبھی پاس نہیں پھٹکنے دیتے تھے۔ رات کے دو بجے گود میں بچہ کو لئے باقاعدہ بینڈ بجا رہے ہیں۔

رفتہ رفتہ تمام عادتیں چھوٹ گئیں۔ گو ان کا چھٹنا "گوشت کا ناخن سے جدا ہونا" تھا۔ پر گوشت سڑا ہوا تھا، اور اولاد پرستی محبت کے کلورفارم کے زیر اثر ہوا۔

اس سلسلہ میں کئی داستانیں بیان کی جاسکتی ہیں۔ پر مجبوری سے وقت کوتاہ و قصہ طولانی

جذباتِ شوق

از پنڈت جگموہن ناتھ رینہ شوق

ہوگئی واماندگی وجہِ سکونِ دل مجھے
ڈھونڈتی ہے کس لئے اب کاوشِ منزل مجھے

امتیازِ دیدنے جب سے کیا غافل مجھے
کر رہا ہے اور حیراں یہ حجابِ دل مجھے

جو قدم بھٹکا وہ خضرِ جادۂ مقصود تھا
خود مری گم گشتگی لائی سرِ منزل مجھے

بے نیازِ ہوش ہوں حاصل ہے لطفِ بیخودی
محوِ حیرت رہنے دے نیرنگیِ محفل مجھے

لذتِ افتادگی بڑھنے نہیں دیتی قدم
کھینچتا ہے کس لئے اب جذبۂ منزل مجھے

راندۂ دیر و حرم ہوں میکدہ اپنا نہیں
کچھ بتا تو اب کہاں لیجائیگا اے دل مجھے

لطفِ ہم آغوشیِ امواج بھی کچھ کم نہ تھا
بے بسی نے کر دیا شرمندۂ ساحل مجھے

مست رہتا ہوں میں خود اپنی نوائے شوق سے
چھیڑتی ہے کیوں صدائے نغمۂ [illegible]

عشق کی جاں سوزیوں نے کیوں ملایا خاک میں
ہو سکے تو کچھ بتا دے جذبۂ [illegible]

جلوۂ لیلیٰ کہاں، یہ دیدۂ حیراں کہاں
شوق دھوکا دے رہا ہے پردۂ محمل مجھے

ساون کی بہار

(از حضرت نسیم خوجیانوالی، سابق ایڈیٹر تعمیر لاہور)

وہ رقص کرتا پھر آیا ساون، فضا پہ مستی سی چھا رہی ہے
گھٹا میں کوئی مغنیہ اپنا رنگیں بربط بجا رہی ہے

صدائیں ، و رہ کے کان میں بوندیوں کے گرنے کی آ رہی ہیں
نسیم صبح بہار اونچے سُروں میں کچھ گیت گا رہی ہے

وہ دھیمی دھیمی شعاعیں خورشید کی چمن پہ جھلک رہی ہیں
یہ کیفیت ہے کہ حور فطرت تجلیوں میں نہا رہی ہے

شگفتگی سے رچی ہوئی ہے بہار فردوس منظروں میں
ہوائے بیخود خرام نکہت ہر ایک شے میں بسا رہی ہے

صدائیں سازِ شکستِ دل کی تڑپ رہی ہیں مچل رہی ہیں
گھٹا میں کوئی حسینہ آتشیں نظر مسکرا رہی ہے

چمک چمک کر جھلک جھلک کر یہ شعلہ خو برقِ فتنہ ساماں
تصورِ حور زا میں میرے حسین شمعیں جلا رہی ہے

یہ شاخِ گُل کی شفق طرازی لطافتیں مے ارغواں کی
گھٹاؤں کے لطف زا دھندلکے میں شمع سی جھلملا رہی ہے

خیال واحساس کے افق پر شراب خانے برس رہے ہیں
نسیم گلشن کی پتیوں میں حسین نغمے بسا رہی ہے

کلاوں کی چھاتی پھڑک رہی ہے ہوا کا سینہ دھڑک رہا ہے

اُدھر وہ انگڑائی لے رہے ہیں ادھر قضا تھرتھرا رہی ہے،

ابھی تک انسان کی نظر پر حجاب ہیں مذہبیتوں کے

روایتوں کی گھٹا ابھی تک افق پہ دانش کے چھا رہی ہے

فریب خوردہ شباب کی ہرزہ کاریاں یاد کر رہا ہوں

سرودِ رفتہ کی گونج دل میں ابھی تلک تھرتھرا رہی ہے

محبّتوں کی حکایتیں ہیں جوانیوں کی کہانیاں ہیں

گھٹا قیامت اُٹھا رہی ہے کہ سوتے فتنے جگا رہی ہے

لطیفِ انور

از جناب لطیف انور گورداسپوری

مضراب کا محتاج ہے سازِ ہستی (۱) ورنہ غم تاراج ہے سازِ ہستی

اے منتظرِ نغمہ! اِسے چھیڑ ذرا　　ہاتھوں میں ترے آج ہے سازِ ہستی

(۲)

کِس آتشِ پنہاں سے ہے دودِ ہستی!　　کچھ ہے کہ نہیں اصل وجودِ ہستی

اے دستِ قضا! پردہ دری ہے حاصل　　اُٹھا ہوا پردہ ہے نمودِ ہستی

(۳)

فطرت سے ہے پیوست مذاقِ ہستی　　لیکن ہے تہی دست مذاقِ ہستی

تسکین اسے ملتی ہے لحد میں انور　　ہوجاتا ہے کیوں پست مذاقِ ہستی

(۴)

ہر سانس اگرچہ ہے حبابِ ہستی　　تھامے ہوئے چلتا ہے رکابِ ہستی

لے ڈوبیگا اِک روز نہ طوفان اُٹھا　　اے تشنہ لبی! تجھ کو سرابِ ہستی

داستانِ غم

(مرزا نوشہ سے ایک انٹرویو)

از مسٹر نند کشور حینگن ایم۔ اے۔ (جالندھر)

نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے　　کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

(غالبؔ)

کہتے ہیں غم آدم کے ساتھ دنیا میں آیا تھا۔ اور قسّامِ ازل نے اپنے ہاتھوں اسے مشتِ خاک کے سپرد کیا تھا۔ اور یہ ہے بھی ٹھیک۔ کیونکہ دلِ دردمند کے سوا اور کہیں اس کا ٹھکانا بھی تو نہیں تھا۔

قسمت کیا ہر ایک کو قسّامِ ازل نے　　جو شخص کہ جس چیز کے قابل نظر آیا
بلبل کو دیا نالہ تو پروانے کو جلنا　　غم ہم کو دیا سب سے جو مشکل نظر آیا

(ایک آدم زاد)

یہ غم ہے کیا بلا؟ آیئے ذرا مصورِ غم شاعرِ جذبات مرزا نوشہ سے ہی پوچھ دیکھیں۔ اُف! ہم نے اُن کے سازِ دل کے کس دردناک تار کو چھیڑ دیا، کہ بس پھوٹ بہے ؎

دیکھا آخر نہ کہ پھوڑے کی طرح پھوٹ بہے　　ہم بھرے بیٹھے تھے کیوں آپ نے چھیڑا ہم کو

اُستاد! ایسا تنگ و تاریک حجرہ، نہ فرش و فروش نہ آرائش و زیبائش!

یہ رہے غم خانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی　　لکھ دیا منجملۂ اسبابِ ویرانی مجھے

کہیں دیا سلائی ہو تو لائیے، شمع ہی روشن کر لیں۔

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے　　اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے

آہ! وہ بھی تو نہیں، وہ بھی جل چکی ہے، اک ذرا سا ٹکڑا باقی رہ گیا ہے، سیاہ پوش، خاموش!

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی　　اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

بڑی مصیبت میں بسر کر رہے ہو اُستاد، اچھا خدا سب کا .... ہے۔

خدا! 　زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ　　ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

اس قدر غم بھی تو اچھا نہیں، آخر اس کا فائدہ کیا؟

دلا یہ درد و الم بھی تو مغتنم ہے کہ آخر　　نہ گریۂ سحری ہے نہ آہِ نیم شبی ہے

للہ کچھ تو اپنی صحت کا خیال کرو، غم تو تپ ہی ہو رہا ہے"

کیجے بیاں سرورِ تپِ غم کہاں تلک ہر مُو مرے بدن پہ زبانِ سپاس ہے

غم نے گھر چوپٹ کر دیا۔

گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اُسے غارت کرتا وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر سو ہے

آپ غم کے ایسے آرزومند کیوں ہیں؟

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

تو کیا غم سے مفر کی کوئی صورت نہیں؟ کس قدر جاں گسل ہے یہ غم!

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ بچیں کہاں کہ دل ہے غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

سُنا ہے آپ دلّی چھوڑ رہے ہیں، خدارا دلّی نہ چھوڑیئے، اُستاد یہیں رہیئے۔

ہے اب اس معمورہ میں قحطِ غمِ اُلفت اسد ہم نے یہ مانا کہ دلّی میں رہیں کھائیں گے کیا

غمِ الفت بھی بھلا کوئی غم ہے، میں تو اسے کم جانتا ہوں۔

کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو پر اب دیکھا تو کم ہوئے پہ غمِ روزگار تھا

اچھا اُستاد یہ تو بتاؤ غم ہے کیا؟ اس سے کبھی چھٹکارا بھی نصیب ہو سکتا ہے؟

قیدِ حیات بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

غمِ ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

خدا کا شکر ہے سنگ و خشت تو اس سے بچے ہوئے ہیں، عاری از حیات جو ٹھہرے،

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

مگر یہ بھی تو آپ ہی کا ارشاد ہے؎

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

جی ہاں ہے، یہ دل دل ہی ہے۔

دن تو خیر کسی نہ کسی طرح کٹ ہی جاتا ہے مگر شبِ غم:

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شبِ غم بُری بلا ہے مجھے کیا بُرا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

اور غمِ شبِ فرقت؟

گر نہ اندوہِ شبِ فرقت بیاں ہو جائے گا بے تکلف داغِ مہ مُہرِ دہاں ہو جائے گا

آپ کہا کیئے اور ہم سنا کیئے، غم کی داستان تو کبھی ختم ہی نہ ہوگی، استاد چھوڑو اسے، چلو باغ کی سیر کر آئیں۔

غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو
مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا

باغ میں مجھ کو نہ لے جا ورنہ میرے حال پر
ہر گلِ تر ایک چشمِ خوں فشاں ہو جائے گا

ضرور چلو استاد، دیکھو تو اب تو بادل بھی برس کر کھل گیا ہے۔

ہے مجھے ابرِ بہاری کا برس کر کھلنا
روتے روتے غمِ فرقت میں فنا ہو جانا

نہیں چلتے۔ سہی۔ اچھا یہ تو بتلا دو کہ سوزِ غم میں کس قدر حرارت ہے۔

آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں
سوزِ غم ہائے نہانی اور ہے

کیا سوزِ غم کا کوئی نشان بھی ہوتا ہے۔ کبھی کسی نے اس کا نشان دیکھا بھی ہے؟

ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا
کس سے کہوں کہ داغ جگر کا نشان ہے

کیا سوزِ غم کو دل میں چھپانے کی بھی کوئی حکمت ہے؟

پیدا پنہاں ہیں شعلۂ آتش کا آساں ہے
ولے مشکل ہے حکمت دل میں سوزِ غم چھپانے کی

کیا غم جلانے اور مٹانے کے لئے ہی بنا ہے۔ تربیت اور پرورش کرنے کے لئے نہیں؟

غم آغوشِ بلا میں تربیت دیتا ہے عاشق کو
چراغِ روشن اپنا قلزمِ صرصر کا مرجاں ہے

سنتے ہیں آپ نوحۂ غم اور نغمۂ شادی میں کچھ فرق ہی نہیں سمجھتے، آخر کیوں؟

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیئے
بے صدا ہو جائیگا یہ سازِ ہستی ایک دن

غم کو آپ بیماری بھی ٹھہراتے ہیں، جب یہ بیماری ہی ٹھہری تو اس میں فراغت کیسی؟

کیا کہوں بیماریِ غم کی فراغت کا بیاں
جو کہ کھایا خونِ دل بے منتِ کیموس ہے

شمع اور اسے غمِ حسرتِ پروانہ! عجیب سی بات کہہ رہے ہیں آپ، بھلا ہم بھی سنیں کیونکر؟

غم اس کو حسرتِ پروانہ کا ہے اے شعلہ
ترے لرزنے سے ظاہر ہے ناتوانیِ شمع

عشق کو بھی آپ غم ہی سمجھتے ہیں، یہ تو بجا ہے مگر وہ غمخوارِ جانِ دردمند کب سے ہوا؟

ذرا تحفے تو ایک نظر دیکھ لیجئے!

جراحت تحفہ، الماس ارمغاں، داغِ جگر ہدیہ
مبارک باد اسد غمخوارِ جانِ دردمند آیا

کیا کسی نے غمِ پنہاں کو سمجھا بھی ہے، اگر سمجھا ہے تو کیسے؟

وہ مری چینِ جبیں سے غمِ پنہاں سمجھا — رازِ مکتوب بہ بے ربطیِ عنواں سمجھا

ہمارے محلہ میں ایک بزرگ تھے، مے و نغمہ کے دلدادہ، کہا کرتے تھے اِن سے غم غلط ہوتا ہے، کیا واقعی یہ چیزیں اندوہ ربا ہیں ؟

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو — جو مے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں

بہت سہی غمِ گیتی شراب کم کیا ہے — غلامِ ساقیِ کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے

بُرا نہ مان جائیے گا اُستاد! اگر ایک ذاتی سوال بھی پوچھ لوں۔ آپ سدا مغموم بھی تو نہیں رہتے، کبھی کبھار ہنس بول بھی لیتے ہیں۔

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس — برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج — مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

تو پھر آپ اس بات کے قائل ہوئے نا کہ جہان میں غم و شادی ہم پائے جاتے ہیں۔

جہاں میں ہوں غم و شادی بہم ہمیں کیا کام — دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں

غمِ دنیا سے آخر کبھی تو فرصت مل ہی جاتی ہوگی ؟

غمِ دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اُٹھانے کی — فلک کو دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی

آپ کی قسمت میں واقعی غم بہت معلوم ہوتا ہے، کہتے ہوگے کچھ کم ملتا تو اچھا تھا۔

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا — دل بھی یا رب کئی دیئے ہوتے

کوئی ایسی تدبیر بھی ہے جس سے غم نہ ہو ؟

شادی سے گزر کہ غم نہ ہووے — اُردی جو نہ ہو تو دَے نہیں ہے

(از راہِ ظرافت) شادی سے مراد نکاح ہے کیا ؟

(بے اختیار ہنستے ہوئے) نہیں۔ (پھر تھوڑی دیر سوچ کر) ہاں، یوں بھی ہو سکتا ہے۔

اب کے عید تو منائی ہی ہوگی آپ نے ؟

ہوئی یہ کثرتِ غم سے تلف کیفیتِ شادی — کہ صبحِ عید مجھ کو بدتر از چاکِ گریباں ہے

آپ تاریکیِ زندانِ غم کے ایسے شاکی کیوں ہیں ؟

کیا کہوں تاریکیِ زندانِ غم اندھیر ہے — پنبہ نورِ صبح سے کم جس کے روزن میں نہیں

آپ ہی کا قول ہے کہ غم زہر ہے، اس زہر کی علامات کیا ہیں ؟

رگ و پے میں جب اُترے زہرِ غم تب دیکھیے کیا ہو — ابھی تو تلخیِ کام و دہن کی آزمائش ہے

عام لوگ تو کم از کم غم سے آزاد رہتے ہوں گے؟

مٹتا ہے فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کوئی — عمرِ عزیز صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو

غمخوار تو غم بٹا ہی سکتے ہوں گے؟

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا — زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا

کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ اہلِ بزم — ہو غم ہی جاں گداز تو غمخوار کیا کریں

آپ تو غمخوار کے بُری طرح پیچھے پڑے ہیں:

کیا غمخوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو — نہ لاوے تاب جو غم کی وہ میرا راز داں کیوں ہو

آخر کسی نے تو آپ کی بھی کبھی غمخواری کی ہوگی؟

زمانۂ ماضی کے کسی واقعہ کی یاد دل میں تازہ ہو جاتی ہے اور کسی غمخوار کی جانبازی [illegible] داغ روشن ہو جاتے ہیں، اور اُستاد "ہائے ہائے" کے ساتھ رونا شروع کر دیتے ہیں۔

تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ — تو نے پھر کیوں کی تھی میری غمگساری ہائے ہائے

کیوں مری غمخوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال — دشمنی اپنی تھی میری دوستداری ہائے ہائے

عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا — عمر کو بھی تو نہیں ہے پائداری ہائے ہائے

زہر لگتی ہے مجھے آب و ہوائے زندگی — یعنی مجھ سے تھی اسے ناسازگاری ہائے ہائے

گلفشانی ہائے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا — خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے

شرمِ رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں — ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے

اب مرزا نوشہ کی حالت ایسی نہ تھی کہ کچھ پوچھا جا سکتا۔ داستانِ غم کا انجام [illegible] ہو بھی کیا سکتا ہے۔ بقول کسے

نہ بولا جائے تھا اُن سے نہ پوچھا جائے تھا مجھ سے

خود بھی روئے اور رلایا سر کو

کہتے ہیں غم رونے سے ہلکا ہو جاتا ہے، مگر ہر ایک غم نہیں۔ مرزا نوشہ [illegible] بھی اپنے آنسو ضبط نہ کر سکے۔

دریائے توی کے ساحل پر شام

(از حضرت احسان بن دانش)

عجب انداز سے زلفِ عروسِ شام لہرائی
چمن زاروں نے چپ سادھی بیابانوں کو نیند آئی

شفق کا سُرخ آنچل ہے پھریرا شادمانی کا فلک سے مینہ برستا ہے شرابِ ارغوانی کا
فضا میں زمزمہ اُڑتا ہے چشموں کی روانی کا سنہری وادیاں نقشا ہیں جنت کی جوانی کا

مرقع وہ ہے جس کو دیکھکر حیران ہو مانی
صباحت زار میں کھوئی ہوئی ہے عقلِ انسانی

دھندھلکا گردمیں لپٹے ہوئے اُبھار گلزاروں سے عبودیت کے جذبے پھوٹ نکلے شاخساروں سے
اشارے ہو رہے ہیں وحشتوں کو لالہ زاروں سے صدا دیتی ہے موسیقی کی دیوی جوئباروں سے

رو پہلے برف زاروں کی ہوا جس وقت چلتی ہے
دلِ شاعر کی دنیا خود بخود کروٹ بدلتی ہے

نظر آتے ہیں جگنو اس طرح شب کی رداؤں میں ستارے جس طرح انگڑائی لیتے ہوں ہواؤں میں
کمانیں نور کی ہر سُو لچکتی ہیں فضاؤں میں ترانے ہنس رہے ہیں آبشاروں کی صداؤں میں

تصور میں ہے اُن کے عارضِ پُر نور کا نقشہ
شبابِ حور کا نقشہ شرارِ طور کا نقشہ

توی کے موڑ پر یہ جلوۂ بیتاب کا عالم یہ موجوں کا تماشا اور یہ گرداب کا عالم
یہ فرشِ آب و رقصِ انجم و مہتاب کا عالم درخشندہ بہشتوں کے مقدس خواب کا عالم

چراغانِ فلک کی ضَو فشانی ہے پہاروں پر
نگاہیں رقص کرتی ہیں تڑپتے برق پاروں پر

یہ سناٹا یہ جنگل اور یہ بیتاب نظارے ملائم فرش پر کیفیتِ طرب میں [illegible]
یہ آئینوں میں جُنباں برق رو جلووں کے گہوارے مچلتے ہیں لبِ دامانِ آب [illegible]
حنا ڈالے ہوئے ہے اک خوابِ فرحِ ہوش خاموشی سکوت اندوز [illegible]

معافی

ایک روسی کہانی کا ترجمہ

اگرچہ لیو سٹاڈن مشکل سے بیس برس کا ہوگا۔ مگر شکل صورت سے پچیس یا چھبیس برس کا جوان معلوم ہوتا تھا۔ اُس کا قد پورا چھ فٹ تھا۔ اُس کے کندھے چوڑے، مضبوط اور خوب بھرے ہوئے تھے گو چہرہ کچھ اُترا ہوا سا تھا جس سے مترشح ہوتا تھا کہ اب تک اُس کی زندگی تکلیف سے گذری ہے اُس کی بھویں گھنی مگر کھلی ہوئی تھیں۔ آنکھیں ایسی معلوم ہوتی تھیں جیسے کوئی جبرائیل گھور رہا ہے۔ وہ جہاز پر بڑھئی کا کام کرتا تھا۔ اُس کی محنت اور مستعدی سے خوش ہو کر مالک اُس کی بڑی قدر کرتا تھا۔ اُسکا باپ کسی اسکول میں ماسٹر تھا مگر شراب کی بدولت جلد ہی دُنیا سے کوچ کر گیا تھا۔ لیو نے باپ کی بے وقت موت سے عبرت حاصل کی اور شراب پینا چھوڑ دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر ہفتہ وہ اپنی کمائی سے کچھ نہ کچھ پس انداز کر کے بنک میں جمع کر دیتا تھا۔ داڑھی اور مونچھ صاف رکھنے کی وجہ سے لوگ اُسے صاحب کہتے تھے ایک دن کسی نے پوچھا کہ "تم داڑھی مونچھ کیوں نہیں رکھتے؟" اُس نے جواب دیا کہ "مجھے صاف ستھرا چہرہ ہی بھلا معلوم ہوتا ہے اور یوں تو بکرے کے بھی داڑھی ہوتی ہے۔"

اپنی ماں کی وفات کے بعد لیو، سائمن گلسکا نامی ایک سوداگر کے یہاں رہنے لگا جو چھوٹے چھوٹے مٹی کے برتنوں اور کھلونوں کا کاروبار کرتا تھا۔ اُس کی بیوی مر چکی تھی اور وہ شہر پیٹروگراڈ کے کنارے ایک مکان کی تیسری منزل میں رہتا تھا۔ اُس کے دو لڑکے تھے جن کی خصلتیں مختلف تھیں۔

بڑا لڑکا سیکسیم ایک وکیل کا محرر تھا۔ اُس کے چہرے سے عیاری مترشح ہوتی تھی۔ اُس کی آنکھیں کنجی، ناک چپٹی، نتھنے چوڑے اور ہونٹھ پھیلے ہوئے تھے۔ باریک کتری ہوئی مونچھیں رکھتا۔ نمود و نمائش اور خوش پوشی کا دلدادہ تھا۔ اُس کا چھوٹا بھائی نکولس جو کچھ دنوں کسی اسکول کا طالب علم بھی رہ چکا تھا ایک دُبلا پتلا مدقوق نوجوان تھا۔ اُس کا سن اٹھارہ برس کا تھا۔ اُس کے بال سنہرے اور گھونگھر والے تھے، رسیلی نیلی آنکھیں اور لمبی اور پتلی ناک تھی۔ چہرہ کسی دوشیزہ کی طرح ملائم تھا۔ اُس کی شکل شباہت اپنی ماں سے ملتی جلتی تھی۔ اِسی لئے اُس کا باپ اُس کو بہت چاہتا تھا۔ اور جو بات اُس کے منہ سے نکل جاتی

ن تو پورا کرنے کی کوشش کرتا۔ اُس کی خواہش تھی کہ وہ بھی زندہ جاوید شاعر پشکن کی طرح بڑا آدمی ہوجائے۔ ی دن تک مسلسل خاموشی اختیار کرلینا اور پھر کھلکھلا کر ہنس پڑنا اور خوشی کے مارے اِدھر اُدھر پھدکتے ں کا وطیرہ ہوگیا تھا۔ وہ ہر حالت میں مست رہتا تھا۔ اُسکا باپ جب اُس کو کھلکھلا کر ہنستے دیکھتا تو ہی خوش ہوتا تھا۔ دراصل اُس کو اِس لڑکے سے بڑی محبت تھی اور وہ اُس کے مزاج کے اُتار چڑھاؤ بڑے غور سے دیکھا کرتا تھا۔

مگر میکسم کو یہ بات پسند نہ تھی۔ وہ اپنے بھائی کے اُداس چہرے اور خوشی کے لمحوں دونوں کا مذاق اُڑایا کرتا تھا "تم تو کتاب کے کیڑے ہو۔ اور بھوت اور جنّوں کی دُنیا میں رہتے ہو۔ آج کوئی کھلونا ٹوٹ گیا تو بچوں کی طرح رونے لگے۔ پھر کل کوئی دوسرا کھلونا مل گیا تو خوش ہوگئے۔ کسی کتاب میں پڑھ لیا کہ فلاں رانی پر مصیبت آئی تو فکر میں ڈوب گئے اور جیسے ہی یہ پڑھا کہ راجا نے اُس کو بچا لیا تو خوشی کے مارے پھولے نہ سمانے۔ ارے بھائی! ان باتوں میں کیا رکھا ہے۔ کتابی دُنیا کو چھوڑ کر حقیقی دُنیا میں قدم رکھو۔ ناولوں کے پلاٹ پر غور کرنے اور قصہ کہانیوں پر سر دھننے کے بجائے دُنیا کے روزمرہ واقعات پر غور کرو۔ معمولی دُنیاداروں کو افسانہ نگاروں کی معشوقوں سے اُلجھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کتابی دُنیا کے چکر میں پڑ کر کسی کو آج تک کچھ حاصل نہیں ہوا۔"

نکولس نے پوچھا کہ "کیا تمہاری رائے میں روپیہ پیدا کرنا ہی زندگی کا مقصد ہے؟"

میکسم نے کہا کہ "ضرور۔ روپیہ پیدا کر کے خرچ کرنا ہی زندگی کا مزہ ہے۔"

"کتاب لکھنے والے بھی تو دولتمند ہوسکتے ہیں۔ پھر کیا نکولس تصنیف و تالیف سے امیر نہیں ہوسکتا؟" لیو نے کہا

"جی ہاں! اُسکی طرح اُسے روپیہ جمع کرنے کی دھن نہیں ہے اور دولت سے تو اُسے نفرت ہے۔ اس لئے دولتمند تو نہیں مگر مشہور بلاشبہ ہوسکتا ہے۔" میکسم نے خشکی سے مُسکرا کر جواب دیا۔

نکولس نے کہا "تو یہی سہی۔"

"یہی کیوں؟ کتابوں کی اچھی اشاعت ہوجائے تو دھن دولت اور نام و شہرت دونوں مل سکتے ہیں اور تم تو روزانہ کچھ نہ کچھ لکھا کرتے ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ تمھاری تصانیف پشکن کے ٹکر کی ہوتی ہیں" لیو نے مُسکرا کر کہا۔

"بھلی ہوں یا بُری۔ مگر بازار میں ان تصانیف کا کوئی پوچھنے والا نہیں۔ نکولس یوں ہی اپنا وقت برباد کرتا ہے۔" میکسم نے جھنجھلا کر کہا۔

نکولس کے ہونٹھ پھڑک اُٹھے۔ وہ آبدیدہ ہوگیا اور چُپ چاپ وہاں سے چلا گیا۔

"تم بڑے بے مروت ہو؟ اور نکولس کا دل دُکھانے میں نہ جانے تم کو کیا مزہ ملتا ہے؟" لیو نے

حقارت آمیز لہجہ میں کہا۔

"تو تم خفا کیوں ہوتے ہو، اسمیں غصہ کی کیا بات ہے؟"

"مجھے ناراض ہونے کی کیا ضرورت ہے؟"

"لیکن معلوم ایسا ہی ہوتا ہے۔ خیر چلو کچھ کھا پی لو تاکہ طبیعت ذرا سنبھل جائے۔"

میکسم اور لیو میں کبھی نہیں بنتی تھی۔ اوّل تو لیو مہذب اور تعلیم یافتہ نہ تھا۔ دوسرے وہ بڑا بخیل تھا۔ ہمیشہ کم سے کم خرچ کرنے کی کوشش کرتا تھا۔

میکسم نے ایک دن اس سے یہ سوال کیا کہ "آخر روپیہ کس کے لئے جمع کر رہے ہو؟ روپیہ خرچ کرنے کے لئے ہوتا ہے۔ مگر تم تو......"

"بے شک روپیہ خرچ کرنے ہی کے لئے ہوتا ہے مگر قرینہ اور عقلمندی کے ساتھ......"

"تم خرچ کرنا کیا جانو، اگر جانتے ہوتے تو معلوم ہوتا کہ کسی دکان پر جاکر روپیہ خرچ کرنے میں کیسا لطف حاصل ہوتا ہے، مجھ سے پوچھو نہ؟ میں تو اتنا پیدا ہی نہیں کرتا جتنا خرچ کر ڈالتا ہوں۔" میکسم نے چٹکی لیتے ہوئے کہا۔

"اسمیں کون سی شیخی کی بات ہے، خرچ تو ایک گنوار آدمی بھی کر سکتا ہے مگر پس انداز کرنا بیشک عقلمندی کی بات ہے۔"

"دیکھنا کسی دن میرا نصیب بھی چمکیگا۔ پچھلی مرتبہ بازی جیتنے میں تھوڑی ہی کسر رہ گئی تھی نہیں تو..."

"ارے یہ بتاؤ کہ ملا کیا؟ اپنی ہی جیب کا روپیہ کھو بیٹھے نہ؟"

"اس سے کیا؟ ہاں، ہوئی تو کبھی جیت بھی ہوگی۔ جس دن گہرا ہاتھ پڑا۔ سمجھو تقدیر چمک اٹھی۔"

لیو نے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی سے ٹھوڑی کھجلاتے ہوئے کہا۔ "ہاں ٹھیک ہے۔ بھلے دن گذرتے دیر نہیں لگتی۔ لیکن برے دن پہاڑ کی طرح کاٹے نہیں کٹتے۔"

"بھئی ان باتوں میں کیوں سر کھپاتے ہو۔ پرانے زمانہ میں تو لوگوں کو کوئی کام ہی نہ تھا۔ بیٹھے بٹھائے فضول باتیں بنایا کرتے تھے۔ تم بھی اس چکر میں پڑ گئے تو تمام عمر محنت کرتے کرتے مر جاؤ گے۔ مگر آرام و آسائش کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوگا۔"

"محنت اور مشقت تکلیف دہ تو ضرور معلوم ہوتی ہیں لیکن انکا نتیجہ ہمیشہ اچھا ہوتا ہے۔" لیو نے آہستہ سے کہا۔

اسی وقت سائمن گلنکا داہنے ہاتھ میں اخبار لئے کمرہ میں داخل ہوا۔ میانہ قد مگر خوب تندرست آدمی تھا۔ گٹھا ہوا جسم ہونے کی وجہ سے کسی قدر کوتاہ قامت معلوم ہوتا تھا۔ داڑھی کے بالوں کی جڑیں سفید ہو رہی تھیں

چہرے پر جھریاں پڑ گئی تھیں اور گنجان ابرو آنکھوں پر سائباں کا کام دے رہے تھے۔

اخبار پر نظر جماتے ہوئے سائمن نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا کہ "بس۔ اب باتوں کا زمانہ گیا۔ جنگ کا طوفان سر پر آگیا۔ ایسی ہی کوئی خلاف توقع بات ہوجائے تو میں نہیں کہہ سکتا ورنہ جنگ چھڑنے میں کوئی کسر نہیں معلوم ہوتی۔"

اس پر سلیم نے کہا کہ "ہاں اگر زار نے شہ دی تو جرمنی ضرور تیغ آزمائی کرے گا۔"

گلنکا نے لمبی سانس بھر کر کہا کہ "جرمنی تو لڑنے پر آمادہ ہے ہی۔ اُف یہ لڑائی کیسی خوفناک ہوگی۔ طرفین کے نہ معلوم کتنے جوان اِس میں کام آجائیں گے۔"

"آپ تو دِل دہلانے والی باتیں کر رہے ہیں۔ ذرا اخبار تو دیکھئے۔ آپ کی تو یکطرفہ بات کرنے کی عادت سی پڑ گئی ہے۔" میکسم نے کسی قدر تیزی سے کہا۔

وہ بہت جلد اخبار کا پورا کالم پڑھ گیا۔ مگر پڑھتے پڑھتے اُس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ اور گھبرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"ہاں! آثار تو کچھ اچھے نظر نہیں آتے۔ مجھ کو بھی ریزرو فوج میں شامل ہونا پڑے گا۔ تیو تم کو بھی تو جانا پڑیگا۔"

لیو نے سنجیدگی کے ساتھ اپنی گردن ہلاتے ہوئے کہا "آہ کیسی بھیانک بات ہے۔ لیکن خدا کی مرضی کے آگے سر تسلیم خم کرنے کے سوائے اور چارہ ہی کیا ہے۔"

"ہم غریبوں کے لئے تو سب سے بڑی آفت یہ ہے کہ لڑائی چھڑتے ہی ہم بھوکوں مرنے لگیں گے۔" گلنکا نے یہ بات بڑی دردناک آواز میں کہی۔ جس سے ثابت ہوتا تھا کہ جنگ کا خوف اُس کے دِل میں سما گیا ہے۔

"محنت اور خدا پر بھروسہ رکھو۔ یہ دونوں باتیں کسی آدمی کو بھوکا نہ مرنے دیں گی،" لیو نے پھر ایک مشہور مثل دھرائی۔

میکسم نے اخبار کو زمین پر ڈال کر کہا کہ "میں باہر جاکر دیکھتا ہوں کہ لوگ کیا کر رہے ہیں۔"

اُس کے باپ نے کہا کہ "جاؤ مگر جلد ہی واپس آنا۔ ہم بھی لڑائی کی خبر جاننے کے خواہشمند ہیں۔"

میکسم گلیوں میں ہوتا ہوا صدر بازار کی طرف چلا۔ اُس کے دِل میں ایک طرح کی کھلبلی مچی ہوئی تھی رستے کے ہر موڑ پر لوگ طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے۔ افواہوں اور قیاس آرائیوں کا بازار گرم تھا۔ جرمن سرحد پار کر کے وارسا کی جانب بڑھ رہے ہیں۔ ایک جگہ اُس نے لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سُنا کہ روس کے کشادہ میدان خدا نے دشمنوں کے ڈھیر لگانے ہی کے لئے بنائے ہیں......"

کچھ لوگ تو لڑنے کے شائق اور کچھ لوگ اس سے خائف تھے۔ میکسم انھیں ڈرنیوالے لوگوں میں تھا۔ اُس کا ڈرپوک دِل لڑائی کی خبریں سُنکر کانپ اُٹھا۔ وہ سوچنے لگا۔ لڑائی چھڑ گئی تو زندگی کا لطف ختم ہوجائیگا

اور بڑی مصیبت کا سامنا ہوگا۔ اُس کا خودغرض دل صرف اپنے ہی دُکھ سکھ کی بات سوچ سکتا تھا۔ اُسے اپنے ملک کی تو کچھ پروا نہ تھی۔ البتہ اپنے آرام و آسائش کا بڑا خیال تھا۔ آج اُس کو اپنے افلاس کا علم ہوا۔ اور یہ خیال آیا کہ اگر تھوڑا روپیہ بھی پاس ہوتا تو وہ روس چھوڑ کر کسی دوسری جگہ چلا جاتا۔ یہ سوچ کر وہ بہت پریشان خاطر ہوا۔ اُس کی خواہش ہوئی کہ کسی ایسے محفوظ مقام پر چلا جائے جہاں لڑائی کا ذکر ہی سننے میں نہ آئے لیکن اسوقت اُسے کوئی ایسا مقام دکھائی نہ دیا۔ اسوقت تو ہر جگہ لڑائی ہی کا چرچا تھا۔ گھر لوٹنے سے پہلے اُس کو فوج میں بھرتی شروع ہونے کی خبر معلوم ہوگئی۔

میکسم گلی کے نکڑ تک پہونچا تھا کہ سیونگ بنک کے ایک ملازم سے اُس کی ملاقات ہوگئی۔

"آج اسقدر جلد کیسے گھر لوٹ چلے؟" میکسم نے پوچھا۔

"اور تم ... ؟ کیا کہوں۔ لڑائی کی افواہ نے بڑی گڑبڑ مچا رکھی ہے۔ ابھی بہت سا کام کرنیکو پڑا ہوا ہے۔ دفتر سے آرہا ہوں۔ اور تھکان محسوس ہو رہی ہے۔"

"بھئی کیا کہتے ہو؟ کیا اب بھی لوگ روپیہ جمع کرنے کی فکر میں ہیں؟" میکسم نے تعجب آمیز لہجہ میں پوچھا۔

"نہیں۔ جمع نہیں کر رہے ہیں بلکہ جمع کیا ہوا روپیہ واپس لے رہے ہیں۔ کھڑکی پر ایک بھیڑ سی لگی ہے۔"

"آہ میرا تو ایک حبہ بھی جمع نہیں ہے۔"

"تم کو اس بارہ میں لیو سے نصیحت لینی چاہئیے۔"

میکسم کا ماتھا ٹھنکا۔ اُس نے اپنے دوست کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے پوچھا:۔

"کیا آج تم نے لیو کو دیکھا تھا؟"

"مجھ سے اِس سوال کے جواب کی اُمید نہ رکھئے۔ اُس نے احتیاط برتتے ہوئے کہا۔

کیا اُس نے بھی سو دو سو روپیہ واپس لیا ہے؟ کچھ تو انداز بتا دیجئے؟

"اس سے بھی زیادہ۔"

"تین، چار سو؟"

"اُس نے چاروں طرف دیکھا پھر دھیرے سے کہا" پورے پانسو۔ معلوم نہیں وہ اتنے روپئے لیکر کیا کریگا؟

"پانسو۔ پورے پانسو" میکسم اپنے دل میں بڑبڑایا اور گم سا ہو کر اپنے دوست کی طرف دیکھنے لگا۔

آپسمیں کانا پھوسی کرتے ہوئے دونوں چل دئے۔

"لیو اتنی بڑی رقم لے کر کیا کرے گا؟" میکسم کے دوست نے پوچھا۔

"ممکن ہے بھرتی کے ڈر سے کہیں باہر بھاگنے والا ہو" میکسم نے جواب دیا۔

"اگر یہ بات ہوتی تو وہ کچھ اور بھی نکالتا۔"
"کیا ابھی اُس کی کوئی اور رقم بھی جمع ہے؟"
"ہاں ابھی کچھ اور ہے۔ اگر وہ باہر جاتا تو کل روپیہ نکال لیتا۔" دوست نے آہستگی سے کہا۔ اُس کے بعد لڑائی کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے دونوں گھر کی طرف چل دیئے۔

میکسم گھر کے بجائے ایک کھلے ہوئے میدان کی طرف چلا گیا۔ اُس کو روپئے کی ضرورت تھی۔ لیو کے روپیوں کا حال سُن کر اُس کو لالچ آ گیا۔ اگر یہ روپئے اس کو مل جائیں تو اسی وقت وہ کہیں باہر چلا جائے۔ یہ سوچتے ہوئے اُس کو اِس بات کا بھی کچھ خیال نہ آیا کہ اسوقت بھاگ جانے پر لوگ اُسے کیا کہیں گے؟ اُس کے وطن اور بھائیوں کا کیا حال ہوگا؟ خود غرضی کے سامنے اُسے ان باتوں کا کوئی خیال نہ آیا۔

لیو نے بنک سے روپیہ لاکر اپنے کمرہ میں کپڑوں کے صندوق میں رکھ دیا۔ اس کے بعد نکولس سے باتیں کرنے کے لئے نیچے کے کمرے میں چلا گیا۔ نکولس ابھی باہر سے آیا تھا۔ اور کھڑکی کے پاس بیٹھے ہوئے پشکن کی شاعری کا مجموعہ دیکھ رہا تھا۔

"چاروں طرف لڑائی کا چرچا ہے اور آپ شاعری میں اُلجھے ہوئے ہیں" لیو نے ہنستے ہوئے کہا۔

نکولس نے جو اپنے مطالعہ میں محو تھا، اوپر نگاہ اُٹھائی اور کہنے لگا۔ "بھائی پشکن کو بھی کمال حاصل ہے، لڑائی ہو یا امن ہر عنوان پر اچھا لکھتا ہے۔ ذرا اس کو سنو تو:-

اُٹھو۔ اُٹھو۔ سب مل کر ایک ساتھ اُٹھو۔
روس کے بہادر لوگو! نڈر ہو کر آؤ۔
سمندر کی لہروں کی طرح لاکھوں کروڑوں کی غیر محدود تعداد میں
دشمن کی مغرور سپاہ کو شکست دو
روس کے کشادہ میدانوں میں تم کو سونے کے لئے جگہ ملے گی
اپنے بھائی کی قبر کو کوئی بھول نہ سکیگا۔"

لیو نے دھیمی آواز میں کہا کہ "ہاں! فتح حاصل ہونے تک نہ معلوم کتنے کام آئیں گے۔"
"آہ! مجھے دلی افسوس ہے کہ میں لڑائی میں نہ جا سکونگا۔ فتح حاصل کرنا یا اپنے ملک کے لئے جان دینا دونوں بڑی خوش نصیبی کی باتیں ہیں۔ افسوس: ہزاروں آدمی لڑائی میں جائیں گے مگر میں یہیں پڑا رہونگا۔ لیو میں کتنا بدنصیب ہوں۔"
"تم بھی اپنا فرض ادا کرنا۔ نکولس روسی بہادروں کے کارناموں کے ترانے گانا۔ تاکہ آنے والی نسلیں

اُن سے بہادری کے سبق حاصل کریں۔

"ہاں اب میں سمجھا۔ تم کو وہ اشعار یاد ہیں جو میں نے اُس دن سنائے تھے؟"

"ہاں۔ بیشک وہ اشعار خوب تھے۔ اب دوبارہ پڑھ کر سناؤ" لیو نے زور دے کر کہا۔

نکوتس سنبھل کر کھڑا ہو گیا اور بائیں ہاتھ میں کتاب لے کر کمرے میں اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ اور کتاب سے خوش الحانی کے ساتھ وہ ایک جوشیلی نظم پڑھنے لگا۔

نظم پڑھتے وقت اُس کا گلا بہت ہی سُریلا ہو گیا تھا۔ لیو اُس کی خوش الحانی پر خوش تھا۔ عموماً اسے شعر و سخن سے کوئی زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ مگر نکوتس کے پڑھنے میں معلوم کیا بات تھی جو اُس کو ہمہ تن محو کئے ہوئے تھی۔

نکوتس نظم ختم کر کے کرسی پر جا بیٹھا تو لیو نے کہا "تم نے تو پڑھنا بند کر دیا؟ اچھا اب فوارے والی نظم سناؤ"

نکوتس نے لیمپ جلایا۔ نظم پڑھتے پڑھتے وہ تھک گیا تھا اُس نے ایک موٹی سی کتاب اُٹھائی اور قابل متصوف کی مشہور نظمیں کو اُلٹنے لگا۔ اور پڑھتے پڑھتے خود بھی ایسا محو ہو گیا۔ جیسے کوئی ایکٹر اسٹیج پر ایکٹنگ کر رہا ہو۔ کبھی کرسی پر اُچکتا اور کبھی اُٹھ کر کمرے میں گھومتا۔

میکسم دبے پاؤں گھر میں آیا اور دھڑکی سے یہ نظارہ دیکھا۔ اُسے معلوم تھا کہ یہ شغل جلد ختم ہونے والا نہیں ہے۔ کیونکہ اکثر اوقات لیو سنتے سنتے خراٹے لینے لگتا تھا مگر نکوتس نظمیں پڑھتا ہی جاتا تھا۔

میکسم نے دل میں سوچا کہ "یہی موقعہ ہے" اُس نے باورچی خانہ کے اندر دیکھا کہ اُلنکا ایک کرسی پر خراٹے لے رہی ہے۔ اُس کے والد سائمن گلنکا کے ایک گھنٹے تک واپس آنے کی کوئی اُمید نہ تھی۔

جس خاموشی اور احتیاط کے ساتھ بلی چوہے پر وار کرنے کیلئے آہستہ آہستہ آگے بڑھتی ہے ٹھیک اسی طرح میکسم بھی لیو کے کمرے کی طرف چلا۔ اُس کو معلوم تھا کہ لیو کا صندوق کہاں رکھا ہے۔ اِس لئے تاریکی میں بھی اُس نے صندوق ڈھونڈھ لیا۔ اُس میں قفل لگا ہوا تھا۔ ٹٹولنے پر کوئی چیز کھنک اٹھی۔ یہ تالیوں کا گچھا تھا جو قفل ہی میں لگا ہوا رہ گیا تھا۔ قفل کھول کر اُس نے صندوق ٹٹولنا شروع کیا۔ ایک ایک کر کے نوٹ تھیلیاں اُس کے ہاتھ لگیں۔ اُن کو اُٹھا کر اُس نے رکھ لیا۔ مگر اسوقت اسکا دل زور سے دھڑک رہا تھا۔

اُس کے بعد اُس نے صندوق بند کر کے قفل لگا دیا۔ کنجی کے گھمانے کی آواز کمرے میں گونج اٹھی اور وہ دبے پاؤں اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ زینے تک آ گیا۔ اُس کو برابر یہی شک رہا کہ کہیں کوئی پیچھے سے تو نہیں آ رہا ہے حالانکہ چاروں طرف خاموشی تھی۔ ہاں نکوتس ابھی تک نظم پڑھ رہا تھا۔ اِسی اثنا میں اُلنکا کے کمرے کی گھڑی گھنٹی بجانے لگی۔ میکسم کانپنے لگا۔ تھوڑی دیر تک رک کر وہ پھر نیچے اترنے لگا۔ خوف سے اُس کے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ اور وہ گھبرا گیا۔ نکوتس کی آواز برابر آ رہی تھی "یہ کمبخت سب کو جگا دیگا۔" اُس نے

نکولس کو دل ہی دل میں کوسنا شروع کیا " سامنے ہی باہر جانے کا دروازہ ہے" اُس نے جوتے اُتار کر ہاتھ میں لئے اور دروازے سے جلدی سے باہر نکل بھاگا۔ گلی سے نکل کر اُس نے پھر جوتے پہن لئے۔

نکلسہ کا مطلب پورا ہوگیا۔ خاصی رقم ہاتھ لگ گئی اور کوئی پکڑ بھی نہ پایا۔ اُس نے اپنے دل میں سوچا کہ اب میں کبھی بھوکھ نہ جاؤنگا۔ ان باتوں سے اس کی روحانی کوفت کم نہ ہوئی۔ اُس کے دل میں ایک تلاطم سا برپا تھا۔ اُس کا ضمیر ملامت کر رہا تھا کہ تم نے بہت بُرا کام کیا ہے، اپنے دوست کا روپیہ چرالیا ہے۔ اس گناہ کی تم کو ضرور سزا ملیگی! اُس کا ضمیر بار بار اُس سے یہی کہہ رہا تھا۔

آخر جب اس کو اطمینان قلب نصیب نہ ہوا تو وہ ایک شراب کی دکان میں چلا گیا۔

ایک گھنٹے کے اندر ہی میکسم کا باپ بھی گھر آگیا۔ اس وقت نکولس جنگ کے متعلق باتیں کرنے میں مشغول تھا۔ نکولس نے پوچھا کہ " جب تم لڑائی پر چلے جاؤ گے تو میرا جی کیسے لگیگا ؟"

لیو نے کہا کہ " میرا جانا تو طے شدہ امر ہے۔ کون جانے اب پھر ملاقات ہو یا نہ ہو ؟"

اسی وقت گلنکا بھی کمرے میں داخل ہوا۔ اور لیو نے پوچھا کہ " کوئی نئی خبر تو نہیں ہے ؟"

" طرح طرح کی افواہیں پھیل رہی ہیں۔ کیا معلوم کون سی بات سچ اور کون سی جھوٹ ہے ؟ مگر جو کچھ ہوکر ہی رہیگا اس میں تو کسی کو کلام نہیں۔ میکسم کہاں ہے ؟"

" وہ ابھی تک نہیں آیا " نکولس نے جواب دیا۔

" نکولس۔ بیٹا جاؤ اور الینکا کو جگا کر کافی تیار کرنے کو کہدو "

نکولس مستعدی سے کھڑا ہوگیا۔ اور یہ کہہ کر کہ " الینکا سوتی ہوگی میں ہی بنائے لاتا ہوں " کمرہ سے باہر نکل گیا۔

لیو نے اپنی کرسی گلنکا کے پاس کھسکالی اور دونوں باتیں کرنے لگے۔

" اب ہمارا تمہارا دونوں کا زیادہ دنوں تک ساتھ نہ رہ سکیگا۔ جنگ میں داخل ہونے کا دروازہ تو بہت بڑا ہے مگر اُس سے باہر نکلنے کا راستہ بہت ہی چھوٹا ہے۔ اسی لئے میں تم سے آج کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ نکولس ہٹا کٹا نوجوان نہیں ہے۔ پچھلے سردی کے دنوں میں اُس کی کیا حالت ہوگئی تھی۔ یہ تم کو معلوم ہی ہے۔ نہ معلوم لڑائی میں اُس پر کیا آفت نازل ہو۔ اسی لئے میں اپنی ساری کمائی اُس کے حوالہ کرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ وہ کسی ایسے مقام پر پہونچ سکے جہاں سردی ذرا کم پڑتی ہو "

گلنکا کا دل بھر آیا۔ احسان سے اُس کی گردن جھک گئی۔ وہ کچھ کہہ نہ سکا۔

" میں نے آج بنک سے پانسو روپئے نکالے ہیں اگر یہ کافی نہ ہوں گے تو سو روپئے اور دے سکتا ہوں۔ ڈاکٹر کے مشورہ سے طے کریں گے کہ نکولس کو کہاں جانا چاہیئے۔ جہانتک ہو جلدی کرنا چاہیئے۔ دیکھنا تم انکار نہ کرنا۔"

"خدا تم کو اس کا اجر خیر دے۔ تم بڑے دریا دل ہو" گلنکا نے بھرے ہوئے دل سے کہا۔
گلنکا کو نکولس کا بہت بڑا خیال تھا۔ اُس کو ہمیشہ اسی بات کی فکر رہتی تھی کہ نکولس کا جاڑا کس طرح کٹے گا۔ وہ بہت ہی کمزور تھا۔

"مگر اس کے متعلق نکولس سے ذکر نہ کرنا ورنہ وہ قبول نہ کریگا۔ بڑا خود دار جوان ہے۔"

لیو۔ "مجھ سے ممکن ہوا تو تمہارا روپیہ ضرور واپس کر دوں گا۔ ہاں اس وقت نکولس کی خاطر سے انکار نہیں کر سکتا۔ خدا میدان جنگ میں تمھاری مدد کرے۔"

"خاموش رہیئے۔ نکولس آرہا ہے۔ اُس کے سامنے کچھ نہ کہئے۔" لیو نے دھیرے سے کہا۔
نکولس نے کافی کا پیالہ لاکر میز پر رکھدیا۔ اُسکے بعد وہ سامنے سے چلا گیا۔ لیو میکسم کے انتظار میں وہیں بیٹھا رہا۔
کسی دوست نے گلنکا کو بتلایا کہ اُس کا بڑا لڑکا میکسم ایک شراب خانہ میں یہ کہتے دیکھا گیا کہ لڑائی میں شامل ہونے کے بجائے وہ روس سے بھاگ جائے گا۔ گلنکا کو اس خبر سے بڑی تکلیف پہونچی۔ اس کا لڑکا لڑائی کے خوف سے بھاگ جائے۔ اس کے لئے یہ ڈوب مرنے کی بات تھی۔ سب لوگ وطن عزیز کیلئے جان دینے کو تیار ہیں۔ مگر اُسکا لڑکا اپنی جان لیئے بھاگا جا رہا ہے۔ یہ سوچکر اُس کو بہت روحانی کوفت ہوئی۔
اسی وقت لیو کمرے میں داخل ہوا۔ اُس کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ گلنکا کے نزدیک آکر اُس نے کہا:۔
"میکسم یہاں آیا اور چلا گیا۔"
گلنکا کھڑا ہو گیا اور کہا۔ "کیا کہہ رہے ہو؟"
"ہاں! وہ آیا اور میرے سب روپئے چرا کر چلا گیا۔ مجھے فرش پر میکسم کا رومال پڑا ہوا ملا ہے" یہ کہکر لیو نے خوشبو سے معطر ایک رومال میز پر ڈال دیا۔
گلنکا کا گویا کسی نے گلا کاٹ ڈالا۔ اس وقت اگر لیو اُسکو نہ سنبھالتا تو وہ زمین پر گر پڑتا۔
میکسم ریل سے پیٹروگریڈ نہ چھوڑ سکا۔ کیونکہ زار نے ریل گاڑیوں کی آمد رفت بند کرادی تھی۔ تین دن اور تین رات تو اُس نے ایک جوئے کے اڈے پر گذارے۔ یہاں پر اُس نے تین سو روپئے ضائع کردے۔ اُس کے بعد ایک تجارتی جہاز کے مالک سے مل کر اور اُسے کچھ رشوت دیکر اُس نے روس چھوڑنا طے کیا۔ مگر اس طرح بھی اس کا مقصد پورا نہ ہوا۔ زار کے آدمیوں نے اُس جہاز کی تلاشی لی اور میکسم کو گرفتار کر لیا۔
میکسم کو کورٹ مارشل سے سزا ہوئی۔ جسے بھگتنے کے بعد وہ فوج میں بھرتی کر کے لڑائی میں بھیج دیا گیا۔

کئی مہینے گذر گئے۔ میکسم نے لڑائی میں کئی معرکے فتح کئے۔ اب وہ بزدل میکسم نہ تھا۔ لڑائی کی مصیبتوں نے

اُس کو نئی رینک بنا دیا تھا۔ خاص کارگزاری دکھانے کے صلہ میں اُسے دو مرتبہ ترقی بھی مل چکی تھی۔ لیکن اُس کا گناہ ــــ روپیوں کی چوری کا خیال ــــ رہ رہ کر اُسے ستاتا تھا۔ ہمیشہ خدا کے سامنے سر جھکا کر کہتا تھا کہ لڑائی ختم ہوتے ہی وہ لیو کا روپیہ واپس کر دیگا۔

بہاڑے کا موسم آ گیا مگر لڑائی بند نہ ہوئی۔ کیا اس کا کبھی خاتمہ نہ ہوگا؟ کیا اُسے کبھی لیو سے معافی مانگنے کا موقع نہ ملیگا؟ روز مرہ اس قسم کے سوالات اُس کے دل میں اُٹھنے لگے۔

پولینڈ کے ایک معرکہ میں زخمی ہو جانے پر وہ اسپتال بھیجا گیا۔ اور جب صحت ہوئی تو گیلیشیا کی ایک رجمنٹ میں بھیج دیا گیا۔

اِس دفعہ کارپیتھیں کے مشرقی ڈھال پر میکسم کو آسٹرین سپاہ سے مورچہ لینا پڑا۔

ڈکلا نامی درہ میں زار کے بہادر سپاہیوں نے مورچہ لگایا۔ برف باری ہو رہی تھی۔ دوسری طرف برف کی آڑ میں دشمنوں کا مورچہ تھا۔ چاروں طرف برف سے ڈھکے ہوئے کانٹے دار تاروں کا حلقہ تھا۔ اس پر بھی زار کے بہادر سپاہی حملے پر حملے کر رہے تھے۔ کتنے ہی معرکے فتح ہوئے۔ روسی سپاہیوں کو بڑی بھاری قربانیاں کرنی پڑیں۔ مگر انھوں نے ہمت نہ ہاری۔ بہادر سپاہیوں کے دستے برف سے ڈھکی ہوئی پہاڑی کے ڈھال پر چڑھ جاتے تھے۔ اُدھر سے مشین گنوں سے گولیاں برس رہی تھیں۔ مگر روسی سپاہیوں کا دھاوا نہ رُکتا تھا بہت سے سپاہی نیچے لڑھک جاتے تھے مگر اُن کی جگہ فوراً ہی دوسرے سپاہی لے لیتے تھے۔ اس ہمت و دلاوری کی بدولت آخر کار انھوں نے دشمن کے بچاؤ کے سبھی راستوں پر قبضہ کر لیا۔ اب تک روس کی پہاڑیوں پر ایسی لڑائی کبھی نہ ہوئی تھی۔ چاروں طرف روندی ہوئی برف پر جوشیلے سپاہیوں کے پاؤں کے نشانات اور خون کے دھبے پڑے ہوئے تھے

شام کا وقت تھا۔ ایک بہت ہی ڈھالو پہاڑی پر آسٹرین فوج نے مورچہ باندھ رکھا تھا۔ مدافعت کا بھی بہت معقول انتظام تھا۔ میکسم اسی دستے سے ٹکر لینے کے لئے اوپر چڑھ رہا تھا۔ جہاں سے لگاتار گولہ باری ہو رہی تھی۔ میکسم کے سپاہی برابر نیچے گر رہے تھے۔ انجام کار میکسم کی گارد کا تھوڑا سا حصہ بچ رہا۔ قریب قریب کُل افسر یا تو مر گئے یا بُری طرح مجروح ہو گئے تھے۔ باقی لوگ پہاڑی کے نکلے ہوئے حصہ میں اس طرح جا چھپے، جیسے برف کے طوفان میں بھیڑیں "اندھیرا ہو جائے تو واپس ہوں"۔ یہ سوچ کر وہ موقعہ کا انتظار کرنے لگے۔ اِتنے میں میکسم نے آگے بڑھ کر ایک پُرجوش تقریر کی جس سے اُس کے سپاہیوں میں نئی اُمنگ پیدا ہو گئی۔ "پیٹھ دکھانے سے تو مر جانا بہتر ہے"۔ سب کے دلوں میں پھر ایک نیا جوش پیدا ہو گیا۔ لوگ آگے بڑھنے لگے۔ ان بچے کھچے لوگوں نے پہلا مورچہ فتح کر لیا۔ دوسرا بھی پار ہو گیا۔ اور اب

حریف آخری حملہ باقی تھا۔ اُس کو مار لیا تو بیڑا پار ہے۔ لیکن فتح کے بالکل نزدیک ہو کر بھی میکسم کامیابی کا منہ نہ دیکھ سکا۔ وہ زخمی ہو کر لڑکھڑاتا ہوا نیچے گر پڑا اور بیہوش ہو گیا۔ اُس کا آدھا جسم برف میں دھنس گیا۔ کتنی دیر تک وہ بیہوش رہا یہ اُسے نہ معلوم ہو سکا۔ ہاں جب اُس کی آنکھ کھلی تو اُس نے دیکھا کہ کوئی شخص اُسے اٹھا کر کہیں لے جا رہا ہے۔ اسی وقت اُس کی ٹانگ میں زور کا درد ہوا اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور وہ پھر بیہوش ہو گیا۔

جب آنکھ کھلی تو اُس نے اپنے کو کسان کے مکان میں ایک زخمیوں کی ٹولی میں پڑا پایا۔ چاروں طرف زخمی سپاہی پڑے ہوئے تھے۔ اُس کی ٹانگ میں لکڑی کی کھپچیاں کس کر باندھ دی گئی تھیں۔ اور کوئی شخص اُس کے ہونٹوں سے گلاس لگائے اُس پر جھکا ہوا کھڑا تھا۔ اُس نے پانی پیا تو کسی قدر تازگی محسوس کی۔ تب اُس نے اُس شخص کے چہرے کی طرف نظر بھر کر دیکھا اور آہستہ سے کہا "لیو"۔ درحقیقت یہ وہ لیو ہی تھا جو میکسم کو اٹھا کر لایا تھا۔

"لیو..... لیو، مجھے معاف کرنا۔ مجھے تمہاری معافی کی سخت ضرورت ہے۔ لیو۔ آہ! میں نے تمہارے روپئے چرائے اور تم نے میری جان بچائی" میکسم نے رُک رُک کر کہا۔

"میرے روپئے نہ تھے، نکولس کے تھے۔ میں نے اُس کو دیدیئے تھے۔ لیکن تم اُس سے معافی نہیں پا سکتے۔ وہ اب دُنیا میں نہیں ہے۔"

میکسم کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اور لیو نہ معلوم کدھر چلا گیا۔

ترجمہ چندر بھوشن سنگھ

تیس سال پہلے

تیس سال ہوئے جولائی ۱۹۲۱ء میں منشی تلوک چند صاحب محروم نے "موسم نو بہار" کے عنوان سے زمانہ کیلئے ایک دلکش نظم لکھی تھی۔ چنانچہ اُس کے دو بند موجودہ ناظرین زمانہ کی دلچسپی کے لئے درج ذیل ہیں:-

جوش و فورِ گل سے ہے حسنِ چمن اُبھار میں — تازہ ادائے پُرخلش نکلی ہے خار خار میں
پھوٹی ہیں کونپلیں نئی پہلوئے شاخسار میں — میں ہی تو ایک غم بھرا دل ہوں لئے کنار میں
اب کے فسردگی ہے اور مرے دلِ نگار میں — ورنہ ہے تازگی وہی موسمِ نو بہار میں

سرو و سمن بناؤ میں، سنبل ترسنگار میں — رکھدیئے ہیں پرو کے دل زلف کے تار تار میں
ایسی ادائے دلنواز اب کے ہے برگ و بار میں — داغ پہ داغ پڑ گئے سینۂ لالہ زار میں
اب کے فسردگی ہے اور مرے دلِ فگار میں — ورنہ ہے تازگی وہی موسمِ نو بہار میں

بیمارِ محبت

از حضرت الطاف مشہدی

اے سوختہ جاں آہ ترا عہدِ جوانی
دل وقفِ الم، آنکھ سے اشکوں کی روانی

کیا بات ہے کس واسطے یہ حال ہے تیرا
بھیگا ہوا کیوں ریشمی رومال ہے تیرا

کیوں تیری نگاہوں سے برستے ہیں فسانے
اُف ہونٹوں پہ آنے کو ترستے ہیں فسانے

کیوں تیری طرف کس لئے دیکھا نہیں جاتا
ہونٹوں کو ترے مَیں کبھی خنداں نہیں پاتا

یہ سوز کی آغوش میں سویا سا ترنّم
کیوں چھین رہا ہے میرے ہونٹوں سے تبسّم

حیراں ہوں کہ تو رات کو کیوں سو نہیں سکتا
اِک داغ بھی سینے سے کوئی دھو نہیں سکتا

کیا بات ستاروں سے تو کرتا ہے شبوں کو
ہر آن یہ کیا آہ سی بھرتا ہے شبوں کو

یہ باغ میں کس چیز کا کرتا ہے اشارہ
پاگل نہ بنا دے تجھے پھولوں کا نظارہ

اے سوختہ جاں آہ ترا عہدِ جوانی
دل وقفِ الم آنکھ سے اشکوں کی روانی

شیر پنجاب مہاراجہ رنجیت سنگھ

(۱)

سردار ہمت سنگھ صاحب (دہلی)

ہندوستان ہزار ہا سال سے غیر ملکی لوگوں کے حملوں کا نشانہ بنتا رہا ہے۔ یہ قدرتی بات ہے کہ جب کسی انسان میں کسی قسم کی جسمانی کمزوری پیدا ہو جاتی ہے تو وہ مختلف بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہی حالت اس دیش کی ہوتی رہی ہے۔ جنگ مہابھارت نے اس ملک کے بہادروں کا صفایا کر دیا تھا اس کمزوری کا فائدہ اٹھانے اور اس ملک کی دولت سے اپنا گھر بھرنے کیلئے بدیشیوں کے پے درپے حملے شروع ہو گئے۔ اور ان حملوں نے اس کو اسقدر کمزور بنا دیا کہ صدیوں تک یہ اپنے پاؤں پر کھڑا نہ ہو سکا۔ آخیر میں مغلیہ بادشاہوں نے حکومت قائم کی اور ان کا زمانہ بھی ظلم و ستم سے خالی نہ رہا۔ مگر زمانہ کسی کا ساتھ نہیں دیتا ہے۔ ہر کمال کو زوال ہے۔ آخر کار ان کا پیالہ بھی لبریز ہو کر چھلکنے لگا یعنی مغلیہ سلطنت کے حکمرانوں کی طاقت کو دکن میں مرہٹوں نے، پنجاب میں سکھوں نے اور راجپوتانہ میں راجپوتوں نے اسقدر کمزور کر دیا کہ وہ ایک ٹمٹماتا چراغ نظر آنے لگی۔ اور ملک کے مختلف حصوں میں مختلف حکمرانوں کی حکومتیں قائم ہو گئیں یعنی ہندوستان سیکڑوں حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ صوبہ پنجاب میں بھی بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہو گئیں جو آپس میں برسر پیکار رہنے لگیں۔

ادھر ایسٹ انڈیا کمپنی نے بنگال میں قدم جما کر ہندوستان کے بیشتر حصہ پر اپنا تسلط جمانا شروع کر دیا اسوقت یہ اندیشہ ہوا کہ یہ کمپنی جلد ہی سارے ملک کو ہڑپ نہ کر جائے یا ہماری کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر کوئی دوسری غیر ملکی حکومت اس پر حملہ نہ کر دے۔ چونکہ ہندوستان پر اس سے پہلے جسقدر حملے اسوقت تک ہوئے تھے وہ سب پنجاب کے راستہ سے ہوئے تھے اور یہی حملہ آوروں کے داخل ہونیکا راستہ سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے یہ ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ کم از کم اس صوبہ میں کوئی ایسا بیدار مغز انسان پیدا ہو جو پنجاب پر مضبوط سلطنت قائم کر کے حملہ آوروں کے لئے اس دروازہ کو ہمیشہ کے لئے بند کر دے، نیز ایسٹ انڈیا کمپنی کی بڑھتی ہوئی طاقت سے بھی اس کو محفوظ رکھے اور صوبہ کے باشندوں کو جو ہزاروں سال سے مظالم کا نشانہ بن رہے تھے، امن و امان کے ساتھ زندگی بسر کرنیکا موقعہ دے۔

قدرت نے اس کام کی خدمت انجام دینے کے لئے مہاراجہ رنجیت سنگھ کو چُنا۔ یہ بہادر اور اولوالعزم انسان ۱۳ نومبر ۱۷۸۰ء کو پنجاب میں پیدا ہوا۔ ان کے والد سردار مہان سنگھ ایک چھوٹی سی جاگیر کے مالک تھے باپ کے مرجانے پر مہاراجہ کی عمر صرف بارہ ۱۲ سال کی تھی۔ انھوں نے چھوٹی ہی عمر سے فتوحات حاصل کرنی شروع کردیں۔ اور آخر باشندگان کے اصرار پر ۱۷۹۹ء میں لاہور پر قبضہ کرکے لوگوں کو پوری حفاظت کا یقین دلایا۔

اِس قبضہ سے پنجاب میں ایک نیا دور شروع ہوا۔ لاہور پہونچ کر ۱۸۰۱ء میں رنجیت سنگھ نے مہاراجہ کا خطاب اختیار کرکے حکم دیا کہ اُن کو ہمیشہ سرکار لکھا جائے۔ اُس کے بعد اُنھوں نے ٹکسال قائم کرکے اپنے نام کا سکّہ جاری کیا۔ انصاف کی نئی عدالتیں مقرر کیں۔ انگریزوں سے دوستی کی کیونکہ مصلحت وقت کا یہی تقاضا تھا۔ اور خود انگریز بھی اُن کی دوستی کے زبردست خواہشمند تھے۔ اِسی طرح پر ترکی، روس اور فرانس نے بھی مہاراجہ سے دوستی کا دم بھرا۔ اور اپنے اپنے سفیر اُن کے دربار میں بھیجے۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنی حکومت میں مذہب کی تفریق کا خیال بالکل اُڑا دیا۔ جہاں کہیں قابلیت نظر آئی۔ اُنھوں نے لائق آدمیوں کو انتخاب کرکے اپنی خدمت میں لیا۔ چنانچہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کو اپنے مسلمان افسروں پر بھی ہندو و سکھ افسروں سے کم بھروسہ نہ تھا۔ اُنھوں نے فوج کو تربیت دینے کے لئے یورپین افسروں کو بھی اعلیٰ تنخواہوں پر مامور کیا۔ اِس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے جسقدر فتوحات کیں انھیں اُن افسروں کا زیادہ حصہ تھا۔ بلکہ اس فوج کے وہ مشہور اور نامور جنرل جن کے نام سے کابل اور قندھار کی دیواریں ہل گئی تھیں، شیر دل ہری سنگھ نلوہ تھے۔ جنکی ذات پر صرف سکھ قوم ہی کو نہیں بلکہ تمام ہندوستان کو فخر کرنے کا حق ہے۔ شیر دل ہری سنگھ نلوہ کو مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حکومت قائم کرنے میں بہت بڑا دخل تھا۔

اگرچہ مہاراجہ لکھ پڑھ نہ سکتے تھے۔ مگر عالموں کی عزت کرتے تھے۔ شکل شباہت سے بھی وہ کچھ خوبصورت نہ تھے۔ مگر بشرہ سے رعب برستا تھا۔ اور ہر وقت خوشی و زندہ دلی کے آثار نمایاں رہتے تھے اُن کے چہرہ کے جاہ و جلال کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ایک موقعہ پر جب فقیر عزیزالدین شملہ گئے، انگریزوں نے سوال کیا۔ "کیا تمہارا مہاراجہ کانا ہے؟"

فقیر عزیزالدین نے حیران ہوکر جواب دیا۔ "میں نے آج آپ لوگوں سے ایسا سُنا ہے۔ [illegible] مالک کے چہرہ میں وہ نور و جلال ہے کہ میں آج تک کبھی اُن کی طرف نگاہ [illegible] کر دیکھ سکا"

مہاراجہ کی قوت متخیلہ بہت تیز تھی۔ وہ بہت مستعد اور خوش دل تھے۔ [illegible] کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ مزاج میں تعصب کا نام و نشان تک نہ تھا۔ [illegible]

شیرِ پنجاب مہاراجہ رنجیت سنگھ

(تاریخ پیدائش ۱۰ر نومبر ۱۷۸۰ء تاریخ وفات ۲۰ر جون ۱۸۳۹ء)

سیاستدان تھے۔ درحقیقت اسوقت ان سے بہتر ہندوستان میں کوئی دوسرا حکمران نہ تھا۔ مہاراجہ کی حکومت پنجاب کے ہر طبقہ کے لوگوں کی نمایندہ تھی۔ اس لئے اپنے وقت کے لحاظ سے انکی حکومت عوام کی نمایندہ حکومت کہی جانے کی مستحق ہے۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ لوگوں سے کام لینا خوب جانتے تھے۔ ایک دفعہ اُن کی فوج نئی [illegible] نئے طریقے اختیار کرنے سے ذرا جھجکی۔ تو خود مہاراجہ نے اس قسم کی وردی پہنی اور قواعد [illegible] تاکہ سپاہی اُن کی نقل کریں۔ اور ان کی جھجک دور ہو جائے۔ اس کے ساتھ ہی وہ پجاریوں کے جذبات خواہشات کا بہت احترام کرتے تھے۔ [illegible] انہوں نے اپنے انگریز افسروں سے جو ان کے یہاں ملازم تھے یہ عہد کرالیا تھا کہ وہ گائے کا گوشت نہ کھائیں گے۔ ڈاڑھی نہ کٹوائیں گے اور تمباکو نہ پئیں گے مگر بعد میں تمباکو کی اجازت دیدی تھی۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ ایک اعلیٰ درجہ کے بیدار مغز و منظم انسان تھے۔ اور جو بات وہ اپنے تجربہ اور عقل خداداد کے زور سے کہہ دیتے تھے وہی ہو جاتی تھی۔ اس کا ثبوت اس واقع سے بخوبی ملتا ہے کہ ایک دفعہ مہاراجہ کے پاس ایک برہمن اپنی لڑکی کی شادی میں امداد طلب کرنے آیا۔ آپ نے اس درخواست کے جواب میں کہا کہ "سرکار تم کو پانچ روپیہ دینے کا حکم دیتے ہیں"۔ برہمن حیران ہو گیا اور اس قدر کم روپیہ لینے سے انکار کر دیا۔ مہاراجہ نے کہا کہ "تیری قسمت کے خزانہ میں پانچ روپیہ ہی ہیں"۔ اس کی تسلی کیلئے مہاراجہ نے پانچ کلسے منگوائے۔ چار میں پانچ پانچ ہزار اور ایک میں پانچ روپیہ رکھ کے سب کا منھ بند کرکے ایک جگہ ملاکر رکھ دئے اور برہمن سے کہا کہ "ان میں سے کوئی [illegible] اٹھا لیجاؤ۔" اُس کا ہاتھ پانچ روپیہ والے [illegible] ہی پر پڑا۔ برہمن قائل ہو گیا۔ مہاراجہ نے کہا "ہمارا کیا قصور ہے۔ آپ کی قسمت میں سرکاری خزانہ سے پانچ ہی روپیہ ملنا مقدر ہے"۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ بڑے حق شناس اور غایت درجے کے عدل پسند تھے۔ باوجود اس کے کہ وہ سکھ دھرم کے پکے معتقد تھے۔ لیکن انکے مزاج میں تعصب کو مطلق دخل نہ تھا۔ جو خوبیاں ایک سچے سکھ میں ہو سکتی ہیں وہ سب مہاراجہ رنجیت سنگھ میں موجود تھیں۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ نے بڑے بڑے عظمت والے سردار [illegible] کو مغلوب کرکے ختم کر دیا تھا اور انکا تمام علاقہ اپنے قبضہ میں لے لیا تھا۔ لیکن تمام کارروائی صرف اس حکمت پر مبنی تھی کہ وہ پنجاب میں ایک مضبوط و مستقل سلطنت قائم کرنا چاہتے تھے جس کی اس وقت بڑی ضرورت تھی۔ درحقیقت [illegible] رنجیت سنگھ سخاوت، ہمت، شجاعت اور مردم شناسی وغیرہ تمام اوصاف [illegible]

ساتھ ہی بڑے صاحب اقبال اور فرخندہ خیال بھی تھے۔

آخرکار وہ دن بھی آپہونچا کہ جس سے ہر شخص کو ایک روز دوچار ہونا پڑتا ہے۔ تاریخ ۱۵ ماہ اساڑھ سمت ۱۸۹۶ مطابق ۲۰ جون ۱۸۳۹ء روز پنجشنبہ شیر پنجاب مہاراجہ رنجیت سنگھ جس کے نام کا دبدبہ تمام ملک میں پھیلا ہوا تھا جس کی شجاعت، ہمت، لیاقت، سخاوت اور دلاوری و دلیری کے کارنامے تواریخ کے صفحوں کو زینت دے رہے ہیں، جس نے دریائے ستلج سے لیکر کابل اور تبت تک خالصہ قوم کا جھنڈا لہرا دیا، ایسے آرام سے سوگیا کہ آج تک ایک صدی گذر جانے پر بھی کروٹ نہ بدلی، اور اپنے ساتھ دبدبہ سکندری اور وہ حکم نادری جس سے ایک وقت زمین و آسمان بھی دہل اٹھتے تھے لے کر آناً فاناً خاک میں مل گیا۔

زمین چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے
نہ گور سکندر نہ ہے قبر دارا مٹے ناموں کے نشاں کیسے کیسے

اُردو اکاڈمی دہلی

اُردو اکاڈمی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی نے عنوانات ذیل پر بہترین مضامین کیلئے ڈھائی ڈھائی سو روپیہ انعام دینا تجویز کیا ہے۔ انعام کے متعلق اکاڈمی کا فیصلہ ناطق ہوگا اور منتخب مضامین کے تمام حقوق اشاعت وغیرہ بھی اُسے حاصل ہوں گے۔ ہر مضمون تقریباً پچاس ہزار الفاظ کا ہو، اور سکرٹری اُردو اکاڈمی کے پاس ۳۰ ستمبر ۳۹ء تک بھیجنا چاہیئے۔ جو صاحب مضمون لکھنا پسند کریں۔ وہ پہلے اپنے مضمون کے انتخاب سے سکرٹری کو مطلع کردیں:۔

۱ اشتراکیت، ۲۔ فاسزم، ۳۔ نازی ازم، ۴۔ سامراج، ۵۔ وطنیت، ۶۔ سرمایہ داری، ۷۔ بحیرہ روم کی سیاست، ۸۔ بحرالکاہل کی سیاست، ۹۔ امریکہ اور سیاست عالم، ۱۰۔ وسطی یورپ کی سیاست، ۱۱۔ نوآبادیوں کی تقسیم، ۱۲۔ ممالک اسلامی کی سیاست

منشی بشیشور پرشاد صاحب منور لکھنوی، مصنف "نسیم عرفاں منظوم" (ترجمہ بھگوت گیتا) کی نظموں کا مجموعہ "کائنات دل" کے نام سے عنقریب شائع ہونیوالا ہے۔ یہ نظمیں دور جدید کی اُردو شاعری کا بہترین نمونہ ہیں۔ شائقین اس دلکش مجموعہ کیلئے ابھی سے اس کے پبلشر رگھوبیر پرشاد سکینہ کتب خانہ دہلی کے پاس اپنی فرمائشات بھیج دیں۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ

(۲)

از ٹی۔ پی۔ بھٹناگر گستہ

مہاراجہ رنجیت سنگھ کی وفات کو ۲۷ جون ۱۹۳۹ء کو سو برس پورے ہوئے۔ چنانچہ آپکی صد سالہ برسی پر اہل ملک نے متحدہ حیثیت سے آپ کی یاد میں خراج تحسین و عقیدت پیش کیا۔ فرقہ وارانہ جذبات اور مذہبی تعصب سے پاک رہ کر جس حسن و خوبی و کامیابی سے آپ نے ملک میں حکومت کی اور انتظام و انصاف کا جو اعلیٰ معیار اپنے دوران حکومت میں آپ نے سامنے رکھا اُس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں شاذ و نادر ملیگی یہی وجہ ہے کہ اسقدر عرصہ گذر جانے پر بھی آج تک اُن کی یاد دلوں میں تازہ ہے اور آپ کا ابھی تک نام عزت و احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ ۲ نومبر ۱۷۸۰ء کو ضلع گوجرانوالہ میں ایک سکھ جاگیردار کے گھرانے میں پیدا ہوئے "ہونہار بروا کے چکنے پات" کے مصداق اُن میں وہ تمام اوصاف حمیدہ جو قدرت ایک نمایاں ہستی میں خاص طور سے ودیعت کرتی ہے، اوائل عمر سے ہی ظاہر ہونے لگے تھے۔

پرماتما نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کو حکمرانی کے لئے پیدا کیا تھا۔ ان کی سپاہیانہ زندگی بارہ ۱۲ سال کی عمر سے شروع ہوئی اور انیس ۱۹ بیس ۲۰ سال کی عمر ہوتے ہوتے اُن کے وہ تمام جوہر چمک اُٹھے جو اُن کی آیندہ زندگی کا طرۂ امتیاز ثابت ہوئے۔ جبوقت وہ برسر اقتدار ہوئے صرف ایک مسل کے مالک تھے اور وہ وقت ایسا تھا کہ تمام پنجاب آپس کے نفاق اور پھوٹ کے باعث برباد ہو رہا تھا۔ پنجاب کی سبھی چھوٹی بڑی ریاستیں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار تھیں۔ اِس باہمی تنازعے اور کشیدگی کے باعث سب ایک ایک کر کے مرہٹہ اور افغان طاقتوں کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنتے جا رہے تھے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی موقعہ شناس نگاہوں نے اس موقعہ کو غنیمت سمجھ کر سکھوں کی غیر منظم و منتشر طاقت کو اپنی عقلمندی اور پالسی سے یکجا و متحد کر کے مضبوطی سے منظم کر لیا۔ ان دنوں سکھ سپاہیوں کی یہ کیفیت تھی کہ فن سپہ گری سے بے بہرہ ہونے کے باوجود اپنے کو اس فن کا ماہر سمجھ کر دوسروں کے زیر کمان رہنا خلاف شان سمجھتے تھے مگر چندہی دنوں میں یہ لوگ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی بہادری کا لوہا مان گئے اور جوق جوق انکی فوج میں

بال بہار کی طرح اٹل تھی۔ اور جس کام کو وہ ہاتھ لگاتے ختم کئے بغیر نہ رہتے۔ دنیا کی کوئی طاقت انھیں اُن کے عزم سے ہٹا نہ سکتی تھی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ جتنے ہی ارادے کے پختہ طبیعت کے مضبوط اور رائے کے سخت تھے اُتنے ہی دل کے نرم بھی تھے۔ سخاوت میں بھی وہ یکتائے زمانہ تھے۔ ان کا دستِ کرم ہمیشہ پیش پیش رہتا تھا مندر، مسجد اور گوردواروں سب کو انھوں نے ہزاروں روپیہ کی خیرات دی۔ سینکڑوں دوسرے ادارے بھی انھیں کی فیاضی پر چلتے تھے۔ انھیں سکھ مذہب پر عقیدہ تھا اور ہر روز گرنتھ صاحب کا پاٹھ سنتے تھے۔ اُن کو علم وادب سے بھی بہت ذوق تھا اور ان کے دربار میں ہمیشہ ہر قسم کے اہلِ کمال جمع رہتے تھے اور وہ سب کی قدر افزائی کرتے۔

مہاراجہ کے خط وخال اور جسم کی بناوٹ خوبصورت نہ تھی۔ اور نہ وہ شکیل ہی تھے۔ کیونکہ بچپن ہی میں چیچک نے اُن کا چہرہ بگاڑ دیا تھا اور ایک آنکھ ضائع کر دی تھی۔ مگر اُن کی پیشانی کشادہ اور فراخ تھی۔ اُن کے چہرہ سے جلال ٹپکتا تھا۔ جو شخص اُن کے سامنے جاتا تھا مرعوب ہوئے بغیر نہ رہتا تھا۔ غرض مہاراجہ رنجیت سنگھ کی ایسی شخصیت تھی جس کو عوام میں ہمیشہ ایک امتیازی درجہ حاصل ہوتا رہا۔ ایک مؤرخ نے لکھا ہے کہ "وہ ایک ڈکٹیٹر تھے اور اُن کی وفات کے بعد سلطنت کا شیرازہ اسی وجہ سے منتشر ہو گیا کہ زندگی بھر انھوں نے مطلق العنان حکمراں کی حیثیت سے حکومت کی اور تمام سلطنت میں انھیں اختیاراتِ کلی حاصل تھے۔ اُن کے مشیر ومصاحب خود انھیں کے ایجنٹ تھے جو اُن کے بعد اس وسیع وعظیم مملکت کا بار قابلیت سے نہ سنبھال سکے۔ اس لئے اسے غیروں کے ہاتھوں میں جانے سے نہ بچا سکے۔"

مہاراجہ رنجیت سنگھ کو گھوڑوں کا بھی بڑا شوق تھا جو اُن کی آخیر عمر تک رہا۔ اپنی ذاتی سواری کے لئے اُن کے پاس کئی نایاب و بیش قیمت گھوڑے تھے۔ لیلی، سفید پری اور گوہر بار نامی گھوڑوں سے تو اُن کو خاص اُنس تھا۔ بہرحال مہاراجہ رنجیت سنگھ نے جس حیثیت سے عروج حاصل کیا اور جو غیر فانی شہرت اور ہر دلعزیزی حاصل کی وہ انھیں کا حصہ تھی۔ اُن کا انتقال ۲۷ جون ۱۸۳۹ء کو ذات الجنب کے مرض سے ہوا۔ لاہور میں اُن کی شاندار سمادھ ہے جس کی حفاظت ونگرانی ایک کمیٹی کے سپرد ہے۔ وہاں ہر روز گرنتھ صاحب کا پاٹھ ہوتا ہے اور ہزاروں جاتری سمادھ کی زیارت کو آتے اور اپنی بھگتی اور عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔ ہم بھی شیرِ پنجاب کی صد سالہ برسی کے موقعہ پر اپنا خراجِ عقیدت پیش کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

تنقید کتب

کلیات بحری[1]

اب تک عام طور پر یہ خیال کیا جاتا تھا کہ اُردو شاعری میں اولیت کا سہرا حضرت ولی اورنگ آبادی کے سر ہے۔ لیکن جدید تحقیقات سے یہ معلوم ہوا ہے کہ اُردو شاعری میں درحقیقت اولیت کا فخر قاضی محمود بحری کو حاصل ہے جو نواح نصرت آباد کے رہنے والے اور ولی دکنی سے پُرانے شاعر تھے۔ ۱۰۹۵ھ میں وہ بیجاپور پہنچے اور وہاں کی سلطنت کے زوال کے بعد حیدرآباد چلے گئے تھے۔ سنہ ۱۱۳۰ھ میں اپنے وطن موضع گوگی تعلقہ شاہ پور میں وفات پائی۔ جہاں اُن کا مقبرہ اب تک موجود ہے۔ زیر نظر کتاب انھیں قاضی صاحب کا مجموعۂ کلام ہے جو شعبۂ اُردو الٰہ آباد یونیورسٹی کے فاضل لکچرار ڈاکٹر سید محمد حفیظ صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی، ڈی۔ لٹ نے بڑی تلاش و تحقیق کے بعد مرتب کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے ادبی ذوق و علمی تبحر سے ناظرین زمانہ بخوبی واقف ہیں۔ کیونکہ آپ رسالۂ زمانہ کے قدیم معاون اور ایڈیٹر زمانہ کے پُرانے کرمفرا ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کلیات کو بڑی محنت و جانفشانی سے مرتب کیا ہے اور اس کے لئے ایک عالمانہ دیباچہ بھی لکھا ہے، جسمیں بحری کے زمانہ کی تاریخ، خود اُن کی سوانح عمری اور اُن کے معصر شاعروں کے حالات وغیرہ درج ہیں اور کلام بحری کی خصوصیات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ ساری کتاب پانچ ابواب میں تقسیم کی گئی ہے۔ اور اس کے آخر میں ایک فرہنگ الفاظ دیدی گئی ہے۔ جسمیں زمانہ قدیم کے تمام مشکل الفاظ کی تشریح کردیگئی ہے۔ اِس بات کا ثبوت کہ بحری، ولی دکنی سے پہلے کے شاعر ہیں اس بات سے بھی ملتا ہے کہ بحری کے کلام میں ولی کے مقابلے میں ہندی و سنسکرت الفاظ کی تعداد کہیں زیادہ ہے۔ ولی کی زبان بحری سے زیادہ ترقی یافتہ اور منجھی ہوئی ہے۔ بحری کی مثنوی "من لگن" کے ایک شعر سے بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ بہت پُرانے شاعر تھے۔ شعر یہ ہے ؎

بحری تو ہی کیتک برس تھے ۔۔۔ بارہ اُپر ایک سو سہس تھے
۱۱۱۲ھ

بحری نے اپنی تصانیف میں ایک دیوان غزلیات، کچھ مرثیے، مثنوی "من لگن" اور مثنوی گنجانامہ چھوڑے۔

---

[1] حجم ۳۱۲ صفحات۔ قیمت تین روپیہ۔ ملنے کا پتہ نولکشور پریس لکھنؤ

جن کی زبان کا اندازہ مندرجہ بالا شعر سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ فاضل مرتب نے اس کلیات کو شائع کر کے اُردو لٹریچر پر احسان عظیم کیا ہے۔ ہمارے نزدیک آپ کی کوشش مشکور ہوئی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ دیوان سے عوام کو دلچسپی نہ ہو۔ لیکن زبان کے محققین کے لئے یہ بڑی قابل قدر چیز ہے اور لائبریریوں اور کتبخانوں میں رکھنے کے قابل ہے۔ لکھائی، چھپائی، کاغذ سب عمدہ۔

بنی اسرائیل کا چاند[1]

یہ مشہور معروف انگریز ناول نگار رائڈر ہیگرڈ کے ایک افسانہ مون آف دی اسرائیل کا ترجمہ ہے، جو عبد المجید صاحب حیرت بی۔ اے نے بڑی محنت سے سلیس اور بامحاورہ اُردو میں کیا ہے۔ جہاں تک ترجمہ کا تعلق ہے فاضل مترجم نے قابل قدر کامیابی سے اپنا فرض ادا کیا ہے اور زبان کی سلامت کے ساتھ روزمرہ محاوروں کا بھی پورا لحاظ رکھا ہے۔ اس افسانہ کا پلاٹ مصر قدیم کے اُس زمانہ کا ہے جب بنی اسرائیل یعنی یہودیوں پر فرعون مصر مظالم برپا کیا کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے وہ مصر سے ہجرت کر کے کنعان کی طرف روانہ ہوئے۔ بنی اسرائیل کا مصر سے بخیریت نکل جانا اور فرعون مصر کا مع فوج تعاقب کرتے ہوئے غرق ہونا بائبل کی پوری روایت کا اصل چربہ آ گیا ہے۔ صرف موسیٰ کا نام رہ گیا ہے۔ اس افسانہ میں بنی اسرائیل کی ایک حسین لڑکی میرآپی اور مصری شہزادہ سیٹی کے حسن و عشق کی داستان نے مزید رنگینی پیدا کر دی ہے۔ کتاب شروع سے آخر تک بہت دلچسپ ہے۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ بھی اچھا ہے۔

مضامین محمد علی[2]

یہ مولانا محمد علی مرحوم کے سرسطہ تاریخی، سیاسی، ادبی اور مذہبی مضامین کا ایک بیش بہا مجموعہ ہے جو اُن کے اُردو اخبار "ہمدرد دہلی" میں وقتاً فوقتاً شائع ہو چکے تھے اب ان دلچسپ و مفید مضامین کو محمد سرور صاحب بی۔ اے (آنرز) پروفیسر تاریخ، جامعہ ملیہ دہلی نے مرتب کر کے ایک مقدمہ کے ساتھ کتابی صورت میں جمع کر دیا ہے۔ یہ مضامین کس پایہ کے ہیں۔ اس کے جواب میں صرف اسقدر کہدینا کافی ہے کہ یہ مولانا محمد علی مرحوم کے مضامین ہیں، جن کے نام سے سیاسی ہندوستان کا بچہ بچہ واقف ہے۔ تمام مضامین میں استدلال، زور، روانی اور معلومات کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے اور کوئی مضمون اعلیٰ ادبیت سے خالی نہیں ہے اس کتاب کی لکھائی، چھپائی اور کاغذ سب نفیس ہے، جلد بھی خوبصورت ہے۔ شروع میں مولانا محمد علی مرحوم کا فوٹو بھی دیا گیا ہے۔

---

[1] حجم ۲۴۴ صفحات - قیمت دو روپیہ ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی، لاہور، لکھنؤ

[2] حجم ۵۹۰ صفحات - قیمت ڈھائی روپیہ۔ ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی، لاہور، لکھنؤ

خود نوشت سرگذشت

یہ اٹلی کے مشہور ڈکٹیٹر بینی ٹو مسولینی کی آپ بیتی سوانحعمری ہے جو خود اس نے لکھی ہے۔ آجکل اٹلی اور جرمنی کے ڈکٹیٹروں نے دنیا بھر میں دھوم مچا رکھی ہے۔ اس لئے اس کتاب کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ جو لوگ یہ معلوم کرنا چاہیں کہ ایک غریب لوہار کا لڑکا اپنی محنت جفاکشی اور اولوالعزمی کی بدولت کس طرح اٹلی جیسی عظیم الشان سلطنت کا کیا دھرتا بن گیا ہے، وہ اس کتاب کو ضرور پڑھیں۔ اٹلی کو از سر نو زندہ کرنے میں مسولینی کو کن کن مصائب کا مقابلہ کرنا پڑا۔ ان تمام مشکلات کا مفصل حال مسولینی نے خود اپنے قلم سے لکھا ہے۔ آج اس طالع اولوالعزم کو جمہوریت پسند دنیا خوف و ہراس کی نظروں سے دیکھ رہی ہے۔ بہرحال گو وہ بدنام بھی ہے اور نیکنام بھی لیکن اپنے وطن کا تو فدائی ہے۔ یہ سوانح عمری انگریزی ترجمہ سے ترجمہ در ترجمہ کر کے شائع کی گئی ہے اور اس کی زبان پر پنجابیت بھی بہت حاوی ہے۔ پھر بھی ترجمہ بہت سلیس اور عام فہم ہے۔ جس کے مطالعہ سے ہر شخص فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ شروع میں پرسیل چیپلد کا لکھا ہوا مسولینی کا پروگرام اور اس کے بعد پبلشر صاحبان کی تمہید ہے۔ مسولینی کیا چاہتا ہے؟ اس کا جواب خود مسولینی کی زبان سے اس کتاب میں پڑھئے۔ اس کی لکھائی چھپائی کاغذ اور جلد وغیرہ سب معمولی ہیں۔ حجم ۲۸۶ صفحات۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ لاجپت رائے اینڈ سنز تاجران کتب۔ لاہور۔

سبد چین

مرزا غالب نے اپنے فارسی کلام کا ایک مختصر مجموعہ، جو کلیات میں شامل ہونے سے رہ گیا تھا، ۱۸۶۷ء میں سبد چین کے نام سے شائع کیا تھا۔ مگر ایک عرصہ سے یہ مجموعہ نایاب ہو چکا تھا۔ اب حسن اتفاق سے اس کا ایک نسخہ نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمن خان شروانی کے کتب خانہ میں مل گیا۔ چنانچہ اسی کی نقل مکتبہ جامعہ نے شائع کر دی ہے۔ اس کے شروع میں مرزا غالب کی ایک نئی تصویر بھی درج ہے اور کارپردازان جامعہ نے مرزا کا وہ کلام بھی جو ان کے کلیات میں شامل نہیں، مگر مختلف کتابوں میں ادھر ادھر ملتا ہے، کتاب زیر نظر میں شامل کر دیا ہے۔ علاوہ بریں مرزا کے چھ فارسی قصیدے، ایک ترکیب بند، ایک ترجیع بند، چند شعر بطرز مثنوی، پچاس قطعے، نو غزلیں، بیس رباعیاں اور ڈیڑھ درجن مختلف اشعار بھی درج ہیں، اور اپنے مرتب کردہ مجموعہ کیلئے مرزا غالب نے جو دیباچہ فارسی زبان میں لکھا تھا۔ وہ بھی شامل کر دیا گیا ہے۔ جو حضرات زبان فارسی کی شیرینی الفاظ کی روانی تخئیل کی بلندی، ترکیبوں کی چستی اور جدت کے دلدادہ ہیں ان کے لئے یہ مجموعہ ایک بہترین تحفہ ہے۔ در اصل غالب کا اصلی رنگ ان کے فارسی کلام ہی میں دیکھنے میں آتا ہے۔ بہرحال اس چھوٹے مجموعہ میں ان کی ضیافت طبع کے لئے بہت کچھ سامان موجود ہے۔ اس کی لکھائی چھپائی روشن، کاغذ نفیس ہے، ضخامت پانچ جزو۔ قیمت چھ آنہ۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی

جرمن وزیر اقتصادیات سے ایک صاحب مسٹر ہڈسن نامی نے انگلستان اور اس کے اتحادیوں کی طرف سے ایک ارب پاونڈ قرض دلانے کا وعدہ کیا ہے بشرطیکہ جرمنی "صلح کی راہ" اختیار کرے۔ اس خبر کو اخبارات نے جلی سرخیوں کے ساتھ شائع کیا ہے۔ انگلستان اور دوسرے ملکوں میں سنسنی پھیل گئی ہے لیکن مسٹر ہڈسن کا بیان ہے کہ انھوں نے یہ سلسلۂ جنبانی محض اپنی نجی حیثیت سے کی ہے اور قرضہ کی کوئی خاص رقم تعین نہیں کی ہے خیر جو کچھ ہو اس سلسلے میں سب زیادہ غور طلب بات یہ ہے کہ جس جرمن وزیر سے یہ تمام بات چیت ہوئی تھی، اُس نے اپنے یہاں کے سفیر سے ان تجاویز کو برٹش گورنمنٹ کی طرف سے صلح کا پیام سمجھ کر بیان کیا۔

جرمنی کے متعلق جتنی خبریں آئی ہیں اُن سب سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ہٹلر اپنے ارادوں پر ڈٹا ہوا ہے البتہ وہ بھی جنگ سے ڈر رہا ہے اور اپنا مطلب حتی المقدور بلا کشت وخون حاصل کرنا چاہتا ہے۔ انگلستان وفرانس لڑائی کے لئے کیل کانٹے سے درست ہو رہے ہیں۔ اس طرف جاپان کے رویہ سے البتہ ایک نئی پیچیدگی پیدا ہوگئی ہے ادھر پریسیڈنٹ روزولٹ بھی امریکہ کی سینٹ کو غیر جانبداری کی پالیسی میں کسی قسم کی ترمیم کرنے پر راضی نہ کرسکے۔ اس سے بھی فرانس و برطانیہ کو قدرتاً مایوسی ہوئی ہے۔

یہ خیال کہ برطانیہ و فرانس کا روس کے ساتھ معاہدہ ہوجائے تو جرمنی و اٹلی اس متحدہ محاذ کی طاقت سے مرعوب ہوجائیں گے اور لڑائی کا خطرہ باقی نہ رہے گا کچھ بہت درست معلوم نہیں ہوتا ہے۔ ہاں اس معاہدہ کا یہ نتیجہ ضرور ہوگا کہ دُنیا دو حصوں میں تقسیم ہوجائے گی۔ اور ایک حصے کے شرکا دوسرے حصے کی طاقتوں سے بالکل علیحدہ ہوکر سیاسی، اقتصادی اور اخلاقی ہر طریقے سے جداگانہ پالسی پر عملدرآمد کریں گے۔ دُنیا کی تجارت بھی دو ٹکڑوں میں تقسیم ہوجائے گی۔ اور ایک دوسرے سے کوئی رابطہ اتحاد قائم نہ رہیگا۔ جس سے طرفین ایک دوسرے سے ہر وقت بدظن رہیں گے۔ اگر کسی طرف ذرا بھی دوسرے کے مفاد پر کوئی چوٹ پہونچی۔ تو اسی وقت عالمگیر جنگ چھڑ جائے گی۔ اسوقت بھی بعینہ یہی کیفیت نظر آرہی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لڑائی چھڑنے میں ذرا دیر نہیں ہے۔ کوئی ذرا سی بات ہوجائے اور تلواریں میان سے نکل پڑیں۔

چین کی غیر ملکی آبادیوں کا انتظام اب تک غیر ملکیوں کے ہاتھ میں تھا۔ لیکن اب جاپان انھیں اپنے ہاتھ میں لینا چاہتا ہے۔ حالانکہ اس عرصے میں فرانس اور انگلستان کے سیکڑوں کارخانے اور نوآبادیاں ان علاقوں میں قائم ہوگئی ہیں۔ اس لئے یہ حکومتیں اپنے امکان بھر اپنا اقتدار ختم نہ ہونے دینگی۔ جاپان کو شکایت ہے کہ چین کو سامانِ جنگ اور دوسری ضروری چیزوں کی بہم رسانی میں ان ملکوں سے غیر معمولی امداد پہونچ رہی ہے حال میں جاپان نے چار مجرم چینیوں کی حوالگی کا جو ٹین تسین میں ارتکاب قتل کے بعد روپوش ہوگئے تھے مطالبہ

[illegible]

ایا تھا اور جب یہ مطالبہ نامنظور ہوا تو جاپان نے برطانیہ کو الٹی میٹم دیکر ٹین ٹسین کی برطانوی بستی اور بیرونی دُنیا کی آمد و رفت کا سلسلہ بالکل مسدود کردیا اور اس سلسلے میں بعض انگریزوں کی ایسے ہتک آمیز طریقے پر جامہ تلاشی لی کہ انھیں بالکل برہنہ کردیا۔ مگر ابھی تک برطانیہ اس کا کوئی تدارک نہ کر سکا۔ اب آپس کے متعلق جو بات چیت ہو رہی ہے تو جاپان نے یہ مطالبات پیش کئے ہیں کہ برٹش گورنمنٹ نئے علاقے تمام دہشت انگیزوں کو جو مقبوضہ جاپان کے سوا کہ گرد ہے (۲) جاپان کی نئی پالیسی کو قبول کرے۔ چینی سکوں کا چلن روکے اور چینی گورنمنٹ کی چاندی جاپان کو منتقل کرنے میں مدد دے (۳) جاپان کو اپنے علاقے چینی بنکوں وغیرہ کی تلاشی لینے کا اختیار دیدے اور ہر ممکن طریقے سے جاپان کے خلاف چینیوں کی سرگرمی کی روک تھام کرے۔

اٹلی اور جرمنی کے اشتعال کی وجہ سے جاپان کے حوصلے اس قدر بڑھ گئے ہیں کہ وہ برطانیہ سے برخاش پر آمادہ ہو گیا ہے۔ اس کو یہ بھی خوب معلوم ہے کہ یوروپ اس وقت جس نازک سیاسی حالت سے گذر رہا ہے اس کے لحاظ سے برطانیہ یا فرانس جاپان سے لڑائی چھیڑ کر دو محاذ پر اپنی طاقت منتشر کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں۔ روس کیساتھ معاہدہ کی گفتگو شروع ہوتے وقت ہٹلر البتہ کسی قدر مرعوب ہوا تھا۔ مگر اب جو اس میں غیر معمولی تعویق ہو رہی ہے تو اس کے حوصلے پھر بڑھ گئے ہیں اور اس نے پولینڈ کی سرحد پر فوجیں ڈالنے کے بعد اب ڈینزگ پر قبضہ کرنے کیلئے ریشہ دوانیاں شروع کر دی ہیں۔ اور پولینڈ کی سرحد پر فوجیں اکٹھا کرکے اس نے تمام ڈینزگ میں ... مسلح جنگ وغیرہ داخل کر دیئے ہیں۔ اسپین کو بھی اس نے ملا لیا ہے اور خبر ہے کہ اسپین، جرمنی و اٹلی کی فوجی تنظیم اب اس طرح کر دی گئی ہے کہ لڑائی چھڑنے پر تینوں ملکوں کی فوجیں ہموار حیثیت سے کام کر سکینگی۔ جرمنی اور اٹلی کے فوجی اسٹاف کی تنظیم بھی باہمی اتفاق کی بنیاد پر کی گئی ہے چنانچہ بہت سے اطالوی ہوائی جہاز اسپین پہونچ گئے ہیں اور خود اٹلی میں جرمن فوجیں موجود ہیں۔ ان سب کارروائیوں کے بعد اب برطانیہ کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ جس طرح سے ممکن ہو وہ جلد سے جلد روس سے سمجھوتہ کرکے اس کو اپنی طرف کرلے۔ پہلے اس معاہدہ سے شرق بعید کو مستثنےٰ رکھا گیا تھا اور جاپان کو بھی اسمیں اعتراض نہ تھا۔ بحالت موجودہ یہ تجویز خلاف مصلحت ثابت ہو رہی ہے۔ کیونکہ اسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ جاپان ایشیا میں روسی حملے سے مطمئن ہو جائیگا۔

امریکہ کی طرف سے جاپان ضرور کچھ خائف ہے اور شاید اسی وجہ سے وہ غیر ملکی آبادیوں میں اہل امریکہ سے کوئی بیجا سلوک نہیں کر رہا ہے تاکہ امریکہ جس کی پالیسی ہمیشہ یوروپ کی الجھنوں سے الگ تھلگ رہنے کی رہی ہے، اپنی قدیم روش کے خلاف کوئی کارروائی کرنا پسند نہ کرے۔ برطانیہ کی خواہش ہے کہ جنگ کی صورت میں امریکہ کو بھی اپنا حلیف بنالے۔ اسی لئے ملک معظم جارج ششم اپنے دورہ کینیڈا کے سلسلے میں امریکہ بھی تشریف لیگئے تھے جہاں پریسیڈنٹ روزولٹ اور اہل امریکہ نے اُن کی خوب آؤ بھگت کی۔ مگر امریکن سینٹ

پریسیڈنٹ کی سفارش کے باوجود ابھی تک غیر جانبداری کی پالیسی کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔

برطانیہ و فرانس نے جاپانی اقدامات کا مقابلہ کرنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ چنانچہ انھوں نے سنگاپور میں جنگی بیڑہ رکھنے کا فیصلہ کیا ہے اور اگر امریکہ نے بھی برطانیہ و فرانس کا ساتھ دیا تو جاپان مقابلہ کی تاب نہ لاسکیگا۔ مگر ان سب اثرات کے ہوتے ہوئے، جیسا کہ اوپر ذکر کیا جاچکا ہے انگلستان اسوقت جاپان سے لڑنا نہیں چاہتا ہے۔ چنانچہ حال ہی میں ٹوکیو میں سفیر برطانیہ اور گورنمنٹ جاپان کے مابین جو سمجھوتہ ہوا ہے اور جس کا اعلان وزیر اعظم برطانیہ نے ۲۴ جولائی کو برٹش پارلیمنٹ میں کیا اس سے بھی یہی ثابت ہے کہ انگلستان اسوقت کسی زبردست پارٹی کی مخالفت مول لینے کو تیار نہیں ہے۔

جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے کم سے کم اسوقت ہم لوگوں کو جاپان کوئی نقصان نہیں پہونچا سکتا ہے لیکن مشرق بعید اور مغرب دونوں میں جنگ کا خطرہ لاحق ہے اور ذرا سی بات پر عالمگیر جنگ شروع ہونے کا اندیشہ ہے۔ ہٹلر کی ساری کوشش یہی ہے کہ وہ اپنا مدعا ایک قطرۂ خون گرائے بغیر حاصل کرے۔ اب دیکھنا چاہئے کہ اس مرتبہ بھی اُسے اپنے ارادہ میں کامیابی ہوتی ہے یا کشت و خون کی نوبت آتی ہے؟

ہندوستان بھی طرح طرح کی اندرونی الجھنوں میں گرفتار ہے۔ آئے دن ہندو مسلمانوں کے فسادات ہوتے رہتے ہیں۔ لکھنؤ وغیرہ میں شیعہ سنیوں میں بھی سخت جھگڑا ہے جس کی وجہ سے اسوقت ہزارہا اہل ملک جیل کی ہوا کھا رہے ہیں۔ بنگال میں سیاسی قیدیوں کے مسئلہ نے بےچینی پیدا کر رکھی ہے۔ یکم اگست سے بمبئی میں شراب کی قطعی ممانعت کر دی گئی ہے جس کی وجہ سے بڑی ہلچل مچ گئی ہے۔ لیکن کانگریس گورنمنٹ اس اصلاح پر تلی ہوئی ہے۔ صوبہ متحدہ میں بھی بعض ضلعوں میں منشیات کی بندش کی پالیسی کی وجہ سے گورنمنٹ کو "ملازمت ٹیکس" جاری کرنا پڑا۔ جس کی بعض حلقوں کی طرف سے ابھی تک بڑے زور و شور کے ساتھ مخالفت ہو رہی ہے۔

قانون مزارعین کے متعلق زمیندار طبقہ سے ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا۔ حالانکہ زمینداروں کو جس صورت سے ممکن ہو گورنمنٹ سے معاملہ کر لینا چاہئے۔ کیونکہ جب تک کاشتکار انکی طرف سے مطمئن نہ ہو جائیںگے انکے لئے خطرہ ہی موجود رہیگا۔ ہندو مسلمانوں کے فسادات دبانے میں بھی کانگریسی گورنمنٹ کو ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی۔ اس بارہ میں اس کی نرم پالیسی کمزوری پر محمول کیجاتی ہے اور مخالفین کانگریس موجودہ وزارتوں کو مرعوب اور بدنام کرنے میں لگے ہوئے ہیں ہم کو تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ جب تک صوبوں کے لیڈران مسلم لیگ کے گورنمنٹ سے ذاتی اختلافات دور نہ ہونگے اسوقت تک باہمی تعلقات میں یہی کشیدگی باقی رہے گی۔ قانونی اسمبلی میں جب کبھی ان فسادات پر مباحثہ ہوتا ہے تو یہی واضح ہوتا ہے کہ اگر کانگریس مسلم لیگ کے لیڈران کو وزارت میں شامل کر لیتی تو اسقدر شور و شر کی شاید نوبت نہ آتی۔

کانگریس میں پھوٹ پڑ گئی ہے۔ سوبھاش بابو نے پرانے لیڈروں کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا ہے جس سے ... [illegible]

زمانہ بک ایجنسی کی قابل دید بیمثل کتابیں

صحیفۂ چین:۔ از اسد علی انوری فریدآبادی۔ اسمیں چین کی قدیم و جدید تاریخ پر نہایت محققانہ نظر ڈالی گئی ہے اور ثابت کیا گیا ہے کہ پرانے زمانہ میں مذہبی۔ اخلاقی اور اجتماعی علوم کا معیار کسقدر بلند تھا۔ تین ضمیمے بھی شامل کئے گئے ہیں جو چین کے جنوری ۱۹۳۲ء تک کے حالات سے بحث کرتے ہیں۔ کتابت وطباعت عمدہ اور کاغذ چکنا۔ خوبصورت جلد اور ڈسٹ کور۔ قیمت عہ

مضامین رشید:۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی، مسلم یونیورسٹی علی گڈھ، اُردو کے چند منتخب لکھنے والوں میں ہیں۔ خصوصاً ان کی مزاحیہ نگاری ملک ہر طبقے میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کرچکی ہے۔ آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ اُن کے مزاحیہ مضامین کا ایک مجموعہ مکتبۂ جامعہ نے شائع کیا ہے۔ یہ مضامین کیا ہیں دریائے لطافت سے سینچی ہوئی کشتِ زعفران۔ تروتازہ شاداب اور فرحت بخش لکھائی، چھپائی، کاغذ سب عمدہ۔ قیمت مجلد عہ

شعلۂ طور (طبع ثانی) حضرت جگر مرادآبادی کا مکمل دیوان جس کا پہلا ایڈیشن نئی ترتیب اور بہت کچھ تازہ کلام کے اضافہ کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ قیمت میں بھی کمی کردی گئی ہے یعنی تین روپیہ کے بجائے عہ

روٹھی رانی:۔ منشی پریم چند مرحوم کا ایک سبق آموز افسانہ ہے۔ قیمت صرف ۶ر

معاہدۂ عمرانی:۔ از ژان ژاک روسو۔ مترجمہ ڈاکٹر محمود حسین خاں صاحب بی۔ اے (جامعہ) ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی (ہائیڈل برگ)۔ حریت، اخوت اور مساوات جس کا روحانی پیام دنیا کو اسلام نے پہنچایا تھا۔ اس کی سیاسی تبلیغ یورپ میں روسو کے معاہدۂ عمرانی نے کی۔ روسو کا کمال یہ ہے کہ اُس نے سیاستِ مدن کے دقیق مسائل باتوں باتوں میں سمجھا دئیے ہیں۔ اُسکی یہ کتاب جو معنوی حیثیت سے فلسفۂ سیاست کی اہم کتاب ہے۔ زبان اور طرز بیان کے لحاظ سے سب سے سہل ہے۔ قیمت مجلد عہ

بنی اسرائیل کا چاند:۔ مصنفہ رائیڈر ہیگرڈ۔ مترجمہ، عبدالمجید حیرت بی۔ اے علیگ، فرعون کا دورِ حکومت۔ شاہزادہ سیٹی ولیعہد سلطنت کی انصاف عدل کے لئے معزولی۔ عبرانیوں پر مظالم۔ ایک عبرانی لڑکی میراپی کے حیرت انگیز کارنامے۔ مصر پر خدا کے بنی اسرائیل کی طرف سے پے در پے مختلف قسم کی وبائیں۔ بنی اسرائیل کی آزادی۔ فرعون کی معہ لشکر غرقابی۔ سیٹی و میراپی کے تعلقات کی دلگداز داستان قیمت عہ

سلومی:۔ آسکر وائلڈ کے مشہور ڈراما "سالومی" کا ترجمہ ہے۔ جس کو جناب مجنوں نے نہایت محنت سے اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔ قیمت صرف ۸ر

ملنے کا پتہ:۔ زمانہ بک ایجنسی کانپور

محمد بہادر شاہ ظفر۔ خاتم السلاطین مرزا سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر کے سوانح حیات اور اُن کی شاعری پر سیر حاصل تبصرہ۔ از منشی محمد امیر احمد علوی بی۔ اے۔ اس کتاب میں غدر ۱۸۵۷ء کے حالات بھی درج ہیں۔ جس سے کتاب کی اہمیت اور بھی زیادہ ہوگئی ہے قیمت عہ

کمال داغ:۔ حضرت داغ دہلوی کے تمام دیوانوں کا انتخاب مع مقدمہ تنقیدی، مرتبہ مولانا حامد حسین صاحب قادری۔ اُردو غزل گوئی پر جدید زاویہ نگاہ سے تنقید کرکے تغزل کے جدید و قدیم محاسن و معائب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کتاب میں داغ مرحوم کے دیوان گلزار داغ۔ آفتاب داغ۔ مہتاب داغ اور یادگار داغ کا بہترین انتخاب ہے۔ قیمت فی جلد عہ

نقش و نگار:۔ شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی کی کیف آور نظموں کا دوسرا مجموعہ ہے نہایت خوبصورت جلد اور ڈسٹ کور۔ قیمت صرف ۶؍

فکر و نشاط:۔ حضرت جوش کی نظموں کا تیسرا مجموعہ، جو حال ہی میں جامعہ ملیہ کے اہتمام سے شائع ہوا ہے لکھائی چھپائی عمدہ۔ غیر مطبوعہ نظمیں۔ قیمت مجلد عہ

اثرستان:۔ ملک کے مشہور سخن سنج مرزا جعفر علیخان اثر لکھنوی کا دیوان جسکا ہر مصرع تیر و نشتر ہے۔ عہ

اُردو مضمون نویسی۔ مضمون لکھنے کے متعلق پروفیسر نانک پرشاد بی۔ اے مرحوم کی نہایت عمدہ کتاب ہے۔ جس سے بہت جلد مضمون لکھنے کی قابلیت پیدا ہوجاتی ہے اور ہر مضمون کا موضوع آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے قیمت ۸؍

نقش و نگار:۔ مسٹر جلیل قدوائی کی دلآویز و پرلطف نظموں کا مجموعہ، جو ملک کے بڑے بڑے نقادوں سے خراج تحسین حاصل کرچکا ہے۔ قیمت عہ

خیالات عزیز:۔ مجموعہ مضامین مولوی عزیز احمد، جن کی باضابطہ رجسٹری کی گئی ہے۔ حجم ڈھائی سو صفحات، ٹائیٹل خوشنما رنگین۔ لکھائی چھپائی اعلیٰ مع تصویر مصنف قیمت فی کتاب مجلد عہ، غیر مجلد عہ

ہندو تیوہاروں کی اصلیت:۔ اس کتاب میں منشی رام پرشاد صاحب بی۔ اے ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول نے ہندو تیوہاروں کی اصلیت اور اُن کی جغرافیائی کیفیت نہایت واضح اور آسان زبان میں لکھی ہے۔ اس کیساتھ ہی ہندوؤں کا اخلاقی و تمدنی نظام اور ہندو تیوہاروں کی ضرورت پر اظہار خیال کیا ہے اُردو ایڈیشن کی قیمت ۹؍ - اور ہندی ایڈیشن کی قیمت جسمیں اُردو کے مقابلہ زیادہ تفصیل دیگئی ہے عہ

رامائن مسدس:۔ مصنفہ جناب منشی رامجی لال کپور۔ مصنف نے سری رامچندر جی کے چرتر کو عجیب مرغوب انداز میں بیان کیا ہے۔ ہر شعر چلتا ہوا جادو ہے۔ لطف محاکات و بلند پروازیٔ تخیل قابل تحسین ہے۔ قیمت مجلد با لتصویر ۶؍ مجلد بلا تصویر عہ غیر مجلد بلا تصویر عہ

طریق دولتمندی:۔ دولت کی چاہ سب کو ہے لیکن دولت کمانے کے طریقوں سے بہت سے لوگ ناواقف ہیں۔ اس کتاب میں دولت حاصل کرنیکے طریقے نہایت خوبی سے بتائے گئے ہیں۔ قیمت صرف ۸؍

ملنے کا پتہ:۔ **زمانہ بک ایجنسی۔ کانپور**

دیوان غالب جرمنی

دیوان مکمل ہے جسمیں مرزا کا خود نوشتہ مقدمہ، غزلیات قصائد اور رباعیات ہیں۔ آخر میں بیاض کے لئے نفیس حاشیہ دار سادہ اوراق بھی شامل ہیں۔ جلد کا رنگ سیاہ، سبز، سرخ، نیلا۔ سائز ۴ء×۵۔ خوبصورت ملائم جلد اُس پر سنہری دلفریب نقش ونگار اور سب سے زیادہ مرزا غالب کی لاثانی عکسی تصویر، جرمن ہنرمندی اور کمال طباعت کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ دیوان ایک خوبصورت سرخ کیس میں فروخت ہوتا ہے اور اب اسکی تخفیف قیمت کے بعد بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ یہ دیوان اُردو کی خوبصورت کتابوں میں سب سے سستی کتاب ہے اب تک اس کے سیکڑوں ایڈیشن طبع ہوئے اور ہو رہے ہیں۔ لیکن اس ایڈیشن کی جو شہرت اب سے دس سال قبل تھی وہی اب ہے۔ قیمت قسم اول عہ۔ دوم ۸ سوم بلا جلد عہ

انتخاب حسرت:۔ مولانا حسرت موہانی کے دس دیوانوں کا سیر حاصل انتخاب اور اُس پر حضرت جلیل کے قلم کا لکھا ہوا فاضلانہ مقدمہ۔ قیمت فی جلد عہ

خیالات مہاتما گاندھی:۔ یہ وہ لاجواب کتاب ہے جسمیں مسٹر سی۔ ایف اینڈریوز نے مہاتما گاندھی کے مذہبی سماجی اور سیاسی خیالات شرح و بسط کے ساتھ درج کرکے دُنیا پر احسان عظیم کیا ہے۔ قیمت حصہ اول عہ، دوم عہ

فلسفۂ جنگ۔ ایک مشہور و معروف روسی تصنیف کے تحت میں فلسفۂ جنگ پر عالمانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ ۱۲ہ

سیر گل:۔ یعنی مسٹر جلیل قدوائی کے مختصر افسانوں کا مجموعہ۔ وہ کتاب جس نے مصنف کو دور حاضر کے اہل قلم کی صف اول میں جگہ دلائی ہے۔ آج روسی افسانوں کو عموماً اور چیخوف کی کہانیوں کو خصوصاً اُردو ادب میں ایک عام شہرت حاصل ہے۔ اُنکے اولیں پیش کرنے والے کی تحریر کا اعجاز دیکھنا ہو، تو سیر گل ملاحظہ فرمایئے۔ قیمت صرف عہ

مرقع ادب:۔ حصہ اول و دوم۔ مرتبہ جناب مقدر مرزا پوری۔ اسمیں ہندوستان کے مشہور انشا پردازوں و شعرا کے وہ خطوط جمع کئے گئے ہیں، جو انھوں نے اپنے احباب وغیرہ کو لکھے ہیں۔ قیمت حصہ اول عہ، دوم ۸

بہار سخن:۔ پانسو چھیاسٹھ ہندو شعراء ماضی و حال کا نفیس تذکرہ ہے جسمیں ۵۶۶ شعراء کے حالات انتخاب کلام بترتیب حروف تہجی درج کئے گئے ہیں۔ قیمت عہ

حدیث حسن:۔ جواں سال ادیب حضرت شمیم احمد فطرت کی دلکش و دلآویز نظموں کا مجموعہ ہے۔ کلام پڑھنے سے طبیعت میں شگفتگی پیدا ہوتی ہے قیمت عہ

دُنیائے راز:۔ مولانا ابوالفاضل راز چاندپوری کی قدیم و جدید طرز کی دلکش نظموں کا مجموعہ۔ ہر نظم بلحاظ موضوع مکمل و نتیجہ خیز ہے مع تصویر مصنف۔ قیمت ۱ر

اسرار رنگون:۔ مسٹر داؤد کا ایک نہایت دلچسپ اور نتیجہ خیز ناول ہے۔ ہر بات کو اصلی سطح پر لاکر پیش کیا گیا ہے۔ بڑی حد تک یہ ناول سچے واقعات سے مرتب ہے۔ حجم ۱۰۷ صفحات۔ قیمت عہ

ملنے کا پتہ:۔ زمانہ بک ایجنسی کانپور

نئی کتابیں

گئودان :- از منشی پریم چند مرحوم۔ [illegible] ناول پہلی بار ہندی سے اُردو میں منتقل ہوا ہے اور دیہات کے اَن پڑھ اور سادہ لوح انسانوں کی زندگی کا صحیح مُرقع ہے۔ قیمت مجلد عہ

محکومیتِ نسواں :- از معین الدین صاحب انصاری بی۔اے (کنٹب) بار ایٹ لا۔ یہ مِل کی معرکتہ آرا تصنیف کا اُردو ترجمہ ہے۔ جسمیں عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق دیئے جانے کی پُر زور طریقے پر حمایت کی گئی ہے۔ قیمت مجلد عہ

خیالستان :- از سید سجاد حیدر صاحب یلدرم بی۔اے۔ یہ پہلی کتاب ہے جس کی اشاعت نے اُردو ادب میں ایک نہایت دلکش انداز پیدا کر دیا ہے اور جس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ اب تک نویں بار چھپ چکی ہے۔ قیمت مجلد عہ

دُنیا کی کہانی :- از پروفیسر محمد مجیب صاحب بی۔اے (آکسن)، جس میں ہزاروں برس کی تاریخ اسقدر دلچسپ اور نرالے انداز سے لکھی گئی ہے کہ پڑھنے والا آسانی سے تاریخ کا اصل مفہوم سمجھ جاتا ہے۔ قیمت غیر مجلد عہ

رحمۃ للعالمین حصہ اول :- از الحاج مولانا محمد سلیمان صاحب مرحوم، یہ سیرت پاکؐ پر مستند اور مقبول ترین تصنیف ہے جو ہم نے خاص اہتمام سے حال ہی میں پانچویں بار شائع کی ہے قیمت مجلد دو روپیہ (عہ)

مکتبہ جامعہ

دہلی۔ نئی دہلی۔ لاہور۔ لکھنؤ۔ بمبئی

منشی دیانرائن نگم ایڈیٹر و پبلشر
خواجہ عبدالوحید پرنٹر انتظامی پریس کانپور

The ZAMANA, August 1939 — Regd. No. A211

زمانہ

مرتبہ: دیا نراین نگم بی۔ اے۔

جلد ۷۳	اگست ۱۹۳۹ء	نمبر ۲

فہرست

تصویر: شام کا سناٹا (رنگین)

قیمت سالانہ پانچ روپیہ

زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا

نمونہ: سات آنے

متھوشیلا سے بھی قدیم تر

انجیل میں ہے کہ متھوشیلا ۹۶۹ سال کی غیر معمولی مدت تک زندہ رہے۔ بعضوں کا گمان ہے کہ اس بوڑھے انسان کی عمر صرف ۷۲۰ سال تھی۔ تاہم موخرالذکر عمر بھی کافی طویل ہے۔ کوئی دوسرا آدمی تو اتنی طویل مدت تک زندہ نہیں رہا۔ اگرچہ خود انسان کے ہاتھوں کی بنائی ہوئی ایسی چیزیں موجود ہیں جو عمر میں متھوشیلا سے بھی زیادہ بوڑھی ہیں۔ مثلاً مصر کے مینار۔

مگر بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو باعتبار عمر متھوشیلا اور مصر کے مینار سے بھی زیادہ بڑی ہیں۔ یہ انسانوں کی بیماریاں اور عوارض ہیں۔ ان بیماریوں اور عوارض میں سب سے زیادہ پرانی اور مضبوط ملیریا ہے۔ جس کا ذکر حضرت عیسیٰ سے ایک ہزار سال پہلے آرفیس کی نظموں میں کیا گیا ہے۔ بقراط "بانی علم طب" اور مشہور ماہر طب گیلین نے اس تباہ کار عارضہ کی توضیح و تفصیل پیش کی ہے۔ اس مہلک عارضہ نے یونان پر تباہیاں لائیں اور رومانوی فلاح و بہبود کے زوال کا باعث ہوا۔

حکومت روما صدیوں ملیریا کے استیصال کے سلسلہ میں کوشاں رہی۔ اگرچہ رومی اس مرض مہلک کے اسباب کی تحقیق میں کامیاب نہ ہو سکے۔ تاہم روم کے نواح سے دلدلوں کو دور کرنے اور آبپاشی کے باقاعدہ انتظام کرنے میں وہ صحیح راستے پر تھے۔ رومیوں کی اس جدوجہد کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے علاقے قابل رہائش ہو گئے۔ یہ علاقے از منہ وسطیٰ میں جب کھنڈرات سے بدل گئے اور لوگ مہلک قسم کے بخاروں کا شکار ہونے لگے تو پھر اُن کو خیرباد کہنا پڑا۔

بعد کو ایک اطالوی عالم طب لانسی نے خیال ظاہر کیا کہ یہ عارضہ مچھروں کی وجہ سے ہوتا ہے لیکن یہ نظریہ اسوقت تسلیم نہیں کیا گیا۔ تاہم لانسی کا خیال درست تھا جیسا کہ ۱۸۸۰ء میں لاورن اور ۱۸۹۷ء میں راس کی تحقیقوں نے ثابت کر دیا ہے۔

اگرچہ ملیریا کے اسباب و علل حال تک نامعلوم رہے۔ اس بیماری کا علاج ۱۶۴۰ء میں تحقیق ہو چکا تھا۔ اس عہد میں جب اس علاج کی تحقیق ہوئی ہے، سنکونہ کی چھال استعمال کیجاتی تھی۔ اس چھال سے بخار کے عوارض جڑ سے فنا ہو جاتے ہیں۔ آج تین سو سال کے بعد اس چھال کا جزو اصلی "کونین" ملیریا کو دور کرنے اور روکنے میں استعمال کیا جاتا ہے۔

مجلس بین الاقوام کی ملیریا کمیشن نے اس بیماری (ملیریا) کی روک تھام کے لئے سفارش کی ہے کہ بخار کے تمام موسم کے دوران میں ہر روز کونین کی ۶ گرین استعمال کی جائے۔ اگر ملیریا کا حملہ ہو جائے تو ۱۵ سے ۲۰ گرین کونین کی خوراک ۵ سے ۷ دن تک یومیہ استعمال کرنی چاہیئے۔ کسی اور مزید علاج کی کوئی ضرورت نہیں۔ البتہ ملیریا کا دورہ شروع ہو جائے تو پہلے کی طرح علاج جاری رکھنا چاہیئے۔

زمانہ بک ایجنسی کی قابل دید بے مثل کتابیں

مضامین رشید:- پروفیسر رشید احمد صدیقی مسلم یونیورسٹی علیگڈھ، اردو کے چند منتخب لکھنے والوں میں ہیں خصوصاً انکی مزاحیہ نگاری ملک کے ہر طبقے میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کر چکی ہے۔ آپکو یہ سنکر خوشی ہوگی کہ انکے مزاحیہ مضامین کا ایک مجموعہ مکتبۂ جامعہ نے شائع کیا ہے۔ یہ مضامین کیا ہیں دریائے لطافت سے سینچی ہوئی کشت زعفران، تروتازہ شاداب اور فرحت بخش۔ لکھائی چھپائی، کاغذ عمدہ اور خوبصورت جلد قیمت مجلد عہ

صحیفۂ چین:- از اسد علی انوری، فرید آبادی۔ اس میں چین کی قدیم و جدید تاریخ پر نہایت محققانہ نظر ڈالی گئی ہے اور ثابت کیا گیا ہے کہ پرانے زمانہ میں مذہبی اخلاقی اور اجتماعی علوم کا معیار کسقدر بلند تھا تین ضمیمے بھی شامل کئے گئے ہیں جو چین کے جنوری ۳۷ء تک کی حالات سے بحث کرتے ہیں۔ کتابت و طباعت نہایت عمدہ اور کاغذ چکنا خوبصورت جلد اور ڈسٹ کور قیمت عہ

شعلۂ طور (طبع ثانی):- حضرت جگر مراد آبادی کا مکمل دیوان، جس کا پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوگیا۔ اور اب دوسرا ایڈیشن نئی ترتیب اور بہت کچھ تازہ کلام کے اضافہ کیساتھ شائع ہوا ہے۔ قیمت میں بھی کمی کر دی گئی ہے۔ یعنی ستے روپیہ کے بجائے ۶ؔ

بزم احباب:- اخلاقی کہانیوں کا نایاب گنجینہ قیمت ۸ؔ

بنی اسرائیل کا چاند:- مصنفہ رائڈر ہیگرڈ، مترجمہ عبدالمجید حیرت بی۔ اے (علیگ)۔ فرعون کا دورِ حکومت، شاہزادہ سیتی ولیعہد سلطنت کی انصاف و عدل کیلئے معزولی۔ عبرانیوں پر مظالم۔ ایک عبرانی لڑکی میراپی کے حیرت انگیز کارنامے۔ منفرپرخدائے بنی اسرائیل کی طرف سے پے درپے مختلف قسم کی وبائیں بنی اسرائیل کی آزادی، فرعون کی مع لشکر غرقابی سیتی و میراپی کے تعلقات کی دلگداز داستان۔ قیمت مجلد عہ

معاہدۂ عمرانی:- از ژان ژاک روسو۔ مترجمہ ڈاکٹر محمود حسین خانصاحب بی۔ اے (جامعہ) ایم۔ اے، پی ایچ۔ ڈی (ہائیڈ برگ) حریت، اخوت اور مساوات جس کا روحانی پیام دنیا کو اسلام نے پہونچایا تھا۔ اسکی سیاسی تبلیغ یوروپ میں روسو کے معاہدۂ عمرانی نے کی۔ روسو کا کمال یہ ہے کہ اس نے سیاست مدن کے دقیق مسائل باتوں باتوں میں سمجھادیے ہیں۔ اسکی یہ کتاب جو معنوی حیثیت سے فلسفہ سیاست کی اہم کتاب ہے۔ زبان اور طرز بیان کے لحاظ سے سب سے سہل ہے۔ قیمت مجلد عہ

سلومی:- آسکر وائلڈ کے مشہور ڈراما "سالومی" کا ترجمہ ہے۔ جس کو جناب مجنوں گورکھپوری نے نہایت محنت سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ قیمت ۸ؔ

ملنے کا پتہ:- زمانہ بک ایجنسی۔ کانپور

انتخاب حسرت:۔ مولانا حسرت موہانی کے دس دیوانوں کا سیر حاصل انتخاب اور اس پر حضرت جلیل قدوائی کے قلم کا لکھا ہوا فاضلانہ مقدمہ۔ قیمت عہ

حدیث حسن:۔ جواں سال ادیب حضرت شمیم احمد فطرت کی دلکش و دلاویز نظموں کا مجموعہ ہے۔ کلام پڑھنے سے طبیعت میں شگفتگی پیدا ہوتی ہے قیمت عہ

طریق دولتمندی:۔ دولت کی چاہ سب کو ہے لیکن دولت کمانے کے طریقوں سے بہت سے لوگ ناواقف ہیں۔ اس کتاب میں دولت کمانے کے طریقے نہایت خوبی سے بتائے گئے ہیں۔ ہر شخص کے لئے قابل خرید ہے۔ قیمت صرف ۸ر

ترجمہ رامائن منظوم:۔ بال کانڈ کے اصلی دوہے اور چوپائیاں، ہندی کا ترجمہ اردو اشعار میں۔ مترجمہ منشی سورج پرشاد تصور۔ قیمت عہ

خیالات مہاتما گاندھی:۔ یہ وہ لاجواب کتاب ہے جسمیں سٹرسی۔ ایف اینڈریوز نے مہاتما گاندھی کے مذہبی، سماجی اور سیاسی خیالات شرح و بسط کے ساتھ درج کرکے دنیا پر احسان عظیم کیا ہے قیمت حصہ اول ۱۲ر۔ دوم ۱۲ر

دنیائے راز:۔ مولانا ابوالفاضل راز چاندپوری کی قدیم و جدید طرز کی دلکش نظموں کا مجموعہ ہے۔ ہر نظم بلحاظ موضوع مکمل و نتیجہ خیز ہے مع تصویر مصنف۔ قیمت ۱۰ر

نقش و نگار:۔ مسٹر جلیل قدوائی کی دلآویز اور پر لطف نظموں کا مجموعہ، جو ملک کے بڑے بڑے نقادوں سے خراج تحسین حاصل کر چکا ہے۔ قیمت صرف عہ ر

ملنے کا پتہ:۔ **زمانہ بک ایجنسی کانپور**

اُردو کی دو زندہ جاوید کتابیں

۱۔ انار کلی

سید امتیاز علی صاحب تاج بی۔ اے کا دہ معرکۃ الآرا المیہ تاریخی ڈرامہ جس کے محاسن کی بنا پر:۔

۱۔ گورنمنٹ پنجاب نے مصنف کو ادبیات کا بیش بہا انعام دیا۔
۲۔ اردو کے طالب علم جاپانیوں نے جاپان میں اسٹیج کیا۔
۳۔ اخبارات و رسائل اور ریڈیو پر اتنے مضامین نکلے، جو موجودہ عہد کی کسی کتاب پر نہیں نکلے۔
۴۔ نقادوں، ڈرامہ نگاروں اور تھیٹر ڈائرکٹروں نے مصنف کو ڈرامے کے ایک عہد نو کا بانی قرار دیا۔
۵۔ مرزا محمد سعید ایم۔ اے دہلوی تحریر فرماتے ہیں:۔ "انار کلی کی اشاعت ایک تاریخی اہمیت رکھتی ہے۔"
۶۔ سید سجاد حیدر یلدرم بی۔ اے:۔ "ایک کتاب ہے جس سے آنکھوں میں نور، دل میں ہمدردی عاشق مہجور پیدا ہوتی ہے۔"
۷۔ اے۔ ایس بخاری ایم۔ اے (کینٹب) ڈپٹی کنٹرولر براڈ کاسٹنگ اسٹیشن دہلی:۔ "انار کلی اردو ڈراما کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔"
۸۔ منشی پریم چند مرحوم:۔ "مجھے جتنی کشش انار کلی میں ہوئی، اور کسی ڈرامے میں نہیں ہوئی۔"
۹۔ عنایت اللہ خاں صاحب مہتمم تالیف و ترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد:۔ "یہ ان کتابوں میں سے ہے اور ایسی کتابیں شاذ و نادر ہیں، جنکو دیکھکر، پڑھکر اور اپنے پاس رکھ کر ہمیشہ دل خوش ہوتا ہے۔ اور اس کو ایک مرتبہ نہیں، بلکہ کئی مرتبہ پڑھنے کو دل چاہتا ہے۔"

ہر عمر اور ہر مذاق کا شخص اسے پڑھتا اور بے اختیار سر دھنتا ہے۔ کتابت، طباعت اور کاغذ نہایت اعلٰے آرٹ کی رنگین تصاویر اور تزئینی نقش۔ تیسرا ایڈیشن قریب الختم۔ قیمت فی جلد ۱۲ر
پر تکلیف ایڈیشن، دستخط شدہ مصنف ۵؍

۲۔ چچا چھکن

سید امتیاز علی صاحب تاج کے ظرافت نگار قلم کا وہ کامیاب کردار:۔

۱۔ جس کے نام سے تعلیم یافتہ ہندوستان کا بچہ بچہ واقف ہے۔
۲۔ جس کی کامیابی سے متاثر ہو کر اکثر ادیب اسی موضوع پر خامہ فرسائی کر رہے ہیں۔
۳۔ جس کے متعلق ایک ادبی یا علمی مضمون شائع کر دینا اکثر ادبی رسائل کے نزدیک انکے خاص نمبروں کی کامیابی کا ضامن ہے۔

شستہ ظرافت جسے پڑھ کر بچے، بوڑھے، عورت، مرد لڑکے لڑکیاں سب قہقہے لگا سکتی ہیں۔ قیمت ۱۲ر

ملنے کا پتہ:۔ **دار الاشاعت پنجاب لاہور**

ہندوستان کے ایک مشہور معالج کی ایجاد!
دُنیا کے اندر ایک
حیرت انگیز جدّت
بحرِ حکمت کا ایک موتی
کرن جوانی
عورت و مرد اس سے مستفید ہو سکتے ہیں
کرن جوانی کیا ہے؟
یہ قدیم آیورویدک سائنس کے اصولوں پر تیار کی ہوئی ایک اکسیر ہے جسے ہندوستان کے مشہور معالج پنڈت ٹھاکر دت شرما وید نے کھوج نکالا ہے۔ انھوں نے اِس اصول طاقت کا خود اپنی پریکٹس میں استعمال کیا ہے یہ ایک ایسی رسائن ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ روحِ حیات گولیوں میں بھر دی گئی ہے۔
تعریفی خط
میں نے کرن جوانی کی دو شیشیاں منگوا کر ان کا استعمال کیا ہے۔ سچ مچ یہ ایک نہایت مفید سب سے عمدہ دوا ہے +
(میاں دلدار حسین قریشی)
برٹش ملٹری ہسپتال راولپنڈی۔
کرن جوانی سے کیا کیا فائدے ہیں؟
اسمیں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ تمام بدن کے غدود کو قدرتی طور پر مضبوط بنا کر سارے جسم میں طاقت بھر دیتی ہے اور عہدِ شباب کی طاقت اور جوش کو پھر سے تازہ کر کے سارے جسم کو نئے سرے سے ڈھالتی ہے۔ اسکی ایک یہ برکت ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے جانداروں کے غدود یا اُن کے سیرم کو کھانا نہیں پڑتا۔ یہ جسم کے اندر طاقت، روح، بیرج اور رد لوح پیدا کرتی ہے۔ اس کا اثر غیر قدرتی نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ قدرتی ڈھنگ سے اپنا عمل دکھاتی ہے۔ جس سے جوانی ایک لمبی مدت تک قائم رہتی ہے۔ اور بڑھاپے میں بھی آدمی بھلا چنگا جوان نظر آتا ہے۔ قیمت ۱۰۰ گولی چار روپے۔ ۲۴ گولی ایک روپیہ
تجدیدِ شباب
نئی طاقت
کرن جوانی
امرت دھارا فارمیسی لاہور

جلد ۷۳ اگست ۱۹۳۹ء نمبر ۲

ہندوستان اور بین القومی شاعر

(از مسٹر توکل حسین ڈبیاوی، بی اے)

دنیا کہتی ہے کہ حضرت اقبال کا انتقال ہوگیا، لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان گنت لوگوں کا مجمع ہے۔ حضرت اقبال کرسیِ صدارت پر رونق افروز ہیں اور میں ایک حقیر مقرر کی حیثیت سے اُن کے پاس ہی کھڑا ہوا مجمع سے مخاطب ہو کر جب کچھ رقت آمیز اور جوشیلے انداز میں حضرت اقبال کا یہ شعر ؎

"مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا"

پڑھتا ہوں تو سارا مجمع بیتاب ہو جاتا ہے، اور یکایک لوگوں کی ایک کثیر تعداد "ہندو مسلم اتحاد زندہ باد" کے نعرے لگاتی ہوئی میری طرف بڑھتی ہے اور میں مجمع کو بمشکل خاموش کر رہا ہوں۔

واقعی اس زندہ جاوید شاعر کے کلام کا ایسا ہی اعجاز ہے اور جب تک ان کی شاعری اس رنگ میں رنگی رہی، ہندوستان کا ہر باشندہ اپنے قومی، مذہبی اور تمدنی اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر شاعر کی آواز پر لبیک کہتا رہا۔ لیکن جہاں اس انداز بیان نے کروٹ بدلی اور شاعر نے اپنی عنانِ خیال کو کسی اور طرف موڑا، اکثریت کے اعتبار سے طبقۂ حاوی کے ایک ذمہ دار فرد نے فوراً ہی اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی، اور شاعر کی آواز کو قوم و وطن کے لئے قاتل سمجھا فرد مذکور کا اعتراض حقیقت سے قریب تر ہے۔ بہ حیثیت مسلمان مجھے اعتراف ہے کہ اقبال نے

مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کی بے انتہا کوشش کی اور ان سے اپنی ہستی پہچاننے اور اپنی گذشتہ عظمت یاد کرنے کی کچھ اس طرح تلقین کی ہے کہ اگر مسلمان اقبال کی دردبھری آواز سُنکر ہاتھ میں تیغ لے لیں اور سر سے کفن باندھ لیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں لیکن جیساکہ پنجاب کے ایک اہل الرائے نقاد نے لکھا ہے یہ بات بہت ہی افسوسناک ہے کہ وہ شاعر باکمال جسکے دماغ کی تراوش "میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے" کی ولولہ انگیز نظم کی ولادت گاہ ہے وہ نئے شوالہ کی تعمیر کا پجاری تھا، جس کو "حبّ وطن" کی سرشاری نے یہ کہنے پر مجبور کیا تھا "خاکِ وطن کا مجھکو ہر ذرہ دیوتا ہے" جو ترانۂ ہندی کے مصنف کی حیثیت سے پورے جوشِ عقیدت کے ساتھ کہتا تھا کہ

"مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا　　ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا"

وہ فیلسوف شاعر جو فرقہ بندی اور ہندو مسلم خانہ جنگی کے خلاف اور ہندو مسلم اتحاد کے حق میں یوں گوہر فشانی کرچکا ہے

دانہ کرنا فرقہ بندی کے لئے اپنی زباں　　چھُپ کے ہے بیٹھا ہوا ہنگامۂ محشر یہاں

پُرونا ایک ہی تسبیح میں ان بکھرے دانوں کو　　جو مشکل ہے تو اس مشکل کو آساں کرکے چھوڑونگا

وہی شاعر اور وہی وطن کا پجاری بعد میں وطن اور مذہب کے درمیان تضاد اغراض اور تصادم مفاد دیکھنے لگا اور وطن پرستی کے جن جذبات کا اظہار "ہمالہ" "نیا شوالہ" "ترانۂ ہندی" "قومی گیت" اور "تصویرِ درد" جیسی مشہور اور روح پرور نظموں میں کرچکا تھا، قدم قدم پر اُن کی تردید کرنا ضرور سمجھنے لگا۔

نرالا سارے جہاں سے اسکو عرب کے معمار نے بنایا　　بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

چین و عرب ہمارا، ہندوستاں ہمارا　　مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے　　جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

میں مذہب اسلام کی تعلیم پر پُورا عبور نہیں رکھتا ورنہ علامہ اقبال کے اس خیال کی بالتفصیل تردید کرنے کی کوشش کرتا جس کی رو سے اُنھوں نے مذہب کے درمیان تضاد و اعراض ثابت کرنیکی کوشش کی ہے لیکن اتنا میں ضرور جانتا ہوں کہ قرآن شریف میں حب وطن کو جزو ایمان قرار دیا گیا ہے۔ پھر حضرت اقبال وطن کے پیرہن کو مذہب کا کفن کیوں بیان کرتے ہیں؛ اپنے مذہب

کے ساتھ محبت کا اظہار کرنا کوئی غیر فطری بات نہیں ہے۔ اپنے مذہب کے بانی کی جائے ولادت کو قابلِ احترام سمجھنا بھی بالکل درست اور بجا ہے لیکن ان باتوں سے یہ لازم نہیں آتا کہ جذبۂ وطنیت کی تضحیک کی جائے۔ اور اپنے وطن کو وطن سمجھنا اور اس کے متعلق اپنے ضروری فرائض کا تسلیم کرنا ایسی بات شمار کی جائے جو بنائے حصارِ ملّت کو کمزور کرتی ہو۔ یہ بات سخت افسوسناک ہے کہ ہندو اور مسلم دونوں میں ایسے اصحاب موجود ہیں جو دیدہ و دانستہ یا نادانستہ طور پر ہندو مسلم اتحاد کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کر رہے ہیں۔ اور اس سے بھی زیادہ یہ بات افسوسناک ہے کہ ان لوگوں کی عوام کی نگاہوں میں خاص قدر و منزلت ہو رہی ہے۔ تعصب نے دونوں کی آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہے یا یہ سمجھئے کہ مذہبی جنون نے انھیں قومی و ملکی مفاد کو ٹھکرا دینے پر مجبور کر دیا ہے۔ جب تک دونوں طرف اس قسم کے لوگ موجود ہیں نہ ہندو مسلم اتحاد ہی ہو سکتا ہے اور نہ وطنی آزادی خیال کی حدود سے آگے بڑھ سکتی ہے۔

میں نہیں کہتا کہ اپنے مذہب، فرقے، اور قوم کے لئے ترقی کی کوشش نہ کی جائے لیکن اس کے ساتھ ہی ملکی مفاد کے خیال سے اپنے وطن کو غلامی سے آزاد کرنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ رواداری برتی جائے اور دوسروں کے دلوں میں گھر کیا جائے۔

ان خیالات کے اقتباس سے میرا یہ ہرگز مطلب نہیں ہے کہ میں جذبۂ اسلامی کی بجائے ہندوستانی مسلمانوں کے دلوں میں کوئی دوسرا جذبہ دیکھنا چاہتا ہوں، بلکہ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ حقیقی مسلمان ہوتے ہوئے ہم حق و صداقت کے لئے اپنی آواز بلند کریں۔ کیونکہ مذہبی اختلافات ہوتے ہوئے بھی ہم غلامی، فلاکت، پستی، اور افلاس کی زنجیریں توڑنے کے لئے متحدہ کوشش کر سکتے ہیں۔

شاعر کی آواز وقت کی آواز ہوتی ہے اور میرے نزدیک وہ شاعری مستحسن نہیں جس میں بنی نوع انسان کی تکالیف کا احساس نہ ہو۔ میری رائے میں سچی شاعری کو قوم و فرقہ کے ادنے تعصبات سے بالاتر ہونا چاہیئے۔ شاعر کی حیثیت ملکی بلکہ بین الاقوامی ہونا چاہیئے۔ اس کا ہر لفظ عالمگیر پیغام ہونا چاہیئے، تاکہ دنیا بھر میں جہاں کہیں اس کی آواز سنائی دے لوگوں کو لبیک ہی کہتے بن پڑے۔ اپنی قوم کو ترقی دینے کا مسئلہ بھی یقیناً پس پشت ڈالنے والی چیز نہیں ہے، حقیقی شاعر کے فرائض میں یہ بھی داخل ہے کہ وہ اپنی قوم کا خیال رکھے، لیکن اس دھن میں نوع انسان کو فراموش کر دینا ایک گناہ عظیم ہے۔ ہر مذہب کی یہی تعلیم ہے کہ اپنوں کے ساتھ ساتھ اپنے ہمجنسوں کا بھی خیال رکھا جائے۔ ہندوستان کے موجودہ دور میں ہر شاعر کو ایسی ہی آواز

بلند کرنے کی ضرورت ہے جن سے باہمی منافرت کے جذبات سینوں سے دُھل جائیں۔ غلامی کی بیڑیاں کٹ جائیں، باہمی تفرقات دور ہوجائیں، مزدور اور سرمایہ دار ایک دوسرے سے بغلگیر ہوں اور بھوک و پیاس سے نڈھال انسانوں کی ڈھارس بندھے۔ تمام دُنیا کے اہلِ دل اس پر قربان ہوں۔ اس کا دماغ مذہب کے والہانہ جذبات سے بھی پُر ہو تاکہ وہ لوگوں کو کارزارِ حیات میں نہ صرف غور و فکر بلکہ عمل صحیح کی بھی دعوت دے سکے۔ ایسا شاعر، ایسا ادیب اور ایسا مصنف قابلِ پرستش ہے۔

ڈاکٹر اقبال کی شاعری کے متعلق "تاریخ ادب اردو" مصنفہ جناب رام بابو صاحب سکسینہ ایم اے مترجمہ جناب مرزا محمد عسکری صاحب بی۔ اے) میں بھی یہی رائے ظاہر کی گئی ہے کہ:۔

"ایک زمانہ میں وہ (ڈاکٹر اقبال) اپنی بیش بہا نظموں کی بدولت پورے ہندوستان کے دلوں پر حکومت کر رہے تھے اور مُلک کا ہر طبقہ اُن کو مادرِ وطن کا حقیقی شاعر مانتا تھا مگر کچھ عرصہ سے وہ اُن لوگوں میں ہر دلعزیز نہیں رہے، جو جذباتِ وطن کو دیگر جذبات پر مقدم سمجھتے ہیں"

بہرحال گو ڈاکٹر اقبال کی اسلام دوستی نے اُنھیں خدا اور رسول تک پہونچا دیا لیکن اُن کا "مولدِ خاص" اُن سے شاکی ہی رہا۔ ان کی شاعری پر یہ ایک نمایاں داغ ہے جس کو کوئی نہیں چھپا سکتا۔ اس لئے اقبال مرحوم پر تنقید و تبصرہ کرتے ہوئے جو لوگ انھیں جذبۂ حب الوطنی سے خالی پاتے ہیں، اُن پر جوشِ عقیدت میں پنجابی صحائف کا پھبتیاں کسنا کسی طرح درست نہیں کیونکہ بقول مسٹر لطیف احمد صاحب "اسلام کا درس مواخات وطنی قومیت کو باطل نہیں کرتا اور اقبال کا نظریہ مسلمانانِ ہند کے لئے دستور العمل کا کام نہیں دے سکتا ہے

بہرحال ڈاکٹر اقبال اپنی شاعری کی معراج ختم کر گئے۔ لیکن آج اُردو کو ایسے شاعر کی ضرورت ہے۔ جس کو مسلمان بھی عزیز رکھیں اور دوسری قومیں بھی۔

افسوس کہ متقدمین سے لیکر موجودہ دور تک کے اُردو شعراء نے اپنا شاعرانہ مسلک ... اور نشاطی رکھا ہے۔ اُردو شاعری کو جون بدلوانے والے صرف دو شاعر ہوئے ہیں، اکبر الہ آبادی اور حالی پانی پتی۔ انھیں دونوں شاعروں کی روش کو الفاظ کے شکوہ اور خیالات کی ندرت ... فانی بدایونی، اصغر گونڈوی، حسرت موہانی اور آزاد انصاری وغیرہ نے اختیار کیا۔ اور غزل ... ایک نئی جان ڈال دی، مگر اس دورِ عمل میں بھی اکبر اور حالی کے لگائے ہوئے پودے کی ... کی توفیق صرف دو ہی چار حساس دلوں کو ہوئی، مثلاً اقبال و چکبست کے بعد اب سیماب ...

کی طرف عام نظریں اُٹھ رہی ہیں جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، اقبال اپنی قوم میں پھنس کر رہ گئے چکبست کو وطن کی خدمت کا زیادہ موقع ہی نہ ملا۔ جوش اور سیماب کے دل و دماغ پر البتہ وطنی خدمت کا جذبہ بدرجۂ اتم ضرور مستولی ہے۔ ساغر نظامی، احسان بن دانش، منشی چند دلوی ضیا فتح آبادی، اور آغا زیر احمدی وغیرہ نوجوان شعرا ابھی اسی نقطہ کے تحت نظم نگاری کے میدان میں گرم رفتار ہیں

بہرحال ہندوستان کو ایسے شاعروں کی ضرورت ہے جو اہلِ جہاں کو آب آزادی کے ساز پر نغمے سنائیں۔ ایسے شعرا کے کلام پر زوال و انقلاب کے اثرات نمایاں ہونا ضروری ہیں ۔

(از حضرت جگر مرادآبادی)

(۱)

لب پہ نالہ ہے مرے اور نہ فریاد ہے آج — کچھ عجب طرح سے حیرت تری یاد ہے آج
کیا قیامت نگہِ یاس کی بیداد ہے آج — کر رہے ہیں کہیں جیسے نالۂ صیاد ہے آج
ہر سرِ رسم، وہ شوخ ستم ایجاد ہے آج — نالہ بھی نالہ ہے، فریاد بھی فریاد ہے آج
حسرتِ قید بھی اب دل سے نکل جائیگی — مژدہ اے شوق! کہ خالی کفِ صیاد ہے آج

ایک اک حرفِ غمِ دل کا سنانا ہے انہیں
کل اگر بھول نہ جاؤں جو مجھے یاد ہے آج

(۲)

نظر بھی ساتھ رہی ہے قدم قدم پہ مری — پھرا ہے صحنِ چمن میں جہاں جہاں صیاد

سناؤں آہ کسے سرگزشتِ سیرِ چمن
نہ ہم خیالِ فلک ہے، نہ ہم زبانِ صیاد

خوابِ زندگانی

(از حضرت احسان دانش)

یہ رنگیں بدلیاں جو تیرتی ہیں آسمانوں پر
یہ دلکش گیت جو لہرا رہے ہیں بوستانوں پر

غروبِ مہر سے یہ زرفشاں جلووں کی ارزانی
یہ گہری ندیوں میں ٹھوکریں کھاتا ہوا پانی

یہ رنگینی جو پھولوں کی رگوں میں مسکراتی ہے
یہ ہریاول جو کمسن کھیتیوں میں لہلہاتی ہے

درختوں کی یہ ہلکی تیرگی میں ہانپتے جنگل
یہ سرخی سے سیاہی کا تصادم کانپتے جنگل

یہ رعنائی جو منڈلاتی ہے جالِ پردۂ بہاروں پر
یہ زیبائی برستی ہے جو گلشن کے نظاروں پر

یہ سازِ شام پردہ میں ترنم جوئباروں کے
یہ خواب آلودہ آڑے ترچھے سائے دیواروں کے

یہ بوچھاریں ہواؤں کی یہ چھینٹے آبشاروں کے
یہ خم کھاتے ہوئے ڈھلوان رستے کوہساروں کے

یہ چرواہوں کی دردانگیز تانیں بزمِ فطرت میں
یہ نزہت اور یہ حسن لطافت نور و نکہت میں

یہ عنّابی فضاؤں میں ابابیلوں کی پروازیں
یہ ساون کی گھٹا کو دیکھکر موروں کی آوازیں

جدھر دیکھو نظر آتا ہے اک طوفانِ شادابی
مگر مجھکو تو اس سے اور بھی ہوتی ہے بیتابی

سمجھتا ہوں یہ منظر جاودانی ہو نہیں سکتا
یہ خوابِ زندگانی، زندگانی ہو نہیں سکتا

ڈاکٹر سر محمد اقبال

از مسٹر باسدیو سنگھ پالیوال بی اے

قبل اس کے کہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کے کلام پر ناقدانہ نظر ڈالی جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصراً انکی سوانح عمری ہدیۂ ناظرین کردی جائے۔ کیونکہ کسی شاعر کے کلام کا اس کے ماحول اور زمانہ کے نشیب وفراز کے ساتھ بہت گہرا تعلق ہوتا ہے۔

ڈاکٹر اقبال کے بزرگوار کشمیری پنڈت سپرو خاندان سے تھے مگر دو تین سو سال کا عرصہ گذرا کہ کسی وجہ سے وہ مسلمان ہو گئے۔ ڈاکٹر مرحوم نے اپنے شعر سے اس واقعہ کی جانب اشارہ کیا ہے ؎

مرا بنگر کہ در ہندوستان دگر نمی بینی　　برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است

آپ کی ولادت ۱۸۷۶ء میں بمقام سیالکوٹ ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کا زمانہ مکتب میں گذرا۔ اس کے بعد مدرسہ میں داخل کئے گئے۔ پانچویں درجہ کے امتحان میں اول پاس ہوئے اور ان کو وظیفہ بھی ملنے لگا۔ انہوں نے انٹرنس اور مڈل کا امتحان بھی امتیازی حیثیت سے پاس کیا اور وظیفہ کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔ اے اور مشن کالج سیالکوٹ سے ایم۔ اے پاس کیا۔ ان کو عربی اور فارسی میں اس وقت کے عربی اور فارسی کے مشہور ومعروف عالم شمس العلماء مولوی سید میر حسن کی شاگردی کا فخر حاصل تھا۔ وہ فلاسفی کے بہت دلدادہ تھے۔ چنانچہ فلسفہ کا مطالعہ انھوں نے جید عالم پروفیسر آرنلڈ کے زیر نگرانی کیا۔ تعلیم سے فارغ ہوکر اورنٹیل کالج لاہور میں انگریزی اور فلاسفی کے اسسٹنٹ پروفیسر ہوئے اور اس دوران میں کتب بینی اور مزاولت تحریر سے ان کی استعداد میں روزافزوں اضافہ ہوتا گیا۔ شوق سیاحت وتعلیم نے ملازمت ترک کرنے پر مجبور کیا۔ اور وہ ۱۹۰۵ء میں یوروپ تشریف لے گئے۔ جہاں تین سال تک انگلستان کی سب سے قدیم اور مشہور کیمبرج یونیورسٹی میں رہ کر فلاسفی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی چنانچہ ان کی قابلیت کے صلہ میں یونیورسٹی نے ڈاکٹر یٹ کی ڈگری عطا کی۔ اسی دوران سفر میں آپ جرمنی تشریف لے گئے۔ جہاں بڑی تحقیق وتدقیق کے بعد ایک کتاب "فلسفہ ایران" پر انگریزی زبان میں تصنیف کی جسکے صلہ میں میونخ یونیورسٹی نے آپ کو ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری عطا کی۔ وہاں سے واپس آکر لندن کے پولٹیکل سائنس کے

اسکول میں مختلف علمی مشاغل میں حصہ لیتے رہے اور ساتھ ہی بیرسٹری کا امتحان بھی پاس کیا۔ اسی زمانہ میں آپ نے مذہب اسلام پر چھ لکچر دیئے۔ جن کی بدولت آپ کی قابلیت کی تعلیمی طبقوں میں دھوم مچ گئی چنانچہ پروفیسر آرنلڈ کی جگہ پر آپ چھ ماہ کے لئے لندن یونیورسٹی میں عربی و فارسی کے قائمقام پروفیسر مقرر ہوئے واپسی پر اسپین اور فرانس کی سیاحت کی۔ اور جولائی ۱۹۰۸ء میں معلومات کا ایک بحر ذخار لیکر ہندوستان واپس آئے۔ گو اُن کو بظاہر سیاست سے کوئی دلچسپی معلوم نہ ہوتی تھی۔ تاہم انھوں نے ۱۹۲۶ء میں پنجاب لیجسلیٹو کونسل کی ممبری کے زمانہ میں بڑی سرگرمی سے کام کیا۔ کسانوں اور مزدوروں کی فلاح و بہبود کیلئے ہر ممکن کوشش کی۔ ان کو ملک کی پامال اقوام کے ساتھ بھی سچی ہمدردی تھی۔ ۱۹۲۷ء میں آپ نے مذہبی علماء اور بزرگانِ دین کے نامناسب سلوک کی انسداد کے لئے ایک ریگولیشن پاس کرایا جو اب تک جاری ہے۔ ۱۹۲۸ء میں میسور یونیورسٹی نے آپ کو لکچر دینے کے لئے مدعو کیا۔ ۱۹۲۹ء میں آپ کو اعلیٰحضرت نظام دکن سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ ۱۹۳۵ء میں ریاست بھوپال نے پانسو روپیہ ماہوار کا وظیفہ مقرر کردیا۔ جس کی بدولت آپ نے فارغ البال ہوکر مسلم پبلک کی خصوصاً غیر معمولی خدمات انجام دیں۔ آخرکار ۱۹۳۸ء کے اپریل میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

آپ کا شمار ان چند بزرگانِ عالی صفات میں ہے۔ جنھوں نے اپنے اعلیٰ دماغی قابلیت اور جوہر طبعی سے جدید اُردو شاعری کے ناتواں جسم میں ایک نئی روح پھونک دی۔ یوں تو جدید اُردو شاعری کو فروغ دینے میں چکبست لکھنوی، سرور جہان آبادی، اکبر الہ آبادی، اصغر گونڈوی، حسرت موہانی، برق دہلوی، محروم اور جگر مرادآبادی کا حصہ کچھ کم نہیں۔ لیکن اقبال مرحوم کا نام نامی اپنی گوناگوں صفات (بے نظیر تخیل۔ نرالا انداز بیان۔ اچھوتے تشبیہات اور استعارے۔ اور بیساختہ پن) سے ایک امتیازی جگہ کا مستحق ہے۔ چنانچہ اگر آپ کے کلام پر ایک گہری نظر ڈالی جائے تو پتہ چلے گا کہ مومن، غالب، آزاد، حالی اور مولوی محمد اسمٰعیل کے بعد اگر کسی نے اُردو جدید شاعری کو چمکایا ہے تو اقبال مرحوم کا نام بڑی عزت اور احتشام سے لیا جائیگا۔ وہ فلاسفی اور فن شعر کے جید عالم تھے۔ ان کی نظموں میں نیچرل شاعری کے تمام اوصاف پائے جاتے ہیں۔ غالب کی مشکل پسندی۔ بے نظیر تخیل اور نرالا انداز بیان اقبال مرحوم کے کلام میں بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔ ان کے متعلق ڈاکٹر مرحوم کے دیرینہ دوست اور اُردو کے قدیم محسن، شیخ سر عبدالقادر صاحب دیباچہ "بانگِ درا" میں رقمطراز ہیں:-

"اگر میں تناسخ کا قائل ہوتا تو ضرور کہتا کہ مرزا اسداللہ غالب کو اُردو اور فارسی شاعری سے جو عشق تھا اُس نے ان کی روح کو عدم میں جاکر بھی چین نہ لینے دیا۔ اور مجبور کیا کہ وہ کسی جسدِ خاکی

میں جلوہ افروز ہو کر شاعری کے چمن کی آبیاری کرے اور اس نے پنجاب کے ایک گوشہ میں جسے سیالکوٹ کہتے ہیں جنم لیا اور اقبال نام پایا۔"

یہ حقیقت ہے کہ اقبال کا کلام مشکل ہے اور اس کے سمجھنے کے لئے باریک بین نظر درکار ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی غوطہ لگانے پر کوئی دقت پیش نہیں آتی ہے۔ انھوں نے خود فرمایا ہے ؎

جہاں وہ مضمون کہ مشکل ہے سمجھنا میرا کوئی مائل دیکھنے پر تو آسان ہول میں

کسی نے ڈاکٹر صاحب کو کاغذ قلم لے کر فکر سخن کرتے نہیں دیکھا۔ ان کے دل و دماغ میں جذبات اور موزوں الفاظ کا ایک متلاطم بحر بے پایاں تھا۔ اُن کے کلام میں تغزل اور بے ساختگی کا کافی ذخیرہ پایا جاتا ہے۔ اور اچھوتے استعارات اور تشبیہات بہتات سے ملتے ہیں۔ اُن کی نظموں میں حُسن و عشق اور معاملہ بندی کی باتیں کم نظر آتی ہیں۔ فلسفیانہ اشعار بہت کافی تعداد میں ہیں۔ اُن کے کلام پر جس قدر گہری نظر ڈالی جائے۔ اُتنی ہی زیادہ خوبیاں نظر آتی ہیں۔ اُن کی قوت حافظہ بے پناہ تھی۔ چنانچہ لمبی لمبی غزلیں دوسرے روز زبانی سنا دیتے تھے۔ لیکن فرمائش پر شعر کہنے سے قاصر تھے۔

ابتدائی مشق کے دنوں کو چھوڑ کر اقبال کا اُردو کلام بیسویں صدی کے آغاز سے کچھ پہلے شروع ہوتا ہے۔ سنہ ۱۹۰۵ء تک انھوں نے جو نظمیں لکھیں۔ وہ سب کی سب حُبِ وطن میں ڈوبی ہوئی ہیں "نالۂ یتیم" "جگنو" "ہندوستان ہمارا" "ہمالہ" "ترانۂ ہندی" "نیا شوالہ" وغیرہ وغیرہ بچہ بچہ کی زبان زد ہے۔ چند اشعار بطور نمونہ درج کئے جاتے ہیں۔ ترانۂ ہندی ۔ ؏

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

زبان کس قدر سادی ہے لیکن اشعار کس قدر بلند پایہ ہیں۔ ناظرین خود ملاحظہ فرمائیں۔

نظم "نیا شوالہ" کے بعض اشعار کبھی فراموش نہیں ہو سکتے ہیں ؎

سچ کہہ دوں اے برہمن اگر تو بُرا نہ مانے تیرے صنم کدوں کے بُت ہو گئے پُرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے
تنگ آکے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا واعظ کا وعظ چھوڑا چھوڑے ترے فسانے
پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے خاکِ وطن کا مجھکو ہر ذرہ دیوتا ہے

ناظرین اپنے سے پوچھیں کہ اس سے بہتر حُبِ وطن کا اور کیا ثبوت دیا جا سکتا ہے۔ دوسرے موقع پر فرماتے ہیں ؎

آ غیریت کے پردے اک بار پھر اُٹھا دیں بچھڑوں کو پھر ملا دیں، نقشِ دوئی مٹا دیں

ہر صبح اُٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے — سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلادیں
شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے — دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

ہندی الفاظ کو اقبال مرحوم نے جس خوبی سے کھپایا ہے۔ یہ انھیں کے بس کی بات تھی۔ اشعار کی داد دل ہی سے دے سکتا ہے قلم مجبور ہے۔ یہ تو تھے اُن کے قومی گیت کے نمونے، جنہیں اُنھوں نے قوم کا راگ الاپا ہے۔ اب خدا اور انسان کی محبت کے سلسلے میں جو کچھ فرمایا ہے اُس کا نمونہ بھی ملاحظہ کیجئے ؎

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں، بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اُس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

یہ پاکیزہ جذبات اور بلند خیالات سب کے دلوں کو تڑپانے اور داد دینے کے لئے مجبور کرتے ہیں۔

اقبال مغربی تہذیب کے دلدادہ نہ تھے، اور اکثر مہذب نوجوانانِ ملت کے خلاف مغربی مادہ پرستی کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ دراصل آپ مغرب کی خوشنما تہذیب و تمدن کو خوشرنگ کاغذی پھول سے بہتر نہیں جانتے تھے۔ چنانچہ لکھتے ہیں ؎

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے — کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی — جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

اُنھوں نے اپنی پولٹیکل شاعری میں تشبیہات اور استعارات کے پس پردہ ملک اور قوم کو آزادی کی جنگ میں شرکت کرنے کی دعوت دی ہے۔ اگر بغور دیکھا جائے، تو اُنھوں نے اس خدمت کو ایسی خوبی سے انجام دیا ہے جو ہندوستان کے کسی جبیب قوم کے لئے مشکل نظر آئے گا ؎

یہ خاموشی کہاں تک لذتِ فریاد پیدا کر — زمیں پر تو ہو اور تیری صدا ہو آسمانوں میں
چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے — عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو — تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

اُن کے کلام میں میر مرحوم کا درد اور سوز و گداز کوٹ کوٹ کے بھرا ہے۔ مثلاً ؎

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے — ہاں ڈبو دے اے محیطِ آبِ گنگا تو مجھے
سرزمیں اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے — وصل کیسا یاں تو اک قربِ فراق آمیز ہے
ٹپک اے شمع آنسو بن کے پروانے کی آنکھوں سے — سراپا درد ہوں حسرت بھری ہے داستاں میری
الٰہی! پھر مزا کیا ہے یہاں دنیا میں رہنے کا؟ — حیاتِ جاوداں میری، نہ مرگِ ناگہاں میری
مرا رونا نہیں، رونا ہے یہ سارے گلستاں کا — وہ گل ہوں میں خزاں ہر گل کی ہے گویا خزاں میری

دُنیا کی چہل پہل اور کرو فر سے گھبرا کر کہتے ہیں سے

دُنیا کی محفلوں سے اُکتا گیا ہوں یا رب
کیا لُطف انجمن کا جب دل ہی بُجھ گیا ہو

شورش سے بھاگتا ہوں، دل ڈھونڈتا ہے میرا
ایسا سکوت جس پر تقریر بھی فدا ہو

مرتا ہوں خامشی پر یہ آرزو ہے میری
دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو

اُن کی مشہور نظم بعنوان "جگنو" کی اچھوتی تشبیہیں اور استعارے دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔
غرض اُن کے اشعار میں مولانا روم اور ... کی فلاسفی کی جھلک نظر آتی ہے۔ زندگی اور موت کے متعلق اُن کے خیالات بہت زیادہ بلند ہیں۔ خودی کی حقیقت کو دنیاوی اشیاء سے بالاتر اور زندگی و موت کی قیود سے آزاد سمجھتے ہیں۔ اِس سلسلہ میں نمونہ کے طور پر اُن کے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں:۔

موت کے ہاتھوں سے مٹ سکتا اگر نقش حیات
عام یوں اس کو نہ کر دیتا نظام کائنات

ہے اگر ارزاں تو یہ سمجھو اجل کچھ بھی نہیں
جس طرح سونے سے جینے میں خلل کچھ بھی نہیں

آہ! غافل موت کا رازِ نہاں کچھ اور ہے
نقش کی ناپائداری سے عیاں کچھ اور ہے

تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے
جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کے لئے

سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے
اے بے خبر جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو
قطرہ ہے لیکن مثل بحر بے پایاں بھی ہے

کیوں گرفتارِ طلسم ہیچ مقداری ہے تو
دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکت طوفاں بھی ہے

ہو نہ ید ... کو نتیجہ ہے تباہی
رہ بحر میں آزاد وطن صورت ماہی

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

کبھی اپنا بھی نظارہ کیا ہے تو نے اے مجنوں
کہ لیلیٰ کی طرح تو خود بھی ہے محمل نشینوں میں

غرض ان کے پاکیزہ اور بلند خیالات اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ وہ نہ صرف کسی خاص ملک و قوم کے شاعر تھے بلکہ ان کے دل میں ایک عالمگیر جذبہ تھا اور وہ ایک عالمگیر شاعر تھے۔ افسوس بدیں اردو شاعری کے گلشن کا یہ گلچیں اسقدر جلد دُنیا سے اُٹھ گیا۔ جس کی تلافی نہ صرف مشکل بلکہ محال ہے۔

رُباعی

اگر در مشتِ خاک تو نہادند
دلِ صد پارۂ خونابہ بارے

زابر نوبہاراں گریہ آموز
کہ از اشکِ تو روید لالہ زارے

اقبال

نمازِ عشق

(از نواب محمود علیخاں صاحب عرف آغا علیخاں صاحب)

حریمِ حسن میں آ کر پڑھی یہ کس نے نماز — جنونِ عشق کے بالکل بدل گئے انداز
تڑپ تڑپ گئے دل، روحیں تھرتھرا اٹھیں — حجابِ ناز سے نکلی وہ دل نشیں آواز
ہر ایک رند بھی انگڑائی لے کے اٹھ بیٹھا — نہ جانے چھیڑ دیا روح کا یہ کس نے ساز
ہزاروں صبح کے آغوش ہی میں سوتے ہیں — سحر کے جاگنے والے، ہو تیری عمر دراز
یہاں یہ ہوتے ہیں آثارِ بیخودی ظاہر — بلا جھجکائے یہاں جھکتی ہے جبین نیاز
ہزاروں ناز ہوں صدقے حجابِ رنگیں کے — ہر ایک گل پہ ابھرنے لگا ہے رنگ مجاز
ابل رہی ہے مے حسن ساغرِ گل سے — حریم صبح میں شبنم ہے پھول کی دمساز
تجلیات سے روشن ہے کائناتِ چمن — ہر ایک پھول دکھاتا ہے اک نیا اعجاز
صبا کی موج میں رقصاں ہیں قطرۂ شبنم — شجر کی گود میں غنچے ہیں زمزمہ پرداز
ہر ایک برگِ شجر نے پڑھی نمازِ چمن — جھکا دی بڑھ کے ہر اک شاخ نے جبینِ نیاز
تڑپ رہا تھا نگاہوں میں صبح کا پرتو — دلوں میں بھرنے لگا پھر اتر کے سوز و گداز
مچل رہی تھی تجلی۔ فضا میں تھی ہلچل — جہانِ عشق تھا، عرصے سے گوش بر آواز
خیال ہو گئے یکسو، نگاہیں اٹھنے لگیں — نشاطِ روح کا عالم میں یوں ہوا آغاز
سریلی نغموں کی بربط پہ لہر سی دوڑی — سحر کی موجِ ہوا کا ہوا نیا انداز
سحر کے دل میں کیا راگنی نے اپنا سنگھار — ہوا خوشی سے ہم آہنگ روح کا ہر ساز
ربابِ عشق کے جب تار تھرتھرانے لگے — فضا میں گونج اٹھی حسن کی نئی آواز
ہر ایک پھول ہنسے، غنچے مسکرانے لگے — چمن میں صبح کی مستی کا ہے نیا انداز
سحر کے لحن سے ہمراز و ہمنوا ہو کر — ہوئے ہیں طائرِ خوش رنگ زمزمہ پرداز
مریضِ عشق کی نبضیں ابھرتی آتی ہیں — دکھا دیا ہے اس آواز نے نیا اعجاز
جبینیں جھک گئیں سجدوں میں روحیں مست ہوئیں — نہ جانے آئی کہاں سے یہ حسن کی آواز
بغور اہلِ نظر دیکھیں، اہلِ دل سمجھیں — کہیں ہوئی ہے بھلا اس طرح شگفتہ نماز

پارنل اسٹوارٹ

از مسٹر ڈی۔ پی کشتہ

آئرلینڈ کے مشہور و معروف محب مسٹر پارنل جون ۱۸۴۶ء میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کی والدہ ماجدہ امریکہ کے فوجی افسر مسٹر چارلس اسٹوارٹ کی صاحبزادی تھیں۔ برطانیہ اور امریکہ کی جنگ آزادی میں مسٹر چارلس کو اپنی بہادری و جانبازی کے بدولت عالمگیر شہرت حاصل ہوئی تھی۔ اپنے آزاد خیال والد کی وجہ سے پارنل کی والدہ کی ابتدائی زندگی سیاسی فضا میں بسر ہوئی تھی۔ چنانچہ وہ بڑی آزادی پسند اور دلدادۂ حریت تھیں۔

پارنل پر بھی ان خیالات کا پورا اثر پڑا۔ چنانچہ آئرلینڈ کی محبت کا جوش اُن کی رگ رگ میں موجزن رہنے لگا۔ اور حب وطن کا جذبہ اُن کے دل و دماغ میں سرایت کر گیا۔ پارنل بچپن ہی سے بڑے کھلاڑی باہمت اور شریر واقع ہوئے تھے۔ وہ اپنے ہم جماعتوں اور ساتھیوں پر ہمیشہ حاوی رہتے۔ اور کبھی خوفزدہ ہونا یا مشکلات سے گھبرانا تو انھوں نے سیکھا ہی نہ تھا۔ ممکن تھا اپنے والد ماجد کی پرداخت و نگہداشت میں رہ کر ان کی زندگی کسی دوسرے ہی سانچے میں ڈھل جاتی مگر مشیت ایزدی کچھ اور ہی تھی۔ چنانچہ تیرہ سال کے سن میں ہی پارنل ظل پدری سے محروم ہو گئے۔ ان کی والدہ نے حالات سے مجبور ہو کر ان کو تحصیل علم کی غرض سے انگلینڈ بھیج دیا۔ مگر وہاں پارنل کی اپنے ہم جماعتوں اور اسکول کے دوسرے طالب علموں سے مطلق نہ بنی۔ روز کسی نہ کسی بات پر جھگڑا ہو جایا کرتا تھا۔ اور اُستادوں سے بھی اکثر کہا سنی ہو جاتی تھی۔ غرض ان کی شورش پسند خصلت اور باغیانہ اطوار کسی کو ایک آنکھ بھی نہ بھاتے تھے خیر جوں توں اسکول کا کورس ختم کر کے یہ کیمبرج میں داخل ہوئے۔ مگر وہاں بھی شیطانیوں اور مکہ بازیوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہ باتیں آخر کب تک گوارا کی جا سکتی تھیں۔ چنانچہ اسکولی نظام قائم رکھنے کے لئے اُن کو درسگاہ سے خارج کر دیا گیا۔

ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ پارنل کی تعلیم نامکمل رہ گئی۔ انگریزی زبان پر عبور و دسترس حاصل نہ ہونے کی وجہ سے ان کو مضامین تحریر کرنے اور تقریر کرنے میں بڑی دقت اور جھجک محسوس ہوتی تھی۔

ی لئے وہ بہت محتاط رہتے تھے۔ کیمبرج سے واپسی پر وہ اعزازی حیثیت سے بلا تنخواہ فوج میں بھرتی
ئے اور اپنی والدہ کے ساتھ رہنے لگے۔ اُنھیں تعلیم ادھوری رہ جانے کا بڑا ملال تھا۔ اور اُن کا دماغ
ت اسی غور و فکر میں مصروف رہتا تھا۔ ان کی توجہ سیاسیات کی جانب مبذول تو ہو چکی تھی۔ مگر ابھی یہ
میں کوئی خاص دلچسپی نہ لیتے تھے۔ جس وقت امریکہ اپنی خانہ جنگیوں سے فارغ ہو چکا اور فضا کچھ بہتر
، تو وہاں کے چند آزاد خیال و حریت پسند نوجوانوں نے آئرلینڈ پہونچ کر ایک نئی تحریک شروع کی۔
کو "سن فین" کے نام سے موسوم کیا گیا اور اُس کا نصب العین آئرلینڈ کے لئے "مکمل آزادی" حاصل
یا مقرر کیا گیا۔ انگلینڈ نے اس تحریک کو کچلنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ مگر اس کی تمام کوششیں رائگاں
بت ہوئیں اور اس تحریک کے شعلے سرد ہونے کے بجائے روز افزوں بھڑکتے گئے۔ پارنل کی والدہ کو
ی اس تحریک سے بڑی گہری دلچسپی تھی اور وہ حتی الامکان اس کے ممبروں کی امداد کرتی رہتی تھیں۔
انچہ پولیس کو اُن پر شبہ ہو گیا اور اُن کے مکان کی تلاشی لی گئی مگر کوئی قابل اعتراض شے برآمد نہیں ہوئی۔
رنل اب تک اس تحریک میں باقاعدہ طور پر شامل نہ ہوئے تھے۔ مگر پولیس کی سختیاں دیکھ کر وہ بھی
س کے ممبر بن گئے۔

انسان کی زندگی میں کبھی کبھی اچانک ایسے عجیب واقعات رونما ہو جاتے ہیں جو اس کو قعر گمنامی سے نکال کر شہرت کی بلند ترین چوٹی پر پہونچا دیتے ہیں۔ پارنل کی شہرت بھی اسی قسم کے ایک واقعہ کی مرہونِ منت ہے۔

جن دنوں وہ مذکورہ بالا تحریک کی ترقی و توسیع کے لئے سرگرداں تھے اور اس کوشش میں جگہ بجگہ مارے مارے پھرتے تھے انھیں ایام میں ان کی ملاقات مس وڈ نامی ایک امریکن خاتون سے ہو گئی۔ پارنل پہلی ہی ملاقات میں اُس کی نظر کے شکار ہو گئے۔ عرصہ تک دیوانہ وار کوچۂ عشق کی خاک چھانی مگر بے اعتنائی و بے رُخیِ محبت کے سوا انھیں کوئی حوصلہ افزا جواب نہ ملا۔ بالآخر جب ضبط کا یارا نہ رہا تو پارنل نے مجبور ہو کر اپنا دلی راز ظاہر کر دیا۔ مگر اُس بیدرد نے اس التجا کا کچھ بھی لحاظ نہ کیا۔ اور کھلے الفاظ میں یہ کہکر شادی سے انکار کر دیا کہ پارنل تو کوئی ایسی معروف شخصیت یا مشہور ہستی نہیں ہے۔ جس کے کارہائے نمایاں سے دُنیا واقف ہو۔ اور میں ایک گمنام اور معمولی شخص کی شریکِ زندگی ہونا گوارا نہیں کر سکتی۔ معشوقِ جفاکار کے اِن تُرش الفاظ نے پارنل کا شیشۂ دل تو ضرور چور چور کر دیا۔ لیکن ان کی بدولت اس بات کی کد ہو گئی کہ جس طرح ہو سکے اپنے مقصدِ حیات کی تکمیل کے لئے انتہائی کوشش کرے۔ چنانچہ اُس کے بعد سچ مچ کایا پلٹ گئی۔ اب اُنھیں دوسری ہی لَو لگ گئی۔ ہر گھڑی یہی دُھن رہنے لگی کہ کس طرح نیکنامی اور

شہرت حاصل کی جائے۔ ہر وقت یہی خیال رہتا کہ دنیا کس طرح اُن کی لیاقت و کارگذاری سے واقف ہو اور ان کا نام بھی صفحات تاریخ میں یادگار ہو کر رہے؟

اولوالعزم اور مستقل مزاج پارنل اب پوری قوت ارادی کے ساتھ ملکی خدمات کی جانب رجوع ہو گئے دنیا کے دیگر مشاغل اور خواہشات سے کنارہ کش ہو کر وہ ہر تن مضامین لکھنے اور تقریر کرنے کی مشق حاصل کرنے میں مصروف ہوئے اور دو سال کی متواتر کوشش سے ایسی مہارت پیدا کر لی کہ ان کا شمار قابل ترین مقرروں اور کہنہ مشق مضمون نویسوں میں ہونے لگا۔ عام و خاص سبھی اُن کی قابلیت کا اعتراف کرنے لگے اور رفتہ رفتہ عوام کے دلوں میں اُن کے لئے ایک جگہ پیدا ہو گئی۔ یہاں تک کہ وہ پارلیمنٹ کے ممبر منتخب ہو گئے۔ اس وقت مسٹر بٹ آئرش پارٹی کے لیڈر تھے۔ اور آئرلینڈ کے مفاد کے متعلق ہر تجویز کی تائید کرنا اس پارٹی کی پالیسی تھی۔ لیکن چونکہ پارلیمنٹ میں انگریزوں کی اکثریت تھی وہ اس پارٹی کو اپنے مقاصد میں کامیاب نہ ہونے دیتے۔ پارنل کو یہ کمزوری بہت کھٹکتی تھی۔ چنانچہ وہ اس کے دور کرنے کی تدابیر سوچنے میں منہمک رہنے لگے اور بالآخر انھوں نے یہ رویہ اختیار کیا کہ انگریزوں کی ہر بات اور ہر قرارداد کی پر زور تردید کرنے لگے۔ یہ پالیسی کارگر ثابت ہوئی۔ چنانچہ اس کی وجہ سے پارنل کے حمائتیوں کی تعداد روز بروز بڑھتی گئی اور جب جنوبی آفریقہ کا بل پیش ہوا، تو اسی پارٹی کی ہنگامہ آرائی اور شور و شر کے باعث پارلیمنٹ کا اجلاس متواتر چھبیس گھنٹے رہا۔

۱۸۷۸ء میں ڈبلن میں ہوم رول کانفرنس منعقد ہوئی اور اُس کے صدر مسٹر پارنل منتخب کئے گئے۔ اس کانفرنس میں انھوں نے ایسی پر زور تقریر کی کہ اس کا پبلک پر بہت بڑا اثر ہوا اور ہر شخص نے بہ آواز بلند اُن کے خیالات کی تائید کی۔

کچھ عرصہ کے بعد انھوں نے آئرلینڈ میں ایک کسان سبھا قائم کی۔ جس کا مقصد کسانوں کو زمینداروں کے فولادی پنجہ سے رہائی دلانا تھا۔ زمیندار زیادہ تر انگریز ہی تھے اور ان کو آئرش کسانوں اور مزدوروں سے ذرا بھی ہمدردی نہ تھی۔ اور وہ ان غریبوں پر جی بھر کر ظلم کرتے۔ کبھی لگان میں اضافہ کر دیا کبھی انھیں زمین سے بیدخل کر دیا۔ کبھی نذرانے نہ پہنچنے پر مارے ٹھوکروں کے بیدم کر دیا۔ غرض ان بیچاروں کی زندگی دوزخ کا جیتا جاگتا نمونہ تھی۔

اتفاق سے جس سال یہ کسان سبھا قائم ہوئی۔ اسی سال قدرت کی طرف سے قہر نازل ہوا اور ایسا زبردست قحط پڑا کہ خدا کی پناہ۔ بہرحال کسانوں کی حالت ناگفتہ بہ ہو گئی اور بیچارے دانے دانے کو محتاج ہو گئے بھوک اور فاقہ سے بیشمار جانیں ضائع ہوئیں قحط سالی کی تباہ کاریوں اور فرشتہ اجل کی ہلاکت آفرینیوں پر بھی

سنگدل زمینداروں کا کلیجہ پتھر ہی بنا رہا۔ کسی نے اس موقع پر غریبوں کی کوئی امداد نہ کی۔

مگر مسٹر پارنل کی کسان سبھا نے اس اڑے وقت پر بڑا کام کیا۔ نہایت مستعدی و جانفشانی سے قحط زدہ کسانوں کو ہر طرح کی سہولتیں بہم پہونچائیں۔ ان کی امداد میں حتی المقدور کوئی دقیقہ باقی نہ رکھا۔ انھیں کارگذاریوں سے اس سبھا نے بہت ہی تھوڑے عرصہ میں نمایاں ترقی اور ہر دلعزیزی حاصل کر لی۔ اس سلسلہ میں مسٹر پارنل نے ایک مرتبہ پھر امریکہ کا دورہ کیا۔ اس بار وہاں کی پبلک نے ان کا نہایت پُرجوش و پُرتپاک خیر مقدم کیا۔ آپ نے بھی اپنی تقریروں میں زمینداری سسٹم کے عیوب و مظالم پر خوب روشنی ڈالی۔ آپ نے ایک تقریر کے دوران میں اس بات پر زور دیا کہ اپنے جائز حقوق کی حفاظت کرنے اور انھیں حاصل کرنے کے لئے ہر آئرش کو جسے اپنی اور اپنے وطن کی عزت کا پاس ہے جان و مال تک قربان کر دینا چاہئے۔ آزادی ہر شخص کا پیدائشی حق ہے اور اس کے لئے مرمٹنا اس کا مقدم فرض ہے۔ لیکن چونکہ آئرلینڈ کے لوگ بہت غریب اور نہتے ہیں اس لئے انھیں بہت احتیاط سے کام لینا چاہیئے اور جوش میں آکر یا بغیر سوچے سمجھے کبھی کوئی ایسا کام نہ کرنا چاہیئے جس کے لئے انھیں بعد میں پچھتانا پڑے اور کامیابی دشوار ہو جائے۔ آپ نے یہ بھی کہا کہ دشمن کو کبھی زہر دے کر نہ مارنا چاہئے کیونکہ یہ جذبہ علوی نہیں ہے۔ بلکہ بقول حضرت عیسیٰؑ اگر کوئی شخص آپ کے ایک تھپڑ مارے تو آپ دوسرا گال بھی اس کی طرف کر دیں۔ وہ خود ہی ندامت سے مرجائے گا۔

آپ نے یہ بھی کہا کہ پیشتر اس کے کہ ہم کسی مقابلہ کی طرف قدم بڑھائیں ہمیں اپنی پوری طاقت اور حوصلے کا اندازہ کر لینا چاہیئے۔ عدم تشدد ہی نہتوں اور کمزوروں کا کامیاب ہتھیار ہے اور ہمیں اسی کا سہارا لینا واجب ہے۔ آپ نے اہل امریکہ سے مخاطب ہو کر ایک جلسہ میں کہا کہ:-

"میں آپ لوگوں سے آئرلینڈ کی مدد کرنے کی التجا کرتا ہوں۔ یہ آپ کا انسانی اور اخلاقی فرض ہے کہ آپ ان مظلوموں کو ظالموں کے پنجہ سے نجات دلائیں۔ خدا آپ کو غریبوں کی امداد کرنے کی توفیق عطا کرے۔ آمین!"

امریکہ سے واپس آکر پارنل پھر کسان سبھا کے کام میں مصروف ہو گئے۔ قحط کی وجہ سے کسانوں میں جو بے چینی پھیل گئی تھی اس کو دور کرنے کے لئے آئرش پارٹی نے پارلیمنٹ میں یہ ریزولیوشن پیش کیا کہ "چونکہ کسانوں کو یہ تمام تکالیف زمینداروں کے ظلم اور زیادتی کی وجہ سے برداشت کرنا پڑی ہیں اس لئے اُن کو زمینداروں سے اس کا ہرجانہ دلایا جائے"۔ یہ قرارداد مناسب ہوتے ہوئے بھی اس لئے منظور نہیں ہوئی کہ انگریزوں نے اس کی تائید نہیں کی۔

اس غیر منصفانہ برتاؤ نے ہر آئرش کے دل میں برطانیہ کے خلاف نفرت و مخالفت کے جذبات پیدا کر دیئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بغاوت کی آگ جو ایک عرصے سے دھیرے دھیرے سلگ رہی تھی۔ ایکدم بھڑک اٹھی۔ پارنل بذات خود بغاوت پسند نہ کرتے تھے اور نہ اس سے ان کو کوئی ہمدردی تھی۔ مگر ملک اور قوم کی خاطر انھیں سب کچھ کرنا پڑا۔

ایک مرتبہ آپ نے ایک تقریر کے دوران میں حاضرین سے دریافت کیا کہ "اگر ایک بےدخل کئے ہوئے کھیت کو دوسرا کسان لے لے تو اُس کے ساتھ کیا سلوک کرنا روا ہوگا؟"

جواب ملا کہ "اسے شخص کو فوراً گولی سے مار دینا چاہیئے۔"

مگر پارنل نے ان الفاظ کو کوئی اہمیت نہ دی اور سنجیدگی سے کہا کہ "اگر کوئی ناسمجھ کسان ایسی غلطی کر بیٹھے تو اُس کے ساتھ خلاف انسانیت برتاؤ کرنے کے بجائے یہ مناسب ہوگا کہ اس سے کوئی تعلق نہ رکھا جائے بلکہ قطعی کنارہ کشی اختیار کی جائے۔ آپ نے کہا کہ کوئی شخص اتنا بے حیا اور ایسا لالچی نہ ہوگا جو عوام کے جذبات کی پامالی کر کے ایسی کمینہ کارروائی کرنے کی جرأت کرے۔"

چنانچہ اس تجویز بائیکاٹ پر عمل کیا گیا اور یہ بہت مفید اور کارآمد ثابت ہوا۔ پارلیمنٹ میں اس تحریک کے دبانے کی کوشش کی گئی لیکن پارنل اور اُن کے ساتھیوں کے آگے کسی کی پیش نہ گئی۔ آخر گورنمنٹ نے تنگ آکر ایک نئے قانون کی رو سے پارنل کو گرفتار کر لیا۔ مگر اس پر بھی بائیکاٹ کی تحریک جاری رہی۔ گرفتاری کے بعد بھی پارنل نے اپنے معمول میں سرمو فرق نہ آنے دیا۔ اور جیل خانہ کی چار دیواری کے اندر ہی سے اعلان کیا کہ "لگان کی ادائیگی فوراً بند کر دی جائے۔"

تمام آئرلینڈ کے کسانوں نے اس حکم کی تعمیل کی۔ چنانچہ انگریزی گورنمنٹ کو پھر نیچا دیکھنا پڑا۔ آخر بات بڑھتی دیکھ کر سمجھوتہ کی طرف ہاتھ بڑھایا گیا اور پارنل کو اس شرط پر رہا کرنا طے کیا گیا کہ پبلک کو سرکار کے خلاف نہ بھڑکائیں اور نہ ایسے خیالات کا اظہار کریں جس سے عوام کے جذبات مشتعل ہوں۔ اس کے صلہ میں گورنمنٹ نے اپنی سخت گیری کی پالیسی ترک کرنے کا وعدہ کیا۔ بہرحال صلح ہوگئی۔ اور مسٹر پارنل کو رہا کر دیا۔ مگر اُنھوں نے جیل سے رہا ہوتے ہی یہ تجویز پیش کی کہ گورنمنٹ اُن غریب کسانوں کی جو باوجود کوشش پچھلے دو سال سے لگان ادا نہیں کر سکے ہیں، مالی امداد کرے۔ شاید گورنمنٹ ایسا کرتی۔ لیکن اسی دوران میں ایک ایسا واقعہ ہوگیا جس سے اس تجویز پر عمل کرنا ناممکن ہوگیا۔ کسی بدنفس نے آئرلینڈ کے نئے وزیر اور اُس کے سکرٹری کو قتل کر دیا۔ اس حادثہ کے بعد پارنل کی اُمیدیں خاک میں مل گئیں اور اُن کا کیا دھرا مٹی میں مل گیا۔ مخالفین نے اس مکروہ قتل کو پارنل ہی کی سازش کا نتیجہ بتایا،

اور اُن کے خلاف بڑے زور و شور سے پروپیگنڈا کیا۔ چنانچہ گورنمنٹ نے پھر جبر و استبداد کا حربہ سنبھالا۔ اور پارنل نے بھی اپنی پوری طاقت سے اِن مظالم کی مخالفت کی اور اپنے خلاف غلط الزامات کا منھ توڑ جواب دیا جس سے حریفوں کے قدم اکھڑ گئے اور بالآخر حقیقت آشکار ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ پبلک پر اصل واقعات روشن ہو گئے بے لوث اور بے غرض خدمات نے مسٹر پارنل کو پھر اپنی اصل جگہ پر لاکر کھڑا کر دیا۔ اور پیشتر کی طرح اُن کو پھر عوام کا اعتماد حاصل ہو گیا۔ اور اس عقیدت کے ثبوت میں پبلک نے اُن کو پانچ لاکھ روپیہ کی گراں نقد تھیلی نذر کی۔ تاکہ وہ اپنے مالی بوجھ سے سبکدوش ہو کر اطمینان و آرام سے اپنا بیش بہا وقت ملک و قوم کے فلاح و بہبود میں صرف کر سکیں۔

مالی مشکلات سے فارغ ہو کر پارنل پھر ہوم رول کے کام میں منہمک ہو گئے۔ اور دو سال تک متواتر تمام آئرلینڈ کا دورہ کیا۔ جس سے عوام اُن کی رائے اور خیالات سے متفق ہو گئے۔

۱۸۸۵ء میں پارلیمنٹ کا نیا انتخاب ہوا۔ جسمیں پارنل ہی بہ حیثیت لیڈر منتخب ہوئے۔ اس مرتبہ پارلیمنٹ میں اُن کے ساتھیوں کی تعداد بہت کافی تھی۔ جس سے گورنمنٹ بھی ڈھیلی پڑ گئی۔ اور اُس کو مجبوراً پارنل کی اسکیم کو تسلیم کرنا پڑا۔ چنانچہ اس دفعہ وزرا نے اپنی طرف سے ہوم رول بل پیش کیا۔ انگریزی اخباروں نے اس پر بڑا واویلا مچایا اور پارنل کے خلاف بڑے زور و شور سے پروپیگنڈا کیا گیا۔ مگر پارنل کے خلاف جتنی تہمتیں لگائی گئیں وہ ثابت نہ ہو سکیں لیکن انھیں دنوں ایک واقعہ ایسا افسوسناک ہو گیا جس کے سبب سے پارنل کی تمام کوششوں پر پانی پھر گیا۔ بعض لوگوں کا قیاس ہے کہ یہ حرکت خود گورنمنٹ کی طرف سے کی گئی۔ کہ جب پارنل کے خلاف کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی تو ایک ایسی شاطرانہ چال چلی گئی کہ ان کو مات کھانی پڑی کہتے ہیں کہ اسی زمانہ میں اُن کی ملاقات ایک خاتون سے کرائی گئی جو ایک کپتان کی بیوی تھی۔ پارنل کو اس کی محبت کے جال میں کچھ اس طرح پھانسا گیا کہ اُنھوں نے اس سے شادی کر لی۔ بساط عشق کے ناتجربہ کار کھلاڑیوں کی طرح شکست پر شکست کھانے پر بھی پارنل کو ہوش نہ آیا۔ اُن کے خلاف پروپیگنڈا تو جاری ہی تھا۔ اس واقعہ کے بعد اُن کے ساتھیوں اور حمایتوں نے بھی اُنکا ساتھ چھوڑ دیا جسکا اُنکی صحت پر مہلک اثر پڑا۔ آخر کار ۱۸۹۱ء میں اُن کو اپنی قیمتی جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔

افسوس کہ جس طرح پارنل کی سیاسی زندگی کا آغاز ایک عورت کے تُرش الفاظ سے ہوا تھا۔ اسی طرح اُنکا انجام بھی عورت ہی کی محبت کی سحرکاری کے باعث ہوا۔ دشمن نے اُن کو راستے سے ہٹانے کی جو کمینہ چال چلی وہ کارگر ہو گئی۔ خیر جو کچھ بھی ہو پارنل کو اپنے ملک اور ملک کے غریبوں سے سچی محبت تھی اور تاریخ شاہد ہے کہ اُنھوں نے آزادی کی دیوی کے سچے پجاری کی طرح پوجا کی اور اسی کی خدمات انجام دیتے ہوئے اپنی زندگی ختم کر دی۔

کلامِ فراق

(از پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق ایم۔ اے)

جام اُدھر چھلکے ادھر راتیں درخشاں ہوگئیں ۔۔۔ ظلمتیں لہرا کے سامانِ چراغاں ہوگئیں
شامِ صحرا ہوگئیں صبحِ گلستاں ہوگئیں ۔۔۔ وحشتیں میری بہ ہر صورت نمایاں ہوگئیں
دل بھی ششدر رہ گئے آنکھیں بھی حیراں ہوگئیں ۔۔۔ سب ادائیں حُسن کی آئینہ ساماں ہوگئیں
پستیاں اربابِ غم کی ہو گئیں ہاں ہوگئیں ۔۔۔ اس نظر کی بجلیاں لہرا کے پنہاں ہوگئیں
پھر سرشکِ خوں ہوئے آئینہ دارِ رُخِ یار ۔۔۔ پھر مری آنکھیں گلستاں در گلستاں ہوگئیں
گل بہاریں رنگ و بو کی کھنچ کے مرکز کی طرف ۔۔۔ شوخیِ برقِ تبسم ہائے پنہاں ہوگئیں
ماورائے ہوش و غفلت ہے یہ قولِ بے حسی ۔۔۔ منزلیں غم کی نہ مشکل تھیں نہ آساں ہوگئیں
پھر عیاں کر حسن کی وہ خوبیاں تیرے نثار ۔۔۔ ہاں وہی جو چشمِ ظاہر بیں سے پنہاں ہوگئیں
راہ دیوانوں کی کھوٹی کی جنونِ نام نے ۔۔۔ وحشتیں گھٹ کر در و دیوارِ زنداں ہوگئیں
پھر تری زلفیں جنوں کے باندھ کر کچھ سلسلے ۔۔۔ صورتِ شیرازۂ ہستی پریشاں ہوگئیں
جاں ستانی، جاں فزائی ان کی کیا جانے کوئی ۔۔۔ وہ نگاہیں جو اُترتے ہی رگِ جاں ہوگئیں
دیدنی ہے عالمِ ہنگامہ زارِ زندگی ۔۔۔ بستیوں کی بستیاں شہرِ خموشاں ہوگئیں
عشق کو تیرے تغافل سے نہیں شکوہ۔ مگر ۔۔۔ دل کی چوٹیں کس لئے مایوسِ درماں ہوگئیں
اک صلائے عام بھی۔ ہے اک، پیامِ راز بھی ۔۔۔ حُسن کی باتیں نہ ظاہر تھیں نہ پنہاں ہوگئیں
دل ہوئے آباد ادھر بادِ مخالف چل پڑی ۔۔۔ بستیاں بسنے نہ پائی تھیں کہ ویراں ہوگئیں
جس طرف اُٹھی پیامِ غیب سا لیکر اُٹھی ۔۔۔ اس نظر کی حیرتیں اسرارِ دوراں ہوگئیں
چار دن کی چاندنی ہے پھر اندھیری رات ہو ۔۔۔ منزلیں چمکیں مگر شامِ غریباں ہوگئیں
وہ بھی کوئی پنجۂ وحشت ہے جس کی وحشتیں ۔۔۔ صرفِ داماں ہوگئیں صرفِ گریباں ہوگئیں
تیرے دیوانوں کو جن کی وسعتوں پر ناز تھا ۔۔۔ وہ فضائیں کیوں در و دیوارِ زنداں ہوگئیں

خیر سے جب ہو چکی تکمیلِ تعمیرِ جہاں / کچھ بلائیں مل گئیں باہم اور انساں ہو گئیں
تھیں جو اک مدت سے جانِ مضطرابِ انتظار / وہ امیدِ وقفِ تاخیر پریشاں ہو گئیں
داستانِ جور و بیدردی کی سب رنگینیاں / حاصلِ خمیازۂ حسنِ پشیماں ہو گئیں
ہو چلی تھیں کچھ سکوں آور ادائیں حسن کی / اک نئے انداز سے پھر حشر ساماں ہو گئیں
زخمِ پنہاں کھل اٹھے نوکِ مژہ کی چھیڑ سے / مسکرا کر آج یہ کلیاں گلستاں ہو گئیں
خاک اڑتی ہے جہاں تھے اشکِ خوں میں موجزن / اف وہ آنکھیں جو گلستاں سے بیاباں ہو گئیں
عشق کے آنسو نثارِ جورِ پیہم ہو گئے / اس ادا سے آج وہ آنکھیں پشیماں ہو گئیں
جن کے ہر لمحے میں تھی کیفیت شامِ ابد / آج کیوں وہ صحبتیں خوابِ پریشاں ہو گئیں
ہاں وہی دکھتے دلوں کو بھی خبر جن کو نہ تھی / وہ رگیں بھی صرفِ کاوشہائے مژگاں ہو گئیں
تھیں ازل ہی سے نگاہِ اولیں میں وحشتیں / بڑھتے بڑھتے صبحِ ہستی کا گریباں ہو گئیں
عشق کا گھر جس طرح ویران تھا ویران ہے / وہ نگاہیں چار دن کو دل میں مہماں ہو گئیں
کیا دھرا ہے زندگی میں کیا دھرا ہے موت میں / مرحبا وہ ہستیاں جو دکھ کے انساں ہو گئیں
غیب کا پہلو بدلنا باعثِ خلقت ہوا / نیستی کی کروٹیں ہستی کا ساماں ہو گئیں
آہ یہ زہرابۂ ہستی کی موجیں اور یہ پیاس / کیا کروں گا؟ گریہ موجِ آبِ حیواں ہو گئیں
درسِ عبرت ہے محبت کا یہ رنگِ بے حسی / آہ وہ چوٹیں جو صرفِ فکرِ درماں ہو گئیں
ناشکیبا جن میں تھا اکثر نشاطِ زندگی / وہ بھی راتیں راحتِ بیمارِ ہجراں ہو گئیں
خود بقا لیتی تھی جن کو دیکھ کر انگڑائیاں / کیسی کیسی صورتیں خوابِ پریشاں ہو گئیں

وہ نگاہیں گرچہ تھیں اپنی جگہ لیکن فراق
باعثِ صد امتیازِ کفر و ایماں ہو گئیں

رباعیات

آنکھیں کھولیں مگر یہ پردا نہ کھلا / سب ہم پہ کھلا پہ حالِ دنیا نہ کھلا
دریائے تفکر میں رہے برسوں غرق / مانندِ حباب یہ معما نہ کھلا

ایذا سے نہ کوئی اس میں اصلا چھوٹا / ادنیٰ چھوٹا نہ کوئی اعلیٰ چھوٹا
دنیا کا بھی زنداں ہے عجب مہلک و سخت / جس میں پھنس کر نہ کوئی بندا چھوٹا

موجد ہومیوپیتھی

از ڈاکٹر نجم الحسن موہانی (ہومیو) حیدر آباد دکن

حالاتِ ہانمن جرمنی کے صوبہ سیلسنی کے ایک غیر معروف شہر میسن میں ۱۰ اپریل ۱۷۵۵ء کو ایک اولوالعزم ہستی نے کتم عدم سے دنیائے ظاہر پر نزول اجلال کیا۔ نام نامی سموئیل ہانمن تھا۔ جو بعد میں ڈاکٹر سموئیل ہانمن کے نام سے مشہور ہوا۔ ڈاکٹر ہانمن کے والد بزرگوار جے۔ ہانمن بہت ہی غریب آدمی تھے۔ سموئیل ہانمن کو قدرت نے خاص دماغ عطا کیا تھا۔ غربت کی وجہ سے ہانمن کو ابتدائی تعلیم میں غیر معمولی مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ ابھی اُن کی عمر بارہ۱۲ برس ہی کی ہوگی کہ یونانی زبان کی تعلیم دی جانے لگی۔ بیس۲۰ برس کی عمر میں سموئیل ہانمن اپنی مادری زبان جرمنی کے علاوہ اطالوی، فرانسیسی، انگریزی، یونانی اور عربی وغیرہ کے ماہر ہوگئے۔ ان تمام زبانوں پر آپ نے محض اپنی ذاتی کوشش اور جانفشانی سے عبور حاصل کیا۔ یہ اِس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ آپ کو خدا نے ایسا ٹھوس دماغ عطا کیا تھا۔ جو بہت کم لوگوں کے حصے میں آتا ہے۔ ہانمن نے اپنی یونیورسٹی تعلیم محض مختلف زبانوں کے درس دینے اور جرمنی زبان میں تالیف و ترجمہ کرنے کی بدولت حاصل کی۔

اُن کا رجحان طبیعت ہمیشہ سے فنِ طب کی طرف تھا۔ چنانچہ ۱۷۷۹ء میں خاص اعزاز کے ساتھ آپ ارلنگن سے طب کے گریجویٹ ہوئے۔ آپ زبان ذاتی کے علاوہ دیگر شعبوں میں بھی جن کا فن طب سے کوئی تعلق نہ تھا ماہرِ کامل تصور کئے جاتے تھے اور مختلف فنی اور ادبی اداروں میں شریک تھے۔ بہرحال نوجوانی ہی میں آپ ڈرسڈن اسپتال کے ہاؤس سرجن بنا دئے گئے۔ ۱۷۸۴ء میں آپ نے بعض سنگین پھوڑوں کے علاج کے متعلق ایک کتاب شائع کی۔ جسمیں ہڈیوں کے قطع و برید کا ایسا اصول قائم کیا۔ جو اب سے نصف صدی پہلے تک فنِ جراحی میں نہایت مقبول تھا۔ اصول مذکورہ کو لوگوں نے غلطی سے آف لیڈز کی طرف منسوب کر رکھا تھا۔ جس کو وہ لوگ اس کا موجد گردانتے تھے۔ اس ایجاد و اکتشاف کے چندروز بعد آپ گار جنتھل کے پاگل خانہ کے مہتمم بنا دئے گئے۔ آپ نے پاگلوں کے علاج کے متعلق کافی غور اور تجربہ کے بعد یہ اصول طے کیا کہ پاگلوں پر کسی قسم کی مار پیٹ یا سختی نہ کرنا چاہئے۔ کیونکہ سخت برتاؤ انھیں صحتیاب نہیں ہونے دیتا۔ آج طب کی دنیا سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ پاگلوں اور مجنونوں کے علاج

میں عدم تشدد کی بنیاد ہانمن نے ہی ڈالی تھی لیکن بعض مورخین اس کو ڈاکٹر پائینل کا کارنامہ سمجھتے ہیں۔ جو صحیح نہیں ہے۔ یہ ضرور ہے کہ پائینل نے ہانمن کی تعلیم کے بعد اپنے تجربات اس معاملہ میں پیش کئے ہیں۔

ہانمن کیمیا (کیمسٹری) کا ایسا مبصر تھا کہ آج تک اُس کے کیمیاوی امتحان کو (کہ شراب کے کیمیاوی اجزا کس طرح معلوم کئے جاتے ہیں اور اُن کا افادہ کیونکر ہوتا ہے) کوئی غلط ثابت نہ کر سکا۔ اہل تحقیق اب بھی اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ اُس نے دوسرے فنون پر بھی کتابیں تصنیف و تالیف کیں جو تراجم کے علاوہ تھیں۔ علاج ہومیوپیتھی کے سلسلہ میں دواؤں کے اثرات کو پورے طور سے عمل میں لانے اور صحت کو بحال کرنے کے لئے ہانمن نے اس کی سخت ضرورت محسوس کی۔ کہ حفظانِ صحت کے مسئلہ پر کچھ لکھا جائے۔ چنانچہ ایک کتاب "رفیقِ صحت" نامی اس موضوع پر سپرد قلم کی جو آج تک ماہرینِ حفظانِ صحت کے لئے ایک بیش بہا کتاب ہے۔ اب بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب ایک سو سال پہلے کی نہیں۔ بلکہ آج کی لکھی ہوئی ہے، جبکہ سائنس کی کافی ترقی ہو چکی ہے۔ کیونکہ جو مضامین اور کھانے پینے کے اصول اس کتاب میں درج ہیں اُن کا حقیقتاً اُس وقت مصنف کے ذہن میں آنا روحانی قوت ہی کا کرشمہ ہو سکتا ہے۔ بہرحال جو باتیں آج بڑی تحقیق و تفتیش کے بعد معلوم ہوئی ہیں۔ وہ بہت کچھ اس کتاب میں موجود ہیں۔

۱۷۸۶ء میں ہانمن نے ایک رسالہ "سنکھیا" کے زہر پر لکھا۔ جس میں اُس نے ایسی نادر باتیں جمع کیں کہ اب تک سمیات (Toxicology) میں یہ رسالہ بہت بلند پایہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ہانمن نے فن دواسازی کا ایک قرابادین بھی تیار کیا جو بہت مقبول ہوا۔ دراصل ہانمن کی ادبی و فکری زندگی کا آغاز ۱۷۷۷ء سے ہوا اور ۱۸۳۹ء میں پایۂ تکمیل کو پہونچا۔ ۱۸۰۶ء میں ہانمن نے اپنے وقت کے مشہور طبی رسالہ "ہوف لینڈ" میں ایک مقالہ لکھا جس کا عنوان میڈیسن آف ایکسپیرینس (Medicine of Exprience) تھا۔ اور یہ ہومیوپیتھک علاج کی پہلی شعاع تھی۔ ہانمن ہاکر صاحب کی مشہور "میٹیریا میڈیکا" کا ترجمہ بھی کیا۔ جسمیں اُس نے ادویہ کو تندرست اشخاص پر آز[illegible] کی سفارش کی تھی۔ ہومیوپیتھی کا لفظ سب سے پہلے ۱۸۰۷ء میں ہانمن نے اپنے قلم سے استعمال ۱۸۱۱ء میں "میٹیریا میڈیکا پیورا" نامی ایک مخزن الادویہ کے طرز کی ایک مبسوط کتاب شائع [illegible]

جس زمانہ میں ہانمن ایلوپیتھک اصولوں کی عدم صحت پر تنقید کر رہا تھا۔ اس کے خلاف [illegible] عام ہیجان پیدا ہوا۔ حتیٰ کہ ایلوپیتھک ڈاکٹر اور اُن کے ہمنوا دوافروش اُس کو شاہراہ عام سے [illegible] گذرنے نہیں دیتے تھے۔ اس عالمِ پریشانی میں اس غریب کو ایک جگہ رہنا نصیب نہیں ہوا [illegible]

کبھی کوتھن، کبھی پیرس۔ اسی پریشانی کے زمانہ میں ہانمن نے پرانے مرضوں کے علاج پر ایک لاجواب کتاب تصنیف کی۔ مگر افسوس کہ ۲ جولائی ۱۸۴۳ء روز یکشنبہ ہانمن کا انتقال ہوگیا۔ شہر پیرس کے گمنام قبرستان مانٹ میری نے اُس کو اپنے سینہ میں جگہ دی۔ یہ مشہور و معروف محب انسان ڈاکٹر مدتوں اسی زمین میں محو خواب رہا۔ بالآخر زمانہ نے اُسے یاد کیا اور اُس کی نہ مٹنے والی آواز اور اُس کے نہ ٹوٹنے والے قوانین کی گونج ایک مرتبہ پھر تمام دُنیا میں سنائی دی۔ اور قدردانوں نے اُس کی لاش کو گمنام قبرستان سے نکال کر مشہور اور ناموَر قبرستان میں منتقل کیا۔ اور اس کی یادگاریں قائم کیں، انجمنیں بنیں، سوانح عمریاں لکھی گئیں۔ غرض ہے

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق　　ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

تیس سال پہلے

زمانہ میں چانکیہ کی نیت کا ترجمہ شائع ہوا تھا۔ چنانچہ اگست نمبر ۱۹۰۹ء سے ہم نصائح چانکیہ کے عنوان سے اس کا جو جزو درج رسالہ ہوا تھا۔ اُس کے بعض اقتباسات ہدیۂ ناظرین زمانہ کرتے ہیں۔ اب یہ سب "نصائح چانکیہ" کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوگئی ہیں۔ شائقین منیجر زمانہ بک ایجنسی کانپور سے سات آنہ کے ٹکٹ بھیج کر طلب فرمائیں۔

۱۔ خیر خیرات افلاس کو۔ خوش خلقی بگڑی حالت کو۔ عقل جہالت کو اور عبادت خوف کو دفع کر دیتی ہے۔

۲۔ خواہش و طمع کے برابر دوسرا کوئی تکلیف دہ مرض نہیں ہے۔

۳۔ خدارسیدہ شخص کی نظر میں بہشت کی کچھ حقیقت نہیں ہوتی۔ بہادر آدمی کو اپنی جان تنکے کے برابر معلوم ہوتی ہے۔ جس شخص نے اپنے دل اور اعضا کو قابو میں کر لیا ہو اُس کو حسین سے حسین عورت بھی اپنا فریفتہ نہیں کر سکتی۔ جس کو کسی چیز کی خواہش نہیں ہوتی اُس کے نزدیک کل دُنیا ہیچ ہے۔

۴۔ سمندر میں بارش بے سود ہے، کیونکہ وہاں اُس سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ جن لوگوں نے پیٹ بھر کھانا کھالیا ہو وہ دوسرے سے غذا ملنے کی خواہش نہیں کرتے۔ اِس لئے ایسے لوگوں کو کھانا کھلانا بے سود ہے۔ جو دولتمند ہیں اُن کو خیرات دینا فضول ہے کیونکہ اُن کو دولت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ روزِ روشن میں چراغ جلانا بیکار ہے۔ کیونکہ آفتاب کی روشنی کے روبرو چراغ کی روشنی بے فائدہ ہے۔

۵۔ جو مفلس ہیں وہ دولت کی خواہش کرتے ہیں۔ جنکو بات کرنی نہیں آتی وہ گفتگو کرنے کی آرزو کرتے ہیں۔ انسان بہشت کی خواہش کرتا ہے۔ دیوتا نجات چاہتے ہیں۔ حاصل یہ کہ جسکی دسترس سے جو چیز باہر ہوتی ہے وہ اُسی کی خواہش کرتا ہے۔

کوہِ مری

(از حضرت طالب چکوالی، بی۔اے، ایل ایل بی)

خدا کی شان ہے عیاں فرازِ کوہسار سے
فضائے پُربہار سے، ہوائے خوشگوار سے

سروش کا پیام ہے نسیم کی زبان پر
رواں ہے بحرِ کیف کا سرودِ جوئبار سے

یہ پتیاں ہری ہری، یہ پھول رنگ رنگ کے
کہ حسن پھوٹ کر نکل رہا ہے شاخسار سے

ہوائے مشکبار ہے لٹا رہی سرورِ دل
خمارِ کیف عام ہے ہوائے مشکبار سے

مری کی مال روڈ ہے کہ جلوہ گاہِ حسن ہے
ہے غیرتِ گل و سمن جمالِ گلعذار سے

نمائشِ لباس و حسن وقتِ شام دیکھیے
چمک دمک غضب کی ہے لباسِ زرنگار سے

اُدھر ہے کوہسار کی اُدھر بہارِ گلرخاں
لڑی ہے آنکھ دیکھیے بہار کی بہار سے

مے طرب سے مست ساکنانِ باغ و راغ ہیں
خمارِ کیفِ حسن ہے کہ عرش پہ دماغ ہیں

جذباتِ عشرت

(از نانک چند عشرت بلرامپوری)

سکوں ناآشنا ہر شَے زمیں سے آسماں تک ہے
ہمارے مضطرب دل کا اثر دیکھو کہاں تک ہے

بتائیں کیا تجھے زاہد جنوں کی حد کہاں تک ہے
نظر محدود جب تیری حدودِ لامکاں تک ہے

امیدِ کامرانی آہ وہ ناکام کیا جانے
کہ جس کی سعی کی پرواز سعیِ رائیگاں تک ہے

دلِ بے مدعا اور آہِ بے تاثیر کی قیمت
نہ اس سے پوچھنا جس کی نظر سود و زیاں تک ہے

چھپاؤں کس طرح تجھکو بتا اے میرے دردِ دل
کہ رسوائی کا ساماں تو خموشی سے فغاں تک ہے

کہے دنیا مگر ہم تو جنوں اس کو سمجھتے ہیں
کہ جسکی فتنہ سامانی بہارِ بوستاں تک ہے

مرے دم سے ہے عزت خاکدانِ دہر کی عشرت
کہ رونق کارواں کی بس امیرِ کارواں تک ہے

سوامی رام تیرتھ

(از مسٹر بینی پرشاد بھٹناگر ایم۔اے)

سوامی رام تیرتھ جی مہاراج نہ صرف ہندوستان کے آسمان پر مہر درخشندہ کی طرح چمکے، بلکہ اُن کی تجلی سے دور دراز ممالک امریکہ وغیرہ نے بھی کسب نور کیا۔ اُن کی ولادت کا فخر پنجاب کے ضلع گوجرانوالہ کے ایک چھوٹے سے گاؤں مرالی والے کو ہے۔ وہ ۲۲ اکتوبر ۱۸۷۳ء کو دیوالی کی صبح کو پیدا ہوئے تھے اور ۱۹۰۶ء میں دیوالی کے دن قیود زماں و مکاں سے آزاد ہو کر اپنے مرکز اصلی یعنی لامکاں ولازماں میں شامل ہو گئے۔

جس طرح آفتاب کو اپنے سفر آسمانی میں دُنیا کو اپنے نور سے منور کرنے کے لئے گھنگھور گھٹاؤں اور بہت تاریکیوں سے جنگ وجہد کرنی پڑتی ہے۔ اسی طرح آپ کو اپنی دنیوی زندگی میں شروع سے آخر تک تکالیف و مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر آپ کسی مصیبت سے نہ گھبرائے بلکہ اپنی روحانی قوت سے سب پر فتح پاکر منزل مقصود پر جا پہونچے۔ جس طرح کالے کالے بادلوں کے مقابلہ میں آخرکار نور آفتاب ہی کی فتح ہوتی ہے اُسی طرح دُنیا کی مصیبتوں اور دشواریوں سے جنگ کرنے میں اُن کی نورانی شخصیت کو فتح حاصل ہوئی

دنیوی زندگی کا کوئی شعبہ نہیں جس میں اُنھوں نے اپنے آپ کو دوسروں کے لئے نمونہ یا آدرش نہ ثابت کیا ہو۔ جس طرح سری رامچندر جی مریادا پرشوتم یعنی دُنیا کے لئے ایک نمونہ ہوئے ہیں۔ اسی طرح یہ گوجرانوالہ کے رام بھی ہمارے لئے ایک قابل تقلید ہستی تھے۔ پیدائش کے بعد ہی وہ مادر مہربان کے سایہ عاطفت سے محروم ہو گئے تھے۔ چنانچہ اُنھوں نے غریبی اور مختلف مشکلات کی موجودگی میں اپنی تعلیم و تربیت کو درجہ کمال تک پہونچایا۔ اور پھر بلا چون وچرا اپنے مرشد کا حکم بجالاکر سول سروس کی ملازمت کے مقابلے میں پروفیسری کو ترجیح دے کر اپنے فرض منصبی کو انجام دیتے رہے اور جب آپ کو مادی اشیا کے فنا ہو جانے کا یقین کامل ہو گیا تو اپنا سب مال و دولت، جاہ و حشمت، ملازمت، گھربار بلکہ بیوی بچوں تک کو خیرباد کہہ کر اُنھوں نے سب کی محبت سے مُنہ موڑ مہاتما بدھ کی طرح ایک لازوال اور لافانی ہستی کی جستجو میں ہمالیہ کا راستہ لیا۔ اور دریائے گنگا کے کنارے برف پوش پہاڑ کی پُرخوف وادیوں اور غاروں میں مسئلہ توحید کی مزاولت کرتے ہوئے ہمہ اوست کی منزل میں پہونچ کر خدا شناس بلکہ خدارسیدہ ہو گئے۔

وہ خدا کو محیط کل یعنی سب ویاپک جانتے تھے جس طرح جب کسی شخص کو کوئی اعلےٰ چیز دستیاب ہوجاتی ہے تو وہ اُس کو اپنے عزیز و اقارب کو تقسیم کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح آپ نے بھی ہمالیہ کے گوشۂ تنہائی کے لطف و سرور روحانی کو چھوڑ کر شہروں و آبادیوں میں آکر دُنیائے دنی کے پریشان حالوں کو اسی سرور جاودانی سے مسرور کر کے اپنی سحر انگیز تحریر و تقریر سے سب کے دلوں کو مسخر کرلیا۔ اپنی محویت و مستی سے دوسروں کو محو و مست بناکر خود فراموشی طاری کردی۔ جس شخص کو اُن کے ہاتھ سے شرابِ وحدت کا ایک جرعہ بھی مِل گیا۔ اُس کی آنکھوں سے مجاز کا پردہ ہمیشہ کے لئے اُٹھ گیا۔

یوں تو سوامی رام تیرتھ نے جیسا کہ اوپر بیان ہوچکا ہے، اپنی زندہ مثال سے خود کو عوام کا مشکلکشا ثابت کردیا۔ مگر جو سب سے معرکۃ الآرا کام اُنھوں نے انجام دیا وہ ہندوستانی قوم کے زخمی دلوں پر مرہم رکھنے کا کام تھا۔ چاروں طرف مذہبی جنگ جاری تھی اور مذہب نفاق و جنگ و جدال کا باعث ہورہا تھا ہر طرف ہندو مسلمان جو ایک ہی خاک سے پیدا ہوئے اور ایک ہی رشتۂ اخوت میں وابستہ ہیں، خون خرابہ میں مشغول تھے۔ مسلمانوں کو ہندوؤں سے شکایت تھی اور ہندوؤں کا سوارتھ مسلمانوں کے اغراض و مقاصد سے ٹکرارہا تھا۔ آپ نے اہلِ ہند سے بار بار یہی پوچھا کہ آخر یہ انتشار اور یہ آپادھاپی کیوں ہے؟ ایک ملک کے افراد ہوتے ہوئے اِس قدر عناد کی کیا ضرورت ہے؟ مذہب کو فساد کی جڑ بنانا مذہب کی انتہائی توہین ہے۔ دُنیا بھر کے مذاہب اِنسانوں کو بہتر بنانے کے لئے ہیں۔ اِن کے بانی ایثار اور رحمدلی کے پُتلے تھے۔ جنھوں نے نسلِ اِنسان کو بہتر بنانے کے لئے اپنی زندگیاں ختم کردیں۔ مگر انسانی خودغرضی کا بھلا ہو، جس نے مذہب کے اصلی منشا کو فوت کر کے اپنی خودغرضی کا ذریعہ بنالیا۔ بہرحال سوامی رام تیرتھ نے مذہب کا مجاہد بن کر مذہب کا کفن پہن کر لوگوں کو مذہب کا سچا راستہ دکھایا۔ خدا لوگوں سے اوجھل تھا۔ عوام کا مذہب خدا کی راہ سے دُور تھا۔ خدا اور مذہب کے نام پر ہزاروں انسانوں نے تلواریں اُٹھائیں اور لاکھوں اسی تلوار کی گھاٹ اُتر گئے۔ لیکن اصلی مذہب مدت کا مرچکا تھا۔ ہندوستانیوں میں اُس کا جو جذبہ ہے وہ یہی مذہبی دیوانگی ہے۔ ہندو، سکھ، مسلمان ایک دوسرے کے ظلم و ستم کی داستانیں سُناتے ہیں۔ مگر اسمیں عوام کا کچھ قصور نہیں ہے۔ قوم کے اہلِ غرض عوام کے جذبات کو بھڑکا کر اپنی لیڈری قائم کرنے کی فکر کرتے ہیں اور سادہ لوح لوگ اُن کی تحریروں، تقریروں سے بھڑک اُٹھتے ہیں اور ملک میں مذہبی جنگ چھڑ جاتی ہے، جس کے سیکڑوں بےگناہ شکار ہوجاتے ہیں۔ ایسی صورت میں کسی عالم باعمل و خدا رسیدہ کی ضرورت ہوتی ہے جو خودغرضی سے مبرا اور مذہب کی قید سے آزاد ہو کر سب کو ایک ہی ذات واحد کا مظاہرہ سمجھے۔ ایسا ہی شخص باہمی محبت اور عالمگیر اخوت کا سبق پڑھا سکتا ہے۔

ایسی ہی سوامی رام تیرتھ کی شخصیت تھی چنانچہ آپ نے اپنی تقریر و تحریر بلکہ ہر قول و فعل سے اس محبت باہمی کی تلقین کی اور لوگوں کو سمجھایا کہ ع

بنی آدم اعضائے یک دیگراند

پھر یہ باہمی فتنہ و فساد کیسا؟ آپ نے اسی بات کی تلقین کی کہ خود غرضی کو چھوڑ کر دوسروں کیلئے قربانی کرنا چاہئے۔ گذشتہ حالات یہی پکار پکار کر زبانِ حال سے کہہ رہے ہیں ؎

مرنا بھلا ہے اُس کا جو اپنے لئے جئے — جیتا ہے وہ جو مر چکا انسان کے لئے

اس مذہبی اتفاق کی بیخ کنی کے لئے سوامی جی نے "اکبر دلی"[1] کے عنوان سے ایک معرکۃ الآرا مضمون لکھا جس میں آپ نے لکھا کہ :-

"غیر مذہب والے سے بھی سلوک کرو، مخالف سے بھی محبت کرو، شخصی عداوت کو جڑ سے اکھاڑ ڈالو وغیرہ وغیرہ۔ کہنا آسان ہے لیکن کرنا بہت کٹھن ہے۔ پر ہاں کٹھن ہو خواہ کٹھن سے بھی کٹھن ہو۔ عموماً ہمیشہ اور خصوصاً آجکل ہندوستان میں بغیر اس اصول کو عمل میں لائے اتفاق قومی اور اتحاد ملکی ہرگز ہرگز پیدا نہیں ہو سکتا۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ جس مذہب میں پیدا ہوئے اُسے چھوڑ دو۔ ڈھلمل یقین یار کا بیہ مذہب بن جاؤ۔ البتہ ہم یہ ضرور کہتے ہیں کہ جس مذہب کی چار دیواری میں پیدا ہوئے اُس سے قدم باہر نکالنے کو گناہ سمجھنا بذات خود روحانی خودکشی کا گناہ ہے۔ کسی چار دیواری میں پیدا ہونا اور پرورش پانا تو امر لازمی ہے البتہ اُس چار دیواری میں بند رہ کر اُسی میں مرنا پاپ ہے"

ان کی اس تحریر کا اثر کیوں نہ ہوتا۔ بقول لیکہ ؎

عشق ہو راست کرامات نہ ہو کیا معنی — حسب ارشاد ہر اک بات نہ ہو کیا معنی

بہرحال آپ کے روحانی جذبہ کا یہ اثر تھا کہ ہندو، مسلمان، عیسائی سب آپکے سامنے اپنے مذہبی اختلافات چھوڑ کر محبت کے رشتہ میں منسلک ہو جاتے تھے۔

ایک اور جگہ وہ یوں فرماتے ہیں کہ ؎

"ظاہری ہندو پن، مسلمان پن، عیسائی پن وغیرہ مختلف پیالوں کی طرح ہیں، جنہیں وقتاً فوقتاً عالمگیر عشق کا پاکیزہ دودھ پلانے کی کوشش ہوتی رہی ہے لیکن ان سب پیالوں کا دودھ ان سب مشربوں کی جان نفی انانیت یا عشق آلہٰی ہے ؎

مذہب عشق از ہمہ ملت جدا است — عاشقان را مذہب و ملت خدا است

---

[1] یہ مضمون آپ نے رسالہ زمانہ کے لئے تحریر فرمایا۔ اور یہ زمانہ اکتوبر ۱۹۰۵ء میں شائع ہوا ہے۔

پیالہ پرستی سے نفاق بڑھتا ہے یہ سب پیالے بذات خود بُت ہیں۔ آخر یہ بُت پرستی کب تک ؟ متبرک ہے وہ مست حقیقی جو بتوں کو چھوڑ کر اصل مالک اور مجاز سے نکل کر حقیقت کو پہونچا۔ سرورِ ذات کی وجہ سے پیالہ ہاتھ سے چھوٹ کر ٹوٹ پھوٹ گیا۔ ع

قدحے بلبم بود شکستی ربی

پھر فرماتے ہیں :-

"بلحاظ قوم و ملت و ملک ہر فرد بشر کے ساتھ وہ اُنس جو سچا انسان بناتا ہے اتنا جوش سے بھرا پیدا کرو جو کینہ میں صرف کر رہے ہو ملک کی مٹی تک کو عزیز بنا کر رکھو۔ یہی دُنیا جنتِ رضوان کو مات نہ کردے تو کہنا۔ کیا تم نے کبھی دل کو عداوت سے بالکل پاک اور سینہ کو کینہ سے شیشے کی طرح صاف کرنے کا تجربہ کیا ہے ؎

وفا کنیم و ملامت کشیم و خوش باشیم　　　که در طریقت ما کافریست رنجیدن

اگر یہ امتحان ابھی تک نہیں کیا تو تم کو اس کے نتیجوں کو رد کرنے کا بھی اختیار نہیں۔ یوگ درشن میں لکھا ہے کہ جب تم میں کامل محبت (اہنسا) مضبوط طور پر قائم ہو جائے تو آس پاس کے جنگلی درندوں اور گزندوں میں بھی عداوت نہیں رہ سکتی۔ اگر عمل اور ردِ عمل (Action or Reaction) کے توازن کا مسئلہ ہے تو کیوں ایسا نہ ہوگا۔"

کسی شاعر نے بھی ذیل کی نظم میں اسی تمنا کا اظہار کیا ہے ؎

گل و لالہ سے ہے رنگِ بہارِ بوستاں قائم　　مہ و خورشید سے ہے آب و تابِ آسماں قائم
ہے دو آنکھوں سے حسنِ روئے یارِ دلستاں قائم　　یوں ہی ہندو مسلمانوں سے ہے ہندوستاں قائم
گلِ ہندوستاں کا رنگ ہندو اور بو مسلم　　تنِ ہندوستاں کی سانس ہندو اور لہو مسلم
تمھیں وہ ہو جو تھے آفاق میں تہذیب کے بانی　　تمھیں کہلاتے ہو سرمایہ دارِ علمِ روحانی
تمھیں علم و ہنر اخلاق مذہب میں تھے لاثانی　　تمھارے سامنے یونان و روما بھرتے تھے پانی
بپا ہے شور اقوامِ جہاں میں سو گئے ہندی　　خدا کی شان دیکھو کیا تھے اور کیا ہو گئے ہندی
محبت کرکے آپس میں دلوں پر پاؤ تم قابو　　ہر ایک پر پڑھ کے پھونکو پریت اور پریم کا جادو
نظر آئیں مسلمان کرشن جی کے شیفتہ ہر سو　　جنابِ مصطفےٰ کا ہو ثنا خواں ہر بشر ہندو
غرض اپنے وطن سے غیریت کافور ہو جائے　　تعصب کا اندھیرا سب دلوں سے دور ہو جائے

سوامی رام تیرتھ ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ :-

"اکبر دل کا ہندی یا سنسکرت ترجمہ ہوگا 'مہاتما' (مہا+آتما) یعنی 'بزرگ روح' وہ آدمی اکبر دل یا مہاتما ہرگز نہیں ہو سکتا جس کا دل تنگ اور محدود ہو کر چھوٹے سے دائرہ میں بند ہو جائے۔ جس کی ہمدردی صرف ہندو، مسلمان یا عیسائی سے وابستہ ہو اور اس سے آگے نہ جا سکے۔ وہ تو اصغر دل ہے 'اکبر دل' نہیں۔ آتما ہے مہاتما نہیں"

ہمارے ملک میں ادھر تو ودوان پنڈت اور ادھر عالم فاضل مولوی صدیوں سے عملاً اتنا نہ سمجھے کہ چونکہ ہم ہندو اور مسلمان ایک ہی ماں (ہندوستان) سے پیدا ہوئے ہیں اور اُس کے دودھ سے پلتے ہیں۔ چونکہ ہم ہندو اور مسلمان دونوں کی رگوں میں ایک ہی خون ہے جو ایک ہی نباتات ایک ہی آب و ہوا سے پیدا ہو رہا ہے پھر ہم حقیقی بھائی نہیں تو اور کون ہیں؟ محبت وہ چیز ہے کہ اس کی وجہ سے دوسرے کی سختی بھی گوارا ہوتی ہے۔ پھر صدیوں سے ہندوستان میں رہتے ہوئے مسلمان ہندوؤں سے کیوں اتنے دور رہتے ہیں۔ ہندوؤں سے ہمارا کہنا ہے کہ مریادا پرشوتم بھگوان نے شبری (بھیلنی) کے جھوٹے بیر کھائے، غریب ملاح سے دوستی کی، بندروں سے محبت کی۔ دشمن کے بھائی کے ساتھ شفقت سے پیش آئے۔ پھر تم مسلمانوں کی شکایتیں کیوں نہیں بھول جاتے؟

گر ز دست زلف مشکینت خطائے رفت رفت ۔۔۔ ور ز ہندوئے شما بر ما جفائے رفت رفت
گر دلے از غمزۂ دلدار باری برد برد ۔۔۔ درمیان جان و جاناں ماجرائے رفت رفت

غرض تعصب کے دور کرنے کا کیا اس سے بڑھ کر اور کوئی نسخہ ہو سکتا ہے۔ جو اس حکیم حاذق نے کج فہم مریضانِ مذہب کے لئے تجویز کیا؟ اس کے استعمال سے ہم کو شفائے کلی حاصل ہوگی اور ہماری روحانی قوت عود کر آئے گی اور آپس کی خانہ جنگی رفع ہو کر باہمی محبت پیدا ہوگی جس کی وجہ سے دین دنیا دونوں میں ہم کو لا انتہا ترقی اور لازوال سرور حاصل ہوگا۔

ادبِ لطیف (ڈرامہ نمبر)

اُردو کے مشہور رسالہ "ادبِ لطیف" نے ابھی حال ہی میں افسانہ نمبر شائع کیا تھا جو بہت ہی مقبول ہوا۔ غالباً اسی کامیابی اور حوصلہ افزائی پر اس رسالہ نے اپریل اور مئی کی مشترکہ اشاعت کو ڈرامہ نمبر کی حیثیت سے شائع کیا ہے، جو ۲۷ مضامین نظم و نثر کا اچھا خاصہ مجموعہ ہے۔ ڈراموں کے علاوہ پانچ مضامین جو فن ڈرامہ کے متعلق درج کئے گئے ہیں، بہت ہی پُر از معلومات ہیں۔ نظموں میں جناب احمد قاسمی اور الطاف مشہدی کی نظمیں قابل قدر ہیں۔ اس نمبر کی ضخامت تقریباً ۲۲۵ صفحات اور قیمت ۱۲ آنے ہے۔ منیجر مکتبہ اُردو لاہور سے طلب فرمایئے۔

تمھاری یاد

(از حضرت ثاقب کانپوری)

ضیائے ماہ سے جب نور چھنتا ہے فضاؤں میں   کسی کا حسن کھنچ آتا ہے جب نگیں شعاعوں میں
دھندھلکے میں سحر کے جب ستارے مسکراتے ہیں   چمن میں جب طیورِ خوشنوا نغمے سُناتے ہیں
مَیں تم کو یاد کرتا ہوں، مَیں تم کو یاد کرتا ہوں

تقاطر ابر کا ہوتا ہے جب صحنِ گلستاں پر   بہارِ سبزہ چھا جاتی ہے جب سارے بیاباں پر
نمی سے جب سکونِ اضطرابِ قلب ہوتا ہے   عجب کیفیتوں میں جب دلِ بیتاب سوتا ہے
مَیں تم کو یاد کرتا ہوں میں تم کو یاد کرتا ہوں

سکوں طائر کو جب ہوتا ہے اپنے آشیانوں میں   تمنا سوتی ہے جب خوابآور داستانوں میں
فنا ہو جاتے ہیں جب دن کے محشر خیز ہنگامے   بپا ہوتے ہیں جب شب کے سکوں انگیز ہنگامے
مَیں تم کو یاد کرتا ہوں، مَیں تم کو یاد کرتا ہوں

مَیں اِس دنیا سے کوسوں دُور جب ہوتا ہوں صحرا میں   میں کھو جاتا ہوں جب خود آپ ہی اپنی تمنا میں
مری تخئیل جب ہوتی ہے میری مونس و ہمدم   ہر اک ذرہ سُناتا ہے مجھے جب نغمۂ پیہم
مَیں تم کو یاد کرتا ہوں، میں تم کو یاد کرتا ہوں

(۲)

مرا فریبِ تخیل تو بار بار نہ پوچھ   قفس نصیب ہوں میں حاصلِ بہار نہ پوچھ
گذر رہی ہے مری عمر اک نشاط کیساتھ   فراق میں تو مرا لطفِ انتظار نہ پوچھ
دفورِ غم سے کہیں آنکھ اشکبار نہ ہو   قرار ہے جو مرے دل میں وہ قرار نہ پوچھ
وہ جی رہے ہیں ترے وعدہ ہائے فردا پر   بلاکشانِ محبت کا انتظار نہ پوچھ

زبان کا مسئلہ

اور

میرے معترض

(از حق پرست)

"مگر مجھ کو خوف ہے کہ میں نے جو کچھ کہا ہے وہ غالباً ایک وسیع طبقہ کے لئے نہایت نامطبوع"
"ثابت ہوگا لیکن افراد کی زندگیوں کی طرح قوموں کی زندگی محض خوش آیند واقعات کا تسلسل نہیں"
"ہوتی۔ نہ صرف نا خوشگوار اور تکلیف دہ بلکہ مہیب اور خطرناک واقعات بھی پیش آتے ہیں اور"
"زندگی کی یہ شرط ہے کہ اُن سے آنکھ نہ میچی جائے۔ بلکہ اُن کو اُن کے اصلی اور حقیقی رنگ میں قرار"
"واقعی طور پر دیکھا جائے اور نہایت تدبر اور سرگرمی سے اُن خطروں کے ازالہ کی کوشش کی جائے"
"جو قومی زندگی کے درپے ہیں"

اردو۔ ہندی۔ ہندستانی والے اپنے ابتدائی مضمون کے ابتدائی کلمات میں میں نے حسب ذیل عرض کیا تھا۔ جناب اڈیٹر صاحب نے "زمانہ" بابت اپریل ۱۹۳۹ء میں اپنے نوٹ میں یہ تحریر فرمایا ہے کہ میرے خلاف زیادہ اور تائید میں کم خطوط وصول ہوئے ہیں۔ ان میں منجملہ بدایونی صاحب کا خط بھی تھا جنھوں نے میری ذہنیت کو غلامانہ اور میرے مضمون کو ہندو مسلم اتحاد میں رخنہ اندازی کا باعث قرار دیا ہے نیز "زمانہ" بابتہ جون ۱۹۳۹ء میں مولانا ح۔ ی ع۔ ایم۔ اے (جنھیں آیندہ میں بنظر سہولت صرف مولانا "ح" لکھوں تو مجھکو امید ہے کہ ممدوح مجھکو معاف فرمائیں گے۔) کے مضمون سے ثابت ہے کہ میرا اندیشہ غلط نہ تھا۔

ایک ایسے مضمون کے متعلق جس پر مختلف فرقوں کے مفاد و اغراض متصادم ہوتے ہوں اختلاف رائے کی توقع رکھنی ہی چاہیئے لیکن رائے کے اختلاف کے اظہار کے لئے کیا یہ ضروری ہے کہ طعن و تشنیع سے بھی کام لیا جائے اور مولینا ح یا مولنا بدایونی کی طرح اڈیٹر صاحب کو ترغیب

(یا دھمکی؟) دیجائے کہ وہ میرا بائکاٹ کریں اور میرے مضامین کی اشاعت سے احتراز کریں۔ ایک طرف مسلم رواداری کے دعوے اور دوسری طرف یہ علی مشورے!

مجھ ناچیز کو دانائی کا دعویٰ نہیں لیکن میں بھی ایک کثیر تعداد کے جذبات و خیالات کی ترجمانی کر رہا ہوں۔ اس لئے مجھکو نادان کہکر ٹالنے سے کام نہ چلے گا۔ کیونکہ مسلمانِ ملک کا مجھ جیسے 'نادانوں' ہی سے سابقہ ہے۔ اپنے 'جی' کو 'زبان' سے کہاں تک بچایئگا؟ ضرورت تو بمصداق اس کے کہ "با ہمیں مردماں بباید ساخت" انھیں یا تو قائل کرنا پڑیگا یا ان سے معقول ہونا پڑیگا۔ اور اگر کسی مسئلہ پر اتحادرائے یا اتحادِ عمل ممکن نہو تو خوشی سے یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ ہمارے راستے مختلف یعنی علٰحدہ علٰحدہ رہیں گے۔ سوائے اسکے کہ "نازی" طریقوں پر ایمان ہو کہ اپنی رائے اور اپنا پروگرام "ڈنڈوں" کے زور سے منوائیں گے۔ یہ نازی طریقے ہی تو ہیں کہ مخالف رائے کو اظہار کا موقع نہ دیا جائے جس کی کوشش بنگال اور پنجاب میں خاص طور پر ہو رہی ہے۔ اور ایک اور جگہ تو گلے گھونٹ دیئے گئے ہیں۔

آخر مسئلہ زیر بحث میں اس قدر ناراضگی اور طعن و تشنیع کا کیا سبب ہے؟ میں نے تو اپنے مضامین میں صرف علامہ شبلی مرحوم، مولٰنا سلیمان ندوی، ڈاکٹر عبداللطیف وغیرہ جیسے بلندپایہ مسلم علما و مفکرین کے اس دعوے ہی کی تائید کی ہے کہ "اردو اسلامی زبان ہے" یا مولٰنا نیاز فتحپوری وغیرہ کے اس خیال کی کہ ہندوؤں کو اردو لکھنا نہیں آتا۔ اس تائید میں میں نے کچھ واقعات پیش کئے ہیں اور حقیقتوں سے استدلال کیا ہے۔ مجھ کو افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مکرمی مولٰنا ح نے میرے مضامین بغور ملاحظہ نہیں فرمائے ورنہ وہ یہ نہ کہتے کہ "مسلمان مصنفین ہندو لکھنے والوں کی خدمات کا اعتراف نہیں کرتے۔ اس لئے بقول حق پرست صاحب ہندوؤں کو چاہیئے کہ وہ اردو زبان سے اپنا رشتۂ تعلق یکسر منقطع کرلیں۔" کیونکہ میرا خیال شروع ہی سے یہ ہے کہ اردو ہندوؤں کی زبان ہی نہیں۔ میں نے اسی حقیقت کو واضح اور ثابت کرنے کی کوشش کی ہے چنانچہ مجھکو شکایت درکنار اس سے سروکار ہی نہیں کہ مسلمان حضرات اردو کے ہندو ادیبوں کے خدمات کا اعتراف کرتے ہیں یا نہیں۔ میری نظر میں جس بات کو منشی جگر صاحب مسلمان بھائیوں کی بے اعتنائی سمجھتے ہیں، اس سے غافل ہندوؤں کی آنکھیں کھلنے میں مدد ملتی ہے۔ اسی لحاظ سے میں نے اپنے پہلے مضمون میں لکھا تھا کہ ہمیں اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے مولٰنا نیاز فتحپوری وغیرہ کا شکر گذار ہونا چاہیئے۔

اب اگر مجھ سے اس لئے ناراضگی ہے کہ میں نے ہندی کی تائید کی ہے تو مولٰنا ح اور

اُن کے ہم خیال بزرگوں کی رواداری ظاہر ہے۔ آپ اُردو کو مشترک زبان سمجھتے ہیں میں ہندی کو۔ میری ہندی کی تائید کو اگر اشتراکِ عمل اور ہندو مسلم اتحاد کے مغائر سمجھا جائے تو یہ الزام اُردو کے مؤیدوں پر بھی عائد ہوتا ہے۔ کیونکہ ہندی جس آسانی سے کُل ہند میں سمجھی جاسکتی ہے اُردو نہیں سمجھی جاسکتی۔ اس سے قطع نظر جب یہ ثابت ہے کہ اُردو اسلامی زبان ہے اور ہندو اس میں وہ کمال حاصل نہیں کر سکتے جو مسلمان بھائیوں کا حصہ ہے جس کی تائید خود مولانا ح صاحب کے اس جملہ سے ہوتی ہے:-

"آزاد نے جو معیار قائم کیا وہ اتنا بلند ہے کہ اُس پر ہندو کیا بعض مسلمان شعرا بھی پورے نہیں اُترتے"

تو آخر ہندوؤں کو بھی یہ سوچنا ضروری ہے یا نہیں کہ اُنھیں درحقیقت اپنی قوتیں کس طرف صرف کرنی چاہئیے اور کس زبان سے اپنا رشتہ مستحکم باندھنا چاہئیے؟ یا وہ یوں ہی بے زبان بنے دربدر کبھی اُردو اور کبھی انگریزی کے .... کی خاک چھانتے پھریں؟ اگر آپ کی رواداری اس کو تسلیم کرسکتی ہے کہ بیچارے ہندوؤں کو بھی آزاد خود مختار اور مخصوص زندگی کا حق ہے تو میں عرض کرتا ہوں کہ اس قسم کی زندگی کی جستجو کرنے والوں کا خیال قدرتاً اُس زبان کی طرف جائیگا جس نے ہندوؤں کو سورداس، کبیرداس، تلسی داس اور میرا بائی جیسے لافانی شاعر دئیے جنھوں نے ہندو قوم کے خیالات اور جذبات کو اُن کی زندگی کے ایک نہایت نازک مرحلہ پر ایسا رُخ دیا کہ اُن میں ایک نئی زندگی پیدا ہوگئی اور اگر ہم اس وقت زندہ ہیں تو ایک حد تک انھیں بزرگوں کا ممنون ہونا ہے۔ کیا یہ اعجاز ہندوؤں کے حق میں کسی اُردو لکھنے والے سے ممکن ہوا ہے؟

اگر میرا گناہ یہ ہے کہ میں نے سردست انگریزی ہی سے لنگوا فرانکا کا کام لینے کی صلاح اس لئے دی ہے کہ عام زبان کا مسئلہ مزید جھگڑوں کا باعث ہے تو خود مکرمی ح صاحب نے بھی تو بالآخر یہی فرمایا ہے، اور مجھ سے کہیں زیادہ زوردار مگر مایوس کن الفاظ میں کہ:-

"یہ کوشش بالکل فضول ہے کہ پہلے زبان ایک کی جائے اس کے بعد دل ملائے جائیں۔ اس کوشش میں دل اور پھٹ جائیں گے اور نہ زبان ایک ہوئی ہے اور نہ ہو گی"

ملاحظہ ہو کہ اِن زوردار الفاظ میں اپنے اِس خیال کے اظہار کے باوجود مولانا ح، کا یہ فرمانا کہ "اڈیٹر صاحب زمانہ" کو اِن جیسے (یعنی مجھ جیسے) حضرات کے مضامین اپنے اس مباحثہ میں شامل نہ کرنا چاہئیے جو واقعی اُنھیں لوگوں کے لئے مخصوص ہے جن کے نزدیک مشترک قومی زبان کی ہندوستان

ضرورت ہے" کس قدر حیرت انگیز ہے۔ بالخصوص جبکہ میرے مضامین پکار پکار کر کہہ رہے ہیں
میں ایک مشترک زبان کے امکان میں یقین رکھتا ہوں۔ چنانچہ میں نے اپنے اس سے پہلے مضمون
میں نہایت وضاحت و صراحت سے بتلایا ہے کہ وہ عام زبان کیا ہو سکتی ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے
کہ برادران وطن کے منشا و مقصد کے (جو در اصل کل ہند کے نقطۂ نظر سے قومی نہیں ہے) خلاف بیٹھتی
ہے۔ اور جب اُن کے راستے میں ایسی چیزیں حائل نظر آتی ہیں تو وہ اس درجہ تلملا اُٹھتے ہیں کہ انھیں
برگزیدہ ہستیوں کے احترام اور ایک وسیع طبقہ کے احساسات کا بھی خیال نہیں رہتا۔ چنانچہ مولٹناء ح'
"ہندی اتھوا ہندوستانی" کو لیکر لفظ "اتھوا" کی پھبتی اڑاتے ہوئے یہاں تک لکھ جاتے ہیں کہ "کیا
وہ اس لفظ (اتھوا) کو استعمال کرتے ہوئے محجوب نہیں ہوتے۔"

مجھکو در اصل حیرت ہے کہ ایک طرف تو یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ مسلمانوں نے ہندی اور سنسکرت
کی نشو و نما میں حصہ لیا اور دوسری طرف صورت حال یہ کہ "اتھوا" جیسے معمولی لفظ کا سمجھنا دشوار ہے
جو سی۔ پی۔ مہاراشٹر۔ مدراس۔ گجرات۔ بنگال وغیرہ میں ہر جگہ سمجھا جاتا ہے۔ یعنی کل ہند کی پڑھی لکھی
آبادی کا کم از کم ۳/۴ حصہ اس لفظ کو بخوبی سمجھتا ہے۔ مہاتما جی کی زبان سے یہ لفظ "اتھوا" اسی برجستگی
و بے ساختگی سے نکلا ہے بلکہ اُس سے کہیں زیادہ جس طرح بہ قول مولٹناء ح، مسلمان حضرات عربی
فارسی الفاظ بولتے ہیں: یہ بھی خوب استدلال ہے کہ:۔

"شمالی ہند کا مسلمان کبھی اس لفظ کو نہیں سمجھ سکتا اور جب مسلمان نہیں سمجھتا تو آپ کیسے کہتے ہیں کہ
یہ زبان صاف اور سادہ ہے جبکہ ملک کا ایک گروہ کثیر اس زبان کو نہیں سمجھ سکتا۔"

میں نے مانا کہ مسلمان بھائیوں کی ایک بڑی تعداد پنجاب اور سرحدی علاقہ میں ہے (گو وہاں
بھی اُن کی مادری زبان اُردو نہیں بلکہ پنجابی یا پشتو ہے جن کا سنسکرت سے زیادہ لگاؤ ہے۔ مگر اُن
کے لئے اُردو مادری زبان بنائی جا رہی ہے) لیکن بنگال میں بھی تو مسلمان اکثریت میں ہیں اور وہاں
اُن کی مادری زبان بنگالی ہے۔ بنگالی پڑھے لکھے "اتھوا" کے معنی بخوبی سمجھتے ہیں (اس بحث میں لفظ
"اتھوا" بمعنی "یا" اسی قسم کے دوسرے ہندی الفاظ کی جانشینی کر رہا ہے) اسی طرح جو مسلمان تلنگانہ
کرناٹک، مہاراشٹر یا گجرات وغیرہ میں بستے ہیں اُن کی مادری زبان مقامی ہے، اور وہ لوگ بھی
اس قسم کے الفاظ بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ ہندوؤں کو چھوڑیئے کیونکہ سوائے "اُردو زدہ" ہندوؤں
کے (جن کی تعداد (نسبتاً) بہت کم ہے) باقی سب ہندو ہر جگہ کے اس قسم کے الفاظ بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔
اب فرمائیے کہ کثیر گروہ سمجھنے والوں کا ہوا یا نہ سمجھنے والوں کا؟

مگر سونیتا کمار نے اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز باتیں کہی ہیں، مثلاً یہ کہ :۔

" سنسکرت کا بولنے والا ہندوستان میں ایک بھی نہ ملے گا۔ مگر سمجھنے والے بھی دو چار ہی ملیں گے"

مجھکو یقین ہے کہ اس جملہ کے پڑھنے والے حضرات کے لئے یہ لاعلمی یا نادانی باعث تفنن طبع ہوئی، ہوگی۔ کیونکہ کون نہیں جانتا کہ ہر یونیورسٹی میں سنسکرت کی تعلیم کا انتظام ہے حتیٰ کہ عثمانیہ یونیورسٹی تک میں۔ اور ان یونیورسٹیوں کی تعداد ہی دو چار کے کئی چند ہو جاتی ہے تعلیم حاصل کرنے والے علاوہ ہیں خاص سنسکرت کی یونیورسٹیاں علیحدہ موجود ہیں جیسے بنارس، جے پور وغیرہ میں۔ آریہ سماجیوں کے درجن سے اوپر گروکل ہیں جو سنسکرت تعلیم کے گہوارے ہیں، اور ٹکری رت، کو یہ معلوم کرکے یقیناً حیرت ہوگی کہ اس ناچیز کے شناساؤں میں دو ایک خاندان ایسے ہیں جن کے گھر کی زبان کلاسیکل سنسکرت ہے[^1]۔

ارد و کے موئید وقت بے وقت یہ راگ الاپتے ہیں کہ سنسکرت مردہ زبان ہے۔ مجھکو حیرت ہے کہ اسکو میں پرو پاگنڈہ پر محمول کروں یا لاعلمی پر۔ میرے خیال میں یہ الزام دونوں ہی پر محمول کیا جاسکتا ہے۔ ورنہ ہر ذی فہم جانتا ہے کہ زبانوں کی صورت اور رنگ ڈھنگ پر وقت اور ماحول کا ہمیشہ اثر ہوتا ہے۔ آج ایران میں فارسی کی وہ شکل نہیں رہی جس کا نقشہ ہم گلستاں اور بوستاں میں دیکھتے ہیں جس نے فارسی کی ان کلاسیکل چیزوں ہی کا مطالعہ کیا ہے اُس کو آجکل کی ایرانی زبان بالکل ایک دوسری ہی زبان معلوم ہوگی۔ اسی طرح آجکل کی انگریزی پڑھے لکھوں کے لئے (Chaucer) چاسر اور اس کے زمانہ کی انگریزی عجیب وغریب معلوم دیگی۔ قواعد میں، تلفظ میں، املا میں، طرز بیان میں اس قدر تبدیلیاں آچکی ہیں کہ تاوقتیکہ اُس پرانی انگریزی کی خاص طور پر تعلیم حاصل نہ کی جائے اُس کا سمجھنا خود اہل زبان کے لئے مشکل ہو گیا ہے۔ لیکن کیا اس بنا پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ فارسی یا انگریزی زبانیں مرچکیں، سنسکرت نے بھی امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ روپ بدلے۔ ایک زمانہ تھا کہ اس نے پالی روپ اختیار کیا تھا۔ آج یہ ان صوبہ جاتی زبانوں بنگالی، گجراتی، مرہٹی وغیرہ کی صورت میں نمایاں ہے جو پراکرت ہیں۔ پراکرت مشتق ہے پرکرت سے (جس کے معنی ہیں قدرتی، کسی مصدر سے نکلنے والی، سلسلہ رکھنے والی یعنی تبدیل ہونے والی) اور جو زبان ویدک کہلاتی ہے اُس زبان سے مختلف ہے

[^1]: ناظرین کو یاد ہوگا کہ پچھلے سال بنارس کے پنڈتوں نے آنریبل سری سمپورنانند وزیر تعلیم صوبہ متحدہ کو خالص سنسکرت زبان میں خیر مقدمی ایڈریس پیش کیا تھا، اور ممدوح نے بھی ادق ہندی میں اس کا جواب دیا تھا۔ جس کے متعلق ہمارے بعض معاصرین نے غلط فہمی پھیلانے کی کوشش کی تھی۔ ایڈیٹر زمانہ نے بنارس کے ایک مشہور وید کو اپنے عزیزوں اور شاگردوں سے ہر وقت سنسکرت زبان میں گفتگو کرتے ہوئے خود سنا ہے (ا۔ ز)

جو سنسکرت کہلاتی ہے۔ دونوں کے قواعد میں بھی فرق ہے۔ جب سنسکرت کی قواعد سے (جو پانینی کے سوتروں پر مبنی ہے) ویدک منتروں کے معنی معلوم کرنے کی کوشش کی گئی تو سخت ناکامی ہوئی اور اُول جلول معنی برآمد ہوئے لیکن جب نروکت سے مدد لی گئی جو ویدک بھاشا کا قاعدہ ہے تو بڑے بڑے رموز منکشف ہوئے اور جو چیزیں بے معنی معلوم ہوتی تھیں وہ بڑے گہرے اور خوبصورت مطالب کی حامل ثابت ہوئیں۔

ہمارے بزرگ یہ خوب سمجھتے تھے کہ کال کے پربھاؤ سے یعنی زمانہ کے اثر سے دنیا کی کوئی چیز محفوظ نہیں رہ سکتی۔ ہر چیز میں تبدیلی ہونا ضروری ہے۔ لیکن تبدّل وتغیّر کے درمیان میں اگر کوئی معیاری اور معراجی چیز پیش نظر رہے تو اس ردّو بدل کا رُخ بھدّے پن کی طرف نہ ہونے پائے گا۔ اور تبدّل وتغیّر نفاست وخوبصورتی کے ساتھ ہم آہنگ رہیں گے۔ لہٰذا اُنھوں نے ایک معیاری چیز پیدا کی جس کا نام سنسکرت رکھا تاکہ وہ ہمیشہ ایک خوبصورت ماڈل اور الفاظ ومعانی ومطالب کے مخزن کا کام دیتی رہے۔ سنسکرت کے معنی ہی "معیاری" یا معراجی" کے ہوتے ہیں، یعنی وہ زبان جس کا سنسکار کیا گیا ہے یعنی جس کو ایک معیار ومعراج پر لایا گیا ہے۔ اس کے مقابلہ میں زبان کا ایک دوسرا نام پراکرت رکھا یعنی وہ زبان جو سابقہ سلسلہ کو قائم رکھتے ہوئے وقت اور ماحول کے زیر اثر صورت بدلتی ہے۔ سنسکرت صدیوں سے ایک خوبصورت ماڈل اور الفاظ ومعانی کے اتھاہ مخزن کا کام کمال خوبی سے انجام دے رہی ہے۔ اور اُس کے زیر اثر پراکرت برابر اپنے روپ بدلتی جارہی ہے، اور اس وقت اِن سو بہ جاتی زبانوں کی صورت میں نمایاں ہے۔

جس اختصار کے لئے مولنٰا ؒ، عربی اور فارسی کی سفارش فرماتے ہیں اُس کا سنسکرت میں بدرجۂ اتم لحاظ ہے۔ اور اس معاملہ میں دُنیا کی کوئی زبان اس پر سبقت نہیں لے جاسکتی۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے بعد اُمید ہے کہ احباب یہ بے مغز دلیل پیش نہ کیا کریں گے کہ سنسکرت مُردہ زبان ہے اور عربی و فارسی مردہ زبانیں ہیں۔ اس لئے مُلکی زبان کی بناوٹ میں اِن غیر مُلکی زبانوں سے امداد لی جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے کوشش کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی۔ اور اُردو ایک محدود طبقہ ہی کی زبان رہیگی۔ کُل ہند میں اس کا رواج ناممکنات سے ہے۔ عربی فارسی زندہ زبانیں اپنے اپنے ملک کے لئے ہونگی، جیسے فرنچ۔ جرمن یا دنیا کی کوئی اور زبان ہوسکتی ہے۔ ہمارے دیس میں خود جب جیتی جاگتی زبانیں موجود ہیں تو آپ انھیں سے رشتہ جوڑئیے، اِن دُور دراز ممالک سے

ہمیں کیا واسطہ؟

دراصل مسلمان بھائی (جو اکثریت کی نظر سے ہندو آبا و اجداد کی اولاد ہیں، لیکن اس وقت ایک نشہ میں اپنی ہی قوم یعنی اپنے آبا و اجداد کے نام لیواوں اور اُن کی تہذیب و تمدن کو تباہ و برباد کرنے کے درپے ہورہے ہیں۔) یہ خواب دیکھ رہے ہیں کہ جیسے آریہ فاتحوں نے اپنا مذہب اور کلچر ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلا یا جس میں نتیجہ کہ جن کو یہاں کے اصلی باشندے تصور کیا جاتا ہے جیسے دراوڑ قوم وغیرہ، اُن کی زبان میں بھی سنسکرت اس درجہ حاوی و ساری ہو گئی کہ پچاس سے پچھتر فیصدی سنسکرت الفاظ اُن میں داخل ہو گئے۔ اُسی طرح یہاں مذہبی جذبات اُبھار کر عربی و فارسی کو ہندوستان بھر میں حاوی و ساری کر دیا جائے لیکن جن آریوں کے مذہبی اصولوں اور فلسفہ نے زمانۂ حال کے بڑے بڑے فلسفیوں، سائنٹسٹ علما و فضلا سے خراجِ تحسین حاصل کئے ہوں اُن کی تسخیر اس طرح نہ ہو سکیگی۔ اُن کا مذہب کوئی ایک خاص DOGMA نہیں ہے۔ بلکہ قدرت سے ہم آہنگ ایک ایسی چیز ہے جس میں اعتقادات کی کہیں روک ٹوک نہیں، اور ہر درجہ کے آدمی اور ترقی کی ہر منزل کا لحاظ ہے۔ ایک طرف بت پرستی کی انتہائی صورتیں نظر آتی ہیں کہ شجر و حجر تک کی پرستش ہوتی ہے تو دوسری طرف توحید کا وہ تصور ہے جس کے آگے انسانی تصور کام ہی نہیں کر سکتا۔ ہندو دھرم درحقیقت مذہب و اعتقادات کی ایک یونیورسٹی ہے جہاں ابتدائی اسباق سے لیکر انتہائی معرفتوں کا اہتمام کیا گیا ہے، اور اس میں اُن لوگوں کی بھی گنجایش ہے جو چار واک یعنی دہریہ کہلاتے ہیں۔ اسی رواداری نے ایک دُنیا کو مسخر کیا، اور اتنا زمانہ گذر جانے کے باوجود جس میں کئی قومیں اور کئی مذہبی سلسلے اُٹھے اور فنا ہو گئے، لیکن باوجود اس کے کہ ہندوؤں میں دنیا بھر کی خرابیاں اور غفلت شعاریاں آگئیں، ہندو قوم اور ہندو دھرم ہنوز زندہ ہے۔ اور بفضلہ تعالیٰ ہمیشہ زندہ رہیگا، اس لئے کہ یہ کسی خاص (Dogma) کی پرستش کا سلسلہ نہیں ہے۔ بلکہ قوانین قدرت کی پابندیوں پر زور دینے والا اور قدرت کی سی فراخ دلی پیدا کرنے کی تلقین کرنے والا سلسلہ ہے جو انسان کی روحانی نشو و نما میں اُس کے ہر درجہ اور ہر منزل کا لحاظ رکھتا ہے۔ انھیں باتوں نے آریوں کی تہذیب و تمدن کو اس درجہ مقبول بنا دیا اور وہ سب پر حاوی و ساری ہو گئی۔

قتل و غارتگری و دہشت ندگی یا ایک لفظ میں نازی طریقوں سے یہ حیرت انگیز نتائج حاصل نہیں ہوئے اور نہ ہو سکتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ہندوؤں کی موجودہ حالت افسوسناک ہے۔ لیکن اب وہ بیدار ہورہے ہیں

اور اِن حقیقتوں کو سمجھ رہے ہیں، اور بفضل خدا جو خرابیاں دیکھ رہے ہیں وہ کچھ عرصہ بعد باقی نہ رہیں گی۔

مکرمی مولانا ح، کے کچھ اور عجیب وغریب بیانات ملاحظہ ہوں :-

میرے اِس استدلال سے بحث کرتے ہوئے کہ پارسی بھی تو ہندوستان میں فارسی زبان لے کر آئے تھے لیکن اُن کی وجہ سے یہاں کوئی نئی زبان پیدا نہیں ہوئی، آپ فرماتے ہیں کہ:-

"وہ بیچارے اول تو قلیل تعداد میں آئے، پھر صرف بمبئی کے ساحل پر آباد ہو گئے، یا کچھ لوگ تجارت کی غرض سے کلکتہ جیسے شہروں میں چلے گئے، ایسی صورت میں یہ اُردو جیسی ہمہ گیر زبان پر کیا اثر ڈال سکتے تھے۔"

تعجب کا مقام ہے کہ مولانا ح، جیسے تعلیم یافتہ بزرگ کو یہ نہ معلوم ہو کہ جب پارسی مہاجرین یہاں آئے تو ہندوستان میں اُردو کا شائبہ تک نہ تھا۔ یہ بیچارے گجرات میں آباد ہوئے، اور گجراتی کو اپنایا، اور اپنی خاص زبان اپنی عبادت وغیرہ کے لئے مخصوص کر لی۔

اس کے آگے وہ جو کچھ فرماتے ہیں وہی ہے جس پر میں نے علامہ شبلی مرحوم کے حوالہ سے یہ استدلال کیا ہے کہ اُردو اسلامی زبان ہے۔

ایک بیان یہ ملاحظہ ہو کہ :-

"ترکی ہندوستان اور دوسرے ممالک میں سمجھی جاتی ہے۔"

یقیناً اُسی طرح سمجھی جاتی ہو گی جس طرح چینی یا روسی زبان!

اسی طرح مسلمانوں کا ہندوؤں کے ساتھ رواداری کا سلوک، مسلمانوں کا سنسکرت کی نشو ونما میں حصہ لینا، وغیرہ وغیرہ کئی ایک بیانات ہیں، جو تنقید کے محتاج نہیں ہیں کیونکہ ان کی حقیقت بالخصوص ان دنوں روز روشن کی طرح عیاں ہے۔

لیکن ایک جگہ مولانا ح، نے انتہائی ستم ظریفی یہ کی ہے کہ اُنھوں نے ایک آدھ باتیں ایسی بھی لکھدی ہیں جن سے خواہ مخواہ پُرانے زخموں پر نمک پاشی ہوتی ہے مگر میں ان کو نظر انداز کرتا ہوں۔

حُسنِ اتفاق سے مولانا ح، کے مضمون میں جو جو اُصولی باتیں ہیں، تقریباً اُن سب کا جواب شافی "ہندوستان کے لئے ایک عام زبان کا مسئلہ" والے میرے مضمون میں آگیا ہے جو اسی پرچہ میں شائع ہوا ہے۔ اب معروضاتِ بالا کے بعد صرف دو ایک امور ایسے رہ جاتے ہیں

اُن پر روشنی ڈالنی ضروری ہے۔ ایک وہ اشعار ہیں جو اُردو کے چند شعرا کے کلام سے چُن کر ممدوح نے یہ ظاہر کرنے کی غرض سے پیش کئے ہیں کہ اُردو شاعری میں ہندوؤں کی تہذیب کی نمایندگی نظر انداز نہیں"۔

جو شخص اُردو ساتذہ کے کلام سے واقف ہے جانتا ہے کہ نظیر اکبرآبادی کے علاوہ اور کسی اُردو شاعر کے کلام میں ہندو تہذیب و تمدن کی وہ نمایندگی نہیں ہوئی جس کو نمایندگی کہا جا سکتا ہے مگر اس کو نتیجہ کیا ہوا؟ خود میاں نظیر قعر گمنامی میں ڈال دیے گئے۔ حالانکہ شاعرانہ حیثیت سے اُن کا درجہ بہت ارفع و اعلیٰ ہے۔ آج سے بیس پچیس سال ہوئے ایک بلند حوصلہ اور روشن خیال بزرگ نے نظیر کو رسالۂ ادیب میں شکسپئیر سے مشابہت دی تھی۔ ڈاکٹر نیلن نے بھی اپنی مشہور و معروف ڈکشنری کے دیباچے میں نظیر کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اُس سے اُن کی عظمت پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ جو انتخاب مولانا ح نے پیش کیا ہے مشتے نمونہ از خروارے نہیں ہے بلکہ بہت چھان بین اور تحقیق کیجئے گا تو اس سے تین چار چند اور اشعار نکل آئیں گے یا کچھ اور زیادہ۔ بہرحال ایسے اشعار ہر ایک کے مجموعۂ کلام کا بہ استثناء انشا ایک بالکل ناچیز جزو ہیں۔ یہ جو شعر اقبال کا دیا گیا ہے کہ

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

اس کو اگر مولانا ح، یعنی برادرانِ وطن اُردو تسلیم فرماتے ہیں، تو ہم بلا شبہ ایسی اُردو سے تعاون کرنے کے لئے ہر وقت آمادہ ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی اُردو اُن پرچوں میں خوب چھپتی ہے جو ہندی پرچے کہلاتے ہیں۔

دوسری چیز جس کے متعلق کچھ عرض کرنا ہے وہ مکرمی ح، کا یہ فقرہ ہے کہ "افسوس یہ ہے کہ بدیسی اشیاء سے نفرت کرنے والے خود وہ ہیں جو دیسی زبان یعنی تیلگو اور تامل وغیرہ زبانوں کے خلاف مدراس میں جہاد کر رہے ہیں"۔

اِس معاملہ کو جس رنگ میں پیش کیا گیا ہے اُس کے متعلق کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں، میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے اپنے ابتدائی مضمون میں جو یہ عرض کیا تھا کہ زبردستی کی ٹھونس ٹھانس کچھ اچھے نتائج پیدا نہیں کر سکتی، اُس کا اشارہ مدراس گورنمنٹ کے ہندی کو لازمی قرار دینے ہی کی طرف تھا۔ راج گوپال اچاریہ صاحب نے علاقۂ مدراس میں ہندی کو لازمی قرار دے کر ہندی کی خدمت نہیں کی بلکہ اُس کے حق میں زہر بویا ہے اور اپنی ضد سے اِن زہریلے

اثرات کو مستقل کرتے جاتے ہیں۔ ہندی کسی جگہ جبری قرار دیئے جانے کی محتاج نہیں ہے اُس کو محض اختیاری رکھ دیا جانا کافی ہے۔ راج گوپال اچاری صاحب کی وزارت سے پہلے لاکھوں نے ہندی سیکھی اور شوق سے سیکھی، لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ ہندی کا جاننا لازمی قرار دینا وہاں کی زبانوں کے خلاف جہاد کیونکر ہو، جبکہ علوم و فنون ہندی کے ذریعے نہیں بلکہ اُن کی مادری زبان میں سکھلائے جاتے ہیں۔ ہندی محض بہ حیثیت ایک لازمی زبان قرار دی گئی ہے۔ (مگر اس کو بالکل ہندی بھی نہیں کہا جا سکتا ہے اس لئے کہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی مہربانی سے اُس میں کافی عربی۔ فارسی الفاظ داخل ہوگئے ہیں[1]۔

مادری زبانوں کے خلاف جہاد اس کو کہتے ہیں جو عثمانیہ یونیورسٹی میں ہو رہا ہے، جہاں علوم و فنون مادری زبان کے ذریعے نہیں بلکہ اُردو کے ذریعے سکھائے جاتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ وہاں کے اصلی باشندے جو جملہ آبادی کے پچاسی[85] فیصدی ہیں نہ صرف اپنی مادری زبان کے فیوض ہی سے محروم رہتے ہیں بلکہ اعلیٰ امتحانوں میں جن کا روزی سے تعلق ہے مسلمانوں کے مقابلے میں قدرتاً پیچھے رہ جاتے ہیں۔ گو جب ذریعۂ تعلیم انگریزی تھا یعنی جب اجنبیت کے لحاظ سے ہندو و مسلمان مساوی حیثیت میں تھے تو ہندو بازی لے جایا کرتے تھے۔

میں آخر میں چوتھی بار اور اس دفعہ مولانا ح کی ہمنوائی میں پھر یہ عرض کرونگا کہ ایک عام زبان یا ہندوستانی قومی زبان کا سوال تمغیوں میں اضافہ کا باعث بن گیا ہے اسلئے قوم کے لیڈروں کا فرض ہے کہ فی الحال اس عام زبان کے سوال کو ختم کر دیں اور انگریزی سے جیسا اس وقت کام چل رہا ہے چلنے دیں۔

جذباتِ رضوی

ازسید محمد الیاس رضوی اجمیر

وفا پرست اگر ترکِ آرزو کرتے　　تو ذرہ ذرہ میں کیوں تیری جستجو کرتے
نشاطِ زیست جنھیں نیشِ غم عطا کرتی　　کبھی نہ چاکِ گریباں کو وہ رفو کرتے
بٹھا کے دل میں تجھے جان سے عزیز رکھا　　ہم اور کیا ترے پیکاں کی آبرو کرتے
اسیرِ زلف جو پاتے کبھی اشارۂ چشم　　بیاں حکایتِ دل تجھ سے مو بمو کرتے
حریمِ دل میں نہ گر غیر کا گذر ہوتا　　تلاشِ دوست نہ اس طرح کو بکو کرتے
سمجھتے وحدت و کثرت کا راز اے رضوی　　کبھی جو آئنہ وہ اپنے روبرو کرتے

[1] ہم نے بھی سُنا ہے کہ مدراس کی ہندی ریڈروں میں جو جامعہ ملیہ دہلی کے زیر اہتمام تیار ہوئی ہیں ایسے ایسے جملے رکھے گئے ہیں کہ "شب کو رب کا شکر ادا کرو" اس پر بھی بعض اصحاب کہہ رہے ہیں کہ وارد ھا اسکیم بھی اُردو کی مخالف ہے۔ (ا۔ز)

مباحثہ

اُردو، ہندی، ہندستانی

از منشی شیام موہن لال جگر بریلوی بی۔ اے

اپریل ۱۹۳۸ء کے زمانہ میں اُردو، ہندی، ہندوستانی کی بحث کے سلسلہ میں حق پرست صاحب نے جو مضمون سپردِ قلم فرمایا ہے۔ اُسمیں انھیں باتوں کو دُھرایا گیا ہے جو موصوف اپنے ابتدائی مضمون میں ارشاد فرما چکے ہیں۔ اور جن کے جواب میں میرا مضمون فروری ۱۹۳۸ء کے زمانہ میں شائع ہو چکا ہے۔ پھر بھی دو باتوں کے متعلق مجھے کچھ مزید عرض کرنا ہے۔

حق پرست صاحب اُردو کو ہندوؤں کی زبان نہیں سمجھتے اور یہ یقین رکھتے ہیں کہ اس کو اختیار کر کے ہندو پنپ نہ پائیں گے۔ اور رفتہ رفتہ بحیثیت قوم اپنی ہستی ہی مٹا بیٹھیں گے۔

میں نے اپنے ابتدائی مضمون مطبوعہ زمانہ اپریل ۱۹۳۸ء میں جو کچھ عرض کیا ہے اُس کا مطلب بھی یہی ہے جو حق پرست صاحب فرماتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ میں اُس اُردو سے وہ زبان مراد لیتا ہوں جس سے ہندوانی عناصر برابر خارج ہوتے رہے ہیں اور جس کو اب عربی، ایرانی بنا دینے کی کوشش کیجا رہی ہے۔ اسی اُردو کے خلاف احتجاج میں میرا ابتدائی مضمون شائع ہوا تھا۔ میں نے اُس مضمون میں اِس بات پر زور دیا ہے کہ اگر "ہندستانی" کو قومی زبان بنایا جاتا ہے تو ہندوانی خصوصیات، تمدن و مذہب سے بھی اُسکو مالا مال کیا جائے۔ آیندہ قومی و ملکی ترقی کی راہوں پر اس کو ڈالا جائے۔ اس مقصد کے لئے ہر امکانی تدبیر اختیار کی جائے۔ ہندو ادیبوں اور ہندو ادبیات کو بھی اسکولوں اور کالجوں میں جگہ دی جائے مختصر یہ کہ ہندستانی کی نشوونما اِس طریقہ پر ہو کہ ہندو بھی اپنی تمام روایتی خصوصیات کے ساتھ اس میں ترقی کر سکیں۔ اور یہ زمانہ کی رفتار کے ساتھ ساتھ ہماری قومی زندگی کی ترقی کا ذریعہ بن سکے۔ ان سب باتوں کے لئے جدوجہد کی ضرورت ہے۔ اگر یہ جدوجہد نہیں ہو سکتی تو ہندوؤں کے لئے ہندی ہی مناسب ہے۔

ہندو کی ادبی حیثیت کے متعلق بھی "حق پرست" صاحب نے وہی فرمایا ہے جو آپ اپنے ابتدائی مضمون میں فرما چکے ہیں یعنی یہ کہ "مجھ کو اس سے اِنکار نہیں کہ ہندوؤں نے بھی اُردو میں بڑے بڑے صاحب کمال پیدا کئے۔" آگے چل کر آپ فرماتے ہیں: "ہماری مزدوروں کی حیثیت اِس سے ثابت ہے کہ

ہمارے بڑے سے بڑے ادیبوں نے اپنے طبعزاد کلام میں پرمیشر نہیں اللہ یا خدا ہی کہا۔ اُردو میں ہندوں کی مزدورانہ حیثیت ہے۔ اس کا جواب دو طریقوں پر دیا جاسکتا تھا۔ اوّل یہ کہ ادب و شعر کا معیار پیش کرکے مسلم اور ہندو ادبا و شعرا کا ایک دوسرے سے مقابلہ و موازنہ کیا جاتا۔ قطع نظر اس کے کہ یہ طریقہ ایک طول امل تھا۔ یہ مسئلہ اس طریقہ سے اور پیچیدہ ہوجاتا۔ اس لئے کہ ممکن تھے حق پرست صاحب میرے پیش کردہ ادبی معیار ہی سے اختلاف کرتے اور اگر نہ بھی کرتے تو موازنہ و مقابلہ میں تو بات بات پر اختلاف کی صورتیں پیدا ہوسکتی تھیں اور ہوتیں۔ اس سے بچنے کے لئے میں نے یہ دوسرا آسان طریقہ اختیار کیا تھا کہ چند ہندو ادیبوں اور شاعروں کے متعلق بعض انصاف پسند مسلم نقادان و مبصران فن کی وہ رائیں پیش کردی تھیں جو متفرق طور پر کہیں کہیں کتابوں میں مل جاتی ہیں اور فن کی بعض اُن کتابوں کے نام لئے تھے جن کے بانی ہندو ہی تھے۔ یہ رائیں اس امر کی ناقابل تردید شہادتیں ہیں کہ ہندو نقال یا مزدور نہیں، مگر افسوس کہ محترم اڈیٹر زمانہ نے ان رائیوں کو شائع نہیں کیا[1]۔ اسی کے ساتھ ساتھ میں یہاں صرف دو ہی مصنفوں سرشار اور پریم چند کا نام لے کر یہ عرض کروں گا کہ جس شخص نے اُن کی معرکہ آرا اور ضخیم تصنیفات کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا ہے اور اُن کی قدرت زبان، جدت فکر، وسعت مضامین، تنوع مطالب اور امتیازی اسلوب بیان اور مخصوص طرز ادا کا اندازہ کیا ہے۔ وہ کبھی حق پرست صاحب کا ہمنوا بن کر ان مشاہیر کو اُردو میں وہ حیثیت نہ دیگا جو حضرات ٹیگور اور ٹنکلتوالا وغیرہم کو انگریزی میں حاصل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انگریزی ہندوستانیوں کے لئے اجنبی زبان ہے اور اُردو اسی سرزمین میں پیدا ہوئی۔ اس لئے ہندوؤں کا اس پر ویسا ہی حق و اختیار ہے جیسا مسلمانوں کا، یہ اور بات ہے کہ جب یہ ادبی زبان بننے لگی تو ہندوانی عناصر اس سے خارج کردیئے گئے اور ہندوں کی تصنیفات کو غیر حقیقی معیار سے جانچا گیا اور تعصب کی نظر سے دیکھا گیا۔ اور ان کا حق و اختیار اُس پر تسلیم نہیں کیا گیا۔

حق پرست، صاحب کو شاید اس سے انکار نہ ہوگا کہ اُردو کی ساخت اور اجزائے ترکیبی میں دونوں قوموں کے دل و دماغ اور انفرادی خصوصیتوں کی نشوونما کے امکانات اور صلاحیتیں موجود ہیں۔ پھر یہ تسلیم کرلینے میں کون سے وجوہ مانع ہیں کہ ہندو بھی اُس میں منتہائے کمال پر پہونچ سکتے ہیں۔ اور واقعات بتاتے ہیں کہ پہونچے ہیں۔ جس کو انصاف پسند مسلم حضرات نے جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا خود تسلیم کیا ہے۔

جن اثرات کے ماتحت اُردو کی ترقی ہوئی، اُن کی وجہ سے یہ ضرور ہوا کہ خود ہندوؤں کی ادبیات

---

[1] ہماری رائے میں ہندوؤں کے ادبی کارنامے کسی تصدیق کے محتاج نہیں ہیں۔ بہرحال ہم نے اختصار کے خیال سے ان اقتباسات کو نظر انداز کردیا تھا۔ اب بھی ہمارے نزدیک اس اختصار سے نفس مضمون میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ ا۔ز

ہندو تہذیب وتمدن کے آثار سے خالی رہیں جیسا کہ میں نے اپنے اوّلین مضمون میں ثابت کیا ہے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ کیونکر نکالا جاسکتا ہے کہ "ہندو مزدور اور نقّال رہے ہیں" یہ استدلال میری سمجھ سے بالاتر ہے کہ چونکہ اُردو ادبیات میں ہندوانی تہذیب وتمدن کا فقدان ہے اس لئے ہندوؤں کی ادبی حیثیت بھی پست وفروتر ہے۔

میں نے اصول کے برخلاف رسالہ زمانہ کے صفحات کی گنجائش دیکھتے ہوئے ہندوؤں کی غیر مقلدانہ واجتہادی بلند پایگی ثابت کرنے کے لئے جو ممکن طریقہ تھا اختیار کیا۔ مگر اس کا ایک جزو جو مسلم حضرات کی بالوں سے متعلق تھا شائع نہیں ہوا[1]۔ اب پھر انھیں باتوں کا دہرانا محترم اڈیٹر کی انتصار پسندی کے خلاف اعلانِ جنگ ہوگا۔ اس لئے صرف اتنا عرض کر کے خاموش ہو جانا چاہتا ہوں کہ اُردو میں ہندوؤں کی ناقدری اور کس مپرسی اُردو ادب میں ہندو تہذیب، تمدن اور مذہب کا فقدان اور ان امور کے متعلق بہت سے ضمنی مسئلے ایک مدت سے مجھے پریشان کئے ہوئے تھے۔ جن کے حل کرنے کے لئے میں نے پچاسوں کتابوں کا مطالعہ کیا جس کے نتائج اپنی کتاب "اُردو ادب اور اہلِ ہنود"[2] میں منضبط کر دیئے ہیں۔ یہ کتاب کم وبیش چار پانسو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کی ترتیب وتصنیف کے سلسلہ میں جو چھان بین اور تحقیقات کرنا پڑی ہے وہ مجھے بار بار یہی کہنے پر مجبور کرتی ہے کہ ہر دور میں ہندو بھی اس پایہ کے ادیب وشاعر ہوئے ہیں جن کے کمالات سے اعلیٰ سے اعلیٰ ادبی معیار مرتب کیا جاسکتا ہے اس لئے آخر میں یہ عرض کر دینے پر مجبور ہوں کہ جس طرح حق پرست صاحب کو یہ اصرار ہے کہ ہندو "مزدور اور نقال" رہے، مجھے یہ علم ویقین ہے کہ ہندو "اہلِ زبان، زباں دان، خلّاق کلام اور خدائے سخن" رہے اور ہیں۔

"حق پرست" صاحب کے اس اعتراض کے جواب میں کہ ہندوؤں کا کلام بھونڈا اور غیر متوازن ہو جاتا ہے۔ میں نے جو کچھ عرض کیا تھا وہ بھی محترم اڈیٹر نے بغیر قطع وبرید شائع نہیں کیا۔ خصوصاً اس بھونڈے پن کی وہ مثالیں بالکل حذف کر دی گئیں جو میں نے غالب نے یہاں سے پیش کی تھیں۔ ظاہر ہے کہ ایک جاہل اور ایک کی غلطیاں ایک ہی حیثیت نہیں رکھتیں۔ جاہل قدم قدم پر غلطی کرتا ہے۔ اس کے لئے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ غلطیاں بڑے بڑوں سے ہوتی آئی ہیں۔ اس کی غلطی پکڑنا ہی غلطی ہے۔

آخر میں حق پرست صاحب فرماتے ہیں کہ مجھ کو جگر صاحب کے مضمون کا لفظ بہ لفظ جواب دینا مقصود نہیں اس میں شکر رنجی اور تلخی کا اندیشہ ہے۔ "حق پرست" صاحب کے پہلے مضمون کے جواب میں جو کچھ میں نے فروری کے زمانہ میں عرض کیا ہے۔ اسمیں یقیناً کوئی لفظ ایسا نہیں جس سے حق پرست صاحب یہ نتیجہ نکال سکیں جو انھوں نے نکالا اور اگر ہے تو میں معافی چاہتا ہوں۔ میں نے جب ایک بحث چھیڑی اور خود دعوتِ اختلاف دی تو

[1] لائق مضمون نگار کی اس شکایت کا اس سے پہلے ہی جواب دیا جاچکا ہے (ا۔ز) [2] یہ کتاب ابھی شائع نہیں ہوئی ہے۔

مجھے اُس کے خلاف ہر بات سُننے کو تیار رہنا چاہیئے اور تیار ہوں۔ اس میں اگر کوئی مجھ پر غیظ و غضب کا اظہار بھی کرے جسکا حق پرست صاحب کی طرف سے قطعی اندیشہ نہیں جب بھی میں بُرا نہ مانوں گا۔ مگر کہونگا وہی جو مجھے کہنا ہے اور شائستگی و تہذیب کے دائرے میں۔

ادب آموز ہے ہر ایک ذرہ اپنی وادی کا
نہیں ممکن کہ گرد اڑ کر پڑے رہرو کے دامن پر

جگر بریلوی

جذباتِ منوّر

از منشی بشیشور پرشاد منوّر لکھنوی

ضرور اے جذبۂ دل تو ہو محوِ کار فرمائی
حیات اک لفظِ بے معنی ہے بے ہنگامہ آرائی

مزا جب ہے کہ دے ذوقِ خلش ہر خارِ صحرائی
نہیں ہر ایک کے بس کا مذاقِ برہنہ پائی

کیا کانٹوں نے خونِ مدعائے دشت پیمائی
خوشی آئی آسمانوں کو نہ میری آبلہ پائی

مرے ہر موئے تن سے پھول بن بنکر لہو ٹپکے
کہ اے سوزِ دروں روشن چراغِ شامِ تنہائی

نجانے دربدر کھانی پڑی ہیں ٹھوکریں لیکن
کہاں ورنہ مری تقدیر میں ذوقِ جبیں سائی

زمین و آسماں میں فاصلہ بڑھتا ہی جاتا ہے
کہانتک دیکھئے لیجائے تجھکو تیری انگڑائی

کہانتک جبر ہوگا تم سے اپنے دیدہ و دل پر
کہانتک آئینہ دیکھو گے ہنگامِ خود آرائی

خموشی میں دمِ نظارہ ایسی روح بھر دونگا
تری تصویر بھی ہو جائے گی مجبورِ گویائی

ہے کیا مدِ نظر صبر آزمائی میگساروں کی
اگر ساقی ہے دریا دل تو پھر کیوں ظرف پیمائی

حدودِ شوقِ سجدہ سے گذرنا عینِ سجدہ ہے
نہ ہو وقتِ جبیں سائی بھی احسانِ جبیں سائی

ہیں اس کے اصطلاحِ عشق میں کچھ اور ہی معنی
تمنائی ترا کہلا نہیں سکتا تمنائی

منوّر ہے غنیمت حضرتِ ساحرؔ[1] کی ہستی بھی
انھیں کی دم سے ہے اتنی سخندانوں کی یکجائی

---

[1] یعنی فخر شعرا جناب علامہ پنڈت امرناتھ صاحب ساحرؔ دہلوی

اُردو

(از مسٹر اعجاز صدیقی ایڈیٹر شاعر)

یہ روح روان و جانِ عالم روہانِ وفصاحتِ مجسّم
ہے نصب جہاں پر اس کا پرچم اِس سے ہوا اختلاط باہم
ہے اس میں عجیب کیف اور کم قایم یہ رہے گی یوں ہی جم جم
ہے سارا جہاں امینِ اُردو
ہے کتنی حسیں جبینِ اُردو

ہے کانِ فصاحت و بلاغت یہ حاملِ صد ہزار ندرت
یہ روح کی اور نظر کی جنّت اس کے ہر بول میں حلاوت
کتنی پیاری ہے اس کی صورت ہے اس میں بلا کی جاذبیت
ہر نقطہ ہے اِک نگینِ اُردو
ہے کتنی حسیں جبینِ اُردو

میر و غالب کو تھی یہ پیاری کی داغ نے اِس کی آبیاری
چکبست اِسی کے تھے پجاری وہ برق و رواں کی جاں نثاری
کیفی پہ ہیں اس کے کیف طاری سپرو اور شاد اس پہ واری
ہر دل ہے یہاں رہینِ اُردو
ہے کتنی حسیں جبینِ اُردو

ہے سارے جہاں میں اس کا چرچا ہے اِس میں فسوں نہ جانے کیسا
ہر چھوٹا بڑا ہے اس کا شیدا ہر گھر میں ہیں اس کے نام لیوا
ایسا کس کو ملا ہے رتبا ہندی ہو کہ اور کوئی بھاشا
اب ہند ہے سرزمینِ اُردو
ہے کتنی حسیں جبینِ اُردو

آؤ آج اس کا گیت گائیں | مل جل کے سب اس کی لے بڑھائیں
یہ باہمی تفرقے مٹائیں | اس کو اپنی زباں بنائیں
آگے سب اس کے سر جھکائیں | سینوں سے پھر آج اسے لگائیں

چیخ اٹھے یہ نکتہ چینِ اردو
ہے کتنی حسیں جبینِ اردو

غزل

(مسٹر ڈی۔پی۔ بھٹناگر کشتہ (منصوری)

طلسمِ حسن ہے ہر ایک منظر تیری محفل کا | خدا جانے کہ ہوگا خون کس کس سے مرے دل کا
کسی دن یہ اثر ہو کر رہے گا جذبِ کامل کا | ترے نغموں میں گم ہوگا ہر اک نغمہ مرے دل کا
جسے کہتے ہیں دنیا اک کرشمہ ہے مرے دل کا | دکھاتا ہے یہ آئینہ تماشا حق و باطل کا
بہت آسان تھی مشکل کشائی۔ پھر بھی مشکل تھی | مری آسانیوں میں بھی تھا مضمر راز مشکل کا
نشاطِ روح شامل ہے مرے ذوقِ تجسس میں | فضا میں رقص کرتا ہے ہر اک ذرہ مرے گِل کا
ہوئی دنیائے دل تاریک داغِ دل کے مٹنے سے | غضب ہے اہلِ محفل جل کے بجھنا شمع محفل کا
یہ تقصیرِ نظر ہے یا ہے تکمیلِ نظر یارب | گماں ہر نقشِ پا کو دیکھ کر ہوتا ہے منزل کا
سلامت شوقِ صادق۔ برقرار اے سعی لاحاصل | تمہارے دم سے قصہ مختصر ہے بُعدِ منزل کا
بجائے خود مری ہر لغزشِ پا ایک منزل ہے | مجھے اے ہم سفر پھر خوف کیا دوری منزل کا
اٹھیں گے سیکڑوں فتنے تری ہر ایک ٹھوکر سے | جوابِ حشر ہو جائے گا ہر ذرہ مری گِل کا

تصدق اس کے اے کشتہ متاعِ ہر دو عالم بھی
بڑی نعمت ہے اطمینان کہتے ہیں جسے دل کا

سائیں بابا

از پروفیسر دیوندر دت لکھار یہ ایم۔ اے

ڈاکیے کو اب کون نہیں جانتا؟ شہری لوگ تو مدتوں سے آتے جاتے ہیں مگر اب دیہات کا بچہ بچہ بھی اسے خوب پہچانتا ہے۔ وہی اس کی خاکی وردی، وہی اس کا دقیانوسی تھیلا اور وہی اس کی متین چال۔ اس کی زندگی کا ایک ایک لمحہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ شدت کی گرمی ہو یا سردی، آندھی آئے یا اولے برسیں۔ یہ بیچارا تھکا ماندہ اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی نہیں کرتا۔ خطوط اچھالتا۔ پارسل دیتا۔ رسیدیں لیتا۔ روپے جھنکارتا مستانہ وار گلی گلی اور کوچہ کوچہ اپنا روزمرہ کا کام بڑی خوش اسلوبی سے نبھاتا چلا جاتا ہے۔ توقف سے اُسے سروکار نہیں۔

دفتری حکومت کے ہر ایک صیغہ میں رشوت کی گرم بازاری ہے۔ منت، سماجت، چاپلوسی، خوشامد، وہ درجہ حاصل نہیں جو بخشش اور انعام کو ہے۔ کسی اہلکار کے آگے ماتھا رگڑو، رشتہ داری جتاؤ۔ عمر بھر کی غلامی کا حلف اٹھاؤ۔ وہ بگلا بھگت ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ مگر چپکے سے اس کی مٹھی میں ایک روپیہ سرکا دو تو جس کام کو وہ ابھی ابھی ناممکن بتا رہا تھا۔ ایک منٹ میں ہی ممکن بنا دیتا ہے۔ اگر کوئی صیغہ اس مرض سے بچا ہے تو وہ پوسٹ آفس ہے۔ اگر ہم ڈاکیے کی پاکیزگی کی داد نہیں دیتے، اگر ہم اسکی عجلت کاری اور دیانتداری کی قدر نہیں کرتے تو ہم ایک سنگین گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں۔

سائیں داس ریاست چنبہ میں ڈاکیہ تھا۔ بتیس سال سے اپنے انوکھے فرائض صدق دلی سے ادا کر رہا تھا۔ اس کی دیانتداری کی دھوم تھی۔ بوڑھے سائیں داس کو بیشک اپنے عہدہ پر ناز تھا۔ تقدیر پر بھی شاکر تھا۔ کبھی زبان پر حرف شکایت نہیں لاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ریاست بھر میں لوگ اسے سائیں بابا کے متبرک نام سے پکارتے تھے۔ وہ عالم نہ تھا مگر زندگی کے کوائف سے بے بہرہ بھی نہ تھا۔ محکمہ کے قواعد پر پورا کاربند تھا۔ کبھی کبھی کسی کی التجا بھی سن لیتا۔ مگر اپنے فرائض میں کوتاہی کبھی نہ کرتا۔ ایسے خط کو بھی جس کا پتہ مشکوک ہوتا، پہاڑی ندی یا غار کے حوالے نہ کرتا۔ اس پر طرفہ یہ کہ وہ وقت کا پورا پابند تھا۔ ہر فرد بشر اُس کیساتھ خندہ پیشانی سے کلام کرتا۔ حلقے کا بچہ بچہ اُس سے مانوس تھا۔ یہاں تک کہ حلقے کی کتیا بھی دُم ہلاتی اُس کے پاؤں چاٹتی،

گویا کسی بچھڑے عزیز کا خیریت نامہ طلب کر رہی ہے۔ اُسے نہ تو کسی کے لڈو پوری کی چاہ تھی، نہ کسی کے نانِ جویں سے مطلب۔ چٹھی دی اور چلتا بنا۔ اُس کا یہی شیوہ اس کی کامیابی و ہر دلعزیزی کا باعث تھا۔ افسرانِ بالا بھی اس سے مطمئن تھے بلکہ اس بات کا بھی اُن کو احساس تھا کہ ایسے وفادار، ثابت قدم اور سلامت رَو ملازم کی تنخواہ اسقدر قلیل ہے۔

(۲)

جنوری کا مہینہ تھا اور کڑاکے کا جاڑا پڑ رہا تھا۔ ہفتہ بھر سے موسلا دھار مینہ برس رہا تھا۔ سائیں داس کے کپڑے تر بتر ہو رہے تھے۔ پھر بھی یہ فرض شناس ڈاکیہ کمر ہمت باندھے اپنی گشت پوری کر رہا تھا۔ ابھی نصف ڈاک بھی تقسیم کرنے نہ پایا تھا کہ ایک قہوہ خانہ کے آگے رُکا جو شہر کے بائیں طرف تھا۔ راجہ کی نگری کے ادنیٰ طبقے کے لوگ عموماً یہاں اکٹھے ہو جاتے اور بغرض تفریح یا تضیع اوقات خوب بے پر کی اُڑاتے۔

"سائیں بابا۔ اِس جھڑی میں بھی آپ دم نہیں لیتے۔ ذرا اندر تشریف تو لائیے، مجھے آپ سے کچھ پوچھنا ہے"

یہ ایک نوجوان کے الفاظ تھے جو چلم پکڑے قہوہ خانہ کے دروازہ میں کھڑا کش لگا رہا تھا۔ اس وقت بارش زوروں پر تھی۔ اور طوفانِ باد و باراں کے تھپیڑے بوڑھے سائیں داس کے چہرہ پر بڑی بیرحمی سے پڑ رہے تھے۔ تناور درخت بھی اس طوفان کے آگے سرِ تسلیم خم کر رہے تھے۔ تاہم ڈاکیہ چٹھیاں وقت سے پہلے ہی بانٹنے کی دُھن میں مست تھا۔ قواعد کی پابندی اتنی کڑی نہیں کہ ایسے غیر معمولی موسمی حالات میں بھی عارضی پناہ سے انکار کیا جائے۔ ڈاکیہ اندر آگیا اور آگ تاپنے لگ گیا۔ اس خوشنودی کی خاطر دو چار لکڑیاں اور لگا دی گئیں۔ آگ بھڑک اُٹھی اور سائیں داس اپنے کپڑے سکھانے لگ گیا۔ اس نوجوان نے ڈاکیہ سے ڈاک اور اُس کی ملازمت کے بارے میں کئی ایک سوال کئے۔

"تو کیا آپ مجھے جانتے ہیں؟"

"ہاں، ہاں؛ یہاں کون ہے جو سائیں بابا کی ذات پر نازاں نہیں؟، مجھے اُمید ہے آپ چائے کا ایک پیالہ ضرور قبول فرمائیں گے؟"

قہوہ خانہ کے مالک سے دو پیالوں کی فرمائش ہوئی۔ ایک کمسن لڑکا چائے لے آیا۔ سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے نوجوان نے کہا۔

"آپ کا جی کتنا خوبصورت اور پیارا جانور ہے۔ ابھی آپ کو بہت دُور جانا ہے کیا؟ شاید آپ کو وہاں اُس مندر تک بھی جانا ہے؛ وہاں اُن درختوں کی اوٹ میں۔ مجھے بھی وہیں جانا ہے اگر آپ چاہیں تو اُدھر کی ڈاک میں ہی بانٹ دونگا۔"

"نہیں آپ کی نوازش۔ میں خود ہی لے جاؤں گا۔"

"اچھا۔ آپ کی مرضی غالباً آپ کو ہدایات ہی ایسی ہیں ورنہ مجھے تو آدھر جانا ہی تھا۔"

نوجوان باتوں کا دلدادہ تھا۔ باتوں ہی باتوں میں اُس نے ڈاک کا تھیلا سرکایا۔ اُسکا وزن بھانپا اور پھر اُسے وہیں رکھ دیا۔ مگر خطوں کی ترتیب کو بگاڑ ڈالا۔

"تھیلے کو نہ چھیڑئے جناب! آپ نے تو ترتیب ہی بگاڑ ڈالی۔ اب مجھے پھر تردد کرنا پڑے گا۔" سائیں بابا نے قدرے ترش ہو کر کہا۔

نوجوان نے معافی چاہی اور انکساری سے کہا۔ "کوئی بات نہیں۔ آپ اس میز پر خطوں کو پھر ترتیب دے سکتے ہیں۔"

ڈاکیہ نے تھیلا میز پر اُلٹ دیا اور چٹھیوں کو ترتیب سے رکھنے لگا۔ اس کا میزبان بیٹھا تو پرے تھا۔ مگر چٹھیوں کو چیل کی سی متجسس نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

سائیں بابا اِس کام میں مصروف تھا کہ اتنے میں پیچھے سے کتوں کے غرانے کی آواز سنائی دی۔

نوجوان نے کہا۔ "آپ کا جمی کہیں میرے جیکی کو مار نہ ڈالے۔ ذرا آپ اُسے روک دیں تو۔"

ڈاکیہ اُٹھا اور جمی کو گردن سے پکڑ لیا۔ جس قدر سائیں بابا خاموش طبیعت تھا۔ اُسی قدر اس کا کتا شور و غل کا دلدادہ تھا۔ مگر مالک کا اشارہ پا کر یہ سمجھدار داعی خاموش ہو گیا۔ لیکن نوجوان نے موسم کو بھانپنے کے بہانہ سے قہوہ خانہ کا دروازہ کھولا۔ ہوا کے تیز و تند جھونکوں کے سبب کمرہ میں دھواں بھر گیا اور بیچارے ڈاکئے کی ڈاک کمرے کے کونہ کونہ میں تتر بتر ہو گئی۔

سائیں بابا بہت برہم ہوئے مگر اس زمانہ ساز مہمان نے کہا۔ "کچھ مضائقہ نہیں، ہم ابھی اکٹھا کئے دیتے ہیں۔"

سائیں بابا کے انکار کے باوجود وہ بکھرے ہوئے خطوط اُٹھانے لگا۔ جب سب اُٹھائے جا چکے اور سائیں بابا نے انھیں ایک ایک کر کے دیکھا، تو اُس کا چہرہ زبانِ حال سے کہہ رہا تھا کہ ایک آدھ چٹھی گم ہے۔

نوجوان نے پوچھا۔ "کیوں کوئی چٹھی گم ہے کیا؟"

"میرا خیال ہے کہ ایک اور چٹھی ضرور تھی۔"

"اگر ہوتی تو یہیں ہوتی۔ آپ بھول رہے ہیں۔ وہیں ڈاکخانہ میں ہی رہ گئی ہوگی۔"

"ممکن ہے۔"

سائیں بابا نے سارا کمرہ چھان مارا، مگر بے سود۔ آخر کار یہی تسلیم کیا کہ اُس کی یاد اُسے دھوکا دے رہی ہے۔

اور وہاں سے چلنے کی ٹھانی۔ دل میں پشیمان تھا کہ ناحق قہوہ خانہ میں قدم دھرا۔ اور اس میزبان کے لئے اُس کے دل میں جذبۂ حقارت تھا۔ جس متنفس سے ریاکاری و مکاری کی بُو آنے لگے اُس سے وہ فوراً کنارہ کشی کر لیا کرتا تھا یہ اُس کا زرّین اصول تھا۔

—————:(۳):—————

طوفان اب تھم چکا تھا۔ جب اس مندر کے پاس درختوں کی اوٹ میں سائیں بابا پہونچا تو مطلع صاف ہو چکا تھا۔

"شانتی کنج" کے باہر اُس کی مالکہ سنیہہ لتا بڑی بے صبری کے ساتھ سائیں بابا کی راہ دیکھ رہی تھی۔ سنیہہ لتا کی شادی کو ابھی ایک سال بھی نہیں ہوا تھا۔ وہ حسین تھی، چنچل تھی، رقیق القلب تھی۔ اُس کا شوہر پنڈت برجموہن ہفتہ بھر سے ڈلہوزی گیا ہوا تھا اور وہ منتظر تھی۔ کہ پیا کا سندیشہ کب آتا ہے۔

"سائیں بابا۔ میری بھی کوئی چٹھی ہے کیا؟"

"نہ بی بی۔ آج تو کوئی نہیں"

"یہ تو انوکھی بات ہے، وہ تو کہہ گئے تھے کہ آج ضرور اُن کی چٹھی ملے گی۔ سائیں بابا کچھ اُن کو ....؟"

سنیہہ لتا کی زبان تو رُک گئی مگر اُس کے چہرہ پر مُردنی سی چھا گئی جو اُس کے دل کی پریشانیوں کی پوری پوری ترجمانی کر رہی تھی۔

"بی بی! گھبراؤ نہیں۔ آج نہیں تو کل ضرور کوئی خبر آ جائے گی۔ شاید کوئی کام اور آپڑا ہو۔ اور وہ چٹھی نہ لکھ سکے ہوں"۔

"نہیں، وہ زمین کا ایک ٹکڑا بیچنے گئے تھے۔ کل بیعنامہ تحریر ہو چکا ہو گا۔ آج اُنھیں یہاں پہونچنا تھا۔ کل سامنے والا کھیت نیلام ہو گا۔ اور اُنھوں نے اُسے خریدنے کا فیصلہ کیا تھا۔ مجھے خدشہ ہے کہ کہیں وہ رانی کھیت کے راستہ کے بجائے بنی کھیت کے چھوٹے راستہ نہ آئیں"۔

"تو اُس میں کھٹکا کیا ہے؟"

کھٹکا یہ ہے کہ نواب رائے کی پن چکی اسی راہ میں ہے اور وہ درپئے آزار رہتا ہے۔ نہ صرف اُنکے پاس روپیہ ہو گا۔ بلکہ وہ کہیں اُن کی زندگی پر دار نہ کر بیٹھے"۔

سنیہہ لتا جب کنواری تھی تو اُس کی نسبت پہلے اسی نواب رائے سے قرار پائی تھی۔ مگر اسکی عادتوں مے نوشیوں اور ہرزہ کاریوں سے مجبور ہو کر سنیہہ لتا کے والد نے اس کا بیاہ برجموہن سے کر دیا تھا۔ اس دن سے نواب رائے درپئے آزار تھا اور یہ خارشہ سنیہہ لتا کے دل میں خار کی طرح کھٹکتا رہتا تھا۔

دیانتداروں کی خوشی، عیاروں، ناہنجاروں، سیکڑوں کی مصیبت کا باعث کبھی نہیں ہو سکتی، مگر نواب رائے اپنی شکست و مصیبت کو سلامت رَو و مرفہ الحال برجموہن سے منسوب کرتا تھا۔ اور مارے حسد کے وہ اس تاک میں رہتا تھا کہ میں اس کا خون ہی تو پی جاؤں۔

قہوہ خانہ کا واقعہ سائیں بابا کی آنکھوں میں پھرنے لگا۔ تھیلے کو سرکانا، جیکی و جمی کا غرانا، کھڑکی کا کھولنا، منع کرنے کے باوجود خطوط اکٹھے کرنا۔ نواب رائے کے اس رَویہ سے اُسے شک ہوا کہ سینہ لتا کے نام ایک خط ضرور تھا، جو نواب رائے نے چرا لیا ہے۔ اُس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ واپسی پر ڈاکخانہ سے وہ ڈلہوزی میں ٹیلیفون پر برجموہن کو آگاہ کر دے گا۔

(۴)

ڈاکخانہ پہونچتے ہی بابو جی سے دریافت کیا تو اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ واقعی سینہ لتا بی بی کے نام ایک چٹھی ضرور تھی۔ ڈلہوزی ٹیلیفون کیا تو اطلاع ملی کہ برجموہن براہ بنی کھیت چنبہ کے لئے روانہ ہو چکے ہیں۔ "کاٹو تو لہو نہیں بدن میں" عالم تخیل میں خون کے پیاسے نواب رائے کا اُٹھا ہوا ہاتھ نظر آنے لگا۔ اور اس خونِ ناحق کی ذمہ داری کے احساس سے اُس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

بجائے گھر لوٹنے کے سائیں بابا مع اپنے وفادار رفیق جمی کے بنی کھیت کی طرف روانہ ہوا۔ جن لوگوں نے سائیں بابا کو چوگان دروازہ کے باہر اپنے خیالات میں غرق آنے جانے والوں سے بے پروا جلدی جلدی قدم اُٹھاتے دیکھا۔ وہ حیران و ششدر تھے کہ تھکا ماندہ، لوہے کی ٹانگوں والا سائیں بابا پھر کدھر جا رہا ہے۔ انسان کتنا ہی تھکن سے چور چور کیوں نہ ہو، قوت ارادی کے ایک ہی جھٹکے سے ساری تھکاوٹ دُور ہو جاتی ہے۔

پُل کے اس پار گھوڑے پر سوار ایک مسافر ملا تو معلوم ہوا کہ پنڈت برجموہن گھراٹ کے پرے پیدل آ رہے ہیں۔ سائیں بابا نے قدم اور تیز کئے اور راودھ بہاری کے کھیتوں کے پیچھے والا تنگ اور خوفناک راستہ طے کر کے گھراٹ سے سَو گز اوپر جا پہونچا۔ جہاں سے وہ برجموہن کے ہمراہ آنا چاہتا تھا۔

رات ہو چکی تھی۔ مہتاب کی ہلکی ہلکی کرنیں چٹانوں پر پڑ رہی تھیں۔ تنگ راستے کے دو رویہ ڈھلوانوں پر لمبے لمبے تناور درخت مہتاب کی کرنوں کو روک رہے تھے۔ عمر بھر کی کدورت کو دُور کرنے اور انتقام کی کی خوفناک خواہش کو پُورا کرنے کے لئے نواب رائے بھی اسی مقام کو موزوں سمجھ کر درختوں کی اوٹ میں چُھپا بیٹھا تھا۔ چاروں طرف سناٹا ہی سناٹا چھایا ہوا تھا۔

اس عالمگیر خاموشی میں اگر کوئی آواز سُنائی دیتی تھی تو وہ رواں ندی کی جھنکار تھی، جو چٹانوں سے

ٹکراتی، سنگ ریزوں سے اٹکھیلیاں کرتی اور اٹھتی جوانی کی اُمنگیں سینے میں دبائے پیا کو ملنے جا رہی تھی
یہیں آکر سائیں بابا رُکا۔ پتوں کی سرسراتی ہوئی آواز کے ساتھ اُس کے کانوں میں پاؤں کی آہٹ بھی سنائی دی۔ یہ برجموہن کے قدموں کی آواز تھی جو روپوں کی پوٹلی بغل میں دبائے گھر کو واپس آ رہا تھا۔ اُسے ملنے کے لئے سائیں بابا آگے بڑھا ہی تھا کہ اُسے گولی لگی۔ جھاڑی کے پیچھے سے قاتل لپکا کہ روپوں کی پوٹلی اُٹھا کر لے۔ مگر یہاں پہونچا تو برجموہن کو سامنے پایا۔ جونہی اپنی غلطی کا احساس ہوا تو چاہا کہ اب تیغ سے انتقام کی بھڑکتی ہوئی آگ کو ٹھنڈا کرے۔ مگر برجموہن چوکنا ہو گیا اور اُسکے سر پر اس زور سے اپنا ڈنڈا رسید کیا کہ نواب رائے زمین پر چت گر پڑا۔
عین اُسی وقت خوف سے ہراساں ایک عورت سائیں بابا کی لاش پر گر پڑی " میں کتنی ابھاگن ہوں۔ میں جانتی تھی کہ وہ ان کی جان لے کر رہیگا"
سنیہہ لتا کو جو اپنے نیک طینت شوہر کی زندگی کے خطرہ کا احساس ہوا تو وہ بھی گھر سے چل پڑی تھی۔ بندوق کی آواز سنتے ہی دیوانہ وار دوڑ کر جائے وقوعہ پر پہونچی۔
سنیہہ لتا۔ فکر نہ کرو، میں تو صحیح سلامت ہوں"
اچھا تو یہ بچارا کون ہے؟"
چاند کی مدھم روشنی میں، ان دونوں نے جھک کر دیکھا۔ تو سائیں بابا کو اپنی رفیقۂ حیات خاکی وردی میں نیم مردہ پایا۔ دونوں اُسے اُٹھا کر گھر تک لے آئے جہاں اُسے لٹا دیا گیا۔ ابھی اُس میں جان باقی تھی۔ لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں سائیں بابا نے سارا ماجرا کہہ سنایا کہ کس طرح برجموہن کا خط نواب رائے نے چرا لیا تھا۔ اس ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے اُس نے ٹھان لی تھی کہ وہ اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر بھی برجموہن کو بچائیگا۔ جس کی زندگی اس کی غفلت کی وجہ سے خطرہ میں پڑ گئی تھی۔
فرض شناس سائیں بابا اس جانکاہ حملہ سے جانبر نہ ہو سکے۔ اگرچہ وہ اب اس دُنیا میں نہیں ہیں۔ لیکن اُن کی سمادھی پر اب بھی سنیہہ لتا اور برجموہن کے علاوہ سیکڑوں لوگ عقیدت کے پھول چڑھاتے ہیں۔

کالیداس اور ودّیا

یہ دلچسپ ڈرامہ جناب جوش انبالوی کی تصنیف ہے اسمیں خوبی کے ساتھ یہ دکھایا گیا ہے کہ مورکھ راج نامی ایک لڑکا جس کو لوگ محض جاہل سمجھتے تھے کس طرح سنسکرت کا مشہور ڈرامہ نویس کالی داس بن گیا۔ ڈرامہ کا پلاٹ سنسکرت کی ایک مشہور روایت سے لیا گیا ہے اور طرز بیان کافی دلچسپ ہے البتہ زبان میں کہیں کہیں اصلاح کی گنجائش ہے۔ یہ ڈرامہ دیہاتی لائبریروں میں رکھنے کے قابل ہے۔ قیمت آٹھ آنہ۔ ملنے کا پتہ:۔ ودّیا پبلشنگ ہاؤس۔ انبالہ چھاؤنی

یادِ ریاض

مولانا محوی صدیقی لکھنوی (از مدراس)

اے ریاضِ خوش نوا، اے شاعرِ شیوا بیاں
تھی تری ذاتِ گرامی نازشِ ہندوستاں

اب کہاں سے لائیں گے ہم آہ تجھ سا نغمہ سنج
ہوتے ہیں ہر روز پیدا ایسے زندہ دل کہاں

یاد آتی ہے تو رو دیتا ہے دل بے اختیار
وہ تری شیریں نوائی اور بذلہ سنجیاں

وہ ترا طرزِ ادا جو آپ اپنا تھا نظیر
جس پہ سر دُھنتی ہے دنیا جسکے سب ہیں قدرداں

تھی تری تحریر کی ہر سطر میں اک دلکشی
تھا تری تقریر کے ہر لفظ میں جادو نہاں

تجھ کو آنکھوں میں جگہ دیتے تھے اربابِ کمال
مانتے تھے اہلِ انشا تیرا اعجازِ بیاں

جھوم جھوم اُٹھتے تھے ہر مصرع پہ تیرے اہلِ ذوق
وجد کرتے تھے ترے شعروں پہ سارے نکتہ داں

کچھ عجب جادو طرازی دی تھی قدرت نے تجھے
دل سے جس کے معترف ہیں ہم مذاق و ہم زباں

چھیچے تیرے دلوں کو بخشتے تھے زندگی
تو نہیں تو آہ افسردہ ہے سارا گلستاں

اللہ اللہ کیا ترے اخلاق اور اوصاف تھے
یاد آتے ہیں تو گر پڑتی ہیں دل پر بجلیاں

موت کے بیدرد پنجوں نے ستم یہ کیا کیا
کر دیا تجھکو جُدا افسوس ہم سے ناگہاں

ختم تجھ پر ہو گیا افسوس وہ طرزِ سخن
جس نے تیرے نام کو بخشی حیاتِ جاوداں

اپنے طرزِ خاص کا تھا موجد و خاتم تو ہی
کس کی قدرت ہے کہ ہو اس فن میں تیرا ہمعناں

وہ لطافت اور شیرینی، زباں کی شستگی
پائی کس شاعر نے جو ہے تیرے شعروں سے عیاں

چٹکیاں لیتا ہے دل میں تیرا اندازِ کلام
شوخیاں کرتی ہیں ہر اک بیت میں اٹکھیلیاں

ہے ترا ہر شعر اک مینائے لبریزِ شراب
جس کے ہر ہر لفظ میں بھر دی ہیں تو نے مستیاں

عاشق و معشوق دونوں تیرے نغموں کے اسیر
ہر غزل کیفِ محبت کی ہے رنگیں داستاں

کھینچ دی تصویر وہ جذباتِ حسن و عشق کی
خلوت و جلوت میں تھا دونوں کا گویا رازداں

جھومتے ہیں پڑھ کے یوں اشعار تیرے اہلِ ذوق
جھومتی ہیں جس طرح پھولوں کی رنگیں ڈالیاں

ہیں جوانی کی ادائیں جن میں اٹھلاتی ہوئی
وہ ترا ہر شعر جس کو پڑھ کے بڈھے ہوں جواں

وہ تری ہر بیت جس میں ولولوں کی چھیڑ چھاڑ
حسن کے غمزے کرشمے جاں نواز و دلستاں

وہ شبستانِ تمنّا کا غضب راز و نیاز
وہ نشاط و بیخودیٔ شوق کی رعنائیاں

گُدگُدانا آہ وہ سوتے ہوئے جذبات کو
فطرتِ انساں کا تھا تجا تو ہی اک ترجماں

حافظِ شیراز ہو، خیّام ہو، یا بو نواس[1]
تیرے ساغر میں ہے اِن سب کی شرابِ ارغواں

حسن کی دلکش اداؤں کی ہیں تصویریں وہیں
عشق کے جذباتِ رنگیں کی ہیں تفسیریں جہاں

ہیں نگینوں کی طرح الفاظ شعروں میں جڑے
یہ ترا حسنِ بیاں اور یہ ترا حسنِ زباں

قلب کی گہرائیوں میں فکر جب پہونچی تری
راز جو سینوں میں مخفی تھے کئے وہ سب عیاں

ہر غزل ہر بیت ہر مصرع میں دیکھے تو کوئی
خلوتوں کے ہیں مرقعے، جلوتوں کی داستاں

ہر نوا ہے غمزہ و ناز و ادا کا آئینہ
ہر صدا میں آرزوئیں عشق کی ہیں خونچکاں

آہ اب ہے ہر طرف افسردگی چھائی ہوئی
تو چہکتا تھا جہاں اب خاک اُڑتی ہے وہاں

خون روتا ہے وہاں اب دیدۂ ہر بادہ خوار
آہ جس میخانے میں تو تھا کبھی پیرِ مغاں

آہ اب ڈھونڈھیں کہاں پائیں تجھے ہم کس جگہ
کُنجِ تربت میں بنایا تو نے اپنا آشیاں

بن گئی ہے محفلِ شعر و سخن ماتم کدہ
مرثیہ خواں ہے ترا ہر شاعرِ ہندوستاں

کرگیا تو شاہدِ اُردو کو بیکس غمزدہ
کیوں نہ ہو یہ تیرے غم میں سوگوار و نوحہ خواں

ہے یہ چہروں کی اُداسی اور غمگینی گواہ
رو رہا ہے دل، نہیں گو آنکھ سے آنسو رواں

تجھ سے خیرآباد کیا، سارا وطن تھا سربلند
تھا تو فخرِ قوم، فخرِ ہند، فخرِ خانداں

آہ تیری موت پر ہر جانِ غمگیں سوگوار
آہ ہے تیری جُدائی آج ہر دل کو گراں

گو نہیں تو آج زینت بخشِ ابوابِ ادب
غیر فانی ہیں مگر چھوڑے ہیں جو تو نے نشاں

وہ تری انشا، وہ تیری جنبشِ نوکِ قلم
چُٹکیے چُٹکیے جو لیا کرتی تھیں دل میں چٹکیاں

اہلِ معنی سے وہ پایا تو نے تحسیں کا خراج
جس کی حسرت میں گئی بہتوں کی کوشش رائگاں

دو چھلکتے جام ہیں دو مصرعِ رنگیں ترے
خلد میں یا کوثر و تسنیم کی نہریں رواں

پڑھ کے جن کو دل پہ طاری وجد کی کیفیتیں
روح جن کے حسنِ معنی سے ہو مست و شادماں

ہے عقیدت مند اک ناچیز محویؔ بھی ترا
تیرے غم میں جس کا دل زخمی ہے آنکھیں خونچکاں

---

[1] دورِ عباسیہ کا مشہور عربی شاعر جو خمریات میں بے مثل مانا گیا ہے۔

تنقید کتب

دیوان ثاقبؔ

مرزا ذاکر حسین ثاقبؔ قزلباش لکھنوی کے اس مجموعہ کلام میں جو دیوانِ ثاقبؔ کے نام سے شائع ہوا ہے غزلیں، قطعات تاریخ اور نظمیں بھی شامل ہیں۔ اس کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ جس میں تاریخ تصنیف کے لحاظ سے غزلیں درج ہیں، دو سو بیالیس صفحات پر ختم ہوا ہے۔ اس کا مقدمہ شیخ بدرالزماں صاحب بی۔اے۔ ایل ایل۔بی نے بیالیس صفحات پر لکھا ہے جس میں مرزا ثاقبؔ کے حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دوسرے حصہ کا جس میں قطعات تاریخ اور نظمیں ہیں، مقدمہ سید شہنشاہ حسین صاحب رضوی ایڈوکیٹ لکھنؤ نے لکھا ہے جس میں مرزا ثاقبؔ کے کلام پر مفصل تنقید کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ مولوی سید محمد حسین صاحب ایم۔اے لکچرار لکھنؤ یونیورسٹی، مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی اور سید اکبر علی صاحب ایم۔اے۔ ایل۔ٹی کے تبصرے بھی اس مجموعہ میں شامل ہیں۔ چونکہ مرزا ثاقبؔ صاحب کو ریاست محمود آباد کی سرپرستی بھی حاصل ہے۔ اس لئے اس دیوان کے شروع میں سابق مہاراجہ صاحب محمود آباد اور موجودہ راجہ صاحب اور اُن کے چھوٹے بھائی مہاراجکمار صاحب کے فوٹو دئے گئے ہیں۔ ایک فوٹو مرزا ثاقبؔ کی بھی ہے۔

مرزا ثاقبؔ لکھنؤ کے مشہور اور کہنہ مشق شعراء میں ہیں۔ اس لئے وہ کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ اُن کے کلام میں طرزِ قدیم و جدید دونوں کی خوبیاں نظر آتی ہیں۔ پرانی وضع کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

صفحۂ دل داغِ حسرت کا رہینِ ناز تھا　　صبح تھی اور صبح پر خورشید نور انداز تھا
گردشِ چشم فسوں ساز اور عیسیٰ کا گماں　　یہ وہ جادو تھا کہ جو صورت کشِ اعجاز تھا
غیر کی امداد سے چمکے نہیں اہلِ کمال　　نام کو روغن چراغِ طورِ سینا میں نہ تھا

معلوم ہوتا ہے کہ ناسخؔ و آتشؔ کے زمانہ میں بیٹھے ہوئے شعر کہہ رہے ہیں۔ اسی طرح کہیں انشاؔ و مصحفیؔ کے زمانہ کا رنگ بھی خوبی سے جھلکتا ہے، مثلاً

---

[1] قیمت مجلد چار روپیہ اور غیر مجلد تین روپیہ۔ ملنے کا پتہ۔ دارالتصنیف والتالیف محمود آباد یا محمود آباد ہاؤس قیصر باغ لکھنؤ۔

تحفۂ رہِ غربت کا ہوں، داغِ کفِ پا ہوں — وہ گل ہوں کہ میں چشم و چراغِ کفِ پا ہوں
بہار ہے اگی ہے خاکِ بیاباں سے ہم آغوش — گم کردۂ منزل کا سراغِ کفِ پا ہوں
تلووں سے مرے خون یہ کہتا ہے نکل کر — میں بادۂ سرجوشِ ایاغِ کفِ پا ہوں

اب چند شعر ایسے بھی سن لیجئے۔ جن میں دورِ جدید کا رنگ ہے ؎

دل کو محوِ لذتِ آزار رہنے دیجئے — خوش رہے جس حال میں ہما رہنے دیجئے
داد بیداد کا تصفیہ ہوا فیصل، یعنے — ہوگیا سب ترے آتے ہی فراموش تجھے
جانبرا ہے عشق سے ممکن موافق ہو جو دل — ہاں مگر آپس میں جھگڑا ہو تو پھر کیونکر بنے
ہٹے یہ آئینہ محفل سے اور تو آکے — کوئی تو ہو جو کبھی دل کے روبرو آئے
موسمِ حسن تو تھا، فصلِ جفا بھی آئی — ساتھ ہی ساتھ جوانی کے ادا بھی آئی
عبرتِ دہر ہوگیا، جب سے چھپا مزار میں — خیر جگہ تو مل گئی دیدۂ اعتبار میں
ڈال لی عادت کہ خونِ آرزو دیکھا کروں — کم نہ ہوں یوں بھی تمنائیں تو پھر میں کیا کروں
دیارِ دل میں کہیں دوست کا پتہ نہ ملا — وہ بدنصیب ہوں کعبہ میں بھی خدا نہ ملا
بھلا ہے عشق، لیکن ہر بشر قابل نہیں ہوتا — بہت پہلو ہیں ایسے بھی کہ جن میں دل نہیں ہوتا
بھولنے والوں کو بھی یہ مٹنے والا یاد تھا — ہم نہ سمجھے تھے کہ اس قابل دلِ ناشاد تھا
راحتوں میں بھی جنوں کا وہی ساماں ہوتا — پھیلتا بھی دلِ عاشق تو بیاباں ہوتا
دل کو تاکیدِ وفا ہے کہ فنا ہو جانا — درد کو حکمِ قضا ہے کہ دوا ہو جانا

مرزا ثاقب کے کلام کا بیشتر حصہ پرانے لکھنوی رنگ ہی میں ڈوبا ہوا ہے۔ بہت سے شعروں میں قدیم شعرا سے مضمون بھی لڑ گیا ہے۔ جسے توارد سمجھئے یا ترجمہ۔ چند مثالیں کافی ہوں گی۔ مثلاً ؎

حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا ؎

گفتہ بودم چو بیائی، غمِ دل با تو بگویم — چہ بگویم کہ غم از دل برود چوں تو بیائی

اسی مضمون کو حضرت میر تقی میر نے اس طرح لکھا ہے۔ مگر لاجواب لکھا ہے ؎

کہتے تھے کہ یوں کہتے، یوں کہتے جو وہ آتا — سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

یہی مضمون مرزا ثاقب نے اس طرح باندھا ہے ؎

بیانِ حال کا نیرنگِ عشق دشمن ہے — ادھر وہ سامنے آئے اُدھر گلہ نہ رہا

حضرت خواجہ میر درد نے شعر کہا ہے ؎

می رود دُرد باز در کویش | چہ کند اضطرارہا دارد

اسی کو میر تقی میر نے اس طرح باندھا ہے ؎

چلا نہ اُٹھ کے وہیں پھر تو چپکے چپکے میر | ابھی تو اُس کی گلی سے پکار لایا ہوں

مرزا ثاقب فرماتے ہیں ؎

بارہا پلٹا ہوں اُن کے در سے بے نیل مرام | جی میں ہے پھر آج قسمت آزمانا چاہئے

میر مومن کا شعر ہے ؎

شب جو زنداں میں ہوئی تازہ گرفتاروں کو | سر یہ ٹکرائے کہ در کر دیا دیواروں کو

مرزا ثاقب اسی مضمون کو یوں باندھتے ہیں ؎

شب کو زنداں میں مرا سر پھوڑنا اچھا ہوا | آج کچھ کچھ روشنی آنے لگی دیوار سے

مرزا ثاقب کو تاریخ گوئی میں بھی کمال حاصل ہے۔ چنانچہ اس مجموعہ کا تقریباً ایک تہائی حصہ قطعات تاریخ سے مملو ہے۔ جنمیں بعض تاریخوں میں صنائع و بدائع سے بھی کام لیا گیا ہے۔

اگرچہ دنیا اور اس کے ساتھ ساتھ اردو زبان منجھتے منجھتے نہیں سے کہیں پہونچ گئی ہے۔ بہت کچھ الفاظ اب متروک ہوگئے ہیں۔ بہت سے لفظوں کے پرانے معنی بدل گئے ہیں مگر مرزا ثاقب انکا استعمال ابھی جائز سمجھتے ہیں۔ اور ہماری رائے میں ہمارے ادیبوں اور شاعروں کو عام طور پر ان معاملات میں آزاد خیالی سے کام لینا چاہئے۔ بہرحال ہم ذیل میں چند مثالیں درج کرتے ہیں ؎

سپید بال ہوئے، دل کا داغ جلتا ہے | سحر ہوئی یہ ابھی تک چراغ جلتا ہے

یا

اچھی تھی مرگ عشق پہ بدنام ہوگیا | میرے ہی سر وفا کا بھی الزام ہوگیا

اب سے دس بیس برس پہلے "تب" کا لفظ "اس وقت" کے معنی میں استعمال ہوا کرتا تھا۔ مرزا ثاقب اب بھی لکھتے ہیں۔ مثلاً ؎

فسانہ ذبح کا جز خونِ آرزو نہ رہا | چھری گلے پہ چلی تب کہ جب لہو نہ رہا

کوئی تو داد دیتا اسی دردِ دل کی آخر | جب تم نہ بولتے تھے تب میں کراہتا تھا

"سدا" کا لفظ بھی بمعنی "ہمیشہ" بڑا پیارا لفظ ہے، جسے اہلِ زبان حضرات ترک کئے ہوئے ہیں۔ لیکن مرزا صاحب اسے برابر استعمال کرتے ہیں ؎

آئینہ جس میں سدا ڈوب کے ابھرا کیا حسن | ایک ٹھہرا ہوا پانی ہے خود آرائی کا

لکھائی، چھپائی و کاغذ سب لحاظ سے یہ دیوان قابل قدر ہے۔ اس کا حجم ۲۴۴ صفحات ہے۔

معلومات سائنس[1]

ہر تیج جو آفتاب طلوع ہوتا ہے وہ دُنیا میں کسی نئے انقلاب کا پیغام لے کر آتا ہے۔ آج سے پچاس برس پہلے گراموفون، ریڈیو لاسلکی، آبدوز کشتیوں، وٹامین (حیاتین) وغیرہ کا کسی نے نام تک نہ سُنا تھا۔ اب یہ چیزیں ہماری ضروریات زندگی میں داخل ہوگئی ہیں۔ ہر طرف موٹریں چلتی اور سروں پر ہوائی جہاز منڈلاتے ہیں اور یہ سب سائنس کے کرشمے ہیں۔ ایسی صورت میں ہر انسان پر لازم ہوجاتا ہے کہ وہ مروجہ سائنس کی معلومات سے بخوبی بہرہ ور ہو۔ یہ زمانہ سائنس کا ہے۔ کیونکہ سائنس نے ہماری زندگی کے ہر شعبہ میں دخل حاصل کرلیا ہے۔ مگر سائنس کی کتابیں عموماً غیر ملکی زبانوں میں ہیں۔ جن کے مطالعہ سے ہمارے نوجوان اکثر محروم رہ جاتے ہیں۔ ہم ممنون ہیں مسٹر آفتاب حسن ایم۔ایس سی، شیخ عبدالحمید بی۔ایس سی۔بی۔ٹی اور چودھری عبدالرشید صاحب تبسم بی۔اے کے جنھوں نے بڑی محنت کرکے اُردو میں یہ کتاب تالیف کی ہے۔ جسمیں خوراک وحیاتین، جراثیم، دانت، نباتات، برقی ایجادات، ریڈیم، گراموفون، قلم سازی، دوربین، لاسلکی وغیرہ پر بہت کافی روشنی ڈالی ہے۔ اور زبان اتنی سلیس اور عام فہم استعمال کی گئی ہے کہ کتاب کے مطالعہ سے تھوڑی سی استعداد کا آدمی بھی مستفید ہوسکتا ہے۔ اس کتاب میں تقریباً بیس۲۰ موضوعات پہ کافی بحث کی گئی ہے اور ڈیڑھ درجن تصویریں بھی دی ہیں۔ جن سے کتاب کی افادی حیثیت اور زیادہ بڑھ گئی ہے۔ یہ کتاب اسکولوں کے کورس میں رکھے جانے کے قابل ہے۔ زبان میں تذکیر وتانیث کی کہیں کہیں غلطی ہے، مثلاً "کواڑ" کو مونث لکھا گیا۔ "جب توپ چھوٹتی ہے تو اکثر کواڑیں ہلنے لگتی ہیں" اُردو میں کواڑ مذکر ہے۔ اُمید ہے کہ اس قسم کی خامیاں آیندہ ایڈیشن میں دُور کردی جائیں گی۔

لکھائی چھپائی، کاغذ سب عُمدہ۔ انگریزی وضع کی خوبصورت جلد۔ ضخامت ۲۰۰ صفحات۔

حالی پانی پتی[2]

یہ اُردو زبان کے مشہور و معروف اہلِ قلم حضرت خواجہ الطاف حسین حالی پانی پتی کی مختصر سی سوانحعمری ہے۔ جسمیں مسٹر ہری چند اختر ایم۔اے اور ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ ایم۔اے، پی۔ایچ۔ڈی۔ ڈی۔لٹ نے خواجہ صاحب کے مختصر سوانح حیات درج کرکے اُن کے کلام اور تصنیفات پر بھی ایک تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ یہ چھوٹی سی کتاب اگرچہ طلبا اسکول کے لئے لکھی گئی ہے۔ مگر اس کے مطالعہ سے دوسرے حضرات بھی مستفید ہوسکتے ہیں۔ فاضل مولفین نے اس چھوٹی سی کتاب میں مولانا حالی کے متعلق تمام ضروری معلومات یکجا کردی ہیں جو طالب علموں کے لئے خاص طور پر مُفید ہوں گی۔

---

[1] قیمت غالباً ڈیڑھ روپیہ (عہ) ہوگی۔ ملنے کا پتہ:۔ انجمن ترقی اُردو۔ نئی دہلی۔
[2] قیمت غالباً چار آنہ (۴ر)۔ ملنے کا پتہ:۔ آر۔ ایس۔ جوڑا، ایم۔ اے، ایڈیٹر، کچہری روڈ۔ لاہور۔

رفتار زمانہ

سیاسیات جنگ ایک مدت سے یوروپین سیاست کی بساط میں ہٹلر کی شاطرانہ چالیں کیے بعد دیگرے برطانیہ کو مات دی رہی ہیں پچھلے پانچ مہینوں سے برطانیہ اور فرانس برابر اس بات کی کوشش کرتے رہے کہ روس کو اپنے جتھے میں شامل کریں۔ مگر اسمیں انھوں نے اسقدر تکلف برتا اور گفتگو اور مراسلات کے سلسلے کو اتنا طول دیا کہ یہ لوگ بحث و مباحثہ ہی میں لگے رہے۔ اور ہٹلر نے روس کے ساتھ پے بہ پے دو معاہدے (ایک تجارتی اور دوسرا سیاسی) اس صفائی سے کر لئے کہ حریفوں کو کانوں کان خبر تک نہ ہوئی۔ ان معاہدوں کی اطلاع فرانس، برطانیہ، پولینڈ وغیرہ کے لئے بلائے ناگہانی کی طرح نازل ہوئی۔ کیونکہ ان کے تحریک کی بھی ان کو خبر نہ تھی۔ اور ہٹلر و اسٹالین کا اتحاد ناممکنات میں شمار ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس خبر نے سارے یوروپ میں تہلکہ ڈالدیا کہ روس اور جرمنی کے درمیان ایک غیر جارحانہ معاہدہ پر فریقین کے دستخط ثبت ہو گئے ہیں۔ برطانیہ کو اس کے بعد بھی کچھ اُمید باقی رہی کہ اگر وہ روس کو فی الفور اس بات کی رضامندی کی اطلاع دیدے کہ کر کہ پولینڈ، روس کی امداد لینے یعنی اپنے ملک میں روسی فوجوں اور اسلحہ جات کے داخلہ کی اجازت دینے کو تیار ہے تو روس اور جرمنی کے معاہدہ کی تکمیل رُک جائے گی۔ مگر یہ اُمید غلط ثابت ہوئی۔ برطانوی اخبارات نے اس معاہدے پر رائے زنی کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اٹلی اس معاہدہ سے کبیدہ خاطر ہوجائے گا جس سے غالباً فرانس اور برطانیہ کو فائدہ پہونچے گا اُن کا خیال ہے کہ جس طرح ۱۹۱۴ء میں اٹلی اتحاد ثلاثہ سے علیحدہ ہوکر برطانیہ سے مل گیا تھا۔ آیندہ بھی شاید وہی صورت ظہور پذیر ہو۔ مگر یہ سب قیاس آرائیاں ہیں اور اسوقت وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا ہے۔ بظاہر حالات اٹلی کے فیسسٹ حلقوں میں روس اور جرمنی کے درمیان معاہدہ کا خیر مقدم کیا گیا ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ پولینڈ کے ساتھ جرمنی کی آویزش میں اٹلی فی الحال علیحدہ رہنا چاہتا ہے۔ مسولینی کی یہی کوشش ہے کہ ڈینزگ کا معاملہ صلح و صفائی سے طے ہوجائے اور لڑائی کی نوبت نہ آئے۔ کیونکہ لڑائی سے اٹلی کو کوئی فائدہ پہونچنے کی اُمید نہیں بلکہ اُلٹا اندیشہ ہے کہ کہیں وہ اپنے افریقی مقبوضات سے ہاتھ نہ دھو بیٹھے۔

اب رہا اسپین کا معاملہ۔ برطانیہ کے اکثر مدبروں کا خیال ہے کہ جنرل فرانکو جنگ یوروپ میں کوئی حصہ نہ لے گا کیونکہ اُسے اپنے ملک کی از سر نو تعمیر کرنا ہے۔ مگر اس کا بھی کوئی اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ آخر کس کو

مان تھا کہ روس و جرمنی کا غیر جارحانہ معاہدہ ہو جائے گا۔ پھر جنرل فرانکو تو جرمنی کا مرہون منت اور رفیق کار ہے
اس کا جرمنی کا معاون ہونا بالکل قرین قیاس ہے۔ تازہ کارروائیوں سے بھی یہی ترشح ہو رہا ہے کہ جنرل
موصوف کی دلی ہمدردی جرمنی ہی کے ساتھ ہے اور ان کے برادر نسبتی Sen or Suner کی تو یہی
کوشش ہے کہ وہ اسپین کو روم برلن محور سے وابستہ کر دے بہر حال اسوقت وثوق کیساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ اسپین
ضرور ہی جنگ میں شریک ہوگا۔ مگر ہٹلر کے حوصلے برابر بڑھ رہے ہیں اور اس کے مطالبات میں اضافہ
ہوتا جاتا ہے۔ ڈینزگ کے الحاق کے علاوہ اب اس نے دو اور مطالبے کئے ہیں۔ اول یہ کہ پولینڈ کا دریائی
راستہ بھی جو جنگ عظیم کے بعد پولینڈ کو سمندر تک پہونچنے کے لئے قائم کیا گیا تھا جرمنی کو دیدیا جائے اور پولینڈ
کو ۱۹۱۴ء کی سابقہ حالت پر لایا جائے۔ اس کے ساتھ ہی سیلیشیا کی سپردگی اور پولینڈ کی جرمن اقلیت کے
ساتھ بھی مناسب برتاؤ کیا جائے۔ جرمنی نے وزیر اعظم فرانس کو جو جواب لکھا ہے اسمیں یہ بھی دھمکی دی گئی ہے
کہ اگر پولینڈ نے جرمنی کی شرائط منظور نہ کیں تو جنگ کا نتیجہ خواہ کچھ ہی ہو مگر پولینڈ ضرور تباہ ہو جائے گا۔ غرض
کچھ بھی ہو پولینڈ لڑنے پر آمادہ ہے اور ہٹلر کی اس رائے سے مرعوب نہیں ہے کہ جنگ میں شکست ہونے
پر پولینڈ کا آزاد وجود باقی نہ رہے گا۔

اس مرتبہ فرانس اور برطانیہ نے بھی مستقل مزاجی و اولوالعزمی سے کام لیا ہے اور پولینڈ کی آزادی برقرار
رکھنے کے وعدوں کا بار بار باصاف و صریح الفاظ میں اعادہ ہو چکا ہے درحقیقت ان دونوں جمہوری
ملکوں نے اب بخوبی سمجھ لیا ہے کہ اگر پولینڈ کے معاملے میں بھی وہ ہٹلر کی دھمکیوں سے دب گئے تو انکی رہی سہی
ساکھ ختم ہو جائے گی۔ چنانچہ وزیر اعظم برطانیہ مسٹر چیمبرلین جیسے صلح جو اور صلح پسند مدبر کو بھی بالآخر اپنی پالیسی
تبدیل کرنا پڑی۔ اور انھوں نے مجبور ہو کر دوسرے ملکوں کو قربان کر کے ہٹلر کے غیظ و غضب کو فرو کرنے کی
پالیسی کو یکلخت ترک کر دیا۔ برطانیہ ہٹلر کے منصوبوں سے بے خبر نہیں ہے۔ لیکن جہاں روس و جرمنی کے معاہدہ
سے اس کو ایک طرف زک ہوئی ہے وہاں دوسری طرف جاپان کو اس اتحاد سے جو صدمہ پہونچا ہے اسکی وجہ سے
وہ اب انگریزوں کیساتھ اپنے تعلقات خراب کرنا نہیں چاہتا۔ برطانیہ بھی اسوقت مشرق اقصیٰ میں جاپان سے برسرپیکار
نہیں ہونا چاہتا۔ حالانکہ جاپان نے پچھلے دنوں انگریزوں کے ساتھ جو سلوک روا رکھا۔ وہ کسی خوددار قوم
کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ خیر برطانیہ مصلحتاً خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ اور اب جاپان نے خود ہی
اپنا رویہ ٹھیک کر لیا جس سے انگلستان کو کم سے کم مشرق میں مطمئن رہنا چاہیئے۔

پریسیڈنٹ روزویلٹ نے ہٹلر سے کئی مرتبہ اپیل کی اور اس بات کی سچے دل سے کوشش کی کہ ہٹلر
صلح و صفائی کے لئے آمادہ ہو جائے مگر اسکا کوئی مفید نتیجہ نہ نکلا۔ اور ہٹلر نے ڈینزگ کو بلا کسی خیال و لحاظ اپنے حدود میں

شامل کرنے کا اعلان کردیا۔ ایک سال کے بعد پولینڈ کے سمندری راستے کے معاملے کو اُس نے عام رائے کے مطابق طے کرنیکا ارادہ ظاہر کیا ہے۔ لیکن نہ پولینڈ نے ان شرائط پر صلح منظور کی اور نہ برطانیہ اور فرانس ہی نے ان باتوں کو قابلِ التفات سمجھا۔ ہٹلر اپنی بات پر اڑا رہا اور یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کو پولینڈ پر تین طرف سے حملہ کردیا۔ اسی کے ساتھ اُس نے ڈینزگ کو جرمنی سے ملا کر ہر فوسٹر کو اُس کا صدر مقرر کردیا۔ اور جرمن پریس نے بھی اس تمام کارروائی کی تصدیق کردی۔ ڈینزگ کے جرمن افسران تو پہلے ہی سے ہٹلر سے ملے ہوئے تھے انھیں اس جبری فیصلہ میں کیا انکار ہوسکتا تھا۔ البتہ جن بڑی بڑی سلطنتوں نے پولینڈ اور ڈینزگ کا آئین طے کیا تھا اُن کیلئے یہ زبردستی ناقابل برداشت ہے چنانچہ اس کی علانیہ مخالفت میں اب انگلستان و فرانس نے جرمنی سے جنگ کا اعلان کردیا ہے

عراق، ترکی اور مصر بھی انگلستان کیساتھ ہیں اور برطانیہ کی تمام نوآبادیاں زور وشور سے برطانیہ کی امداد و اعانت پر کمربستہ ہوگئی ہیں۔ البتہ آئرلینڈ نے فی الحال غیر جانبدار رہنیکا ارادہ کیا ہے۔ مگر اُس نے بھی اپنی فوجوں کو جمع ہونے کا حکم دیدیا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر لڑائی کچھ دنوں اور قائم رہی اور بظاہر اسباب اس کے جلد ختم ہونے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے تو آئرلینڈ کو مجبوراً برطانیہ کا ساتھ دینا ہوگا۔

اس طرح ہندوستان کے لئے بھی اسوقت انگلستان کا ساتھ دینے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں ہے ہمارے پرجوش و سرگرم لیڈر سبھاش بابو اور اُن کے ہمنوا خواہ کچھ ہی کہیں۔ لیکن ہماری رائے میں جرمنی اور انگلستان کی معرکہ آرائی میں ہم کو اس بات کو دم بھر بھی سوچنے کی ضرورت نہیں کہ ہم کو کس کی امداد و اعانت کرنا چاہیئے۔ ہٹلر نے جرمنی میں مطلق العنان حکومت کی انتہائی صورت قائم کرکے دُنیا کی جمہوریتوں کو پامال و مغلوب کرنے کا تہیہ کرلیا ہے۔ چونکہ ہماری تمام امیدیں جمہوری طرز حکومت کی توسیع و ترقی سے وابستہ ہیں۔ ہم کسی طرح بھی ہٹلر کی فتح کے خواستگار نہیں ہوسکتے۔ انگلستان اپنے معیار سے کتنا ہی کیوں نہ گر جائے لیکن اس کے عوام آزاد اور آزادی پسند ضرور ہیں۔ اور اپنے اصول و عقائد سے کبھی اسقدر منحرف نہیں ہوئے ہیں جیسے کہ ہٹلر کے نازی پیرو۔ علاوہ بریں ہٹلر کے قول و فعل کا بھی کوئی اعتبار نہیں۔ آج وہ ایک بات کا بڑے شد و مد سے وعدہ کرتا ہے مگر کل ہی اسے حرفِ غلط کی طرح بے تکلف و بے تردد مٹا دیتا ہے۔ ہٹلر پر تمام دُنیا پر حاوی ہونے کا نشہ بھی ایسا چھا گیا ہے کہ جب تک اس کا وجود باقی رہے گا دُنیا کو امن و چین نصیب نہ ہوگا۔ اس لئے ہر بہی خواہ جمہور کو اس جنگ میں انگلستان و فرانس کو امداد دینے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں ہے

مہاتما گاندھی نے اپنی پوزیشن صاف کردی ہے۔ آپ کو والسرائے ہند نے شملہ میں تبادلۂ خیالات کے لئے بلایا تھا چنانچہ آپ نے انگلستان و فرانس کے ساتھ اپنی ہمدردی کا علانیہ اظہار کردیا ہے۔ البتہ آپ نے

والیسرائے سے یہ بھی صاف کہدیا ہے کہ کانگریس سے گورنمنٹ کو کوئی معاملہ کرنا ہو تو وہ اُس کے صدر اور ممبران ورکنگ کمیٹی سے گفتگو کریں۔ خبر ہے کہ ہز ایکسیلنسی نے بابو راجندر پرشاد اور دیگر ممبران ورکنگ کمیٹی کو شملہ میں مدعو کیا ہے۔ مسٹر جناح، مسٹر ایمبیٹے اور دیگر لیڈران سے بھی ملاقاتیں ہو چکی ہیں۔ ۱۱ر دسمبر کو وائسرائے ہند اسمبلی اور کونسل آف اسٹیٹ کے روبرو تقریر کرنے والے ہیں۔ یہ بھی خبر ہے کہ مدبران انگلستان اسوقت ہندوستان کے حقوق کیساتھ انصاف سے کام لینا چاہتے ہیں۔ بہرحال ہم ہندوستانی اس مصیبت کیوقت انگریزوں سے علیحدہ نہیں رہ سکتے۔ برٹش سلطنت کے دشمن، جمہوریت کے دشمن اور ہمارے مُلکی دشمن ہیں اور ہمکو اُن باتوں کے لئے جو زندگی سے بھی زیادہ عزیز ہیں اسوقت انگریزوں کا ساتھ دینا چاہیئے۔

ہم کو اُمید ہے کہ کانگریس ورکنگ کمیٹی جو کچھ فیصلہ کرے گی، عام خیالات و عام جذبات کا پورا لحاظ رکھکر کریگی۔ ہم کو اس بات کے کہنے میں مطلق عذر نہیں ہے کہ ہندوستان میں سب طبقوں کی دلی ہمدردی اس لڑائی میں برطانیہ کے ساتھ ہے۔ ملک کے راجہ، مہاراجوں اور بڑے بڑے روسا اور زمینداروں نے اپنی پوری طاقت سے برطانیہ کو امداد دینے کا ارادہ کیا ہے۔ پنجاب کے طرف سے سر سکندر حیات وزیر اعظم نے پورے اشتراک عمل کا اطمینان دلایا ہے۔ اور پنجاب سے فوج کی ساٹھ فی صدی بھرتی ہوتی ہے۔ بنگال بھی برطانیہ کے ساتھ ہے۔ غرض اس وقت کانگریس کے لئے مہاتما گاندھی کی رہنمائی قبول کرنیکے سوا اور کوئی صحیح راستہ نہیں ہے۔

حیدر آباد کی اصلاحات | خوشی کی بات ہے کہ حضور نظام کی روشن خیالی کی بدولت آریہ ستیہ گرہ ایجی ٹیشن کا بخیر و خوبی خاتمہ ہو گیا۔ آریوں کی تحریک کامیاب ہوئی اور کل نزاعی معاملات صلح و صفائی کے ساتھ طے ہو گئے۔ نظام گورنمنٹ نے ۸ر اگست کو جو سرکاری اعلان شائع کیا ہے اُس نے سابقہ اعلان کی کچھ اس طرح وضاحت کر دی ہے کہ ہندوؤں کی ساری بدگمانیاں دور ہو گئیں اور ستیہ گرہ کے لیڈران نے سرکار دکن کی فراخدلی کا اعتراف کرتے ہوئے ستیہ گرہ کی تحریک کو بند کر دیا ہے۔ گورنمنٹ نظام نے بھی ستیہ گرہ کے قیدیوں کو رہا کر کے اپنی روشن خیالی کا مزید ثبوت دیا۔ حضور نظام اور سر اکبر حیدری جنھوں نے معاملہ فہمی اور بے تعصبی سے کام لے کر اس قضیئہ کو رفع کر دیا ہمارے دلی شکریہ کے مستحق ہیں۔ جن اصحاب کا خیال ہے کہ یہ اصلاحات ناکافی ہیں۔ اُن کو بھی اس لحاظ سے مطمئن ہو جانا چاہیئے کہ رعایا میں جب ایک مرتبہ بیداری پیدا ہو جاتی ہے اور گورنمنٹ کی طرف سے اس کی کچھ بھی حوصلہ افزائی ہوتی ہے تو پھر ناممکن ہو جاتا ہے کہ آئندہ رعایا کو پوری سیاسی آزادی حاصل نہ ہو جائے۔

آپ بیتی

نالہ را ہر چند میخواہم کہ تنہا میکشم — سینہ میگوید کہ من تنگ آمدم فریاد کن

رنج و مصیبت کے واقعات اور ذاتی حادثات کے تذکرے سے قدر دانِ رسالہ کو مکدر و بے لطف کرنا کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن اس ماہ اگست ۱۹۳۹ء میں میری جو خانہ ویرانی ہوگئی، اُس کی احباب زمانہ کو اطلاع نہ دینا بھی مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ ہمدرد ناظرین کو یہ سن کر افسوس ہوگا کہ ۱۴ اگست ۳۹ء کی علی الصباح اُن کے دیرینہ خادم ایڈیٹر زمانہ کی رفیقِ زندگی نے جس کی بدولت راقم اڑتیس ۳۸ سال سے زائد تمام تفکرات و ترددات خانگی سے آزاد رہا، اپنی جان شیرین جانِ آفرین کے سپرد کر دی۔ پندرہ ۱۵ روز کی علالت کے بعد بھی ہم لوگ مایوس نہ تھے لیکن ۱۲ اگست کو جو حالت غیر ہوئی پھر سنبھالے نہ سنبھلی۔ احباب و اعزا نے دوا دوش و خدمتگذاری میں کسر اٹھا نہ رکھی۔ شہر کے سبھی بڑے بڑے ڈاکٹروں اور ویدوں نے دن رات ایک کر دیا۔ مگر مشیت ایزدی کے سامنے کسی کی کچھ نہ چلی اور جانے والی نے جنت کی راہ لی۔

ابھی یہ غم تازہ ہی تھا اور اس خانہ بربادی کی تعزیت کا سلسلہ ختم نہ ہونے پایا تھا کہ سولہ دن کے بعد یعنی ۳۰ اگست کو نو ۹ بجے صبح کے وقت چہیتی بیٹی کماری دلاری بھی جس کی علالت پچھلے تین ماہ سے تمام خاندان کے لئے فکر و تردد کا باعث ہو رہی تھی، لکھنؤ میڈیکل کالج اسپتال میں ہمیشہ کیلئے داغ مفارقت دے گئی۔

یہ دونوں اندوہناک واقعات اس قدر تیزی سے پے در پے ہوئے ہیں کہ ہم لوگوں کے دل و دماغ کی عجیب کیفیت ہوگئی ہے جس کا بیان فضول ہے جانیوالی روحوں کی خوبیاں بیان کرنے کا بھی یہ کوئی موقعہ نہیں ہے۔ لیکن مسز دیا نرائن کے حسنِ انتظام، سلیقہ مندی، معاملہ فہمی اور گھریلو دور اندیشی کا سرسری ذکر نہ کرنا بھی انتہائی ناشکری ہوگی۔ انھیں کی سلیقہ شعاری اور جفاکشی کی بدولت راقم اتنے دنوں گھر گرہستی کے تمام بکھیڑوں سے آزاد رہ کر ملک کی بُری بھلی جو ادبی خدمت ممکن ہوئی اطمینان اور سیر چشمی انجام دے سکا۔ اخبار نویسوں کی زندگی کچھ بہت خوشگوار نہیں ہوتی خصوصاً ہندوستانی اخبار نویس کو تو معمولی آرام و آسایش کے موقعے بھی نصیب نہیں ہوتے اور خود دار اردو اخبار نویس کو تو ہمیشہ خاص مشکلات کا سامنا رہتا ہے جس کا صحیح اندازہ بہت کم لوگوں کو ہوگا۔ مگر مرحومہ کی حُسنِ لیاقت اور تندہی کی بدولت میری زندگی بے فکری و آسودہ حالی میں بسر ہوئی ہے انھیں کے ایثار و جفاکشی کی وجہ سے مجھے اپنے محدود ذرائع کے باوجود اب تک وہ اطمینان قلب

حاصل رہا جس سے زیادہ وسیع سے وسیع ذرائع والے شخص کو بھی مشکل ہی سے نصیب ہوا ہوگا اور اگر مصائب ومشکلات میں بھی میری ہمت قائم رہی تو اس کا اصلی کریڈٹ اسی نیک بخت خاتون کو ملنا چاہئے۔ جس نے میرے کنبے کی پرورش وتربیت کا بار اس قابلیت وجفاکشی کے ساتھ اپنے ذمہ لے رکھا تھا جس نے شروع سے آخر تک اپنی زندگی کے پچاس سال فرض شناسی، خدمتگذاری اور دوسروں کی دلجوئی میں بحسن وخوبی بسر کردیئے جو جیتے جی دوسروں کے لئے مرتی رہی اور جس کی مرتے وقت بھی یہی خواہش تھی کہ ایشور اُس کی بیٹی کے بدلے اُس کی جان کا نذرانہ قبول کرلیں۔ مگر بھگوان کو یہ منظور نہ تھا اور صرف سولہ دن کے بعد اُسکی نیک نہاد ونیک سیرت بیٹی بھی اپنی پیاری ماں سے جاملی۔ یہ فرشتہ خصلت لڑکی نہ صرف اپنے والدین اور بھائی بہنوں ہی کی محبوب تھی بلکہ اُس نے نوعمری ہی میں اپنے سلیقہ، فہم وفراست ونیک بختی سے خاندان کے ہر چھوٹے بڑے شخص کے دل میں ایک خاص جگہ پیدا کرلی تھی۔ ڈھائی ہفتے کے اندر یکے بعد دیگرے ان دونوں حادثات عظیم کی بدولت تمام اعزا واقربا پر رنج وغم کا جو پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے اُس کا اٹھانا کوئی آسان کام نہیں ہے لیکن مشیت خداوندی اٹل ہے اور ہمارے لئے گردن تسلیم خم کرنے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں۔ ایشور اُن دونوں پاک روحوں کو غریق رحمت کرے اور ہم لوگوں کو ان صدمات عظیم کے برداشت کرنے کی قوت عطا فرمائے۔

مرحومہ نے پانچ لڑکے اور چار لڑکیاں اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ اِن میں سب سے بڑا لڑکا سری نراین نگم ایم۔اے، ایل ایل بی ایڈوکیٹ (کانپور) ہے۔ دوسرا لڑکا بشن نراین نگم ایم۔اے ایل ایل بی آئی۔سی۔ایس، آجکل ڈسٹرکٹ وسشن جج نخگاڈھ ہے۔ تیسرا شیام نراین نگم ایم۔اے۔ پی۔سی۔ایس ڈپٹی کلکٹر گورکھپور ہے۔ چوتھا بیٹا براج نراین نگم ایم۔ایس سی، ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس اٹیہ ہے۔ پانچواں جس کی عمر دس سال ہے زیر تعلیم ہے۔ تین بیٹیاں بیاہ گئی ہیں۔ ایک چھوٹی لڑکی ابھی زیر تعلیم ہے۔

انھیں حادثوں کی وجہ سے اس ماہ کے پرچے کی اشاعت میں کسیقدر تاخیر ہوئی۔ ناظرین معاف فرمائیں۔

"شام کا سناٹا"

اس مرتبہ سرورق زمانہ کے ساتھ جو رنگین تصویر ہدیۂ ناظرین ہے اُسمیں چابکدست مصور نے شام کے سناٹے کا دلگداز سماں دکھانے کی کوشش کی ہے۔ غروب آفتاب کے وقت فضائے آسمانی پر جو کیفیت چھا جاتی ہے۔ اُس کا نظارہ پرلطف وسبق آموز ہونے کے علاوہ کتنا عبرت انگیز ہوتا ہے۔ اس کا حال کسی حسرت زدہ دل سے پوچھئے۔

نئی کتابیں

گئودان:۔ از منشی پریم چند مرحوم بی۔اے، یہ دلچسپ ناول پہلی بار ہندی سے اُردو میں منتقل ہوا ہے اور دیہات کے اَن پڑھ اور سادہ لوح انسانوں کی زندگی کا صحیح مرقع ہے۔ قیمت مجلد ۶؍

محکومیتِ نسواں:۔ از معین الدین صاحب انصاری بی۔اے (کنٹب) بارایٹ لا۔ یہ مِل کی معرکتہ آرا تصنیف کا اُردو ترجمہ ہے۔ جسمیں عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق دیئے جانے کی پُر زور طریقے پر حمایت کی گئی ہے۔ قیمت مجلد عہ؍

خیالستان:۔ از سید سجاد حیدر صاحب یلدرم بی۔اے، یہ پہلی کتاب ہے جسکی اشاعت نے اُردو ادب میں ایک نہایت دلکش انداز پیدا کر دیا ہے اور جس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ اب تک نویں بار چھپ چکی ہے۔ قیمت مجلد ۶؍

دُنیا کی کہانی:۔ از پروفیسر محمد مجیب صاحب بی۔اے (آکسن) جسمیں ہزاروں برس کی تاریخ اس قدر دلچسپ اور نرالے انداز سے لکھی گئی ہے کہ پڑھنے والا آسانی سے تاریخ کا اصل مفہوم سمجھ جاتا ہے۔ قیمت غیر مجلد ۶؍

رحمۃ للعالمین حصہ اوّل:۔ از الحاج مولانا محمد سلیمان صاحب مرحوم، یہ سیرت پاک پر مستند اور مقبول ترین تصنیف ہے جو ہم نے خاص اہتمام سے حال ہی میں پانچویں بار شائع کی ہے۔ قیمت مجلد دو روپیہ (۶؍)

مکتبہ جامعہ

دہلی۔ نئی دہلی۔ لاہور۔ لکھنؤ۔ بمبئی

ایڈیٹر و پبلشر:۔ منشی دیانراین نگم

پرنٹر:۔ خواجہ عبدالوحید نظامی پریس کانپور

The ZAMANA, SEPTEMBER 1939. Regd. No. A811

زمانہ

مرتبہ: دیا نراین نگم بی۔ اے

نمبر ۳	ستمبر ۱۹۳۹ء	جلد ۷۳

فہرست

تصویر:- حضرت عروج لکھنوی

قیمت سالانہ پانچ روپیہ — ممالک غیر سے آٹھ روپیہ
زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا

۸۹۸۶
نمونہ سات آنہ

زمانہ کے پرانے فائل
دفتر ہذا میں ۱۹۲۶ء سے پرانے فائل موجود ہیں
زمانہ کے تشنگان ادب خوب واقف ہیں کہ شمالی ہند کا یہ قدیم ترین اور مشہور رسالہ چھتیس سال سے اردو زبان و ادب کی کسقدر انہماک اور سرگرمی سے خدمت کر رہا ہے۔ اس کے نقادانہ مضامین اور گرانبایہ نظمیں ملک کے بڑے بڑے نقادوں سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ زمانہ کے پرانے فائل لائبریریوں میں رکھنے کے قابل چیز ہیں۔ صرف چند فائلیں باقی رہ گئی ہیں۔ خریداروں سے حسب ذیل رعایت کی جائے گی:۔
۱۔ بارہ ۱۲ سال کے مکمل سٹ کے خریدار سے ۲۸
۲۔ چار سال کے خریدار سے تین روپیہ فی فائل
۳۔ ایک سال کے خریدار سے ۳ علاوہ محصول۔
نوٹ۔ آرڈر کے ہمراہ چوتھائی قیمت پیشگی بھیجنا چاہیئے۔ فائل ۱۹۲۸ء میں جوبلی نمبر باقی نہیں ہے ۱۹۲۴ء میں ستمبر کا پرچہ موجود نہیں۔ ۱۹۰۳ء سے ۱۹۲۵ء تک مختلف پرچے بھی آرڈر آنے پر مل سکتے ہیں
مینیجر زمانہ کانپور سے طلب فرمایئے
اور اب میں پھر نیا آدمی بن گیا ہوں
صرف سناٹوجن کی بدولت
نہ معلوم ممنون احسان لوگوں نے دنیا بھر میں کتنی مرتبہ یہ الفاظ کہے ہونگے! احسانمند کا لفظ ہم نے اسلئے استعمال کیا ہے کہ سناٹوجن وہ چیز ہے جس سے انہیں اعلیٰ درجہ کی بیفکرانہ تندرستی پیدا کردی ہے جو انھیں برسوں سے نصیب نہ ہوئی تھی۔ اگر آپ خستگی، بے کیفی یا تھکن محسوس کرتے ہیں یا بیماری سے اٹھے ہیں تو ضرور سناٹوجن استعمال کیجئے۔ سناٹوجن درماندہ اور خستہ اعصاب کی مرمت کردیتی ہے۔ اس سے نیا اور بکثرت خون پیدا ہوتا ہے۔ اس سے آپکے اندر وہ طاقت اور توانائی پیدا ہوجاتی ہے جو فکر اور محنت کی وجہ سے زائل ہوجاتی ہے۔ سناٹوجن محض محرک شے نہیں ہے جس طرح آپکے جسم میں خون مستقل ہے اسی طرح سناٹوجن کا فائدہ بھی مستقل ہوتا ہے۔ ہمارا پختہ ایمان ہے کہ سناٹوجن سے بہتر مقوی ابتک کوئی غذا دستیاب نہیں ہوئی ہے اور ہمارے یقین کی تصدیق پچیس ہزار سے زیادہ ڈاکٹروں نے بذریعہ تحریر کی ہے۔
تمام دوا فروش اور بازاروں سے ملتی ہے۔
SANATOGEN
THE TRUE TONIC FOOD
واردات
منشی پریم چند کے تیرہ ۱۳ افسانوں کا مجموعہ جو نہایت محدود تعداد میں شائع ہوا ہے۔ قیمت عہ علاوہ محصول
ملنے کا پتہ:۔ زمانہ بک ایجنسی کانپور

اعداد و شمار کا استعمال

اخبارات میں گاہے گاہے سرکاری اعداد و شمار شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اعداد و شمار کے ان مجموعوں سے مختلف قسم کے سوال پیدا ہوتے ہیں۔ شاید تم نے کبھی اپنے آپ سے بھی یہ پوچھا ہوگا کہ آخر اعداد و شمار کی ان طویل فہرستوں کا حاصل کیا ہے اور یہ بھی خیال کیا ہوگا کہ ان لوگوں کے پاس جنھوں نے ان فہرستوں کو تیار کیا ہے بہت سا فاضل وقت ہوگا۔

تاہم یہ اعداد و شمار جو گرد کی مانند خشک ہندسوں سے بھرے ہوتے ہیں فوائد سے خالی نہیں۔ یہ اعداد اور گنتیاں ہماری توجہ ان سوالات کی طرف مبذول کراتی ہیں جن پر انکی غیر موجودگی میں ہم نے غور تک نہ کیا ہوتا۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ اگرچہ اتنا ہم میں سے ہر کسی کو معلوم ہے کہ چوہے نہایت موذی قسم کے جانور ہوتے ہیں مگر ان سے کتنا نقصان پہونچتا ہے۔ یہ تو جب ہی سمجھ میں آتا ہے جب ان نقصانات کے اندازوں کو ہم پڑھتے ہیں۔

آج اسکولوں میں سکھایا جاتا ہے کہ ملیریا انسان کے جسم میں مچھر کی نیش کے ذریعہ داخل ہوتا ہے مگر جب اعداد و شمار سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ صرف برطانوی ہند میں ہر منٹ پر ملیریا سے ڈیڑھ جان ہلاک ہوتی ہے اور یہ کہ ہر سال دس کروڑ انسانوں پر ملیریا کا حملہ ہوتا ہے۔ تب کہیں پتہ چلتا ہے کہ ملیریا کتنا بڑا عذاب ہے، اندیشہ وہ عذاب ہے جو طاعون اور جنگ سے بھی زیادہ تباہ کن ہے۔

ابھی یہ دریافت کرنا باقی ہے کہ ملیریا کے ایجنٹوں یعنی مچھروں سے کس طرح ہر جگہ کو پاک کیا جاسکتا ہے۔ ملیریا کو روکنے اور اس سے مقابلہ کرنے کا ایک طریقہ بہرحال ایجاد ہو چکا ہے۔ بڑے بڑے مشاہیر نے (ہمارا اشارہ سر رونالڈ راس، لاروآن اور دیگر حضرات کی طرف ہے) اپنی عمریں ملیریا کی تحقیق پر صرف کر دیں اور بلا شبہ ان کی کوششیں بے فائدہ اور لاحاصل نہیں تھیں۔ آج عالم انسانیت انھیں کے طفیل میں جانتی ہے کہ کس طرح کے بخاروں سے محفوظ رہا جاسکتا ہے۔ یہ طریقہ "کونین" ہے۔

مجلس بین الاقوام کی ملیریا کمیشن کی رائے ہے کہ ملیریا سے بچنے کے لئے صحیح خوراک ۶ گرین کونین پورے بخار کے موسم کے دوران میں یومیہ استعمال کرنا چاہئے۔ ملیریا کے علاج کیلئے کمیشن نے سفارش کی ہے کہ ۱۵ سے ۲۰ گرین کونین کی خوراک یومیہ ۵ سے ۷ دن تک استعمال کی جائے کسی مزید علاج کی کوئی ضرورت نہیں البتہ بیماری کے عود کر آنے کی صورت میں علاج پہلے کی طرح شروع کر دینا چاہئے۔

نوٹس ثبوت قرضہ

بحکم جناب مسٹر ضمیر الاسلام خاں صاحب جج خفیفہ بہادر کانپور باختیار انسالونسی

بعدالت خفیفہ کانپور

مقدمہ انسالونسی نمبر ۱۹ سنہ ۱۹۳۹ء

بمقدمہ سکندر ولد عبد القادر قوم مسلمان ساکن روٹی والی گلی مول گنج کانپور قرضخواہ سائل
بنام ۔ لکھن لال ولد بھیرون پرشاد قوم نائی ساکن لاٹوش روڈ انور گنج کانپور (قرضدار فریق ثانی) انسالونٹ

ہرگاہ مقدمہ مندرجہ عنوان میں جملہ قرضخواہان و ہر خاص و عام کو اطلاع دی جاتی ہے کہ لکھن لال قرضدار فریق ثانی متذکرہ بالا بتاریخ پچیس ۲۵ اگست سنہ ۱۹۳۹ء عدالت ہذا سے دیوالیہ قرار دیا گیا ہے اور اس کو مہلت بنابر ادخال درخواست ڈسچارج ایک سال کی عطا ہوئی ہے۔
اور اب عدالت ہذا نے بتاریخ تیسری ۳ نومبر سنہ ۱۹۳۹ء بغرض ثبوت قرضہ کے مقرر کی ہے۔

المرقوم

دستخط منصرم

مہر عدالت

حضرت عروج لکھنوی

زمانہ

جلد ۷۳ — ستمبر ۱۹۳۹ء — نمبر ۳

ادیب[1] کی آرزو

(ایک غیر ادیب کے قلم سے)

پیارے جمال!

تمھیں سخت شکایت ہے کہ میں طویل اور دلچسپ خط نہیں لکھا کرتا، دو چار لفظوں میں اپنی حالت لکھ کر بھیج دیتا ہوں۔ اور اس سے تمھیں الجھن اور تکلیف ہوتی ہے۔ اس تکلیف کے دینے میں تم سے معافی چاہتا ہوں، لیکن کتنی بار، تم بھی معاف کرتے کرتے تھک جاؤ گے۔ یہ تو ہمیشہ ہی ہوتا رہیگا۔ تم مجھ سے ایسا "دلچسپ" خط چاہتے ہو جسے تم "بار بار" اور لطف لے کر پڑھ سکو۔ او میرے دماغ میں کوئی ایسی بات محفوظ نہیں جو لکھ بھیجوں تم پڑھو اور خوش ہو جاؤ۔ جمال! اس خط میں تم نے مجھے چھیڑنے کی کوشش کی ہے، تم نے "ادیب کی آرزو" پر بحث چھیڑی ہے، اور تمھاری فرمائش ہے کہ میں بھی اپنی رائے ظاہر کروں۔ ایک تو میں کوئی ادیب نہیں، جس کا مجھے پورا پورا احساس ہے۔ کوئی شخص دو چار ٹیڑھی میڑھی سطریں لکھ کر ادیب نہیں بن سکتا۔ خدا کے لئے ادیب بننا اتنا آسان نہ سمجھو، یہ بحث تم کسی لائق آدمی سے چھیڑتے تو بہتر ہوتا۔ بہرحال تم میری رائے جاننا چاہتے ہو تو سنو،

مجھے ایک دقت کا احساس ہو رہا ہے، شاید میں تمھیں اپنا خیال پورے طور پر نہ سمجھا سکوں۔ وہ دقت یہ ہے کہ ادب کے متعلق تمھارا نظریہ وہی ہے جو آج سے کم و بیش پچاس سال پہلے تھا، اور میرا خیال — میرا خیال ابھی

---

[1] اس عنوان سے "ایک ادیب" کا لکھا ہوا ایک غور طلب مضمون زمانہ بابتہ جنوری ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا تھا جس کا جواب "ایک دوسرے ادیب" نے لکھا جو زمانہ اپریل ۱۹۳۹ء میں ہدیہ ناظرین ہوا۔ اب ایک اور صاحب الرائے نوجوان ادیب نے اس مضمون میں اصل مضمون کے اہم نکات پر اظہار خیالات فرمایا ہے۔ (ایڈیٹر)

تک ایک سہانے خواب سے زیادہ معنی نہیں رکھتا۔ اسے تم خود بھی جانتے ہو، تم کم و بیش مجھ پر وہی الزام لگاتے ہو جو میں بیس برس پہلے کے ادیبوں پر عائد کرتا ہوں۔

بہر حال میرا ذاتی خیال ہے (کوئی ضروری نہیں کہ تم اسے آخری فیصلہ سمجھ لو) لیکن میرا خیال ہے کہ ایک ادیب کی آرزو صرف یہ ہو سکتی ہے کہ اس کا ادب زندۂ جاوید ہو۔ خواہ وہ ادیب کسی نظریہ کا قائل نہ ہو۔ "ادب برائے ادب" کا قائل ہو یا "ادب برائے زندگی" کا۔ ہر ادیب کی یہی آرزو ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ساری آرزوئیں شخصی اور انفرادی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ ایک دوسرے سے مختلف یا ملتی جلتی ہو سکتی ہیں۔ کیونکہ آرزوئیں حالات یا رجحانات کی پیداوار ہیں۔ اور امکانات، خاص حالتوں میں انھیں پورا کرتے ہیں۔ "امکانات" کا لفظ میں نے ذرا مبہم انداز میں لکھ دیا ہے جس پر ایک بحث الگ کھڑی ہو سکتی ہے۔ لیکن میں اس وقت اس بحث میں نہ پڑونگا۔

ہاں، تو میں نے یہ کہا تھا کہ کسی کی آرزو، حالات اور رجحانات کی پیداوار ہوتی ہے۔ حالات کی پیداوار، تو یہ ہے کہ کوئی شخص بھوکا ہے، اس کی آرزو صرف یہ ہے کہ اسے روٹی مل جائے، اس وقت اسے کوئی آرزو نہیں ہوتی۔ بادشاہی کی آرزو بھی اگر اس کے دل میں پیدا ہوگی، تو صرف اس لئے کہ بادشاہی میں اسے دونوں وقت آرام سے روٹی ملنے کا یقین ہو جائے گا لیکن اس کے برعکس جس شخص کی روٹی کا مستقل انتظام موجود ہو، اسے پیٹ بھر کھانا ملنے کی آرزو کبھی نہیں ستاتی، بلکہ یہ خیال بھی اس کے دماغ میں نہیں آ سکتا۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے جمال! انسان بڑا ہی بلند حوصلہ یا حریص واقع ہوا ہے۔ اس کی آرزو سدا بدلتی رہتی ہے۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ انسان کی آرزو حالات یا رجحانات کی پیداوار ہوتی ہے، اور حالات یا رجحانات کے بدلتے ہی بدل جاتی ہے۔ مثلاً ایک بھکاری کو دیکھو، وہ تمھارے سامنے ہاتھ پھیلائے آتا ہے اس وقت اس کی آرزو صرف یہ ہوتی ہے کہ تم اسے ایک پیسہ دیدو۔ وہ اس کے پا لینے کے بعد ہی آگے بڑھ جاتا ہے۔ لیکن تم اسے ایک پیسہ کے بدلے میں ایک روپیہ دیدو، پھر وہ ایک پیسہ کی آرزو لے کر تمھارے سامنے کبھی نہ آئے گا۔ کچھ دنوں کے بعد تم اسی فقیر کو دیکھو، اگر اس نے بھیک مانگ مانگ کر کچھ روپئے جمع کرلئے ہیں، تو اس کی آرزو رقم بڑھانے کی ہوگی، اگر اس نے ہزار روپئے جمع کرلئے، تو وہ تم سے ایک پیسہ یا ایک روپیہ مانگ کر گزارہ کرنا نہیں چاہتا۔ بلکہ اس کی آرزو اس رقم کو بڑھانے کی ہوتی ہے۔ اگر وہ بھکاری سے چھوٹا موٹا بیوپاری بن گیا تو پھر بھیک مانگ کر وہ کسی رقم کا اضافہ کرنا بھی پسند نہ کرے گا، اور آرزو کرنا تو بہت بڑی بات ہے۔ یہ حالات کے مطابق "آرزو" کی پیدائش کی مثال ہے۔

میں کہہ چکا ہوں کہ "آرزو" "رجحانات" کے مطابق پیدا ہوتی ہے۔ جانتے ہو، میں نے عجیب عجیب لوگوں

کو دیکھا ہے۔ آج ملک میں ہر طرف "کسان سبھائیں" اور "مزدور سبھائیں" قائم ہیں۔ ان کے مقابلے میں زمینداروں اور مل مالکوں کی انجمنیں بھی ہیں۔ ان زمیندار سبھاؤں میں میں نے ایسے لوگوں کو سرگرمی سے حصہ لیتے دیکھا ہے جن کی ٹکڑے کی بھی زمینداری نہیں۔ انھوں نے مجھے بتایا ہے کہ اُن کی دلی آرزو یہ ہے کہ "کسان سبھاؤں" کی طاقت کا ناش ہو۔ حالانکہ اس آرزو سے نہ آج انھیں کوئی فائدہ پہونچ رہا ہے اور نہ کل پہونچنے کی اُمید ہے۔

ٹھیک اس کے برعکس تمھیں "کسان سبھاؤں" اور "مزدور سبھاؤں" میں بہت سے زمینداروں اور سرمایہ داروں کے لڑکے ملیں گے۔ وہ جانتے ہیں کہ ان سبھاؤں کی طاقت بڑھانے میں خود اُن کا نقصان ہے مگر وہ باز نہیں آتے۔ اِس لئے کہ اُن کی آرزو یہی ہوتی ہے۔ ہاں اس بحث سے تم نے اتنا نتیجہ تو ضرور ہی نکال لیا ہوگا کہ ہر آرزو کی بُنیاد میں کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے۔

ٹھیک یہی حالت ایک ادیب کی ہوتی ہے۔ وہ بھی آدمی ہوتا ہے اور وہ بھی حالات سے متاثر ہوتا ہے رُجحانات اُسے بھی کسی نہ کسی نہج پر لگا دیتے ہیں۔ تم شاید یہ کہو کہ انسان خود حالات کی پیداوار ہوتا ہے اور اُس کے رجحانات بھی۔ لیکن میں اس کا بہت زیادہ قائل نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ حالات انسان پر اثر کریں، لیکن انسان کے رُجحانات حالات کے ہرگز پیداوار نہیں، بلکہ انسان کے رُجحانات کا خالق اُس کی "داخلی حرکت" (Inner drive) ہے۔ اگر کسی شخص میں کوئی "داخلی حرکت" پیدا نہیں ہوتی تو یقین کرو اس کا کوئی خاص رُجحان نہیں ہوسکتا۔

مَیں محسوس کر رہا ہوں کہ بحث خواہ مخواہ بڑھ گئی، اسے میں نے ہی بڑھا دیا ہے، مگر ڈرتا ہوں کہ شیطان کی آنت نہ بن جائے۔ اس لئے اب تمھارے خط کی طرف مڑنا ضروری ہوگیا ہے۔ ادب کی بحث میں تم نے لینن اور اسٹالن کو مفت ہی میں شریک کر لیا۔ لینن انقلابی تھا اور بہت بڑا انقلابی، لیکن انقلاب کی آرزو جو اُس کے دل میں خون کی لہروں کے ساتھ دوڑ رہی تھی بے مقصد نہ تھی۔ اوپر کہہ چکا ہوں کہ کوئی آرزو بے مقصد نہیں ہوسکتی، شرط یہ ہے کہ یہ ذی عقل آدمی کی آرزو ہو۔ دیوانے کی نہیں۔ لینن کی آرزوئے انقلاب اس لئے تھی کہ وہ روسی عوام کو دُکھ درد بھری زندگی سے نکالنا چاہتا تھا۔ وہ عوام کی ضرورتوں کو جاننے کے علاوہ محسوس بھی کرتا تھا۔ جاننے اور محسوس کرنے کو مَیں نے الگ الگ لکھا ہے، کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ جاننے اور محسوس کرنے میں بہت بڑا فرق ہے۔ تم کسی غریب اور مجبور کی تکلیفوں کو جان سکتے ہو لیکن محسوس نہیں کرسکتے۔ لیکن لینن محسوس بھی کرتا تھا، اگر تم بھی محسوس کرلو تو یقین ہے کہ اُسی طرح اُن کی تکلیفوں کو رفع کرنے پر آمادہ ہو جاؤ۔

لینن کے تذکرہ سے ایک بات اور بھی صاف ہو جاتی ہے۔ میں نے پہلے لکھا ہے کہ حالات انسان پر اثر انداز ہوسکتے ہیں، لیکن انسان حالات کی پیداوار نہیں ہوتا۔ اور رُجحانات بھی اُس وقت تک پیدا نہیں ہوتے

جب تک اس کی "داخلی حرکت" (Inner drive) کام نہ کرے۔ اگر انسان حالات کی پیداوار ہوتا تو لینن کے تمام ہمعصروں کو اُسی جیسا ہونا چاہیئے تھا۔ اگر رجحانات حالات کی پیداوار ہوتے تو کم سے کم سب کے رجحانات بھی لینن ہی جیسے ہوتے۔ لیکن روسی انقلاب کی تاریخ لینن کے مقابلے میں بڑے بڑے رجعت پسندوں کو بھی پیش کرتی ہے۔

دوسری بات یہ کہ آرزو بے مقصد نہیں ہوتی۔ لینن نے انقلاب کی آرزو کی۔ اُس انقلاب کو پیدا کرنے کے لئے مصیبتیں جھیلیں، اور انقلاب پیدا کر کے چھوڑا۔ کیونکہ صدیوں کے کچلے ہوئے عوام کا ایک یہی علاج تھا۔ انقلاب کے بعد اُس نے سوشلسٹ حکومت قائم کی۔ اس کے بعد اُس کی آرزو بدل گئی، یعنی انقلاب کی آرزو نہ رہی۔ اگر صرف انقلاب پیدا کرنا اُس کی آرزو ہوتی، تو پھر دوسرے انقلاب کے لئے وہ سرگرمی کے ساتھ کوشش کرتا۔ لیکن انقلاب کے بعد وہ سوشلسٹ حکومت کو مضبوط بنانے میں سرگرم ہو گیا۔ اگر اس کا پیدا کردہ انقلاب بے مقصد ہوتا تو پھر یقینی دوسرا انقلاب بھی وہ کر کے رہتا۔ یا کم سے کم اس کی کوشش تو ضرور ہی کرتا۔ لیکن کیا تم سمجھتے ہو کہ یہی لینن چودھویں صدی میں پیدا ہوتا تو کیا اتنا بڑا انقلابی ہوتا۔ ہرگز نہیں، میں یقین دلانا چاہتا ہوں کہ اس داخلی حرکت (Inner drive) کی موجودگی میں وہ کسی طرح چپ نہیں بیٹھ سکتا تھا، یقینی کوئی عظیم الشان سلطنت کا بانی ہوتا، اور ہم دنیا کی تاریخ میں لینن کو سکندر، نپولین کی صف میں عظیم الشان اور عظیم المرتبت شاہنشاہ دیکھتے۔

تم نے دو چار شاعر اور ادیب کے نام لکھے ہیں، اور اُن کی کچھ چیزیں پیش کر کے اُن کی آرزو کا پتہ ڈھونڈنا چاہا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ خدا کے لئے ایسی غلطی نہ کرو، ہندوستانی شاعر اور ادیب اب بھی لفظوں کا طلسم خانہ بنانے کے عادی ہیں۔ جس شاعر کو تم سب سے بڑا انقلابی سمجھ رہے ہو۔ میرا خیال اُس کے متعلق تم سے مختلف ہے نہ تو میر صاحب "گھل گھل" کے مرنا چاہتے تھے، اور نہ تمہارا شاعر جس کی انقلاب خواہی سے تم گھبرا رہے ہو "آگ کے شعلوں اور تلوار کی جھنکار" سے کھیلنا چاہتا ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ "شعلوں" کے تصور سے بھی وہ کانپ اٹھتا ہوگا۔ خیر کہنا صرف یہ ہے کہ انقلاب پسندی اور انقلاب خواہی کو اتنی سستی چیز نہ بناؤ۔ ہمارے ملک میں یہ چیز کافی سستے داموں پر بک چکی ہے، اب ذرا اس کی قیمت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ باقی رہا تمہارا ڈر ــــ سو میں جانتا ہوں، تم ہر نئی اور تیز چیز سے ڈرنے کے عادی ہو، اور رہو گے۔

جمال! ادب میں انقلاب، صرف دو چار دہکتے ہوئے شعروں اور مزدوروں کسانوں کی کہانیوں سے پیدا نہیں ہو سکتا۔ ابھی ادب میں انقلاب پیدا ہونے میں دیر ہے۔ ہمارے ادیبوں کا کوئی صحیح "تصور حیات" ہی نہیں، تم کس چیز سے ڈر رہے ہو؟ ڈرتے ہو "عریانی" سے، کھلے بند عاشقی سے۔ ارے یہ تو تمہارے الف لیلہ اور گل بکاؤلی میں موجود ہے۔ کیا تم تلواروں کی جھنکار سے ڈرتے ہو؟ لیکن کیا یہ چیزیں داستان امیر حمزہ منظوم

اور جنگ نامہ امام حنیفہ میں نہیں ہیں؟ لڑنا مرنا ـــ یہ تو تم برابر ہی پڑھتے آئے ہو۔ تمہارے فصیح الملک داغ کا نازک معشوق بھی تلوار رکھتا ہے اور بڑا ہی ظالم ہے، قتل کئے بغیر مانتا ہی نہیں، اُس کو قتل کرنے میں مزا بھی آتا ہے حالانکہ قتل کا مقصد بھی اُسے معلوم نہیں، اور اُس کا مقصد صرف تمہیں قتل کرنا ہے۔ ـــ کیا زندگی کا کوئی صحیح تصور رکھے بغیر انقلاب کی دعوت دینا نوجوانوں کو داغ کا معشوق بنانا نہیں؟

ہاں کچھ لوگ ایسے بھی ضرور ہیں جو زندگی کا ایک صاف تصور رکھتے ہیں اور وہ انقلاب کی دعوت بھی دے رہے ہیں، لیکن تم نے ابھی اُن کو پہچانا ہی نہیں، اور شاید دیر ہی میں پہچان سکو گے

"زندگی کا تصور" بار بار دُہرا چکا ہوں، شاید تم گھبرا جاؤ، میں سچ کہتا ہوں کہ زندگی کا کوئی صحیح اور صاف تصور ہمارے دماغوں میں نہیں ہے۔ ہم ہندوستانی ابھی بہت چھوٹے چھوٹے مسئلوں میں اُلجھے ہوئے ہیں جن کی گتھی کو ہمارے بڑے بڑے دماغ ابھی تک نہیں سُلجھا سکے ہیں۔ تم اپنی موجودہ سیاست پر ذرا نظر ڈالو صاف معلوم ہو جائیگا کہ اِن چھوٹے چھوٹے مسئلوں میں وہ بڑے بڑے دماغ اُلجھے ہوئے ہیں، جن کی برتری کی دنیا قائل ہے۔

اور آگے چلو تو معلوم ہوگا کہ ہر جگہ یہ عیب موجود ہے۔ کچھ مخصوص لوگوں کے علاوہ تم جماعتی حیثیت سے اس کو مفقود پاؤ گے۔

اب اصل بحث رہ جاتی ہے یعنی ادیب کی آرزو، اس کے بارے میں میں تم سے پہلے ہی کہہ چکا ہوں، اس کو ختم ہی سمجھو ـــ لیکن تم نے میری آرزو کو پوچھا ہے؟ عزیز دوست! میں کہہ چکا ہوں کہ میری آرزوئیں سُہانے خواب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں، میں اپنی آرزو بتانے کے لئے ذرا وقت لونگا۔ میں تمہارے سامنے ایک تصویر رکھنا چاہتا ہوں۔

دیہاتوں میں کسان بھوکوں مر رہے ہیں، ہر سال مہاجن کا سود بڑھتا جا رہا ہے۔ سال میں جو کچھ پیدا کرتے ہیں، مہاجن کو سود میں دے دیتے ہیں، اور پھر بھی اصل باقی رہ جاتا ہے۔ مہاجن روپیہ بڑھاتا جاتا ہے اور جو روپیے گھر میں رہتے ہیں، وہ کسی گھڑے میں بند کر کے کسی کونے میں دفن کر دئے جاتے ہیں۔ مزدوروں کو ہمیشہ تخفیف کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ پھر سرمایہ دار بھی اقتصادی بدحالی میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ کارخانہ بند کر کے کسی پہاڑی کوٹھی پر زندگی گزارنے لگتا ہے۔ مزدور روٹی کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔ ہمارے ملک کے ڈاکٹر بڑی بڑی فیسیں لیکر اپنی جیبیں بھر رہے ہیں۔ لیکن دوسری طرف غریب مریض کراہتے ہوئے ہسپتالوں کو جاتے ہیں اور کراہتے ہوئے واپس چلے آتے ہیں۔ ایک مزدور نہیں جانتا کہ صبح اُٹھکر اُسے کوئی کام ملے گا یا نہیں۔ ایک کسان نہیں جانتا کہ کل اُس کا کھیت اس کے قبضے میں رہیگا یا نہیں۔ ایک آرٹسٹ نہیں جانتا کہ اس کا پیش کردہ

آرٹ سراہا جائیگا یا نہیں۔ ایک صناع نہیں جانتا کہ بازار میں جاکر اس کی صنعت کا کیا حشر ہوگا۔ ایک ادیب نہیں جانتا کہ اُس کے کارناموں کا انجام کیا ہوگا۔ دوسری طرف عیش و عشرت اور شادمانی ہیں"۔

یہ ہے ایک جھلک اُس تصویر کی جو میں تمہیں دکھانا چاہتا تھا۔ سمجھتا ہوں کہ اب تم خود ایک نظر ڈال کر پوری تصویر، اپنی قومی زندگی کی تصویر کو دیکھ لوگے۔

جمال! میں ذاتی طور پر ـــ چاہتا ہوں کہ یہ بدرونق تصویر باقی نہ رہے۔ اس کے بدلے ہماری قومی زندگی میں ہنسی خوشی، نغمے اور ساز، مسرت اور کامرانی ہو۔

اس لئے میں ایک سماجی انقلاب چاہتا ہوں، اور ادب کو اس انقلاب کا آلۂ کار بنانا!

تمہارا

ارشد

تیس سال پہلے

زمانہ بابتہ ستمبر ۱۹۰۹ء میں شہنشاہ اکبر پر ایڈیٹر رسالہ کا لکھا ہوا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس کا اقتباس ناظرین زمانہ کی دلچسپی کیلئے درج ذیل ہے:۔

"دلوں کی تسخیر مشکل بات ہے، ایسی مشکل کہ سخت سے سخت مہم بھی اسکے آگے کچھ حقیقت نہیں رکھتی، اور اسی وجہ سے اُسے جو اکبر کا معزز خطاب دیا گیا ہے۔ دنیا کی تمام فتوحات عارضی ہیں اور بے دیرپا۔ اکبر کی یلغاروں اور کشور کشائیوں کا ماحصل اور اُسکی شان و شوکت بلکہ عظیم الشان سلطنت کا آج نام و نشان بھی باقی نہیں۔ کہاں ہیں وہ ریاستیں جنکے مغرور سرداروں کو اُس نے اپنی تلوار اور جان نثاروں کے بل پر ایک مرتبہ نیچا دکھا دیا تھا۔ کہاں ہیں وہ صوبے جنھیں اُس نے اپنے زیر حکومت اور زیر اقتدار کر لیا تھا۔ انہیں پر کیا منحصر ہے؟ تمام شاہان سلف کی فتوحات کا کہیں نام و نشان بھی باقی نہیں ہے لیکن اکبر نے جس طرح اور جس قدر دلوں کو مسخر کر لیا تھا اُسکے فسانے آج بھی ویسے ہی دلکش اور زندہ جاوید ہیں اور عالم کے دلوں پر اس وقت بھی اُسکی حکومت اُسی طرح قائم ہے۔

آخر وہ کیا بات تھی کہ برسوں کی کھوٹ دور ہوگئی، باہمی رشک اور قومی عناد و دلی نفض اور مذہبی تعصب یک لخت مٹ گئے اور ہندو مسلم ہمدوشیٔ اسلام کا معاملہ ہوگیا۔ جو اکبر کے جوہر ذاتی تھے جن اوصاف کا وہ مالک تھا وہ ایک ذات واحد میں کم جمع ہوتے ہیں۔ نیکی میں، نیک نیتی میں، دلاوری میں، جوانمردی میں، شان و شکوہ میں، رعب داب میں، رحم و انصاف بے تعصبی اور فراخدلی فیاضی اور علم دوستی اور رعایا پروری میں اکبر کا پایہ بہت اعلیٰ ہے۔ یوں تو دلی اور دماغی دونوں قسم کی بہترین قابلیتیں اس کی ذات میں موجود تھیں۔ مگر دل کو دماغ پر فوقیت تھی۔ دماغی قابلیتوں میں بیرونی مدد مل سکتی ہے لیکن دلی نقص کی کوئی تلافی ممکن نہیں۔

دو شامیں

(از جناب احسان بن دانش)

ایک شام تھی وہ بھی کبھی آغوشِ نظر میں — طوفان تھا جلووں کا مرے قلب و جگر میں
خوشبو سے تری مست تھیں شاداب فضائیں — کلیوں کو تھپکتی تھیں فسوں کار ہوائیں
پھولی تھی شفق یوں کہ تجھے شمع دکھائے — رنگین ضیائیں ترے رستے میں بچھائے
چھائی تھی چمن پر تری گلبار جوانی — آئینہ دکھاتا تھا جھلکتا ہوا پانی
سبزہ ترے ہنس ہنس کے قدم چوم رہا تھا — مہکے ہوئے جھونکوں سے چمن جھوم رہا تھا
دل راگ کے قانون پہ چلتا تھا دھندلکا — بچ کر تری راہوں سے کھسکتا تھا دھندلکا
چلتی تھیں ہوائیں ترے دامن کو سنبھالے — تختہ کوئی کلیوں کا نہ جھرمٹ میں بٹھا لے
اس پاک تمنا میں کہ تو روند کے جائے — ہر گام پہ بیتاب تھے مہکے ہوئے سائے
کلیاں تھیں ترے سامنے شرمائی ہوئی سی — خوشبو کو بسیروں میں تھی نیند آئی ہوئی سی
اس ناز سے پڑتی تھی ملاحت کی پھواریں — بوجھل سی ہوئی جاتی تھیں پلکوں کی قطاریں
خم تھیں ترے قدموں پہ شعاعوں کی جبینیں — آتی تھیں فلک سے مری نظموں کی زمینیں

عفت کے نشے میں تری لغزیدہ خرامی
شاعر سے لکھا کر ہی رہی خطِ غلامی

ہے آج بھی سورج تو اسی طرح ضیا بار — لیکن مری آنکھوں میں ہے نظارہ بیمار
تو جب سے نہیں ہے یہ مرا حال ہوا ہے — جو چیز نگاہوں میں ہے محروم ادا ہے

مرجھائی سی جاتی ہیں ضیا بار فضائیں — شبنم سے ہیں سیلی ہوئی افسردہ ہوائیں
دھندلے ہیں چمن زنگیِ فطرت کے نظارے — آتے نہیں گردوں کے دریچوں میں ستارے
کملائے ہوئے پھول ہیں روکے ہوئے آنسو — لپٹی ہوئی کانٹوں سے ہے سہمی ہوئی خوشبو

سبزے پہ دبے پاؤں مچلتا ہے اندھیرا
فطرت کے مساموں سے نکلتا ہے اندھیرا

ہیں سایۂ اشجار میں ہانپے ہوئے ننھے
جھینپے ہوئے، سمٹے ہوئے، کانپے ہوئے ننھے

نوخیز دھندلکوں سے جو بے نور ہیں راہیں
آنکھوں سے نکلتی ہوئی ڈرتی ہیں نگاہیں

سُرخی میں سیاہی سی فلک گھول رہا ہے
جو رنگ ہے پرواز کو پَر تول رہا ہے

ہر لحظہ فضا درہم و برہم ارے توبہ
عالم پہ یہ اک نزع کا عالم ارے توبہ

اِک بار پھر اِس خلوتِ خاموش میں آجا
آغوش میں آجا، مری آغوش میں آجا!

مرگِ ناگہاں

(از منشی جگدیش سہائے سکسینہ، بی۔اے۔ ایل ایل بی)

یہ درد انگیز اشعار اُن ناگہانی حادثات کی ہمدردی میں موصول ہوئے ہیں جو ایڈیٹر زمانہ کو پچھلے ماہ برداشت کرنا پڑے ہوں گذشتہ میں سکسینہ صاحب کے خاندان میں بھی اسی قسم کے افسوسناک واقعات ہوئے ہیں۔ اسی لئے ان اشعار کا حرف حرف رنج وغم میں اس قدر ڈوبا ہوا ہے۔ (آر ز)

غمِ مرگِ ناگہاں کا بھلایا نہ جائے گا
بارِ الم یہ دل سے اُٹھایا نہ جائے گا

کیا پوچھتے ہو بزم میں شورِ عزا ہے کیوں
جاں سوز ہے یہ قصہ سُنایا نہ جائے گا

ہم یہ سمجھ کے خوش تھے کہ دورِ بہار میں
دل شاد کر کے ہم کو رُلایا نہ جائے گا

سمجھے تھے ہم کہ وہ تنِ سیمیں وہ روئے خوب
شعلوں سے بے محابا جلایا نہ جائے گا

وہ نوگلِ شگفتہ کہ جانِ بہار تھا
یوں خاک میں خزاں سے مِلایا نہ جائے گا

وہ نقشِ دلنشیں کہ بہشتِ نظارہ تھا
نیرنگیٔ فلک سے مٹایا نہ جائے گا

کہتا تھا جس کا حسن کہ خاکی نہیں ہوں میں
ہم سے وہ زیرِ خاک ملایا نہ جائے گا

حضرت عروج لکھنوی

(از سید مسعود حسن رضوی ادیب، ایم اے، صدر شعبۂ فارسی و اُردو لکھنؤ یونیورسٹی)

میر انیس کے پوتے اور میر نفیس کے بیٹے سید خورشید حسن صاحب عرف دولھا صاحب عروج غدر کے چند سال بعد لکھنؤ کے محلے راجہ کی بازار میں پیدا ہوئے۔ مولوی میر نیاز حسین صاحب سے فارسی پڑھی اور اپنے والد میر نفیس صاحب سے عربی اور عروض۔ آپ کی علمی استعداد بہت معمولی تھی، مگر گھر میں ہر وقت علمی چرچے تھے زبان کی درستی اور محاورات کی صحت کا خیال خمیر میں شامل تھا، شاعری کئی پشتوں سے ہوتی چلی آتی تھی مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی آبائی ہنر تھے۔ غرض کہ تعلیم کی کمی وراثت اور ماحول نے پوری کر دی تھی۔ چنانچہ آپ کے کلام سے کم علمی کا اظہار نہیں ہوتا۔ اگر کہیں کہیں کوئی غلطی نظر آئے تو اُسے بشریت کا مقتضا سمجھنا چاہیئے، جس سے بڑے بڑے اہل علم بھی محفوظ نہیں رہ سکتے۔

میر نفیس کے یہاں بارہ اولادیں ہوئیں جن میں سے صرف دو بیٹیاں زندہ رہیں۔ میر نفیس کو بیٹے کی فطرتاً بڑی تمنا تھی کہ اس خانوادۂ کمال کا نام روشن رہے۔ آخر اُن کی یہ تمنا پوری ہوئی، اور اُن کی آخری اولاد یعنی دولھا صاحب عروج نہ صرف زندہ رہے بلکہ آبائی کمالات میں اپنے بزرگوں کے صحیح جانشین ثابت ہوئے اور ایک مدت تک مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کا وقار انھیں کے دم سے قائم رہا۔

وہ والدین جو اپنے دس جگر پاروں کو پیوندِ خاک ہوتے دیکھ چکے ہوں، اُن کا اپنے اکلوتے بیٹے کی محبت میں حد سے گزر جانا بالکل فطری ہے۔ لیکن ایسی محبت اولاد کی تعلیم و تربیت میں اکثر مخل ہو جاتی ہے۔ حضرت عروج کے معاملے میں بھی ایسا ہی ہوا۔ چنانچہ ابتدائے شباب کا زمانہ ساز و آواز کی رنگینیوں میں گزرا۔ خاندانی متانت اور ثقاہت اِس معاشرت کی متحمل نہ تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ باپ کا دل بیٹے کی طرف سے ہٹ گیا۔ اُسی آزادانہ معاشرت کے دور میں ایک ایسا اتفاق پیش آیا جس نے جناب عروج کی زندگی کا رُخ بدل دیا۔ خود حضرت عروج نے مجھ سے وہ واقعہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا تھا۔ افسوس ہے کہ مجھے صرف اتنا یاد رہ گیا کہ آپ لکھنؤ کے باہر کسی مقام پر اپنے ایک دوست کے یہاں مقیم تھے۔ اُن کے یہاں مجلس عزا منعقد ہوئی۔ اتفاق سے ذاکر صاحب کسی سبب سے نہ آسکے۔ اِس پریشانی میں انھوں نے حضرت عروج سے مرثیہ پڑھنے کی فرمایش کی، اور

آپ کے انکار پر کچھ ایسے طنز آمیز جملے کہے، اور بعض حاضرین نے اتنا اصرار کیا کہ آپ مجلس پڑھنے پر آمادہ ہوگئے منبر پر جانا تھا کہ آبائی کمال کے جوہر کھلنے لگے۔ انیسؔ ونفیسؔ کی مرثیہ خوانی کا انداز سامعین کی آنکھوں میں پھرنے لگا۔ قدر دانوں نے خوب خوب داد دی۔ کسی نے میر نفیسؔ کو اس مجلس کی پوری کیفیت لکھ بھیجی۔ باپ کا مایوس دل اُمیدوں سے برپز ہوگیا، بیٹے کو ایک محبت بھرا خط بھیجا جس میں لکھا کہ کہاں تم اور کہاں یہ تعریفیں، تم کو چاہیئے کہ شکر کا سجدہ یوں بجالاؤ کہ زمین سے سر نہ اُٹھاؤ۔ اس اتفاقی واقعے نے حضرت عروج کے دل میں مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کا شوق پیدا کر دیا۔ کامیابیاں اس شوق کو ہوا دیتی رہیں۔ یہاں تک کہ ساری عمر انھیں مشغلوں کی نذر ہوگئی۔ جناب عروج کے فرزند و جانشین سید محمد حسن صاحب عرف للّن صاحب فائز کا بیان ہے کہ لکھنؤ کے محلہ نواز گنج میں شہزادے مرزا صاحب کے یہاں حضرت عروج نے پہلے پہل اپنا کہا ہوا مرثیہ پڑھا تھا، جس کا مطلع یہ ہے :۔

"ہاں اے قلم صدق رقم دُر فشاں ہو!"

حضرت عروج مرثیہ خوانی اور مرثیہ گوئی میں اپنے والد میر نفیسؔ کے شاگرد تھے، مگر حق یہ ہے کہ اُن کے کمال کو اکتساب سے بہت کم تعلق تھا۔ شاعری کئی پشتوں کی میراث تھی، طبع موزوں اور زبان شعر فطرت کا عطیہ تھا وہ اپنے ایک ابتدائی مرثیے میں خود فرماتے ہیں :۔

بے مشقت مجھے اللہ نے یہ باغ[۱] دیا ۔۔۔ پنجتن خوش ہوئے قسمت جو ہوئی میری رسا
کس قدر لطف و کرم خالق اکبر نے کیا ۔۔۔ کی وہ بخشش کہ سزاوار نہ تھا میں جس کا

لیکہ آغاز میں اُس کو خبر انجام کی تھی
وہ زباں تو نے عطا کی جو مرے کام کی تھی

شغل مدّاحی مولا سے یہ کیوں ہوں خرسند ۔۔۔ مجھ سے ناچیز کو بخشے یہ مضامین بلند
شدّت لطف الٰہی سے ہوں خود حیرت مند ۔۔۔ در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند

ہر کہ در طبع رسد من بہ زباں می گویم
آنچہ استاد ازل گفت ہماں می گویم

جب حضرت عروج کی طبیعت نے یکایک پلٹا کھایا اور آپ بزم نشاط کی رنگینیاں ترک کر کے مجلس عزا کی رونق بنے تو بعض لوگوں کو یہ شبہ ہوا کہ آپ اپنے بزرگوں کا کلام اپنے نام سے پیش کرتے ہیں، آپ نے اس واقعے کا ذکر یوں کیا ہے :۔

---

[۱] امام حسینؑ کی مدح کو باغ سے استعارہ کیا ہے۔

کرتے ہیں مری نظم بزرگوں سے جو منسوب　　　اپنی غلطی کا مجھے اظہار ہے مطلوب
یا مجھکو وہ فرماتے ہیں استادوں میں محسوب　　　اس فہم پہ حیرت ہے کہاں زشت کہاں خوب

عروج مغفور کے کل مرثیوں کی تعداد پچیس سے زیادہ نہیں ہے۔ ان میں سے بیشتر مرثیے راقم نے اول سے آخر تک پڑھے ہیں۔ میرانیس کے سے باکمال تو روز روز پیدا نہیں ہوتے۔ ان کو چھوڑ کر باقی اور مرثیہ گویوں میں حضرت عروج کا پایہ اچھا خاصا بلند نظر آتا ہے۔ وہ ایک جگہ اپنے اسلاف کا ذکر کرنے کے بعد بجا طور پر فرماتے ہیں:-

گو کہ وہ مرتبہ حاصل نہیں مجھ کو زنہار　　　لیکن ابتک ہے وہی باغ مضامیں کی بہار
وجد میں کرتا ہوں نغمے جو کبھی شکل ہزار　　　اب بھی غنچے زرِ گل کرتے ہیں لا لا کے نثار
زمزمے سن کے برے ملل بلے کہتے ہیں
کان آواز پہ ہر گل کے لگے رہتے ہیں

سادگی، صفائی اور روانی حضرت عروج کے زبان کے جوہر تھے۔ وہ بیان کی سلاست اور وضاحت کا خاص طور پر لحاظ رکھتے تھے۔ چنانچہ ایک مرثیے میں اپنے کو مخاطب کرکے فرماتے ہیں:-

تیری ہر بات کو دل دے کے سنیں اہل عزا　　　ہو وہ اردوے معلی جسے مانیں فصحا
نرم لفظوں میں کچھ اس طرح سے مطلب ہو ادا　　　کہ جسے سن کے سمجھنے میں نہ ہو دیر ذرا
بزم میں رزم کا نقشہ دم تحریر کھنچے
دامن حرف پہ مضمون کی تصویر کھنچے

اور میں لفظوں کے مضمون ہوں یوں جلوہ فگن　　　شمع فانوس کے شیشے میں ہو جیسے روشن
ہو وہ ہر نقطۂ بے شک کی کاغذ پہ پھبن　　　رکھے جس طرح ہتھیلی پہ صدف در عدن
مطلب الفاظ سے یوں وقت نظارا جھلکے
جس طرح پانی میں ڈوبا ہوا تارا جھلکے

عروج مرحوم مشکل اور غیر مانوس لفظوں کا استعمال پسند نہ کرتے تھے۔ وہ عام فہم لفظوں میں اپنا مطلب ادا کرنا چاہتے تھے۔ راقم حروف نے مرحوم کو بارہا مجالس میں برسر منبر ہندی لفظوں کے باکمال صرف پر فخر کرتے سنا اور سامعین کو وجد کرتے دیکھا ہے۔ مرحوم کے یہ الفاظ کہ "لفظوں کا صحیح استعمال ہم سے سیکھو" آج تک میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ کوئی اور ہوتا تو لکھنؤ والے اس کو چٹکیوں میں اڑا دیتے۔ حضرت عروج ہی کو یہ وقار حاصل تھا کہ لوگ بھری مجلسوں میں ان کا یہ دعویٰ سنتے تھے اور برا نہ مانتے تھے۔

ہندی لفظوں کے استعمال کی چند مثالیں ذیل میں پیش کی جاتی ہیں:-

قبضے گرہ بیٹھے تھے ہاتھوں میں جگرداروں کے

دریا میں جھلک آ گئی تھی خون کی بو کی

ٹھٹھ لگے ہیں ترے دروازے پہ میخواروں کے

بڑھ کے ٹوکے یہ نہیں ہے کسی دشمن کا بہاؤ صورتِ برگ خزاں دیدہ ہے ہر سو ستھراؤ

نہ طرارے وہ اچانک وہ جھپٹ وہ چھل بل ابھی کمسن ہے سوار اور ہے گھوڑا اچپل

داب کر رانوں میں لٹکے ہوئے دامن مُڑنے دونوں باگوں کو ذرا ساجو دیا کَن جُڑنے

شہر کیا فصلِ بہار آنے سے آباد ہیں گاؤں بلبلوں سے نہیں اب چلنے کے صیاد کے داؤں

تازہ سبزے پہ درختوں کے تلے دیکھ کے چھاؤں بیلیں انگڑائیاں لے لیکے جو پھیلاتی ہیں پاؤں

فرش ہے نرم، تو کیا چین سے نیند آتی ہے

دم بدم بادِ صبا پاؤں دبا جاتی ہے

جیسا اوپر لکھا جا چکا ہے سادگی، صفائی اور روانی حضرت عروج کی زبان کے جوہر تھے، انھیں اپنے کلام میں مصنوعی خوبیاں پیدا کرنے کی فکر نہ تھی، اور اسی وجہ سے وہ صنعتوں کے استعمال کی طرف مائل نہ تھے۔ پھر بھی اُن کے کلام میں بعض صنعتیں کہیں کہیں بے ساختہ آ گئی ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:-

چھوڑ کر سرحدِ شر خیر سے پہنچا خادم	ایہام تضاد
شہ کے نزدیک پہنچتے ہی گنہ دُور ہیں سب	تضاد
اُس کی ادنیٰ نظر مہر ہوئی بدر تھا میں	ایہام تناسب
دریا بھرا ہوا ہے قلم میں شراب کا	"
دے وہ ساغر مجھے جس کا نہ کبھی کیف ہو کم	"
جب تک تنوں میں دم رہا یہ توڑں سے گئے	"

دردِ سر کھونے کو ہے دَرد بھی کافی مجھکو — تجنیس محرّف

سَن سَن کی اک صدا تھی جسے سُن کے رہ گئے — "

جَل کے تِل کھا گیا موئے سرِ آتش کی طرح — تجنیس لاحق

اب دیر نہ ہو دَور میں زنہار خبردار — "

پُتلیاں حوریں بھی آنکھوں سے لگائیں اس کی[1] — ایہام

چہرۂ حسیں ہے ماہِ دو ہفتہ سے چار چند — سیاق الاعداد

نردوں انھیں اشکوں کے بہانے سے ملے گا — ادماج

کتا نہ مرا سامنا گر سام بھی ہوتا — تجنیس مذیل

اُڑانے میں خضر ہے تو روانی میں ہے یہ تیر — تجنیس مضارع اور تجنیس محرف کا مجموعہ

چھیڑ کر سحرِ فرسِ برق سفر غازی نے — تجنیس قلب بعض

پیر تو پیر ہیں بچے سے جواں کانپتے ہیں — مراعاۃ النظیر

دلدوز و دلگداز و دل آزار و دلربا — تنسیق الصفات

حق نے چاہا کہ قوی ہوئیں قویٰ خوف ہو دُور — اشتقاق

پیدل مثالِ ریگِ رواں رن سے ہو گئے — صنعت التزام کی ایک خاص صورت

گُل سے رُخ، مُشک سے مو، غنچہ سے لب، پھول سے تن — تنسیق الاسما کی ایک خاص صورت

ضو کا اپنی یہ ہر اک قلب کو پروانہ کریں — سیکڑوں جل کے جو مرجائیں تو پروا نہ کریں — تجنیس مرفو

نیمچے سے ہاتھوں کی دکھلا کے صفائی لڑکے — مر گئے دونوں جوانوں کی لڑائی لڑکے — تجنیس تام مستوفی

چھائی ڈھالوں کی گھٹا رن میں برسنے لگے تیر — برق کی طرح چمکنے لگی ہر اک شمشیر

صورتِ رعد گرجنے لگے لشکر کے شریر — ... ... — مراعاۃ النظیر

... ... — ناسمک جاتی ہے رہوار کی ٹاپوں کی دھمک

اثرِ نقشِ قدم واں بھی عیاں سارے ہیں — پشتِ ماہی پہ یہ ٹاپوں کے نشاں سارے ہیں — حسنِ تعلیل

---

[1] مصرعہ [illegible] ہے ۔

جمع اسباب تباہی سے پریشاں ہے کوئی　　　لب خاموش سے گویا تن بیجاں ہے کوئی

اس شعر کے پہلے مصرع میں صنعت تضاد اور دوسرے میں ایہام تضاد ہے۔
حضرت عروج کے انداز بیان میں جو دلکشی ہے اُس میں قافیے اور ردیف کے حسن استعمال کو بھی دخل ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

عزم پورا نہ ہو جس کا وہ بسا دہی نہیں　　　تیرے روکے سے جو رک جاؤں تو میں حُری نہیں

کوشش سے ملی ہیں نہ تگ و دو سے ملی ہیں　　　راہیں یہ اسی شمع کے پرتو سے ملی ہیں

یہ ناتمھارے ہی نبی کا ہوں نواسا کہ نہیں　　　کوئی تم لوگوں میں ہے میرا شناسا کہ نہیں
تم کو معلوم ہے دو دن سے ہوں پیاسا کہ نہیں　　　اب بھی پانی مجھے تم دو گے ذرا سا کہ نہیں

آنکھ سے آنکھ لڑی مردم دیدہ تڑپے　　　طائر ہوش بھی ہو ہو کے پریدہ تڑپے
کچھ تو بالائے زمیں حلق بریدہ تڑپے　　　مرنے والوں سے سوا زخم رسیدہ تڑپے

میرے گلشن کا ہر اک پھول مہکتا ہی رہا　　　عندلیبوں کو مرے سامنے سکتا ہی رہا
دم بدم باغ مضامیں کا پھبکتا ہی رہا　　　رنگ معنی گل مضموں سے ٹپکتا ہی رہا

ذیل میں جو دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں اُن میں الفاظ قافیہ کی مکتوبی صورت سے قطع نظر کر کے صرف اُن کی ملفوظی ہیئت کا لحاظ کیا گیا ہے :۔

چہرے آغوش میں زلفوں نے جو ڈھکے ہیں　　　شب معراج میں قرآن کھلے رکھے ہیں

سیدھے جاتے ہیں کبھی اور کبھی گر پڑتے ہیں　　　بھاگتے ہیں کبھی اٹھ کر کبھی گر پڑتے ہیں

مرثیوں کا موضوع مشترک ہے، اس لیے مرثیہ گویوں کے کلام میں مضامین کا اشتراک ناگزیر ہے۔ مگر حضرت عروج اِن مشترک مطالب میں اکثر جدت پیدا کر کے اُن کا اثر بڑھا دیتے ہیں ذیل کی مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

خوف کی شدت سے یزیدی سپاہیوں کی حالت :۔

پنجۂ مرگ گلو گیر نظر آتا ہے ایک اک موت کی تصویر نظر آتا ہے

تم گڑ زمیں میں پیرز میں گیر کی طرح چپکے کھڑے ہیں خوف سے تصویر کی طرح

اب نہیں بچنے کی تدبیر نظر آتی ہے تیغ ہیں موت کی تصویر نظر آتی ہے

ڈر ہو خوف تو پائی ستم بھی ٹھہریں دم ذرا سینوں میں ٹھہریں تو قدم بھی ٹھہریں

... ... دل ہاں جسم عیاں کانپ رہے ہیں تھرتھر

دبدبہ موت کا رد میں جو اثر پاتی ہیں تیلیاں تک نفس جسم کی تھراتی ہیں

دھڑکا ہے یہ بانی بچے شیر سے کیونکر تصویر لگی بن گئی ہے فوج سراسر

گر دم میں دم آیا تو وہ ناپاک لڑیں گے مٹی کے جو پتلے ہوں وہ کیا خاک لڑیں گے

گھوڑے کے نعلوں کی چمکتی ہوئی کیلوں کا نہر میں عکس :-

کیلیں نعلوں کی چمک اپنی جو دکھلاتی تھیں شمعیں جلتی ہوئی پانی میں نظر آتی تھیں

گھوڑے کی رفتار کی ہمواری :-

پست و بلند ایک طرح چلتا ہے دم میں ہیں تیلیاں گھوڑے کی کہ آنکھیں ہیں قدم میں

گھوڑے کی سُبک روی :-

بن گیا راہ میں چلتا ہوا جادو گھوڑا

ہوا اور گھوڑے کا مقابلہ :-

باؤں بھی چھو نہ سکی اور یہ غم لے کے پھری اپنے دامن میں فقط گرد قدم لے کے پھری

شمر عون و محمد کے نام دریافت کرتا ہے، اور وہ جواب میں کہتے ہیں :-

جو جری ہیں اُنھیں حاجت نہیں اظہار کی ہے نام مردوں کا رقم باڑھ پہ تلوار کی ہے

شمر عون و محمد کو میدانِ جنگ میں دیکھکر کہتا ہے :-

خوفِ جاں دونوں کو ہنگامِ وغا کافی ہے پھول سے جسموں کو تیروں کی ہوا کافی ہے

عون و محمد میدانِ جنگ میں:۔

بل کے چلّوں سے ہزاروں ہوئے ناوک جو رہا — ہر پر تیر سے آنے لگی سَن سَن کی صدا
چھیڑ دیتی ہے جو تیروں کی ہوا زلفوں کو — جنبشیں ہوتی ہیں رہ رہ کے سوا زلفوں کو

حضرت علی اکبر کا میدانِ جنگ کو جانا:۔

... ... — گھوڑے پہ یہ براق پہ بیٹھے ہیں یا رسول
غل تھا کہ خاص ہے یہ شرف آج کے لئے — دن کو رسولؐ جاتے ہیں معراج کے لئے

حرم بیت شہ مشرقین پیاسے ہیں — جہاں میں آگ لگی ہے حسین پیاسے ہیں

دب گیا خون کی بوچھار سے میداں کا غبار

یاں رن کی زمیں ڈر سے ہے گہوارۂ جنباں

صدف چشم سے برسانے لگے گوہر تر

ایران کے قدیم مثنوی گو جب کوئی نئی داستان شروع کرتے تھے تو طبیعت کو گرمانے کے لئے ساقی سے شراب مانگتے تھے۔ اُردو کے بعض مثنوی نگاروں نے بھی اپنے ایرانی پیشروؤں کی تقلید کی ہے۔ آخری دَور کے مرثیہ گویوں نے بھی اُن کی پیروی شروع کر دی۔ یہاں تک کہ ساقی نامہ مرثیے کا ایک اہم جزو بن گیا مگر مرثیوں میں ساقی کا لفظ استعارے کے طور پر آتا ہے۔ اور اس سے مراد ہوتی ہے ساقی کوثر (حضرت علی) ساقیِ ازل (خدا) یا کوئی امام یا معصوم۔ اسی طرح شراب سے ولائے اہلبیت، معرفت خدا وغیرہ مراد ہوتی ہے اپنے زمانے کے رواج کے مطابق حضرت عروج نے بھی ساقی نامے کہے ہیں اور خوب کہے ہیں۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں

ساقیا مجھ سے سوا کون ہے خواہانِ شراب — جان میری ہے شراب اور میں ہوں جانِ شراب
مجھ سا ہو پیر جو میخانے میں مہمانِ شراب — پھر تو ہر رگ سے اُٹھے موجۂ طوفانِ شراب

ہے جہاں سرد لہو نے کی وہاں دھاریں ہوں
جھُریاں جسم کی جلتی ہوئی تلواریں ہوں

بجلی بن جاتی ہے اس مے کے وسیلے سے فروغ — گو یہ شعلہ ہے مزاج اس کا ہے لیکن کافور

غش سے چونکا دیا موسیٰ کو اسی نے سرِ طور — پی کے اس مے کو ہوا آنکھوں میں یعقوب کی نور
مشکل آساں ہوئی رحمت کی نشانی پائی
نشے سے اس کے زلیخا نے جوانی پائی

ساقیا فصلِ بہاری ہے نہیں اب مجھے ہوش — اب ترا رند نہیں رہنے کا دم بھر خاموش
جب نظر کرتا ہے شیشے کی طرف یہ مے نوش — خود بخود پانی ہے ... ہوتا ہے اس طرح مدہوش
فخر میرا ہے ترے در پہ جگہ پانے میں
سات پشتیں مری گزریں ترے مے خانے میں

ساقی وہ جام دے جو چھلکتا ہوا ہو جام — مانندِ آفتاب چمکتا ہوا ہو جام
ایسا سبک تو ہو کہ اچھلتا ہوا ہو جام — گرتی ہوئی شراب چھلکتا ہوا ہو جام
دستِ شرع سنبھلا نہیں تو ساتھ ہاتھ اُٹھے
بے اختیار زاہد و واعظ کا ہاتھ اُٹھے

ایران کے قدیم قصیدہ گو اور اُن کی پیروی میں ہندوستانی قصیدہ نگار اپنے ممدوح کی شجاعت اور فنونِ جنگ میں مہارت کے سلسلے میں اکثر اُن کے گھوڑے اور تلوار کی بھی تعریف کرتے تھے۔ اُردو کے مرثیہ گویوں نے بھی یہی طریقہ اختیار کر لیا۔ اور گھوڑے اور تلوار کی تعریف میں خوب خوب زورِ طبع صرف کیا۔ حضرتِ عروج نے گھوڑے کی تعریف اکثر اور تلوار کی تعریف کمتر بہت اچھی لکھی ہے:-

گھوڑے کی تعریف

بیچ میں پشت پہ رہواروں کو یہ دھیان جو تھا — اتنی تیزی پہ بھی جنبش نہ تھی جھومروں کو ذرا
رَو میں بھی لطف سبک خیزیاں دکھلاتی تھیں — کشتیاں دو تھیں کہ پانی پہ چلی جاتی تھیں

کبھی دکھلائے سبک چال جو یہ برق سرشت — جائے رکھتا ہوا اڑتے ہوئے ذرّوں پہ قدم
صدقے اس چال پہ ہونے کو پری رو ہو تیار — جائے کوسوں پہ زمیں سے نہ قدم چھو جائیں

جس پہ لاکھوں میں نظر پڑتی ہے ممتاز ایسا — دل ہیں پریوں کے فدا چال میں انداز ایسا

تمام اوج ہوا گرم تھا زمیں کی طرح
بگولے دشت کے تھے دیو آتشیں کی طرح

فلک سے آگ برستی تھی رن میں سرتا سر — نہ چین تھا کسی ذی روح کو کہیں دم بھر
اُمس تھی ایسی کہ رُکتی تھی سانس رہ رہ کر — غبارِ دشتِ بلا تھا کہ آتشیں چادر
مثالِ تابۂ آہن زمین تپتی تھی
کہ دن کو دھوپ میں ذرّوں سے لُو نکلتی تھی

تپش سے کھولتا تھا آبِ فرات بھی یکسر — تھی نہر یا تھی زمیں کی جبیں پسینے سے تر
ذرا نہ تہ سے اُبھرتی تھیں مچھلیاں اوپر — کلیجہ پھٹتا تھا پانی کا پڑتا تھا جو بھنور
وہ حال اب نہیں دریا کی بھی روانی کا
نہ ٹپکی بوند جو دامن نچوڑا پانی کا

دوسرے مرثیہ گویوں کی طرح حضرت عروج کے کلام میں بھی اُن کے زمانے کے واقعات کا ذکر نہیں ملتا۔ صرف ایک مرثیے میں حضرتِ عارف[1] کے انتقال کا حال ذرا تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ یہ مقام ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔

ابھی کا ذکر ہے یاد آپ کو بھی ہوگا ضرور — گئے جہان سے کس طرح عارفِ مغفور
چلے تھے پڑھنے کو وہ مجلسِ امامِ غیور — کہ ناگہاں اجل آنے سے ہوگئے مجبور
دل و جگر میں خدنگِ ملال بیٹھ گئے
اُٹھا جو درد کلیجہ پکڑ کے بیٹھ گئے

افاقہ اِس مرضِ سخت سے ہوا بھی نہ تھا — کہ ایک دوست کو فوراً خدا نے بھیج دیا
سنبھالا بڑھ کے اُنھوں نے یہ حال جب دیکھا — وہیں تھا ایک مطب اُن کو لے گیا جس جا
تمام جسم تھا ڈوبا ہوا پسینے میں
مزاج پوچھا تو بتلایا درد سینے میں

کسی نے جا کے اس آفت کی کر دی گھر میں خبر — یہ سُن کے دوڑ کے سب آئے با دلِ مضطر
کلیجے ہِل گئے، کی اُن کے حال پر جو نظر — یہ دیکھا اب کوئی دم میں ہے سوئے خُلد سفر

---

[1] سید علی محمد صاحب عارف مرحوم حضرت عروج مغفور کے حقیقی بھانجے تھے۔ مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی دونوں فنون میں بلند پایہ رکھتے تھے۔ ۱۴۔ ذوالحجہ ۱۳۳۴ھ مطابق اکتوبر ۱۹۱۶ء میں انتقال کیا۔

لگی وہ چوٹ کہ دل بے قرار ہونے لگا
ہر ایک پھیر کے منھ چپکے چپکے رونے لگا

ذرا سی دیر میں تھوڑی بہت دوا بھی ہوئی — مگر سکوں نہ ہوا جس قدر بھی کوشش کی
مکاں پہ لے کے چلیں سب کی رائے یہ ٹھہری — کہا جو اُن سے کہ چلئے کہا تمھاری خوشی

اُٹھائے کوئی کیا رُخ نہ ایسی باتوں پہ
وہ اُٹھ کھڑے ہوئے خود زور دے کے پاؤں پہ

چلے بھی اُٹھ کے قدم بھی بڑھائے اک دو کہا — ہوا درد جگر جس سے زور چل نہ سکا
زبان بند ہوئی ڈھل کے رہ گیا منکا — نہ پاؤں دوسرا لیکن جگہ سے اپنی ہلا

تعلق اُن کو نہ کچھ پھر جہانِ زشت میں تھا
قدم تھا ایک یہاں دوسرا بہشت میں تھا

اگرچہ موت نے چھلکا دیا حیات کا جام — مگر رہے گا دلوں میں خیال اُن کا مدام
کبھی نہ صفحۂ ہستی سے مٹنے پائے گا نام — ہمیشہ یاد دلائے گا اُن کی اُن کا کلام

مثالِ دعبل و حسّاں رہے گا نام اُن کا
کہ مجلسوں میں پڑھا جائے گا کلام اُن کا

اوپر جو اقتباسات مثالاً پیش کئے گئے ہیں اُن سے معلوم ہوگا کہ حضرت عروج واقعات و مناظر کے خارجی پہلوؤں کی تصویر کشی خوب کرتے ہیں، مگر داخلی پہلو میں زیادہ گہرے نہیں جاتے۔ اُن کی شاعری کے چند اچھے نمونے ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں:-

صبح کی ٹھنڈی ہوا کا نباتات پر اثر:-

کان میں آتی ہے جب بادِ صبا کی آہٹ — لے کے انگڑائی بدل لیتی ہیں بیلیں کروٹ
خنکی بادِ سحر سے جو مزہ پاتی ہیں — بسترِ نرم پہ آرام سے سو جاتی ہیں

عون و محمد گھوڑے اُڑاتے ہوئے میدانِ جنگ کو جا رہے ہیں:-

چھیڑ دیتی ہے روا روی میں اگر بادِ صبا — کروٹیں لیتی ہے بالائے ہوا زلفِ دوتا
خم بہ خم پیچ بہ پیچ اور جو پڑتے ہیں سوا — دوڑ کر ہاتھوں پہ لے لیتی ہے بالوں کو ہوا

کوششیں لاکھ کرے پھر بھی ہوا پیچھے ہے
چاند دو آگے ہیں گھنگھور گھٹا پیچھے ہے

امام حسین خیمے سے میدانِ جنگ کو تشریف لیجاتے ہیں :-

جانبِ فوج چلے سبطِ رسولِ دوجہاں ... ...
علم فوج ہیں عباس جری کھولے ہوئے سر پہ ہے مہرِ فلک چترِ زری کھولے ہوئے

چھ مہینے کا بچہ پیاس سے جاں بلب ہے :-

خشک ہیں پیاس سے لب سرد بدن ہے سارا سانس بھی آتی ہے رُک رُک کے یہ سوکھا ہے گلا
نرگسی آنکھوں سے ماں بہنوں کو تکتے بھی نہیں اب تو یہ گود میں آنے کو ہمکتے بھی نہیں

پیاس کی شدت سے بچوں کی حالت :-

تین دن گزرے ہیں سہتے ہوئے تکلیفِ عطش غش سے جب اُن کو اُٹھاؤ تو پھر آجاتا ہے غش
مائیں چونکاتی ہیں جب "اے مرے جانی" کہہ کے آنکھیں پھر بند وہ کر لیتے ہیں "پانی" کہہ کے

ایک یزیدی پہلوان :-

دیکھا نہیں اس طرح کا انسان تن آور نامرد کا سر کوہ کی چوٹی ہے مدوّر
ابرو ہیں ستمگار کے فولاد کا خنجر پلکیں ہیں کہ ہیں تیلیاں لوہے کی سراسر
رخسارے جفاکار کے سختی میں حجر ہیں
اُبھرے ہوئے شانے ہیں کہ عفریت کا سر ہیں

قد تھا کہ شجرِ خبیثہ کا واک تھا یا فیل ٹکڑا تھا پہاڑی کا کہ بیڈول تھا وہ ڈیل
ساقیں نہ کہو راہِ ضلالت کے تھے وہ میل تھے ہاتھ ستمگار کے یا صورِ سرافیل
بدکیش تھا، بدعہد تھا اور زشتِ عمل تھا
مرّیخ تھا غصے ہیں نحوست میں زحل تھا

امام حسین کا گھوڑے پر سوار ہونا :-

یہ کہہ کے پشتِ فرس پر چڑھے امامِ زمن کیئے درست قبا کے حسین نے دامن
ضیا سے رُخ کی فلک یک بیک ہوا روشن زمیں کا مَس قدم سے اُبل پڑا جو بن
ضیائے پائے شہِ دیں جو پاتے ہیں ذرّے
چمک کے مہر کو آنکھیں دکھاتے ہیں ذرّے

حضرت قاسم کی ہیبت :-

گرتی ہے صف پہ صف یہ اُٹھاتے ہیں جب نگاہ　　تیغِ اجل نگاہ ہے برقِ غضب نگاہ
امکان کیا کہ ان پہ کریں بے ادب نگاہ　　نیچے کیے ہیں فرق جھکائے ہیں سب نگاہ
آثار ہیں جلال علی کے جناب میں
ابرو پڑا ہوا ہے تنِ آفتاب میں

حضرت علی اکبر کی جنگ سے دنیا میں ہلچل:-

سمجھے ملائکہ کہ یہ ہے ساعتِ نشور　　اُٹھے جگہ سے اپنی سرافیل لے کے صور
آندھی سی یہ چلی کہ تلاطم ہوئے بحور　　ذرے زمیں پہ پا کے ملے شق ہوئے قبور
سامانِ حشر رن میں نمودار ہو گئے
مُردے لحد سے اُٹھنے کو تیار ہو گئے

ہلتی ہے بار بار زمیں لرزتے ہیں کوہسار　　شدت تھی گرد کی کہ ہوا کو بھی تھا فشار
طوفاں ہوا بپا خاک کے دریا میں آشکار　　اُٹھتا تھا کانپ کانپ کے ہر مرتبہ غبار
طاری ہراس کیوں نہ ہو سارے جہان پر
ڈر کر زمین چڑھ رہی تھی آسمان پر

یزیدی فوج پر خوف کا غلبہ:-

جنگ میں ایک کے ایسے ہوش بجا ہیں نہ حواس　　چہرے اُترے ہوئے ہیں جینے سے ہر اک کو ہے یاس
چھٹ گئیں ہاتھوں سے ڈھالیں ہیں نہ تلواریں پاس　　بھاگتے بھی نہیں اب زیست سے لیا ہے ہراس
بن کے زنجیر قضا اُن کو جکڑ لیتی ہے
بھاگیں کیا خاک زمیں پاؤں پکڑ لیتی ہے

ہول کے مارے گرے پڑتے ہیں گھوڑوں سے سوار　　نہ کہیں امن کا موقع نہ کہیں جائے قرار
رن میں پھرتے ہیں ہاتھوں کو جو کوتل رہوار　　ہو رہا ہے ستم ایجادوں کو بے قبر فشار
جو لرزتے ہیں بہر حال سنا دیتے ہیں
استخواں ٹوٹ کے اُف اُف کی صدا دیتے ہیں

حضرت زینب اپنے بچوں کو میدان جنگ میں بھیجنے کیلئے تیار کرتی ہیں:-

کنگھی کی بالوں میں اُلجھے ہوئے گیسو سلجھائے　　سُرمہ دینے لگیں آنکھوں میں تو آنسو بھر آئے

عون و محمد کا جنگ کیلئے روانہ ہونا:-

سُن کے شبیر کا ارشاد علمدار بڑھے ساتھ ماموں کے بصد شوق وہ جرار بڑھے
مسکراتے ہوئے دونوں سوئے پیکار بڑھے دل جو بیچین ہوا خود شہ ابرار بڑھے

حضرت عروج مرثیہ گوئی میں بھی بلند پایہ رکھتے تھے۔ مگر اُن کا اصل کمال مرثیہ خوانی میں ظاہر ہوتا تھا۔ راقم حروف نے مرحوم کو لکھنؤ کی مجلسوں میں بارہا پڑھتے ہوئے سُنا ہے۔ اُن کے پڑھنے سے اُن کے کلام کا اثر دس گُنا نہیں بلکہ سو گُنا ہو جاتا تھا۔ مرثیہ خوانی ایک طرح کی اعلیٰ درجے کی ایکٹنگ ہے اس لیے مرثیہ خواں کا کمال اُن مقاموں پر خوب ظاہر ہوتا ہے جہاں آواز کے اُتار چڑھاؤ، چہرے کے تغیر اور اعضائی جنبشوں کو زیادہ نمایاں کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ ذیل میں عروج مرحوم کے مرثیوں میں سے نمونے کے طور پر چند اقتباس پیش کئے جاتے ہیں، کہ اس طرح کے مقامات کو جب وہ پڑھ دیتے تھے تو اثر کا وہ عالم ہوتا تھا جو قلم کی زبان سے بیان نہیں کیا جا سکتا۔

رن میں پہونچا جو بصد غیظ حسن کا دلیر دیکھ کر رعب جری ہو گئے حیراں خود سر
بڑھ کے دو چار قدم اور سوئے لشکر شر دیکھی میدان کی حد گھوڑے کو کاوا دیکر
روک کر پھر فرس برق سفر غازی نے
کی مخواروں پہ جُن جُن کے نظر نازی نے

اللہ رے پُر دلی علی اکبر جواں تھے مطمئن قریب تھا گو لشکر گراں
سو کھے ہوئے لبوں پہ پھرائی کبھی زباں پونچھا کبھی لہو کبھی چٹکائیں اُنگلیاں
نعرہ کیا مثال اسد گاہ جھوم کے
اور یا علی کہا کبھی قبضے کو چُوم کے

رعب نے جسم سے بدخواہوں کی جانیں کھینچیں زین پر جم کے دلیروں نے عنانیں کھینچیں
جو علی کا تھا سواری کا قرینہ ہے وہی دونوں بازو وہی، شانے وہی، سینہ ہے وہی

غور سے دیکھ لیں انسر کہ غلط گو نہیں ہم وہ بلندی پہ ستارہ سا چمکتا ہے علم

خوف چھایا ہوا تیرے دل ناپاک پہ ہے اب زباں ہل گئی منھ میں تو یہ سر خاک پہ ہے

لکھنؤ میں حضرت عروج کے پڑھنے کی جو سالانہ مجلسیں مقرر تھیں اُن میں دو مجلسیں خاص کر قابل ذکر ہیں ایک وہ جو ماہ شوال کے تیسرے اتوار کو پرانے نخاس میں اکرام اللہ خاں کے امام باڑے میں ہوا کرتی تھی۔ اس

مجلس کے بانی لکھنؤ کے ممتاز وکیل سید شہنشاہ حسین صاحب مرحوم تھے۔ سامعین کی وہ کثرت ہوتی تھی کہ امام باڑے کے بڑے بڑے دالان، شہ نشین اور پورا صحن میں تل رکھنے کی جگہ نہیں رہتی تھی اور پھاٹک سے لے کر سڑک تک ٹھٹھ لگے رہتے تھے۔ ایک مجلس کا وہ منظر اب تک مجھے یاد ہے کہ ساقی نامہ پڑھا جا رہا ہے اور سامعین وجد کر رہے ہیں۔ جب حضرت عروج اس بند پر پہنچے:-

تیری سرکار سے رہتا نہیں کوئی محروم　　سال بھر بعد پھر آئی ہے یہ ہمت سے دھوم
حال رندوں کا بخوبی تجھے ہوگا معلوم　　دیکھ تو آ کے کہ زینے پہ یہ کتنا ہے ہجوم

دل ترے بیچین بہت ہے کے طلب گاروں کے
ٹھٹھ لگے ہیں ترے دروازے پہ میخواروں کے

یہ بیت پڑھتے وقت امام باڑے کے دروازے کی طرف اشارہ کیا تو حاضرین کے جذبات میں طوفان آ گیا اور تحسین و آفرین کا شور برپا ہو گیا۔ اس وقت کا عالم دیکھنے کے قابل تھا۔ افسوس ہے کہ وہ مجلس حضرت عروج کی زندگی ہی میں بانیِ مجلس کی ناوقت وفات کے باعث موقوف ہو گئی۔

دوسری قابلِ ذکر سالانہ مجلس وہ تھی جو رجب کی پچیسویں[۲۵] تاریخ کو دل آرام کی بارہ دری میں ہوا کرتی تھی۔ اس مجلس کی اہمیت اور شہرت کا خاص سبب یہ تھا کہ وہ میر انیس کے زمانے میں قائم ہوئی تھی اور وہ اس مجلس میں زندگی بھر نیا مرثیہ پڑھتے رہے۔ میر انیس کے بعد اُن کے فرزند اور جانشین جناب نفیس نے ساری عمر یہی طریقہ جاری رکھا۔ میر نفیس کے انتقال کے بعد حضرت عروج ہر سال نیا مرثیہ پڑھا کیے۔ اس مجلس کی اہمیت بڑھانے کے لیے اس کی یہ خصوصیت اور اس کی قدامت ہی کافی تھی۔ مگر اس سے بڑا سبب یہ تھا کہ اسی تاریخ کو میر باقر سوداگر کے امام باڑے میں مرزا دبیر اور اُن کے جانشین ہر سال اپنا نو تصنیف مرثیہ پڑھا کرتے تھے۔ اس طرح یہ مجلسیں دونوں حریف اُستادوں کے مقابلے کی مجلسیں ہوتی تھیں۔ دونوں اُستاد اپنا اپنا زورِ طبع دکھاتے تھے۔ اور دونوں کے طرفدار کثیر تعداد میں بڑے جوش کے ساتھ ان مجلسوں میں شرکت کرتے تھے۔ یہ سلسلہ بفضلہ اب بھی جاری ہے۔ ہر سال پچیسویں رجب کو دل آرام کی بارہ دری میں حضرت عروج کے صاحبزادے جناب میر محمد حسن صاحب عرف للّن صاحب فائز، اور میر باقر سوداگر کے امام باڑے میں مرزا دبیر مغفور کے پوتے اور حضرت اوج مرحوم کے فرزند جناب مرزا محمد طاہر صاحب رفیع اپنے اپنے کلام سے سامعین کو مستفیض فرماتے ہیں۔

حضرت عروج اس مجلس میں ہر سال اپنا نیا مرثیہ پڑھتے تھے۔ اُن کا کلام سُننے اور کمال دیکھنے

کے لئے دُور دُور سے لوگ آتے تھے۔ بڑا مجمع ہوتا تھا۔ راقم بھی اِس مجلس میں التزام کے ساتھ شرکت کرتا تھا۔ وہاں جو کیفیتیں میری آنکھوں نے دیکھیں اُن کو قلم کی زبان ادا نہیں کر سکتی۔ آخری عمر میں عروج مرحوم کی صحت خراب رہنے لگی تھی۔ ایک مرتبہ پیری میں طویل بیماری نے اتنا کمزور کر دیا کہ چلنا پھرنا دشوار تھا۔ اسی حالت میں رجب کی چھبیسویں آگئی۔ دل آرام کی بارہ دری حسبِ معمول سامعین سے بھری ہوئی تھی۔ مجلس شروع ہونے کا وقت آگیا۔ دو آدمیوں نے بغلوں میں ہاتھ دے کر حضرت عروج کو منبر پہ بٹھا دیا۔ آپ نے مرض اور ضعف کا عذر کر کے مرثیہ شروع کیا۔ چند بند پڑھے تھے کہ طبیعت میں گرمی پیدا ہوئی۔ ایک چادر سے اپنی کمر کسوائی اور اِس جوش و خروش سے پوری مجلس پڑھ گئے کہ گویا بیماری اور ضعف کا نشان تک نہ تھا۔ اُس دن کا یہ سماں کچھ ایسا پُر اثر تھا کہ دیکھنے والے اُس کو کبھی بھول نہیں سکتے۔ ایک مرثیے میں حضرت عروج نے اپنی پیرانہ سالی کا ذکر ذیل کے بندوں میں کیا ہے:۔

اے زباں عرض یہ اب خدمتِ احباب میں کر — بس ہے کیا ہو جو بلاؤں میں گھرے سر تا سر
کشمکش ایسی کہ ہو سانس کا لینا دوبھر — جسم ہی ہو تنِ مدقوق کی صورت لاغر
پھر ہو کیا نظم نہ جب ذہنِ رسا کام کرے
بات کرنا جسے مشکل ہو وہ کیا کام کرے

قد جو مانندِ الف تھا وہ ہوا جاتا ہے دال — خم کمر ہونے سے آتا ہے یہ رہ رہ کے خیال
ڈھونڈ لا پھر سے جوانی کو تو جائے یہ بال — عقل کہتی ہے کہ بڑھ جائیگا کچھ اور زوال
نفع کیا سوئے سراب آئے جو پانی کے لیے
خود بھی مل جائے گا مٹی میں جوانی کے لیے

دل میں جو کچھ ہے مرے آپ سے سُن لیجے ضرور — درگزر کیجئے میری غلطی ہو کہ قصور
نظم کا پہلے سلیقہ تھا نہ اب کچھ ہے شعور — اس پہ طرّہ ہے کہ ہوں ضعف سے بیحد مجبور
معترف خود ہوں کہ پہلے تھا نہ اب کچھ ہوں میں
آپ کی ہو نظرِ لطف تو سب کچھ ہوں میں

التماس اور یہ ہے آپ سبھوں سے بہ ادب — جتنے اعضائے بدن ہیں وہ بیکار ہیں سب
جودتِ ذہنِ رسا نام کو باقی نہیں اب — شرطِ خدمت نہ بجا لاؤں یہ ہے اور غضب
ایک بچے سے بھی کم تاب و تواں رکھتا ہوں
اب تو کہنے کیلئے منہ میں زباں رکھتا ہوں

آخری بڑی مجلس جو حضرت عروج نے پڑھی وہ مجلس تھی جو جناب خان بہادر سید ابو محمد صاحب نے مارچ ۱۹۳۸ء کے آخری اتوار کو لکھنؤ کے آصفی امام باڑے میں منعقد کی تھی۔ ہر قوم و مذہب کے لوگوں کا ایک عظیم الشان مجمع تھا اور ہر شخص حضرت عروج کے کمالِ فن کا معترف نظر آتا تھا۔

مجلسِ عزا مسلمانوں کی مذہبی چیز ہے مگر حضرت عروج کے پڑھنے کی مجلسوں میں ادبی ذوق رکھنے والے ہندو حضرات بھی بڑے شوق سے شرکت فرماتے تھے۔ راقم حروف نے ایسے جن لوگوں کو مجلس میں موجود دیکھا ہے، اُن میں مشہور شاعر پنڈت برج نرائن چکبست مرحوم، اور فاضل ادیب پنڈت منوہر لال صاحب زتشی کے اسمائے گرامی خاصکر قابلِ ذکر ہیں۔

اگر کوئی شخص کسی فن کی واقفیت کے ساتھ ساتھ علمی منزلت، اخلاقی عظمت اور مالی وجاہت بھی رکھتا ہو تو یہ پتہ لگانا دشوار ہو گا کہ اُس کو جو وقعت حاصل ہے، اُس میں کتنا دخل اُس کے کمالِ فن کو ہے اور کتنا دوسرے اسباب احترام کو۔ مگر حضرت عروج کو صرف مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کے کمال کی بدولت وہ رتبہ حاصل تھا کہ بڑے بڑے اہلِ علم و فضل اور عمائدِ صاحبانِ جاہ و ثروت اُن کے اس کمال کے سامنے سر جھکاتے تھے۔ حضرت عروج نے اپنے ایک ابتدائی مرثیے میں اس حقیقت کا اعتراف یوں کیا ہے:-

پہلے اس طرح کی حاصل تھی بلندی مجھے کب	مدح سے آلِ نبی کی یہ ملا ہے منصب
عرش پر جانے کا بے شبہ قرینہ ہے یہی	یعنی منبر مری معراج کا زینہ ہے یہی
طے کروں مدح کا جادہ یہ نہ تھی میری مجال	پر کیا اُس کے کرم نے مجھے دم بھر میں نہال
اُس کی رحمت سے در شاہ نجف تک پہنچا	کوکبِ بختِ رسا برجِ شرف تک پہنچا
میں کوئی شے نہیں اس کا ہے مجھے خود اقرار	پر خدا کو تو کوئی امر نہیں ہے دشوار
گو کہ ناچیز تھا اک ذرۂ بے قدر تھا میں	اُس کی ادنیٰ نظرِ مہر ہوئی بدر تھا میں

ایک دوسرے مرثیے میں کہتے ہیں:-

مجھ سے ناچیز کا دیکھو تو ذرا عز و وقار	خادمانِ شہِ والا میں ہے میرا بھی شمار
مجھ کو مطلب نہیں کچھ کوئی اگر ہو زردار	ابنِ زہرا کی غلامی سے مجھے ہے سروکار

خادمِ خاصِ امامِ مدنی ہوں میں تو
درِ حیدر کی گدائی سے غنی ہوں میں تو

رحمتِ خالقِ اکبر سے یہ رتبہ پایا	ذاکرِ سبطِ رسول دوسرا کہلایا
مرتبہ مجھ کو یہ آقا نے عطا فرمایا	چترِ زرّیں ہے مرے سر پہ علم کا سایا

فخر ہو اپنے مقدر پہ نہ کیونکر مجھکو
تختِ شاہی سے زیادہ ہے یہ منبر مجھکو

حضرت عروج کو اپنے کمال کا صلہ اہلِ ذوق سے تعریف و تحسین کی شکل میں اور اہلِ دول سے نقد نذرانے کی صورت میں ملتا تھا جس کی بدولت مرحوم فارغ البالی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اِس انفرادی اور نجی قدردانی کے علاوہ اجتماعی اور سرکاری طور پر بھی مرحوم کے کلام کی قدر کی گئی۔ اُن کے تین مرثیوں کا ایک مجموعہ "معراج سخن" کے نام سے انڈین پریس الہ آباد نے ۱۹۲۹ء میں شائع کیا تھا۔ اُس کو اِس صوبے کی سرکاری ادبی انجمن "ہندوستانی اکیڈمی" نے اُس سال کی بہترین منظوم تصنیف قرار دیکر مصنف کو پانسو روپے کے انعام کا مستحق قرار دیا تھا۔ افسوس ہے کہ اکیڈیمی کے اِس فیصلے کے کچھ ہی دن بعد حضرت عروج کا انتقال ہوگیا اور وہ روپیہ اُن کی بیوہ کو وصول ہوا۔

حضرت عروج کو قدردانانِ سخن لکھنؤ کے باہر مجلسیں پڑھنے کے لیئے بڑے شوق سے بُلاتے تھے آپ جہاں جاتے تھے وہاں کے بڑے سے بڑے لوگ آپ کو آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ لکھنؤ کے باہر چار جگہ آپ کے پڑھنے کی سالانہ تاریخیں معین تھیں۔ ریاست محمود آباد ضلع سیتاپور میں والیِ ریاست کے یہاں ۲۱۔ رمضان۔ ریاست اصغرآباد ضلع علی گڑھ میں راجہ اصغر علی خاں صاحب مرحوم کے یہاں، ۲۷۔ صفر۔ ریاست بلوہ ضلع سیتاپور میں چودھری علی اختر صاحب کے یہاں ۴۔ ربیع الاول۔ اور حیدرآباد دکن میں نواب تہور جنگ بہادر کے یہاں عشرۂ محرم۔ اِن مقامات میں سے حیدرآباد اور محمود آباد کے تعلقات کئی پشتوں کے تھے۔

نواب تہور جنگ بہادر نے ایک مرتبہ نہایت عقیدت سے بڑے اہتمام کے ساتھ میر انیس کو حیدرآباد بُلایا۔ اُن کی خواہش تھی کہ میر صاحب ہر سال تشریف لے جایا کریں۔ لیکن کچھ تو طولانی سفر کی تکلیفیں، کچھ یہ احساس کہ اہلِ حیدرآباد مغزِ سخن تک اُس طرح نہیں پہونچتے جس طرح اہلِ لکھنؤ۔ غرضکہ میر انیس دوبارہ حیدرآباد تشریف نہ لے گئے، اور اُن کی جگہ اُن کے نامور صاحبزادے میر نفیس ہر سال جایا کیئے۔ میر نفیس کے انتقال کے بعد نواب صاحب کی طلب پر حضرت عروج حیدرآباد جانے لگے۔ نواب تہور جنگ کی وفات کے بعد اُن کے صاحبزادے نواب بشیر جنگ اور نواب عنایت جنگ ہر سال حضرت عروج کو طلب فرماتے رہے۔

ریاست محمود آباد کے نامور رئیس امیر الدولہ راجہ سر امیر حسن خاں صاحب بہادر میر نفیس سے بڑی عقیدت رکھتے تھے، حضرت عروج کی بھی بہت قدر کرتے تھے۔ راجہ صاحب مغفور کے فرزند و جانشین مہاراجہ سر محمد علی محمد خاں صاحب مرحوم حضرت عروج کی جو عزت کرتے تھے اس کی ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔

ایک مرتبہ لکھنؤ میں مہاراجہ صاحب مرحوم ایک مجلس میں اپنا تصنیف مرثیہ پڑھنے والے تھے، ایک کثیر مجمع تھا۔ شہر کے بڑے سے بڑے لوگ مجلس میں شریک تھے، حضرت عروج بھی منبر کے سامنے تشریف رکھتے تھے۔ مجلس شروع ہوئی اور مہاراجہ صاحب کے کلام اور خوانندگی نے اہل مجلس کو مسحور کر دیا۔ ایک وجد اور بیخودی کا عالم تھا، تحسین وآفریں کا غلغلہ بلند تھا۔ اس عالم میں جب کبھی حضرت عروج تعریف کرتے تھے تو مہاراجہ صاحب منبر پر کھڑے ہوکر ادب سے تسلیم کرتے تھے اور فرماتے تھے "یہ سب حضور ہی کا طفیل ہے"۔ اسی ایک مثال سے واضح ہو جائیگا کہ حضرت عروج کو اپنے کمال کی بدولت کیا عزت ووقار حاصل تھا۔ مہاراجہ صاحب مرحوم کے فرزند رشید اور ریاست محمود آباد کے موجودہ مسند نشین عالیجناب راجہ محمد امیر احمد خاں صاحب بہادر دام اقبالہٗ جس طرح مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کے فن میں اپنے والد ماجد کے قدم بقدم ہیں اسی طرح قدردانی کمال میں بھی اُن کے نقش قدم پر چل رہے ہیں اور حضرت عروج مرحوم کے صاحبزادے جناب فائز کی بہت عزت اور قدر فرماتے ہیں۔

لکھنؤ میں اس وقت بھی اچھے اچھے مرثیہ گو اور مرثیہ خواں موجود ہیں۔ مگر ہر فن کی ترقی اُس کی قدردانی پر منحصر ہے، اور اب قدردانی کا یہ حال ہے کہ متعدد نہایت قابل قدر حضرات جنھوں نے اپنی ساری عمر فن مرثیہ گوئی کی تکمیل میں صرف کردی اس فن کے ذریعے سے اتنا مالی نفع بھی حاصل نہیں کرسکتے کہ آسانی سے اپنا پیٹ بھر سکیں۔ اور تن ڈھانک سکیں، خوش حالی اور فارغ البالی کا تو ذکر ہی کیا۔ اس ناقدری کے زمانے میں یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ کوئی دوسرا عروج پیدا ہو۔ اس لئے یہ کہنا کوئی مبالغہ نہیں کہ مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کا وقار حضرت عروج کے دم سے قائم تھا اور اُنھیں کے ساتھ رخصت ہوگیا۔

حضرت عروج نے ۱۴ مئی ۱۹۳۰ء مطابق ۱۴ ذوالحجہ ۱۳۴۸ھ کو چہارشنبہ کے دن دوپہر سے قبل سترّ سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔ مرحوم کے فرزند حضرت فائز نے بڑے اہتمام سے جنازہ اُٹھایا اور دریائے گومتی میں غسل دے کر اپنے جد اعلیٰ میرانیس کے مقبرے میں شب پنجشنبہ دفن کیا۔

ہمیشہ رہے نام اللہ کا!

[illegible]

ترجمہ
کبھو سبھن کبھو تلسی چندن　کبھو پریت پھلواری اور بن
دیا جھلک کبھو باس پھول کی　بن بستی سب تیرے درپن

آفتاب

(از پنڈت اندرجیت شرما ماچھرہ ضلع میرٹھ)

کس کی تلاش ہے تجھے دن رات آفتاب ہر روز صبح صبح دکھاتا ہے سُرخ رو
آرائشیں تری ہیں یہ کس درجہ کامیاب اتنا حسیں نہیں کوئی جتنا حسیں ہے تو
اس وقت تیرا اور ہی کچھ رنگ ڈھنگ ہے
شوخی سی ہے نگاہ میں، دل میں اُمنگ ہے

کرتا ہے گشت چرخ پہ شانِ شکوہ سے اتنا سُبک خرام ہے تو کس اُمید پر
نیلی فضا میں جاتا ہے اونچا ہی کوہ سے اللہ رے طویل ہے کتنا ترا سفر
ہوتا ہے چور تو جو سفر کے تکان سے
کرتا ہے رُخ زمیں کی طرف آسمان سے

لیکن ہیں اب وہ صُبح کی سرگرمیاں کدھر شوخی کہاں گئی وہ شرارت کہاں گئی
قابو نہیں رہا ترا رنگِ شکست پر صبر و سکوں کی رُخ پہ علامت نہیں رہی
ہے زرد زرد رنگ سے افسردگی عیاں
حسرت بھری نگاہ ہے پھر سوئے آسماں

کرشن جنم

از مسٹر راجیندر نرائن سکسینہ بی اے

۱

دہر پر خاموشیاں چھائی ہوئی تھیں شام سے
کالے کالے بادلوں میں چھپ گئی تھی بھیگی رات
کوئی شئے واقف نہ تھی آغاز اور انجام سے
کیفِ مدہوشی میں ڈوبا تھا نظامِ کائنات

۲

یک بیک ہونے لگے روشن زمین و آسماں
چھپ گئیں تاریکیاں مہتاب کی آغوش میں
نیم شب تھی، تھا اسیرِ خوابِ غفلت اک جہاں
ٹمٹماتے تھے ستارے وادیِ خاموش میں

۳

گا رہی تھی معرفت کے کیف زا نغمے نسیم
روح کو ملتا تھا ہر لمحہ یہ پیغامِ حیات
عطر افشاں تھی فضا میں غنچہ و گل کی شمیم
اک بہارِ گل بداماں تھی نمودِ کائنات

۴

بارگاہِ قدس میں ہر پاک تن خاموش تھا
سربسجدہ تھے ملائک اک عجب انداز سے
نور سے معمور تھی خلدِ بریں کی کل فضا
چل رہی تھی بادِ فردوسِ بریں صد ناز سے

۵

خندہ زن تھا پھول تو غنچہ تبسم ریز تھا
دید کے قابل تھیں فواروں کی گوہر ریزیاں
چہچہاتے تھے خوشی سے طائرانِ خوش نوا
کس قدر جاں بخش تھیں قدرت کی رنگ آمیزیاں

۶

جنت الفردوس تھی یا اک طلسمِ رنگ و آب
خوں میں آلودہ نظر آتا تھا دامانِ بہار
غنچہ و گل کی وہ مستی جس پہ قرباں خود شباب
کر دیئے شبنم نے موتی حسنِ فطرت پر نثار

۷

برلبِ قدرت سے ناگہ اک صدا پیدا ہوئی — ذرہ ذرہ کیفیت میں جھومتا تھا بار بار
دہر کی ہر شے سے پیدا تھی نوائے زندگی — وہ نوا مدت سے تھا ہستی کو جس کا انتظار

۸

اس سہانے وقت میں اُس برگزیدہ روح کا — عرشِ بالا سے ہوا دُنیائے فانی میں ظہور
رازِ الفت آشنا تھی جس کی نَے کی ہر صدا — جس کے نغموں سے نمایاں تھا محبت کا سرور

جذباتِ شایق

(از مسٹر کیلاش ورما شایق بی۔اے ہنگامی)

کبھی ہوں عین حقیقت کبھی مجاز ہوں میں — جہانِ راز میں پوشیدہ ایک راز ہوں میں
نہیں غم ہوں مگر غم سے بے نیاز ہوں میں — کہ خود ہی درد ہوں اور خود ہی چارہ ساز ہوں میں
نیاز ختم ہے مجھ پر تمام ناز ہوں میں — جو اپنا آپ ہے محمود وہ ایاز ہوں میں
قبول ہو کے رہا رنگِ ناتمامیِ عشق — نظر میں حسنِ مکمل کی سرفراز ہوں میں
نفس نفس سے ہے آہنگِ زیست کا اظہار — ہزار راز کے پردوں کا ایک ساز ہوں میں
ہزار شکر کہ تکمیلِ عشق ہو کے رہی — کہ ناز بول اُٹھا بندۂ نیاز ہوں میں
کشیدگی بھی تعلق میں کارفرما ہے — تمام ناز ہیں وہ سر بسر نیاز ہوں میں

عجب ہے کیا جو حقیقت سے دور ہوں شایق
فریب خوردۂ نیرنگیِ مجاز ہوں میں

گیتا اور تصوّف

از منشی منظور الحق کلیم

ہندوستان جس طرح تمدن و معاشرت میں دوسری مہذب قوموں کا گرو تھا اُسی طرح وہ روحانیت میں بھی کمال پر پہونچا ہوا تھا۔ سری کرشن جی کی گیتا اُس زرّین عہد کی بہترین یادگار ہے۔

گیتا مہابھارت مصنفہ وید بیاس کے بھیشم پرب کا جزو ہے۔ اس میں اٹھارہ باب اور سات سو منتر ہیں جن میں وہ اُصول اور نصیحتیں درج ہیں جن کی سری کرشن جی نے مہابھارت کی لڑائی کے موقعہ پر ارجن کو تلقین کی تھی۔ اسی کو ویاس جی نے نظم کر کے کتاب مہابھارت میں منسلک کر دیا۔ ویاس جی کے متعلق دارا شکوہ کے الفاظ یہ ہیں:-

"کلام راحت انجام حق اساس حقیقت شناس معرفت بے قیاس وحدت موسس محرم اسرار خاص الخاص سوامی بیاس کہ تعریفش از ہر چہ گوئیم افزوں و توصیفش ہر چہ نویسند خارج و بیروں است"

مہابھارت کی لڑائی دو حقیقی بھائیوں دھرتراشٹر اور راجہ پانڈو کی اولاد کے درمیان ہوئی تھی۔ دھرتراشٹر انابینا تھے اس لئے راجہ پانڈو کو سلطنت ملی تھی۔ راجہ پانڈو کی وفات کے بعد دریودھن دھرتراشٹر کا بڑا بیٹا کاروبار سلطنت کیا کرتا تھا، اس نے پانڈو کے لڑکوں کا حق جو ریاست کے اصلی وارث تھے دغا سے چھین لینا چاہا اور ان کو اذیت پہونچانی شروع کی یہی جنگ کا سبب ہوا۔

گیتا کے پہلے باب میں سینتالیس منتر ہیں۔ دھرت راشٹر اپنے رتھ بان سنجے سے جنگ کا حال پوچھتے ہیں اور وہ طرفین کے حالات کی اطلاع دیکر کہتا ہے کہ جب طرفین لڑائی کے لئے صف آرا ہوئے تو دریودھن نے اپنے اُستاد بھیشم سے کہا کہ ہماری طرف فلاں فلاں بہادر ہیں، اس کے بعد ارجن نے موقع جنگ کا معائنہ کیا اور کرشن جی سے فرمایا کہ ان میں میرے تمام اعزہ، اُستاد دوست شامل ہیں، سلطنت کے لئے میں ان کا خون نہیں بہا سکتا، یہ کہہ کر افسردہ خاطر ہو کر رتھ میں بیٹھ رہے۔

گیتا کے دوسرے باب میں جس میں سانکھیہ یوگ سے بحث کی گئی ہے اکہتر منتر ہیں۔ اس میں کرشن جی نے ارجن کو سمجھانے کے تین طریقے اختیار کئے ہیں۔ پہلے مردانگی کی غیرت دلائی اور جب دیکھا کہ نامردی نہیں ہے بلکہ اگیان مانعِ جنگ ہے تو حیات و موت پر فلسفیانہ روشنی ڈالنی شروع کی، اور بتایا کہ روح کو فنا نہیں، یہ لازوال اور ایک حالت پر قائم ہے اور زندگی و موت روح کے اتصال و انفصال کا نام ہے۔ جو نمود بے بود ہے۔ پس عارف موت اور حیات کے وہم کو خیال میں نہیں لاتے۔ ماضی اور مستقبل کو چھوڑ کر حال پر نظر رکھتے ہیں، اس کے بعد انسانی فرائض پر توجہ دلائی کہ حق پر جنگ کرنا اس کا فرض ہے۔ اس باب کے چند منتر وضاحتِ بیان کے لئے حسب ذیل ہیں:-

मंत्र ۱۲

नत्वे वाहं जातु नासं नत्त्वं ने मे जनाधिपा ।
न चैव न भीवष्यामः सर्वे वयमतः परम ॥ १२

مطلب: ایک آتما یعنی روح مجھ میں تجھ میں اور ان سب راجاؤں میں بسیط ہے، وہ نہ کبھی پیدا ہوئی اور نہ آئندہ پیدا ہوگی؛ وہ قدیم ہے اور سب اجسام میں ساری ہے اور سب کو ظاہر کرنے والی ہے، اور ان اجسام کا وجود در اصل طلسمی ہے، وہ قادرِ مطلق کا پرتو ہے، جس کی وجہ سے ہم تم اور یہ راجگان فرض کئے جاتے ہیں، یہ سب اشکال فانی اور بے ثبات ہیں۔ ہستی بحت جاودانی اور فنا سے بالاتر ہے۔

ہے اصل وجود ایک باقی فانی — اشکال کا نام ہے وجودِ ثانی
پانی سے بخار، ابر، بوندیں پھر برف — جب گھل گیا برف پھر ہے پانی پانی

منتر ۱۴

मात्रा स्पर्शास्तु कौंनय शीतो ष्ण सुख दुःख दा ।
आगमा पायिनो निन्यास्तांति तिक्षस्व भारतः ॥ १४

مطلب: ماترا سپرش یعنی احساس جو ایک قدرتی تعلق علمِ ذات اور علمِ صفات میں ہے، یہی راحت و رنج دینے والے ہیں۔ جب نفس انسانی بے یادِ خالق اندر جاتا ہے تب وہ اپنا اثر کرکے پندار پیدا کرتا ہے، اس پندار کی وجہ سے رنج و راحت محسوس ہوتے ہیں۔

منتر ۴۴

भोगैश्वर्य प्रसक्तानां तया पहृत चेतसाम् ।
व्यवसाया त्मिका बुद्धिः समाधौन विर्धा यते ॥ ४४

مطلب: جن کا دل لذات اور دولت میں پھنس کر ایک ہو جاتا ہے محویت کی جانب

اُن کی رائے سلیم نہیں ہوتی۔(وہ بیابان میں معشوق حقیقی کو نہیں دیکھ سکتے اور علم خودشناسی سے بے نصیب رہتے ہیں من عرف نفسہ فقد عرف ربہ سے بیگانہ رہتے ہیں۔)

منتر ۴۶

यावानर्थ उदपाने सर्वतः संप्लु नोदके ।
तावान्स वेर्षु वेदेषु ब्राह्मणस्य विजानतः ॥ ४६

مطلب: برہم کے جاننے والے عارف کا ویدوں سے اتنا ہی مطلب باقی رہتا ہے کہ جتنا آسودہ انسان کا کنوئیں، تالاب دریا وغیرہ مقامات آبی سے۔

منتر ۵۱

कर्मजं बुद्धियुक्ता हि फलं त्यक्त्वा मनीषिणः ।
जन्म बंधा विनिर्मुक्ताः पदं गच्छं त्यानामयम ॥ ५१

جو عارف گیان یوگ علم خودشناسی پر قادر ہو کر فعل کے نتیجہ کی پروا نہیں کرتے، وہ پیدائش کی قید سے آزاد ہو کر سرور ابدی کا مقام پاتے ہیں۔

تیسرے باب میں تینتیالیسؔ منتر ہیں جس میں اچھی طرح بتایا گیا ہے کہ افعال لازمی ہیں جن سے کسی کو نجات نہیں ملتی، افعال کا مبداء قدرت ہے، قدرت ہی کی حرکت سے کل عالم متحرک ہے، ذات پاک اور بے لوث ہے۔ دلی تعلق اور انانیت کو ترک کر کے فعلوں کا کرنا ان سے بریت حاصل کرنے کا طریقہ ہے۔ یعنی حواس کو شوق اور نفرت کا مطیع نہ ہونے دے اور اُن کے فعلوں کا باعث قدرت کو جاننے سے پابندیٔ افعال چھوٹ جاتی ہے۔

منتر ۱۰

सहयज्ञाः प्रजाः सृष्ट्वा पुरोवाच प्रजापतिः ।
अनेन प्रसविष्यध्व मेवाऽसिष्ट्व कामधुक ॥ १०

قادر مطلق نے مخلوقات کو ریاضت کرنے کی قوت دیکر پیدا کیا اور ہدایت کی کہ تم اس کے وسیلہ سے ترقی کرو اس سے تمھارے مطالب پورے ہونگے۔

منتر ۳۸

धूमेना व्रियते, वह्नि यथा दर्शो मलेनच ।
यथो ल्बेना वृतो गर्भस्तथा तेनेदमा वृतम ॥ ३८

مطلب: جیسے دھواں آگ کو اور میل آئینہ کو جھلی بچہ کو چھپا لیتی ہے ویسے ہی خواہش اُس علم ذات کو پوشیدہ کر دیتی ہے۔

منتر ۴۳

एवं बुद्धेः परं बुद्ध्वा संस्तभ्यात्म नमत्मना ।
जहि शत्रु महा बाहो काम रूपं दुरासदम ॥ ४३

اوپر کے اشلوکوں میں یہ بتایا گیا تھا کہ جسم کثیف سے حواس برتر، حواس سے دل، دل سے عقل، عقل سے خواہش برتر ہے۔ اسی کی طرف اس اشلوک میں اشارہ ہے کہ اے ارجن! جو اس طور پر عقل سے برتر بیان کیا گیا ہے اس کو جان کر اور دل کو اپنے قابو میں کر کے تو اس زبردست دشمن کو جو خواہش کی صورت رکھتا ہے ہلاک کر مراد یہ ہے کہ ذات پاک چھوٹے سے چھوٹے ذرّے اور بڑے سے بڑے عالم میں موجود ہے اور وہ اندریوں (قویٰ) اور من، بدھی سے برتر ہے پس دانش کو اس میں دخل نہیں صرف حالتِ کیف میں اس کے جمال کا مشاہدہ ہو سکتا ہے۔ انسان علم ذات میں مسرور رہ کر اور خواہش کے افعال سے بے تعلقی اختیار کر کے خواہش کو پیدا نہ ہونے دے، خواہش کا مخزن خیال ہے اس لئے خیال کے روکنے سے خواہش کا سلسلہ رُک جاتا ہے۔

چوتھے باب میں بیالیس منتر ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ روح لازوال، محیط اور قدیم ہے اور مصدر علم و سرور ہے، اس کا علم کبھی ضائع نہیں ہوتا، البتہ کبھی پوشیدہ اور کبھی آشکارا ہوتا رہتا ہے صرف عارف اس رمز کو جانتے ہیں جاہل صفت دوئی کے غلبہ سے اس کے سمجھنے سے معذور ہیں انسانوں میں صرف صفت اور فعل کا فرق ہوتا ہے، روح سب میں یکساں موجود ہے۔ روح جسمانی افعال اور اُن کے نتیجے سے بے تعلق رہتی ہے۔ پس انسان بے تعلق ہو کر فعل کرنے سے روح میں واصل ہو سکتے ہیں، ترکِ فعل کے یہی معنی ہیں فعل ۲ قسم کے ہوتے ہیں فعل باتعلق اور فعل بے تعلق۔ فعل باتعلق میں نیک و بد کی تمیز ہوتی ہے اور فعل بے تعلق میں تمیز نیک و بد اُٹھ جاتی ہے، اس طرح پر عمل کرنے سے تمام افعال آتش عرفان میں سوخت ہو جاتے ہیں اور انسان ذات میں مستغرق ہو جاتا ہے۔

منتر ۱۷

कर्मणो ह्यपि बोद्धव्यं बोद्धव्यंच विकर्मण ।
अकर्मण श्च बोद्धव्यं गहना कर्मणो गति: ॥ १७

مطلب: - نیک افعال بد افعال اور ترک افعال میں تمیز کرنا واجب ہے۔ ترک افعال کی ماہیت کا دریافت کرنا مشکل امر ہے۔

منتر ۱۸

कर्मण्य कर्मय: पश्ये दकर्माण चकर्मय: ।
सबुद्धिम ान्मनुष्येष सयुक्त: कृतुन कर्मकृत ॥ १८

مطلب: - جو بشر افعال میں ترک افعال کا ہونا اور ترک افعال میں افعال کا ہونا سمجھتا ہے وہ عارف اور واصل ہے چاہے تمام افعال اس سے سرزد ہوتے ہوں

نتیجہ کی اُمید رکھ کر خواہش کے ساتھ جو کچھ کیا جاتا ہے وہ فعل کہلاتا ہے بلا امید نتیجہ اور بے خواہش جو کچھ سرزد ہوتا ہے اُسے فعل سے بریت کہتے ہیں فعل دونوں میں ہوتا ہے فرق انسان کے تعلق اور بے تعلقی سے کرنے کا ہے۔ فعل سے بریت کے معنی ترک فعل نہ سمجھنا چاہئیے۔ بریت از فعل ایک حالت کیف کی ہے جو ذات بحت سے معلوم ہو سکتی ہے

ब्रह्मार्पणं ब्रह्महवि ब्रह्माग्नौ ब्रह्मणाहुतम।
ब्रह्मैव तेन गंतव्यं ब्रह्म कर्म समाधिना ॥ २४ منتر ۲۴

جو یگیہ کرتے کو یگ میں ڈالنے کی شئے کو یگیہ کی آگ کو یگ کرنے والے کو ذات واحد تصور کرتا ہے اس کا ذات واحد سے وصال ہوتا ہے ؎

صوفی شدہ نیست ہست لامذہب نیست | با دوست رسیدہ را دگر مطلب نیست
رہ رس رب شد تمام رب را رب نیست | ہر جا خورشید ہست آنجا شب نیست

اگلے منتروں نمبر ۲۵ تا ۳۰ میں مختلف قسم کے یگیہ پر روشنی ڈالی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مختلف قسم کے یگیہ یعنی ریاض مثلاً بعض جو فعل کے پابند ہیں دیوتاؤں کا یگیہ کرتے ہیں بعض ذات واحد کی آگ میں عمل کو عمل کی مدد سے جلاتے ہیں نمبر ۲۵ بعض قوت سامعہ وغیرہ حواس کو ضبط کی آگ میں جلاتے ہیں، بعض صوت وغیرہ محسوسات کو حواس کی آگ میں جلاتے ہیں نمبر ۲۶ بعض سب حواس کے فعلوں اور نفس کے فعلوں کو ضبط دل کی آگ میں جو علم ذات سے روشن ہے۔ جلاتے ہیں۔ نمبر ۲۷ بعض مستقل مزاج طالب، خیرات کا یگ، تزکیہ کا یگ تحصیل علوم معقولات اور منقولات کا یگ کرتے ہیں۔ نمبر ۲۸۔ بعض لوگ جو اندازہ کے موافق غذا کھاتے ہیں پرانوں کو پرانوں میں سوخت کرتے ہیں۔ نمبر ۲۹۔ بعض اشخاص جو حبس نفس کے شاغل ہیں پران اور اپان (اندر داخل ہونے والی اور باہر نکلنے والی سانس) کو روک کر پران کو اپان اور اپان کو پران میں جھونکتے ہیں۔ اوپر کے منتروں سے پتہ چلتا ہے کہ یگیہ کا اشارہ مختلف شغلوں کی طرف ہے۔

तद्विद्धि प्रणिपातेन परि प्रश्नेन सेवया
उपदेक्ष्यन्ति ते ज्ञानं ज्ञानिनस्तत्त्व दर्शिनः ३४ منتر ۳۴

(اے ارجن) سمجھ لے کہ حقیقت شناس عارف تعظیم، التجا اور خدمت کے کرنے پر تجھے وہ علم (معرفت) بتائیں گے ؎

راہ حق کی ہے اگر آتی تلاش | خاک پا بن مرد حق آگاہ کی

پانچویں باب میں انتیس[۲۹] منتر ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ کیفیتِ قلبی کی دو صورتیں ہیں، ایک کا نام سانکھیہ یعنی علمِ حقیقت دوسری یوگ یعنی علمِ معرفت یوگی تمام افعال جسمانی کو کرتے ہوئے بھی نظر بباطن رہتا ہے مگر اور طریقوں کے شاغل جب کاروبار دنیوی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں نظر باطن ہو جاتے ہیں۔ یوگی کے معنی واصل اور سنیاسی کے معنی تارک کے ہیں مشاہدہ روح کی ترکیب حسب ذیل لکھی ہے۔

स्पर्शा कृत्वा वहि वाह्यां श्चक्षुश्चे वांतरे भ्रवा ।
प्राणा पानौ समौ कृत्वा नासाभ्यंतर चारिणौ ॥ २७
यतेंद्रिय मनो बुद्धि मुनि मोर्क्ष परायण : ।
विगते च्छा भय क्रोधः यः सदा मुक्त एवसः २८

جو عارف تعلقات بیرونی کو باہر کرکے اور نظر کو اُم الدماغ کے وسط میں ٹھہرا کر اور ناک میں سے گزرنے والے انفاس بالا و پائیں کو مساوی کرکے حواس، دل اور عقل پر قادر ہو جاتا ہے آزادی حاصل کرتا ہے اور خواہش خوف اور غصہ سے مخلصی پاتا ہے وہ ہر وقت نجات رکھتا ہے یہی نصیرؔ محمودؔ کا شغل ہے۔

چھٹویں باب آتم سم یم یوگ نامی میں سینتالیس[۴۷] منتر ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ ناساگر دھیان یعنی شغل طاوسی سے انقباض قلب پیدا ہوتا ہے اور یوگ کا تعلق بیرونی افعال سے صرف اس وقت تک رہتا ہے جب تک کہ کشایش باطنی حاصل نہیں ہوتی جب شاغل قلب کی سیر دیکھنے لگتا ہے اُس وقت اُسے کل اندرونی قوتیں کام میں لانی پڑتی ہیں۔

उद्धरे दात्मनात्मानं नात्मान मवसादयेत ।
आत्मैव ह्यात्मनो बंधुरा त्मैव रिपुरात्मनः ५

انسان دل (روح) کو عروج دے نہ کہ اس کو پستی میں گرائے دل ہی اپنا دوست ہے اور دل ہی اپنا دشمن۔ ان فی الجسد مضغۃ ان صلحت صلح الجسد کلہ واذا فسدت فسد الجسد کلہ الا وھی القلب ۔

دے دل کو عروج اس کو پستی میں نہ لا	ہے دوست بڑا اس کو نہ مٹی میں ملا
گر اس کی عناں چھوٹ گئی ہاتھوں سے	دشمن نہیں اس سے بڑھکے کوئی تیرا

यथा दीपो निवात स्थो नेगंते सोपमा स्मृता
योगिनो यत चित्तस्य युञ्जतो योगमात्मनः १९

اور جیسا چراغ کی لو بند ہوا میں نہیں ہلتی یہ اس یوگ کی مثال ہے جو خیال پر قادر ہے
اور جس کا دل یوگ میں مصروف ہے۔

ساتویں باب گیان وگیان یوگ نامی میں تیس منتر ہیں۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ویدک کے ابواب میں اشغال وریاض کا جو بیان ہے اس سے اشراق حاصل ہوتا ہے۔ اور اس سے وہ پرکرتی کے ساتھ طبقوں کی سیروں میں کرتا ہے۔ قدرت نے کارن سے سوکشم اور سوکشم سے استھول ہوکر غیب سے ظہور کی طرف نزول کیا ہے اور رنگارنگ اشیا پیدا کی ہیں جیسے کہ پانی حرارت طبعی کے کم ہو جانے سے منجمد ہوکر مختلف اشکال برف، ژالہ، یخ، گلیشر وغیرہ کی شکل اختیار کرتا ہے۔

پانچ مہا بھوت (عناصر بسیط) پانچ گن (خاصیت عنصری) پانچ گیان اندری (حواس علمی) پانچ کرم اندری (قوت افعالی) پانچ پران (انفاس) انھیں جیس کا نام برہمانڈ ہے۔ یہ عالم میں بصورت کل اور ہر انسان میں بصورت جزو موجود ہیں، کل کا نام تت پدیا ایشر ہے اور جزو کا نام تم پدیا جیو ہے انھیں کے امتزاج سے کل اشکال نمود پاکر پھر کسی وقت اصلی خزانہ میں مل جاتی ہیں۔

علم جزویت کل پر حاوی نہیں ہوسکتا اور واقعات کو ظاہر نہیں کرسکتا علم کلیت بطون میں مشاہدہ کیا جاتا ہے اور وہ راست ہے۔

آٹھویں باب مہا پرش یوگ میں اٹھائیس منتر ہیں۔ اس باب میں ادنیٰ یگہ یعنی ذات بے نشان تک رسائی کا طریقہ درج ہے جو عقل کی رسائی سے پرے ہے علم اشراق کے ذریعے اس کا علم ہوتا ہے اس میں ترپٹی دھیان اور آتم دھیان کا تذکرہ ہے جس پر عمل کرکے یہ انکشاف ہوتا ہے۔

अयास याग युक्तेन चेतसा ना ऽ च गामिना ।
परमं पुरुषं दिव्यं याति पार्थानु चिंतयन ॥ ८

اے ارجن دل کو شغل کی مدد سے یکسو کرکے اعلیٰ اور حیرت انگیز ذات کا تصور کرنے سے جیلے وصال حاصل کرسکتا ہے۔

مضمون کی طوالت کو مدنظر رکھتے ہوئے بقیہ ابواب کے بیانات کا صرف خلاصہ درج کیا جاتا ہے جس سے پوری کتاب پر روشنی پڑجائیگی۔

نویں باب میں معرفت کی اس حالت کو دکھلایا گیا ہے جس کا سمجھنا حیطۂ عقل سے باہر ہے اور جس میں عارف ذات پاک کو ہر ذرہ میں محیط اور ہر شے سے بری دیکھتا ہے۔

دسویں باب میں اس کیفیت کا بیان ہے جو معرفت کے استغراق کے بعد یعنی عالم کی کثرت

میں وحدت کا جلوہ نظر آنے پر عارف کے دل میں پیدا ہوتا ہے اور جس کی مدد سے وہ اپنی ہستی کو ماضی و مستقبل میں موجود اور عالم کے ظہور کا باعث جانتا ہے۔

گیارھویں باب میں وصال کی جلالی اور جمالی ، دونوں صورتیں جو علم معرفت کے حاصل ہونے پر دریافت ہوتی ہیں اجیرن کو عین الیقین کرادی گئیں اور اس نے ان میں سے جمالی پسند کی۔

بارھویں باب میں جمالی وصال کے قائم رکھنے کے لئے عشق حقیقی کا ہونا لازمی بتایا گیا ہے۔

تیرھویں باب میں عشق حقیقی کی شناخت کے واسطے جسم اور جان کی تشریح کی گئی ہے، اور جان کے ساتھ عشق کا ہونا حقیقی اور جسم سے عشق ہونا مجازی بتایا گیا ہے۔

چودھویں باب میں جان کا صفات سہ گانہ کے ساتھ تعلق ظاہر کیا گیا ہے اور باوجود تعلق اس کا ان صفات سے بری ہونا دکھلایا گیا ہے

پندرھویں باب میں صفات سہ گانہ کے وسیلے سے جان کے جسم میں نزول کرنے اور عالم کے ظہور کی کیفیت بیان کی گئی ہے ۔ اور ذات پاک کا جسم اور جان سے برتر ہونا اور اس میں وصل ہونے والے کا فعل وعمل کی تمیز سے آزادی پانا ثابت کیا گیا ہے۔

سولھویں باب میں امرونہی دو قسمیں جو جان کے جسم میں نزول کرنے سے پیدا ہوتی ہیں بیان کی گئی ہیں ۔ سترھویں باب میں عقیدوں کی وہ تین قسمیں دکھائی گئی ہیں جن کی پیدائش جان کے جسم میں نزول کرنے پر صفات سہ گانہ سے ہوتی ہے

اٹھارھویں باب میں ذات پاک کا وصال حاصل کرنے والے کی حالت جو بالمعنی نجات ہے ظاہر کی گئی ہے۔

سحر حال

غم عشق بو الہوس را نرسد

دل پروانہ ہمہ کس را نرسد

سحر حال

پریم نہ پائے لوبھ کی آنکھی
پتن پتنگ کی پائے نہ ماکھی
سر دے اپنا جیون وارو
تب پربھو چرنوں میں راکھی

مترجمہ
سید مقبول حسین
(بی اے ایل ایل بی)
احمد پوری

بھلا برا سب بس میں اُس کے
کھلا چھپا سب ہی دکھا دے
ہو جو نہ باور دیکھ لے مجھ کو
بس نہ چلے شیطان کے آگے

جذباتِ فراق

از پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق ایم۔ اے

یہ اور بات ہے وہ نہ ہوں شادماں کبھی ۔ ہوتا ہے بیدلوں سے کوئی بدگماں کبھی

گو عشق کو ملا نہ کوئی ہمزباں کبھی ۔ ہوتی تھی اور نہ ختم ہوئی داستاں کبھی

تھے محوِ نالۂ جرسِ کارواں کبھی ۔ بڑھ بھی گئی ہے حسرتِ پس ماندگاں کبھی

وہ نغمہ چھیڑ مطربِ آتش بجاں کبھی ۔ کوندی تھیں جس سے طور پہ کچھ بجلیاں کبھی

بستی کبھی، اُجاڑ کبھی، لامکاں کبھی ۔ ٹھہری نہ ایک جا مری عمرِ رواں کبھی

ایامِ خوش گوارِ محبت بھی کاٹ لے ۔ مشکل بھی ہو رہیں گی یہ آسانیاں کبھی

یہ تا بہ کے حجابِ تغافل، ستم بھی کر ۔ اپنا بھی کر خدا کے لئے امتحاں کبھی

نقشِ قدم ہیں اب نہ کہیں گردِ کارواں ۔ منزل کو ہو سکا ہے غمِ رفتگاں کبھی

اب عشقِ بے خبر کو کسی کی خبر نہیں ۔ دل تھا حریفِ گردشِ ہفت آسماں کبھی

کیا کیجئے جو کارِ محبت محال ہو ۔ اب تک تو کوششیں نہ ہوئیں رائگاں کبھی

مانوس ہو چکا نگہِ آشنا سے بھی ۔ کم ہو سکیں نہ عشق کی حیرانیاں کبھی

غم کی جھلک ہو یا وہ فریبِ نشاط ہو ۔ تھا حسن و عشق کے بھی کوئی درمیاں کبھی

ان کے سکوتِ یاس کو اب مدتیں ہوئیں ۔ رکھتے تھے اہلِ درد بھی منہ میں زباں کبھی

سب کچھ بھی کھو کے حسن کو پانا محال ہے ۔ سستی ہوئی نہ ہوگی یہ جنسِ گراں کبھی

کچھ حیرتیں تھیں عشق تو کچھ حیرتیں تھیں حسن ۔ یوں تو نہ راز تھا نہ کوئی رازداں کبھی

منصور پرتوِ غمِ بے سودِ عشق ہے ۔ لائے گی رنگ یہ خلشِ رائگاں کبھی

صبحِ ازل سے حسن کا مسکن دلوں میں ہے ۔ آباد ہو سکیں نہ یہ ویرانیاں کبھی

برہم بساطِ خلوتِ دل کر گیا کوئی ۔ تھیں رشکِ انجمن بھی یہ تنہائیاں کبھی

وہ ماجرائے عشق بھی خوابِ خیال ہے ۔ تیری نگاہ سے جو ہوا تھا بیاں کبھی

کوئی ترے فریبِ تبسم سے بچ سکا ۔ تھا عشق بھی ملول کبھی شادماں کبھی

سازِ سکوت ساز نوا ہائے راز تھے
تھیں حسن و عشق میں یہ ہم آہنگیاں کبھی

سر بھی انھیں بلا درو دیوار بھی ملے
کم ہو سکی نہ وحشتِ زندانیاں کبھی

خاموشیاں جہان کی کچھ اور بڑھ گئیں
آئی صدائے درد اگر ناگہاں کبھی

منزل فریبِ کاوشِ پنہاں کا نام ہے
اپنی جگہ سے بڑھ نہ سکے کارواں کبھی

آوازِ صور دیکھ ابد کا سکوت دیکھ
ٹوٹا نہ اہلِ عشق کا خوابِ گراں کبھی

پرچھائیاں ہیں دار و رسن کی بھی عشق پر
مٹ کر بھی مٹ سکا ہے کسی کا نشاں کبھی

بیگانگیِ حسن بھی اِک رنگ پر نہیں
ناواقفِ ملال کبھی، رازداں کبھی

بادِ صبا نے دل کا کنول بھی بجھا دیا
کچھ اور بات تھی کہ کھلے گلستاں کبھی

کیا کیجئے فراق کسی پہ اگر کوئی
نامہرباں کی طرح ہوا مہرباں کبھی

کلامِ سحرؔ

(از حضرت سحرؔ عشق آبادی)

رہینِ جلوۂ تغیرِ امتیاز ہوں میں
کبھی ہوں ناز سراپا کبھی نیاز ہوں میں

عیاں ہے مجھ پہ تعلق سے کُل نظام کا حال
جو ایک راز ہے دنیا تو ایک راز ہوں میں

مراد بندگیِ حق ہے، یہ نہیں معلوم
کہ بُت پرست ہوں یا بندۂ نماز ہوں میں

کسی میں بھی تو نہیں کوئی اپنی اصلیت
نشیب کی ہے خبر، واقفِ فراز ہوں میں

ہے یہ بھی کوئی کرشمہ مری حقیقت کا
فریب خوردۂ نیرنگیٔ مجاز ہوں میں

مری سنبھال میں ہے مرگ و زیست و مدہوشی
کہ محوِ شعبدۂ چشمِ نیم باز ہوں میں

فراق میں ہے عجب وصل کا لطیف احساس
ترا سپاس گزارِ شبِ دراز ہوں میں

نجانے ہو کہ نہ ہو عشق میں حصولِ کمال
ابھی تو وقفِ اداہائے سوز و ساز ہوں میں

مرے وجود سے ہے کائنات کی تکمیل
جو کچھ ہوں سحرؔ اخود اپنا مگر جواز ہوں میں

لہ ۲۱ ۔ فروری ۱۹۳۸ء کو دہلی میں برق مرحوم کی یاد میں ایک مشاعرہ ہوا تھا چنانچہ یہ غزل اسی تقریب میں لکھی گئی تھی۔

منشی پریم چند کی شخصیت

از ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ

کسی کام سے کانپور سے لکھنؤ جانا ہوا۔ سوچا چلو، پریم چند کے درشن بھی کر لوں۔ مادھری کے دفتر کی طرف روانہ ہوا۔ دفتر کے قریب پہونچا ہی تھا کہ ایک کھدّر دھاری صاحب ننگے سر مجھ سے کچھ آگے سڑک پر جاتے ہوئے دکھائی دیئے۔ چار بج چکے تھے۔ خیال آیا کہیں یہی پریم چند نہ ہوں۔ حالانکہ میں نے اُن کی تصویر بھی نہ دیکھی تھی۔ لپک کر اُن کو جا لیا اور پوچھا "مادھری کا دفتر کہاں ہے؟ میں ایڈیٹر مادھری منشی پریم چند سے ملنا چاہتا ہوں۔"

جواب ملا "میں ہی پریم چند ہوں، اور آپ؟"

کہہ نہیں سکتا کہ وہ میرے نام سے پہلے واقف تھے یا نہیں، مگر بڑے تپاک سے ملے۔ جیسے مجھے اُن کے برسوں سے تعلقات ہیں۔ اپنے دفتر میں لے گئے۔ مگر سڑک سے دفتر جاتے تک جبکہ ہم بڑے آہستہ آہستہ قدم اُٹھا رہے تھے ہم دونوں ایک دوسرے سے کچھ اس طرح کھل گئے اور تعلقات اتنے گہرے ہو گئے کہ سیڑھیوں پر پریم چند بولے "بھئی تمھاری زندگی بڑے مزے سے گذر رہی ہے اور دلچسپ واقعات سے لبریز ہے۔ میں تم پر ایک کہانی لکھوں گا" میں نے عرض کیا تو بندہ بھی آپ کو اپنے کسی افسانہ کا ہیرو بنائے گا۔ انھوں نے وعدہ پورا نہ کیا اور منزل پر پہونچ گئے۔ میں ابھی خستہ جانی سے پابراہ ہوں، اور ایفائے وعدہ کا ابھی تک میرے دل میں خیال ہے۔ وفا ہو یا نہ ہو، یہ مالک کل کی مرضی پر منحصر ہے۔ اگر مرحوم مجھے اپنی کسی کہانی میں دھر گھسیٹتے تو میرے لئے نہایت مفید ثابت ہوتا۔ اور مجھ پر اپنی نامعلوم گہرائیاں آئینہ ہو جاتیں اور میں "خود شناس" ہو جاتا۔ دوسرے کے دل کی تھاہ لینا اور اپنا حال بے کم و کاست سامنے رکھ دینا۔ وہ بھی دس بیس منٹ میں۔ یہ پریم چند جی حصہ تھا۔ میں نے اس خیال کو ایک جگہ یوں باندھا ہے ؎

احساس کو بناتا ہوں اپنے عمیق تر — دیتا ہوں طول، زندگی مختصر کو میں

پریم چند نے اور میں نے اپنے احساسات کو پہلی ملاقات کے چند لمحوں میں اس قدر عمیق بنا لیا کہ

یہ مختصر لمحات ایک عمر کے مساوی ہو گئے۔

(۲)

صبح ہم دونوں اوپر کی منزل کے برآمدے میں کھڑے تھے۔ میں نے کہا "اس احاطہ[1] میں اور کون کون رہتے ہیں؟" انھوں نے نارائن سوامی کا نام لیا۔ "ہیں نارائن سوامی؟ میں تو ابھی اسی وقت ان کی قدم بوسی کو جاؤں گا۔" فرمایا: "کیا جلدی ہے؟ چلے جانا۔ ان سے کیا پہلے کی جان پہچان ہے؟" میں نے عرض کیا "نہیں۔ زندہ جاوید سوامی رام تیرتھ کے فیض صحبت سے برسوں تک مستفید ہونیوالے، ان کے امرت بچن کا پالن کرنیوالی ہستی کے درشن گویا خود سوامی جی کا ست سنگ ہے۔" بات آئی گئی ہوئی۔ وہیں کھڑے کھڑے ادھر سے کچھ شور اٹھا۔ پریم چند نے کہا "ذرا کان دھر کے سنو۔ کوئی صاحب بلند آواز میں جھاڑ جھنکار بتا رہے تھے، اور گالی گلوچ کی بوچھاڑ ہو رہی تھی۔

پھر پوچھا "جانتے ہو یہ کون ہیں؟ یہی آپ کے نارائن سوامی ہیں۔ ان کے غصہ کی انتہا نہیں اور گالیاں تو جس منہ سے ملازموں کو دیتے ہیں کیا کہنا۔"

فرشتہ خصلت پریم چند کا نقطۂ نظر بجا تھا۔ جس شخص کو غم و غصہ پر قابو نہیں اور جو علی الصباح رام نام سمرن کے بجائے غلیظ گالیوں کا مالا جپتا ہے وہ اپنی زندگی کیا سنواریگا اور دوسروں کی روحانیت افروزی کا کیا باعث ہوگا؟ مجھے بار بار یہ خیال آیا۔ آخر میں نے اپنے دل سمجھانے کے لئے اسے نظم کیا ؎

عمر عزیز اپنی غم و غصہ میں نہ کھو کچھ اور کام بھی ہیں غم و غصہ کے سوا

(۳)

پریم چند اور میں بازار جا رہے تھے۔ دوپہر ہو چکی تھی، راہ میں غالباً چتر سین شاستری نے پریم چند نے بتایا کہ میرے خلاف آجکل ایک برہمن پارٹی زہر اگل رہی ہے۔ تفصیل میں نہ وہ اور نہ میں نے ہی تفصیل دریافت کی۔ انھوں نے اپنے ادیبانہ اور شریفانہ انداز میں خامہ فرسائی سے ایک آدھ مخالف کو تادیب کی اور بس۔ میں شروع ہی سے پریم چند کو اپنا ماں جایا بھائی سمجھتا تھا اور یوں بھی میری ہمدردی ہمیشہ زیردست[2] کے ساتھ رہی ہے۔ میرے دل میں پریم چند کی حمایت کا خیال جم گیا۔ انھیں دنوں میں جوشی بھائیوں سے ایک نے پریم چند پر جارحانہ اقدام

[1] اس احاطہ میں کئی مکانات تھے جنمیں سے ایک میں پریم چند جی اور ایک میں قریب ہی سوامی رام تیرتھ [illegible]

[2] UNDERDOG.

رذیل سی تنقیص لکھی۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے بشمبھر ناتھ کوشک اور بالکشن نوین سے مشورہ کرکے میں نے ایک کہانی "چھیلن" کے نام سے لکھی اور میرے اصرار پر گنیش شنکر جی نے اپنے توصیفی نوٹ کے ساتھ اسے اخبار پرتاپ میں شائع کیا۔ یہ کہانی مخالفوں پر ایک خاصی موثر چوٹ ثابت ہوئی۔ اس کی کامیابی کا ایک ثبوت تو میری نظر سے بھی گذرا یعنی اس کو معمولی تغیر کیا تھا کسی صاحب نے اپنے نام سے شائع کرایا۔ مگر نقل را چہ عقل۔ میری کہانی دراصل جوشی صاحب کی ایک کہانی کا Caricature تھی۔ پریم چند کی توجہ اس طرف مبذول کی گئی۔ مگر وہ اپنے خطوط میں اسکے متعلق خاموش رہے۔ میں بھی اب یہ محسوس کرتا ہوں کہ اکثر موقعوں پر دشمن کے حملوں کا جواب خاموشی ہوتا ہے جیسا کہ انجیل میں آیا ہے "انتقام خدا کے لئے ہے بندے کیلئے نہیں"[1]

دشمن کے حملے کا نہ دیا ہم نے کچھ جواب — دشمن کو اس کی نظروں میں آخر زبوں کیا
تیری مدافعت کی تو تھی تاب اے حریف — اپنے خدا سے ڈر کے میں غصے کو پی گیا

یہی نہیں کہ ایک مومن کے دشمنوں سے خدا خود نبٹ لیتا ہے۔ اس مومن کیلئے جو یہ کہہ کر سے

ہے پاس ہی تو منصف کامل کی عدالت — تجھکو ترے شر کو میں سمجھتا ہوں گر ہیچ

دشمن کو اس کی قسمت اور اس کے خدا کے حوالے کرتا ہے۔ اکثر تائید غیبی اس کے سر سے دفع ضرر اور رد بلا کرتی ہے۔ غیب سے ایسے ایسے سامان پیدا ہوجاتے ہیں اور ایسے ایسے دوست نمودار ہوجاتے ہیں کہ ایماندار دوست خواب میں بھی اُن کی توقع نہیں رکھتا۔ ادب اور ادیبوں کے متعلق بھی ایسا ہوسکتا ہے۔ اس کا ثبوت مجھے پہلی مرتبہ پریم چند ہی کے حلقۂ احباب سے ملا۔ بنارسی داس چترویدی کو پریم چند سے کچھ عشق ہوگیا تھا۔ پریم چند نہ صرف ایک ہندی ادیب کی حیثیت سے اُنکے معیار پر پورے اُترے تھے بلکہ ایک شریف، خدا دوست، غریب پرور انسان اور گاندھی جی کے سچے پیرو ہونے کی حیثیت سے بھی پریم چند، چترویدی کے دل پر چھائے ہوئے تھے۔ پھر دونوں "دیہاتی" سادگی پسند، ہٹیلے، نفس کش اور ریاضت پرور تھے۔ کلکتہ میں جب میں چترویدی جی سے ملا تو مجھے احساس ہوا کہ یہ شخص پریم چند کو کسی دن اس بین الاقوامی شہرت کے تخت پر پہونچا کے چھوڑے گا جس کے پریم چند مستحق ہیں۔ جو بات ٹیگور کے لئے اینڈریوز نے کی ہے وہی چترویدی جی پریم چند کیلئے کرنا چاہتے تھے۔ چترویدی جی دُھن کے پکے، قول کے پابند، عمل کے مرتاض اور پروپیگنڈا کے لطیف

[1] کانپور کا مشہور و معروف ہندی اخبار "پرتاپ"

لطیف ماہر فن ہیں۔ اُردو والوں نے پریم چند کے کمال سے علانیہ اغماض کیا اور تعریف بھی کی تو تنقیص اور تذلیل کا پہلو لئے ہوئے۔ ہندی والوں نے پریم چند سے درپردہ دشمنی کی اور ادبی تنقید کے پردہ میں اُن پر سخت چوٹیں کیں۔ مگر چترویدی جی وہ شخص ہیں جنھوں نے اپنے صدق و وفا سے پریم چند کو دُنیا بھر کی بے وفائی سے بے پروا کر دیا۔ تفصیل تو مجھے معلوم نہیں مگر میرا دل گواہی دیتا ہے کہ چترویدی جی کی تحریک و کوشش سے پریم چند کی کہانیاں دوسرے ملکوں کی زبانوں میں منتقل ہوئیں۔ اور ٹیگور سے پریم چند کا تعارف کرانے میں بھی انھیں کا ہاتھ تھا۔ انھیں کی تحریک سے پریم چند پروگریسو ادیبوں کے حلقہ میں شامل ہوئے۔ حتیٰ کہ وہ باتیں جن کی عدم موجودگی پریم چند کی تصنیف میں بیان گنایا کرتا تھا۔ خصوصاً Psychological Analysis اور محبت پرست عورت اور امیر طبقہ کے اصلی جذبات' ان کا پریم چند میں ہونا انھیں نے ثابت کیا۔

داغِ دل

از مسٹر ڈی۔ پی۔ بھٹناگر گشتہؔ

سرِ تُربت چراغ جلتا ہے
مرنے والے کا داغ جلتا ہے

بے کسی کا چراغ جلتا ہے
یا مرے دل کا داغ جلتا ہے

کیا مجھے حاجتِ چراغِ مزار
دل میں اُلفت کا داغ جلتا ہے

نہیں بجھتی کبھی لگی دل کی
عمر بھر اس کا داغ جلتا ہے

چشم تو روشن و دلِ ماشادؔ
خوب اُلفت کا داغ جلتا ہے

اُف رے نیرنگیاں محبت کی
دل کے بجھنے سے داغ جلتا ہے

دل کی یہ شکل ہی نہیں رہتی
دل میں جب کوئی داغ جلتا ہے

اس کی سوزش پہ ناز ہے مجھکو
داغ سا دل میں داغ جلتا ہے

سوزِ فرقت میں ہے خموشی شرط
شمع ساں اس کا داغ جلتا ہے

سوزِ پنہاں نہیں عیاں پھر بھی
یونتو جلنے کو داغ جلتا ہے

آگ بجھ بجھ کے یہ بھڑکتی ہے
داغ دے دیکے داغ جلتا ہے

اس کی عظمت کلیم سے پوچھو
جس کے سینے میں داغ جلتا ہے

دلِ گشتہ کی ہے عجب حالت
ایسا کس دل میں داغ جلتا ہے

میرا مسلک

(از حضرت نسیم گجراتی سابق ایڈیٹر احمیر لاہور)

ہم نشیں سچ ہے تڑپ دل کی نہیں اشعار میں
میرے سینے میں نہیں جذبات الفت کے شرر

سن نہیں سکتا مرا دل چاند کے بربط کے گیت
سینۂ گل میں نہیں ملتے مجھے نغمے و گہر

پی نہیں سکتا میں راتوں کو ستاروں کی شراب
دل میں کیوں غلطیدۂ انوار ہو موجِ نظر

مرغزاروں کا تبسم مجھکو تڑپاتا نہیں
آبشاروں کے ترنم کا نہیں مجھ پر اثر

گلستاں کے سینے پر ملتا نہیں مجھکو سکوں
کہکشاں کی گود سے میں چن نہیں سکتا شرر

زہرہ و ناہید کے نغموں سے ہے امن بچی
یعنی اس دل پر نہیں ہے اندھے کیوپڈ کی نظر

میں نے دیکھی ہی نہیں ان آنکھوں سے شام فراق
کیف زا میرے لئے ہو خاک نغموں کی سحر

مجھکو رکھتا ہی نہیں درد و تمنا مضطرب
میں سمجھتا ہی نہیں مفہوم اس شئے کا مگر

نکہتِ گیسو کے طوفاں سے نہیں وحشت مجھے
خرمنِ دل کو جلا سکتی نہیں برقِ نظر

گردشِ دوراں کی نیرنگی سے میں واقف نہیں
چرخ کی کروٹ ہو یا بے ربطیِ شام و سحر

میرا مسلک میرا آئیں حسن کو سجدے نہیں
خال و خط رخسار و گیسو کا نہیں مجھ پر اثر

اک جہانِ تازہ کی رخشندگی نظروں میں ہے
میں نے پایا ہے جسے اپنے ہی دل میں ڈوبکر

شعلۂ فطرت شاعروں کے اُف وہ ذہنِ تابناک
جس میں ہنستے ہیں ستارے مسکراتے ہیں قمر

کتنا بے پرواہ ہے ان کا عشقِ وارفتہ مزاج
طعنہ زن ہے جو ہجومِ گنبدِ افلاک پر

نازنیں سینوں پہ وہ زلفِ معطر کے ہجوم
ظلمتیں بھی ان کی ہیں غلطیدۂ نورِ قمر

کھینچ لاتا ہے جو حسن و ناز کو آغوش میں
میری قسمت میں نہیں وہ جذب قصہ مختصر

ہاں مگر اک چیز ہے ایسی مرے انداز میں
جس کو سن کر پھٹ گئے ہیں دشت زاروں کے جگر

چھوٹ جاتی ہے مرے ہاتھوں میں نبضیں بحر کی
تیر جاتی ہے دلِ خورشید میں میری نظر

میں شہیدانِ وطن کے گیت گاتا ہوں ندیم!
اور ایسے کہ الجھتے ہیں فرشتوں کے بھی پر

انقلابی رو تڑپتی ہے مری تخئیل میں
میں سکھاتا ہوں غلاموں کو غلامی سے حذر

کھیلتا ہے خون و آتش سے مرا رنگ سخن　　بجلیوں میں پرورش پاتا ہے ذوق شعلہ گر
ان کی نظروں میں مسلّم گو نہیں ہستی مری　　لیکن اتنا سُن رکھیں یہ شاعرانِ نکتہ ور
آندھیاں، طوفان، شعلے، جنگ و محشر، زلزلے
گیت یہ گائے ہیں میں نے زندگی کے ساز پر

جذباتِ شاد

(از حضرت شاد عارفی - رامپور)

کسی کو دیکھ کے میرا یہ حال ہوتا ہے　　سنبھل سنبھل کے سنبھلنا محال ہوتا ہے
وہ میرے دل میں بہ شکلِ خیال ہوتا ہے　　اور اس طرح کہ بھلانا محال ہوتا ہے
ہر ایک چیز پہ اُس کا خیال ہوتا ہے　　جنوں یہیں تو "بوجہِ الکمال" ہوتا ہے
ہم اُن کی راہ میں بیٹھے ہوئے ہیں آس لگائے　　خیال یہ کہ انھیں اب خیال ہوتا ہے
ہزار دل ہوں تو رفتارِ مست پر صدقے　　زمیں پہ چلتے ہو، دل پائمال ہوتا ہے
قصوروار نہیں حال پوچھنے والے　　ہمارے حال سے پیدا سوال ہوتا ہے
نشاطِ رفتہ کے اِن تذکروں سے کیا حاصل　　کہیں زمانۂ ماضی بھی حال ہوتا ہے
نہ رہگذر میں تکلّم نہ بام پر جلوہ　　وہ مجھکو بھول گئے، یہ خیال ہوتا ہے
شریکِ دردِ محبت ہے طبعِ موزوں شاد
ہر ایک شعر مرا حسب حال ہوتا ہے

عورتوں کی مضمون نگاری

از مسز شفیع احمد قدوائی صاحبہ

کہتے ہیں ایک تم ظریف کسان جہاں جاتا اپنے گدھے کو ساتھ لے جاتا اور اُسے شیر کی کھال پہنا کر دوسروں کے کھیت روندنے کے لئے آزاد چھوڑ دیتا۔ دیہات کے سیدھے سادے لوگ اُسے شیر سمجھ کر اُس کے پاس پھٹکنے کی بھی ہمت نہ کرتے۔ مدتوں مسٹر گدھے دوسروں کے خون پسینہ کی کمائی سے اپنا پیٹ پالتے رہے۔ آخر ایک دن جب وہ حسب عادت چر چگ رہے تھے تو بھرے پیٹ پر اپج کی سوجھی۔ طبیعت نہ مانی اور بلا ارادہ اُنھوں نے اپنا گیت گانا شروع کر دیا۔ پھر کیا تھا اصلیت کا پتہ لگتے ہی گنواروں نے جی بھر کر خاطر تواضع کی۔ اِس کہانی کو تھوڑی سی مشابہت عورتوں کی جرنلزم سے بھی ہے۔ کیونکہ مدتوں تک ہماری جرنلزم کا گدھا شیر کی کھال پہنے ادب' تاریخ' سیاست سب کے کھیتوں کو روندتا رہا اور آخرکار مُلک پر انقلاب کا رنگ چڑھتے ہی ڈھول کا پول کھُل گیا۔ آج خود ہم کو بھی پتہ لگ گیا ہے کہ ہم کتنے پانی میں ہیں ویسے لکھنے پڑھنے کا شوق تو بہت دنوں سے پیدا ہو گیا تھا اور جب سے یہ اکّا دکّا رسالے عورتوں کے نام سے چھپنے لگے تب سے اور بھی جی میں اُمنگ پیدا ہوئی کہ لاؤ اپنا مرت بھیدبھی سُنائیں۔ میں جانتی ہوں وہ شاید شروع ہی کے دن تھے، جب اکبر الہ آبادی نے جل کر کہا تھا ؂

شوق تحریر مضامین میں کھُلی جاتی ہیں   بیٹھکر پردہ میں بے پردہ ہوئی جاتی ہیں

عورتیں بیچاریاں ذرا اسی بہانے پڑھے لکھے لوگوں میں شامل ہو جایا کرتی تھیں۔ ادب اور تاریخ سے انجان رہ کر مصنف لوگوں کی فہرست میں چھپ جانے کے لئے چڑے چڑیا کی کہانی کافی ہو جایا کرتی تھی، لیکن خدا مردوں کا بھلا کرے، اسمیں بھی وہ آن کودے۔ کبھی میاں بیوی کا برقعہ اوڑھ کر، کبھی بھائی بہن کے نام سے اور اکثر یہ کالج کے لڑکے اپنے کو عورتوں کی نظر میں جچانے کے لئے بڑے مضمون نگار بن بیٹھے۔ ایڈیٹر ایک دو کو چھوڑ سارے کے سارے مرد تھے، وہ اپنا من مانا لکھواتے اور چھپواتے۔ ہر رسالہ کے سرورق پر عورتوں اور بچوں کے لئے لکھا ہوتا تھا۔ کیونکہ ان عقلمند لوگوں کے نزدیک سمجھ بوجھ میں عورت اور بچہ برابر تھا۔ بیچاری عورتوں کو سکھایا بھی یہی جاتا تھا کہ قصہ لکھو یا نظم، سب کو بیٹ پاٹ کر راہِ نجات؟ یا

"بہشتی زیور" بنا دو۔ اکیلے گھر والے یہ دھونس جماتے تو خیر کوئی بات نہ تھی۔ اخبار رسالے والے بھی جان مارے رہتے تھے کہ جو لکھو "راہِ نجات" کے ڈھرے پر۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر چودہ برس کی لڑکی بوا بن کر رہ گئی۔ بڑی بوڑھیوں کی طرح نصیحت کرنے کا ایسا شوق بڑھا کہ پڑھ کر دیکھ کر اس بات کا پتہ ہی نہ لگتا تھا کہ ہمارے آپ کے سامنے منی چھوکری بول رہی ہے یا خاندان بھر کی نانی دادی۔ بابا آدم کے وقت کی باتیں کرنے کا کچھ ایسا چسکا پڑ گیا تھا کہ قلم ہاتھ میں لیا اور ساری ماؤں بہنوں کو جنت کا سیدھا راستہ بتا دیا۔ خیر اللہ کا شکر ہے، تھوڑے ہی دن بیتے تھے کہ ملک کا رنگ بدل گیا۔ عورتوں کی جرنلزم بھی آسمان سے اتر کر زمین پر آئی۔ اس دور میں وعظ بیان کرنے کا شوق تو کم ہو گیا۔ لیکن نہ پڑھائی پوری تھی نہ فیشن۔ اس لئے سب آدھا تیتر آدھا بٹیر ہو کر رہ گیا۔ افسانے بھی لکھے گئے، نظمیں بھی ہوئیں اور غزل بھی۔ تاریخ سیاست خانہ داری، دلچسپی تو سب چیزوں سے پیدا ہو گئی۔ لیکن افسانہ لکھا تو ڈپٹی نذیر احمد اور مولانا راشد الخیری کی نقل کی۔ مضمون میں سید ممتاز علی یا حسن نظامی کا خاکہ اڑایا، اور غزل گائی تو داغ یا امیر مینائی کی دھن میں۔ سیاست سے دلچسپی صرف جلسوں میں رائے زنی کرنے یا تقریر کرنیوالوں کی تعریف تک محدود رہی۔

فیشن کا اثر افسانہ پر بہت پڑا۔ کبھی بی جرنا ڈرائنگ روم میں پیازی ساری باندھے بیٹھی نظر آئیں اور چڑے صاحب باتھ روم سے سوٹ ہاتھ میں لئے برآمد ہوئے۔ ادب تمیز کے ساتھ اپنی ڈارلنگ سے بھونڈی بھونڈی دو چار باتیں کیں اور موٹر پر سوار ہو دونوں ہوا خوری کو نکل گئے۔ دُکھ بھری کہانیوں کی حد نہ رہی۔ جہاں دیکھو کسی نہ کسی عقل کے اندھے، گانٹھ کے پورے شوہر پر بیوی صدقہ قربان ہو رہی ہے، کبھی اُس کے قدموں پر آقا اور مالک کہتی ہوئی لوٹتی نظر آئی۔ میاں سے لے کر ساس سسر تک کی جوتیاں کھا کر گھر سے نکل گئی اور قبر میں منہ چھپا کر سو رہی، یہ ہوئے افسانے۔ انہیں اکثر کوئی دل جلی ہارمونیم پر گاتی نظر آئی اور انگریز عورتوں نے تحسین ناشناس سے ہندوستانی گانوں کی عزت بڑھائی۔

شعر اور افسانہ دونوں کو عورتوں نے جی بھر کر رگڑا۔ آپا کی شان میں قصیدے لکھے گئے، ننھی ٹیا اور منے بھیا کے لئے جھولا تیار ہوا۔ اطاعت اور عصمت کا راگ الاپا گیا۔ کبھی بہنوں سے خطاب ہوا سے

بہنوں پیاری تمھیں اللہ جلائے، تھوڑا!	کبھی بہکائے نہ شیطان ستائے تھوڑا!
ساتھ شوہر کے رہو بن کے بیاہی ٹانگن	نکلو باہر تو ذرا آنکھ جھکائے، تھوڑا
بیوی اچھی ہے وہی ہاتھ ہوں جس کے اگن	پیر پھیلے ہوں مگر بین بجائے تھوڑا

کبھی عشق پر غزل لکھی سے

نیلگوں ہے فلک جام میں فردوسِ خیالی	گردش مے ہے بساط فلک انجم فروز

صانع حسنِ ازل جذب محبت ہو گیا　　قدرتِ محبوب حق آغوش داماں ہوا

غرض یہ ساری چیزیں بلا ردیف اور قافیہ معنی اور مطلب کے نظم کر ڈالیں۔ کبھی گھریلو زندگی کی برائیاں کیں تو کبھی اپنی بے بسی کا رونا رویا۔ بزموں اور محفلوں کے بہانے دنیا پہ ثابت کر دیا کہ ؎

سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

کسی کے پیارے مولوی صاحب کا کولہا اتر گیا اور دوا علاج کا بوجھ یا جڑی بوٹیوں کی پہچان بزن ادبی مذاق رکھنے والی بہنوں کے سپرد کی گئی۔ کسی بہن نے اپنے بہرے پن اور میاں کے خبط کی دوا لقمانی صفت بہنوں سے پوچھ ڈالی۔ درزی سے لیکر لوہار اور سنار تک کی دکانوں کا پتہ پوچھا۔ بھابھی بھتیجی کی شادی یا بہن بہنوئی کے نتیجہ حماقت کے لئے تاریخی نام اور قطعوں کی فرمائش کر دی۔ غرض اُن دنوں عورتوں کی جرنلزم ایک ایسا اونٹ تھی جس کی کوئی کل سیدھی نہ تھی اور سب پر طرّہ وہ تعالیٰ والا کوبڑ تھا۔ اعتراض کرنے کو تو سب ہی کرتے ہیں اور میں بھی کہتی ہوں لیکن انصاف سے دیکھئے تو آخر پھر کیا لکھتیں اُنہوں نے دیکھا کیا تھا۔ اونچی اونچی دیواروں والا جیل نما مکان۔ گاؤ تکیہ سے لگ کر چھالیہ کترنے والی سست عورتیں اور بدتمیز لڑاکو نوکر۔ یہ تھا اُن کا تجربہ اور اُن کا ماحول۔ کہتے ہیں افسانہ زندگی کی سچائیاں دکھاتا ہے اور شاعری دماغی خیالات کی جھلکتی آنکھ ہے۔ جو کچھ ہو اسمیں تو کوئی شک نہیں لیکن یہاں تو عورتوں کے رسالہ خالی پیٹ پیٹ رہے تھے۔ آخر اُن کو بھرنا بھی تھا اب اس کے لئے عاشق ہونے کون جاتا اور دُنیا دیکھنے کی کسے اجازت ملتی۔ اٹکل پچو جو جی میں آیا لکھ مارا۔ جب سے پڑھی لکھی عورتوں کی تعداد بڑھنے لگی ہے تھوڑی بہت جرنلزم بھی اونچی ہو رہی ہے۔ دو چار سچ مچ کی شاعرہ اور چند اچھے بھلے قصے لکھنے والیاں بھی پیدا ہو گئی ہیں۔ ذرا بیچ میں اردو کچھ من اُتری ہو گئی تھی انگریزی کا بڑا زور تھا۔ سو اب تو اس کا غرور ڈھے گیا ہے۔ اب تو رسالوں میں گاندھی جی کی سیاست اور ٹیگور کا فلسفہ بھی نظر آتا ہے۔ وہ فلسفہ جسے "اپنا لکھا وہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے" کہنا چاہئے۔ ایک زمانہ تھا جب قومی لیڈر بننے کا گر تعلیم نسواں اور ہندوستانیوں کے حق حقوق پر لڑنے جھگڑنے تک محدود تھا لیکن اب تو ایسا زمانہ بدلا ہے جن کے جاہل عورت کے خیال سے رونگٹے کھڑے ہوتے تھے تعلیم یافتہ لڑکیوں کو دیکھ کر منہ بناتے، فیشن ایبل بیویوں میں کیڑے ڈالتے اور سیاستداں بیوی پر آوازے کستے ہیں۔ اللہ جانے یہ کیوں کایا پلٹ ہو گئی ہے۔ خیر یہ تو بات میں بات نکل آئی۔ ہاں تو ہوا یہ کہ عورت آگے تو بڑھی، تقریریں کرتی، مضمون لکھتی اور افسانوں کے پلاٹ سوچتی ہوئی، لیکن سوجھ بوجھ، اینچ پینچ، پن کو دھکے دیتی ہوئی یہاں تک آئی۔ سیکھنے سمجھنے کی ضرورت تو سب کو ہوتی ہے مگر یہاں کون ایسا بیٹھا تھا جو

جو ٹھنڈے دل سے سوچتا کہ لڑکیوں کو الگ بٹھکر سکھاؤ پڑھاؤ، اور بڑی عورتیں جلا بھُکر خوش گپیاں اڑائیں۔ یہاں تو جدھر دیکھو۔ وہی اصلاح والا ڈھونگ رچا ہوا ہے حالانکہ اصلاحی شاعری، اصلاحی افسانوں اور اصلاحی مضامین وہ نچوڑی ہوئی ہڈیاں ہیں جنھیں برسوں گذرے مردوں نے اپنے دسترخوان سے جھاڑ کر پھینک دیا ہے۔ کیا غضب ہے کہ آج تک عورتیں اُن پر ندیدوں کی طرح ٹوٹی پڑتی ہیں۔

ویسے رنگ تو بہت بدل گیا ہے اور اِدھر دو برس سے ذرا ملک کی جوتی پیزار نے اُن کے کان کھڑے کر دیئے ہیں، اِس لئے اب ہوا میں قلعہ بنانا کم ہوتا جا رہا ہے لیکن کہاں تک؟ ملک تو نہ جانے کہاں سے کہاں پہونچ گیا۔ اقبال کی حجازی مے کو جوش اور ساغر کے سازسے ہندوستانی راگ بن کر نکلے بہت دن ہو چکے لیکن عورتیں ابھی لکیری پیٹ رہی ہیں۔ اور وہاں ترقی پسندوں کا غول بھوک بھوک چلاتا ہوا بڑھا چلا آ رہا ہے۔ نوجوان انقلابی کھرپا اور کلہاڑا لئے جھاڑیوں کانٹوں سے میدان صاف کرتے آ رہے ہیں۔ اُن کی لکڑ توڑ شاعری میں نہ مے ہے نہ معشوق۔ اُن کے یہاں محبوب "چہرہ فروغ مے سے گلستاں کئے ہوئے" نہیں آتا ہے بلکہ میلی پگیا سر پر جمائے، گاڑھے کی مرزئی پہنے، سر پر گارے کا ٹوکرا رکھے مزدور "مرے جا رہے ہیں" "بڑھے جا رہے ہیں" کہتا ہوا نازل ہوتا ہے۔ اب ساقی کی صراحی، شراب ارغوانی کے بدلے خون اُگلتی ہے اور دھان من موہنی کی جگہ دیہات کی ٹھوس گنواری لہنگا پھڑکاتی، چوڑیاں بجاتی غصہ میں ناگن کی طرح پھنکارتی ہوئی، امیروں کو اُپلے کی طرح پاتھ ڈالنے تشریف لاتی ہے۔ ابھی کیا بھوڑے دن میں دیکھئے گا۔ کون کہہ سکتا ہے دس ہی پانچ برس کے اندر یہ چنگاری سچ مچ انگارے نہ اگلنے لگے گی۔ غرض ملک میں تو یہ کچھ ہو رہا ہے۔ انقلاب کی پکار ہو رہی ہے۔ نئے ادب کا پرچم لہرایا جا رہا ہے۔ اور یہاں غزل جو مسلمانوں کی بگڑی تقدیر کی نشانی اور کاہلی کی لوٹ بن کر ورثہ میں ملی تھی، نئے سرے سے پھر گھروں کے اندر جنم لے رہی ہے۔

ذرا اِس ستم ظریفی کو دیکھئے، عورتیں غزل کہتی ہیں وہ بھی پردہ نشین۔ جن پر پوری جوان بھی نہیں ہونے پاتیں کہ ایک مرد ماں باپ کی رضامندی سے مسلط کر دیا جاتا ہے۔ لو اسے پوجو اور محبت کرو! پیاری پیاری گڑیا سی لڑکی پورے چھ فٹ لانبے دیودار سے باندھ دی جاتی ہے، یا فنونِ لطیفہ سے ذوق رکھنے والے نوجوان کے سر کالی کلوٹی ہتنی جیسی بیوی مڑھ دی جاتی ہے یہ ہے یہاں کا دستور! اب آپ ہی بتائیے ایسا جذبات کہاں سے پیدا ہوں اور خشتیں

لڑایا جائے۔ مجھے تو اسی میں شک ہے کہ کیا عورت غزل کہہ بھی سکتی ہے؟

کہتے ہیں عورت فطرت کا راز ہے، انسانیت کی ایک پہیلی ہے۔ جسے بوجھنا ہر مرد کے لئے یہ سچ ہو یا نہ ہو۔ لیکن اسمیں تو شبہ نہیں کہ وہ اپنی محبت اپنے جذبات یا خواہش کا بے دھڑک اظہار نہیں کرپاتی۔ آپ کسی جاہل عورت کو دیکھئے جب وہ لڑنے یا تقریر کرنے پر آتی ہے تو گھنٹوں بے تکان بولتی چلی جاتی ہے نہ اسوقت اس کے پاس مثلوں کی کمی ہوتی ہے نہ محاوروں کی۔ لیکن جب وہ پیار کی آنکھوں سے اپنے شوہر کو دیکھکر کچھ کہنا چاہتی ہے تو الفاظ حلق میں اٹک اٹک کر رہ جاتے ہیں۔ کچھ گونگوں کی طرح اشاروں سے کچھ آنسوؤں سے اور کچھ نگاہوں سے مدد لئے بغیر اپنا مطلب ادا ہی نہیں کرپاتی۔ نظر لاکھ پیام محبت دے لیکن اس پیام کو ڈگی پٹواکر سب کو سنانا عورت کے بس کی بات نہیں۔ جوانی لاکھ دیوانی ہو لیکن بھرے مجمع میں ہرگز نہیں کہہ سکتی ع

لو اُن کی جوانی آ پہونچی اب کیسے چھپیں گے دل و جگر

عورت بے بس ہو کر آنسو بہاتی ہے لیکن زندان سے دیوانی ہو کر دم تحریر کی طرف نہیں بھاگتی۔ نہ دفتر ناکامی کو عنوانِ تمنا بناکر مردوں کے سامنے پیش کرتی ہے جو وہ پھٹ سے کہدیں ؎

میں نے کہا کہ غیر کا کہنا نہ کیجئے　　　بولے وہ بیچ میں مرے بولا نہ کیجئے

جب دل پر چوٹ ہی نہیں تو درد بھرے راگ نکلیں گے کہاں سے؟ اور پھر غزل تو نری مردوں کی رام کہانی اور ساری انجمن کی بپتا ہوتی ہے۔ بھلا عورت اسمیں کہاں سماجائے گی؟ نہ معلوم اُسے دربان کی گالیاں کھانے اور لیلیٰ کا کتا بننے کا کیا شوق چرّایا ہے؟ رہا عشق حقیقی سو میاں کی پانوں کی ڈبیہ اور میاں کا پیٹ بھرنے سے اتنی چھٹی کہاں؛ جو دو گھڑی آنکھیں موندا پنی آتما اونچی کرلیں۔ ہاں لغت اور دیوان کی مدد سے لفظوں کا ایک گورکھ دھندا بن سکتا ہے، اُسے غزل یا بقول برنارڈ شاہ اگر یورپ نیم دیوانوں کا ملک ہے تو ہندوستان کے مکمل دیوانوں کی بستی ہونے میں کوئی شک ہی نہیں! یہاں غزل عورت کہتی ہے اور گیت مرد بناتا ہے۔ اور سچ پوچھئے تو مردوں کی بے ہوئی بپتا اور بن آئی موت کی داستان سنتے سنتے ملک کا پہلے ہی سے برا حال ہوچکا ہے بھلا اُسے عورتوں کی زبان سے سیاپا سننے کی کیا ضرورت آپڑی ہے؟

غرض جب ہماری اوندھی سیدھی جرنلزم کا ابتک یہ حال ہو کہ کسی نہ کسی شہسوار کی گرد راہ سے اپنی منزل کا پتہ پوچھتی ہی رہی ہوں تو نئے ادب کا استقبال کون کرے اور کس کو اسکی پہچان ہے کہ پرانا ادب کونسی بلا تھی اور نیا ادب ہے کس چڑیا کا نام؟

سب کچھ جلی کٹی کہہ لینے کے بعد ذرا اپنی صفائی تو پیش کر لینے دیجئے۔ ایک بڑے آدمی نے کہا کہ اگر عورت کو پھانسی پانے کا حق ہے تو اسے عدالت کی کرسی پر بیٹھنے کا بھی حق ہے۔ پھر جب یہ دونوں حق آپ کو حاصل ہیں، تو مجھے اپنے جی کی بات کہنے کا کیوں نہ حق حاصل ہو؟ اگر آپ پھر ایسی گفتگوئیں سننا چاہیں تو ذرا ناپ تول کر بات کہا کیجئے اور قلم سنبھال کر لکھا کیجئے۔ تاکہ اپنوں کا جی خوش ہو اور پرایوں میں ناک اونچی رہے!

نوائے راز

از حضرت ابوالفاضل راز چاندپوری

ہمنشیں! ایسی کوئی تدبیر ہونی چاہئے　　میرے قبضے میں مری تقدیر ہونی چاہئے
ختم ہونا چاہئے اب قصۂ دیر و حرم　　خانقاہِ زندگی تعمیر ہونی چاہئے
اس طرح تو نظمِ عالم منتشر ہو جائے گا　　خود پرستی قابلِ تعزیر ہونی چاہئے
شیخ کافر، رند مومن، متقی بادہ پرست　　منقلب ہر ایک کی تقدیر ہونی چاہئے
امتیازِ کفر و ایمان وقت پر ہو جائیگا　　دعوتِ میخانہ عالمگیر ہونی چاہئے
اور بڑھ جائیں ذرا تشنہ لبی کی تلخیاں　　دورِ ساغر میں ابھی تاخیر ہونی چاہئے
رہزنِ ایماں ہیں دونوں شیخ ہو یا برہمن　　ان سے بچنے کی کوئی تدبیر ہونی چاہئے
مرکزِ حسن و محبت، مطلعِ مہر و وفا　　دل کے آئینے میں اک تصویر ہونی چاہئے
تابکے یہ لنترانی ہوشیار اے برقِ طور　　آرزوئے دید کی توقیر ہونی چاہئے
ننگِ میخانہ ہے ساقی! یہ حریفِ خود فروش　　میکشِ کم ظرف کی تشہیر ہونی چاہئے

تابکے یہ بے نیازی اے حریفانِ سخن
اب زبانِ راز عالمگیر ہونی چاہئے

نوٹ یہ تقریر جولائی گذشتہ میں مسز شفیع احمد قدوائی صاحبہ نے آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن لکھنؤ سے کی تھی۔ اب مسز مدحت اور ڈائرکٹر صاحب ریڈیو سٹیشن کی عنایت سے ہدیۂ ناظرین ہے۔　ا۔ نمبر

تنقید کتب

یادِ چکبست [1]

اُردو دنیا میں چکبست کا نام کسی تعریف یا تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ کوئی اُردو داں حلقہ ایسا نہیں جہاں چکبست کا نام عزت و احترام کیساتھ نہ لیا جاتا ہو۔ چکبست کا سب سے بڑا اور قابل تعریف و توصیف کمال یہ ہے کہ گو لکھنؤ کی فضا ابھی تک کنگھی چوٹی، گل و بلبل کے مضامین سے گونج رہی ہے۔ مگر اُنھوں نے قومی شاعری کے میدان میں قدم رکھا اور فرات و دجلہ اور جیجوں سیحون کے پانیوں میں غوطہ لگانے کے بجائے، گنگا جمنا کے پوتر دھارا میں اشنان کیا۔ ان کی تمام نظمیں قوم پرستی اور حبِ وطن کے جذبات میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ سلیس، فصیح اور ٹکسالی زبان میں نہایت بے ساختگی سے قومی نظمیں کہنا، چکبست کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ اسی لئے اُردو ادب میں اُنکا نام قیامت تک زندہ رہیگا بمصداق

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

بیشک چکبست کا دل قوم اور وطن کے عشق سے سرشار تھا پھر اُن کا نام دُنیا سے کیونکر مٹ سکتا ہے۔

یہ کتاب ان متعدد مضامین نظم و نثر کا دلکش مجموعہ ہے جو ملک کے مشہور اہلِ قلم ادیبوں اور شاعروں نے پنڈت برج نراین چکبست اور ان کی شاعری پر لکھے تھے۔ جنھیں ہمارے دوست، نامور سخن سنج و سخن فہم پنڈت آنند نراین مُلا لکھنوی نے نہایت سلیقہ سے مرتب کر کے یکجا کر دیا ہے مضامین نظم و نثر کے درمیان کہیں کہیں خود حضرت چکبست کی مشہور نظموں کے اقتباسات بھی داخل کردئے گئے ہیں، جس سے اس مجموعہ کا حسنِ معنوی دوبالا ہوگیا ہے۔ ادیبوں میں حضرت نیاز فتحپوری، مولانا عبدالحق، مرزا جعفر علی خاں اثر، پروفیسر مسعود حسین رضوی، ڈاکٹر تاراچند، رائٹ آنریبل سر تیج بہادر سپرو، منشی دیا نراین نگم؛ اور شعرا میں مولانا صفی لکھنوی حضرت وصل بلگرامی حضرت محشر لکھنوی، حضرت جگر بریلوی وغیرہ کے اسمار گرامی شامل ہیں۔ لکھائی چھپائی کاغذ عمدہ۔ شروع میں چکبست کا ایک نیا فوٹو بھی ہے۔ حجم چھوٹی تقطیع کے ۱۷۰ صفحات۔

---

[1] قیمت درج نہیں۔ ملنے کا پتہ:۔ انڈین پریس لمیٹڈ الہ آباد۔

نادر خطوط غالب

مرزا غالب مرحوم کے تقریباً تمام رقعوں اور خطوط کا مجموعہ مختلف ناموں سے شائع ہو چکا ہے۔ جنمیں "اُردوے معلیٰ" اور "عودِ ہندی" زیادہ مشہور ہیں۔ مگر کتاب زیر نظر میں مرزا غالب کے ۳۷ خط ایسے ہیں جو ابھی تک شائع نہیں ہوئے ہیں۔ اسی لئے ان خطوط کے مجموعہ کا نام "نادر خطوط غالب" رکھا گیا ہے۔ یہ خطوط وہ ہیں جو مرزا نے اپنے تین بہاری شاگردوں (۱) حضرت کرامت ہمدانی (۲) حضرت صفیر بلگرامی اور (۲) حضرت صوفی منیری کے نام وقتاً فوقتاً بھیجے تھے اور جو حضرت کرامت ہمدانی کے یہاں موجود و محفوظ تھے۔ اب حضرات کرامت ہمدانی کے نبیرہ حضرت رسا ہمدانی گیاوی نے اُن خطوط کو مسٹر شاکر میرٹھی کے اصرار و تقاضہ سے ایک بسیط مقدمہ کے ساتھ جو بہت فاضلانہ اور محنت سے لکھا گیا ہے، شائع کرا دیا ہے۔ خطوط سبق آموز اور پڑھنے کے قابل ہیں۔ فدائیان غالب اور شیدائیان ادب اُردو کے لئے واقعی ایک نادر تحفہ ہے۔ لکھائی چھپائی، کاغذ معمولی۔ چھوٹی تقطیع کے چار جزو ضخامت۔ قیمت آٹھ آنے ملنے کا پتہ :- کاشانۂ ادب گھسیاری منڈی لکھنؤ۔

مہابھارت مسدس

راماین اور مہابھارت پراچین بھارت کی مشہور و معروف اور بہترین نظمیں ہیں۔ جن میں رزم و بزم دونوں کے مناظر نہایت دلفریب طریقے سے کھینچے گئے ہیں۔ دونوں کتابیں سنسکرت میں تھیں۔ راماین شری والمیک جی نے کانپور کے قریب مقام بٹھور میں گنگا جی کے کنارہ بیٹھکر لکھی تھی اور اسکا ہندی ایڈیشن سوامی تلسی داس جی نے لکھا۔ جن کی "راماین" بچہ بچہ کی زبان پر ہے۔ راماین و مہابھارت دونوں کا ترجمہ فارسی زبان میں علامہ فیضی نے شہنشاہ اکبر اعظم کی فرمائش سے کیا تھا۔ اُردو زبان میں دونوں کتابوں کا ترجمہ حضرت افق لکھنوی نے کیا جو بہت مقبول ہوا۔ مگر یہ ترجمہ اُردو نثر میں تھا۔ اس کے بعد بعض شعراء نے بھی طبع آزمائی کی۔ اب منشی راجی مل صاحب کپور سنبھلی المتخلص بہ رام نے دونوں کتابوں کا نہایت شگفتہ اور پسندیدہ نظم میں بصورت مسدس کیا ہے۔ رام صاحب کی راماین مسدس مقبول عام ہو چکی ہے۔ اب آپ نے مہابھارت کو بھی اُردو مسدس کے سانچہ میں ڈھالا ہے۔ ایک بند ملاحظہ فرمائیے۔ اسی سے مصنف کی شاعری اور کتاب کی خوبیوں کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا۔ ایک نئے باب کے شروع میں لکھتے ہیں ؎

سوسن بتا رہی تھی کہ فصل بہار ہے　　گردن میں گلعذاروں کی پھولوں کا ہار ہے
سنبل میں گویا نکہت مشک تتار ہے　　شبنم کا گوش گل میں دُرِ شاہوار ہے
ہر اک کلی کے دل میں ہے کھلنے کی بیکلی
سبزہ کا صحن باغ میں ہے فرش مخملی

لکھائی چھپائی روشن۔ کاغذ عمدہ حجم بڑی تقطیع کے ۱۱۶ صفحات ہے قیمت سوا روپیہ ملنے کا پتہ۔ ساہتیہ نکیتن کانپور

من کی بپتا

یہ سلسلہ ادارۂ ادبیات اُردو، حیدرآباد دکن کی تینتیسویں کڑی ہے۔ جسمیں لطیف النساء بیگم صاحبہ بی۔اے، نے متوسط طبقہ کی عورتوں کی معاشرتی اور اخلاقی کمزوریوں پر بہت اچھے پیرائے میں روشنی ڈالی ہے۔ طرز بیان نصیحت آمیز ہے۔ امور خانہ داری اور تدبیر منزل کے نکات بھی خوب سمجھائے گئے ہیں اور گھر، نوکر، لباس، بچوں کی تعلیم، علاج معالجہ، سیر و تفریح وغیرہ موضوعات پر نہایت سلجھے ہوئے پیرایہ میں بحث کی گئی ہے۔ متوسط طبقہ کی خواتین اور لڑکیوں کے لئے یہ چھوٹی کتاب بہت مفید ہوگی۔ حجم ۸۰ صفحات قیمت ۸ر۔ ملنے کا پتہ:۔ دفتر ادارۂ ادبیات اُردو، رفعت منزل خیریت آباد حیدرآباد دکن

انیس الاخلاق

یہ میر انیس کی اخلاقی رُباعیوں کا مجموعہ ہے۔ جس کو سید محمد عباس صاحب ایم۔اے، نے مرتب کیا ہے۔ شروع میں چند صفحات میں رباعیوں کی تاریخ اور میر انیس کے حالات زندگی درج ہیں۔ ہر رباعی مع عنوان ایک صفحہ پر درج کی گئی ہے۔ اس چھوٹی سی کتاب میں انیس کی ۹۵ رباعیاں درج ہیں۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ سب دیدہ زیب ہے۔ قیمت پانچ آنہ۔ شائقین دارالتصنیف و تالیف محمود آباد ہاؤس قیصر باغ لکھنؤ سے طلب فرمائیں

مصنفین اُردو

چھوٹے سائز کے ۲۳۲ صفحات پر حالی پبلشنگ ہاؤس کتاب گھر دہلی نے اس نام سے اُردو کے مشہور اہل قلم کی تصانیف کی ایک جامع اور باتصویر فہرست تیار کی ہے۔ جسمیں مختلف عنوانات قائم کر کے تصانیف کو کئی مدوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے تاکہ شائقین اپنے حسب پسند کتابیں آسانی سے طلب کر لیں۔ اس فہرست میں مشہور مصنفین اُردو کی مختصر سوانحعمری اور اُن کی تصویریں بھی درج کردی گئی ہیں۔ باتصویر فہرست صرف ۲/ آنہ میں حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی سے مل سکتی ہے۔

تصحیح افسوس کہ کاتب و پروف ریڈر کی غفلت سے اکثر مضامین میں اہم غلطیاں رہ جاتی ہیں۔ مثلاً پچھلے ماہ کے رسالہ میں "اُردو، ہندی، ہندستانی" کے متعلق حق پرست صاحب کے مضمون میں صفحہ ۱۰۰ پر نیچے سے چھٹی سطر میں "عربی فارسی زندہ زبانیں ہیں" کی جگہ "مردہ زبانیں" چھپ گیا ہے جو صریحاً غلط ہے۔ اسی طرح صفحہ ۱۰۳ پر نیچے سے دسویں سطر میں "مگر حقیقت یہ ہے" کی جگہ "اور حقیقت یہ ہے" ہونا چاہئے۔ صفحہ ۱۰۴ پر اُوپر سے پانچویں سطر میں "ہندی بہ حیثیت ایک زبان لازمی" ہونا چاہئے یعنی "زبان" پہلے اور "لازمی" بعد۔

صفحہ ۱۲۷ پر مضمون "آپ بیتی" میں کئی غلطیوں کے علاوہ عنوان کا شعر "سینہ می گو ید کہ من تنگ آمدم فریاد کن" کے بجائے "سینہ میگویم من تنگ آمدم فریاد کن" چھپ گیا ہے جو صریحاً غلط ہے۔ ناظرین اِن غلطیوں کو درست فرمائیں۔ ا۔ ز

رفتار زمانہ

جنگ

جیسا کہ ناظرین کو معلوم ہے۔ جرمنی کے یکم ستمبر کو پولینڈ پر تین طرف سے حملہ کر دیا۔ جس پر انگلستان اور فرانس کو اُس کے خلاف جنگ کا اعلان کرنا پڑا۔ یکم اکتوبر تک اس لڑائی کو ایک مہینہ پورا ہو گیا۔ پولینڈ دو تین ہفتوں سے زیادہ جرمنی کے حملے کی تاب نہ لا سکا۔ پہلے خیال تھا کہ وہ دو ڈھائی ماہ تک جرمن افواج کو اُلجھائے رکھیگا جس کے بعد بارش شروع ہو جائے گی اور جرمنی کو نئی مشکلات سے سامنا ہوگا۔ جنکی وجہ سے اسکی طاقت زیادہ کام نہ دیسکے گی۔ لیکن روس نے بھی پیچھے سے اُس پر حملہ کر دیا۔ جس سے جرمنی کا کام بہت آسان ہو گیا۔ اور پولینڈ دو طرفہ حملے کی تاب مقاومت نہ لا سکا۔ وارسا اور بعض دیگر مقامات نے البتہ آخر تک حملہ آوروں کا بہادرانہ مقابلہ کیا لیکن حکمرانان پولینڈ نے کچھ زیادہ بہادری نہ دکھائی۔ بلکہ آنیوالے خطرہ کا خیال کر کے وارسا کی تسخیر سے بہت پہلے ہی پایہ تخت کو چھوڑ گئے اور کچھ دنوں اِدھر اُدھر رہنے کے بعد رومانیہ میں پناہ گزین ہوئے۔ مسٹر لائیڈ جارج نے اُنکی اس حرکت کی بجا طور پر مذمت کی ہے اور واقعی اُن کے لئے اپنی فوج اور شہری آبادی کو اس طرح بے یار و مددگار چھوڑنا زیبا نہ تھا۔ مگر کچھ بھی ہو، پولینڈ کی حکومت اور فوج کے تباہ و برباد ہونے اور روس اور جرمنی کے حصّے بخرے کرنیکے بعد یہ جنگ ختم نہیں ہوئی۔ جرمنی کا یہ خیال تھا کہ پولینڈ کے خاتمے کے بعد برطانیہ و فرانس یا کم سے کم فرانس ضرور ہی صلح کے لئے تیار ہو جائے گا۔ مسولینی نے اپنی حال کی تقریر میں اسکا اشارہ بھی کیا ہے اور کہا ہے کہ یوروپ کو جنگ جاری رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہٹلر نے اپنی آخری تقریر میں بھی اس پر بہت زور دیا ہے کہ جرمنی کا (اپنی نو آبادیوں کی واپسی کے علاوہ جنکا تصفیہ باہمی بات چیت سے ہو سکتا ہے) انگلستان یا فرانس سے کوئی مطالبہ نہیں ہے اور وہ تمام مسائل یوروپ بلکہ اسلحہ کی کمی کا معاملہ بھی باہمی مشورہ سے طے کرنے کو تیار ہے۔ لیکن اس کا یہ خواب بے تعبیر رہیگا۔ پول قوم کی روح ابھی مفتوح نہیں ہوئی ہے چنانچہ پولستانی حکومت بھی فرانس میں قائم ہو گئی ہے۔ ادھر چیکوسلاویکیہ میں بھی جرمنی سے آزادی حاصل کرنے کی زبردست خواہش پیدا ہو رہی ہے اور لنڈن میں ڈاکٹر بنیس عارضی حکومت قائم کرنیکی فکر کر رہے ہیں۔ امریکہ نے بھی پولینڈ میں روس اور جرمنی کا قبضہ منظور نہیں کیا ہے۔ غرض برطانیہ اور فرانس متفقہ طور پر اس بات کا تہیہ کئے ہوئے ہیں کہ ہٹلریت کو فنا کر ہی کے دم لیں گے۔ بات یہ ہے کہ ہٹلر کے وعدوں کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ چند ہی سال کے عرصہ میں وہ خود اپنے بیسوں وعدے توڑ چکا ہے۔ پچھلے سال بھر کے اندر اندر ہی اُس نے چیکوسلاویکیہ اور پولینڈ

کے متعلق کئی اہم وعدے کئے لیکن وقت آنے پر اُنکے صریحاً خلاف کارروائی کی۔ اسلئے جبتک جرمنی پر اُسکا اقتدار قائم ہے۔
مستقل صلح کا کوئی سامان نظر نہیں آتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس کیلئے انگلستان اور فرانس دونوں کو طولانی جنگ کرنا پڑیگی
اور جرمنی کی موجودہ حکومت کو شکست دینا کوئی معمولی کام نہیں ہے لیکن ہم کو بھروسہ ہے کہ اگر اتحادی اسی طرح ہمت و
استقلال سے ڈٹے رہینگے اور اُن کے بستگان اس موقعہ پر اُن کی پوری امداد کریں گے تو جرمنی کے موجودہ حکمرانوں کو
مُنہ کی کھانی پڑے گی۔ اِس وقت جرمنی کو روس سے معاملہ کرنے میں کچھ فوائد ضرور حاصل ہوگئے ہیں لیکن روس کی
رفاقت جرمنی کو بہت مہنگی پڑے گی۔ اس وقت بھی روس نے پولینڈ کے بڑے اور اہم حصے کو اپنے قبضے میں لے لیا ہے
اور اب وہ قرب و جوار کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں پر اپنا اقتدار قائم کر رہا ہے جو بالآخر جرمنی کے حق میں مضر ثابت ہوگا۔
پولینڈ کی فتح کا سب سے اہم نتیجہ یہ نکلا ہے کہ روس جو بیس پچیس سال سے یورپین سیاست سے بیدخل ہوگیا تھا۔ اب پھر
ایک قوی طاقت کی حیثیت سے داخل یاب ہوگیا ہے اور بلقان کی ریاستیں جرمنی سے محفوظ ہوگئی ہیں اور بحر اسود بھی
جرمن جہازوں کے لئے بند ہوگیا ہے۔ اِسوقت تک جرمنی کا لندن پیرس یا کسی دوسرے مشہور مقام پر کوئی ہوائی حملہ
نہیں ہوا ہے۔ لیکن ہٹلر نے اِس جنگ میں ایک خاص آلۂ حرب استعمال کرنے کی دھمکی دی ہے۔ جرمنی کی سرحد پر فرانسیسی
فوجوں کے حملے شروع ہو گئے ہیں۔ اور جرمنی کے حفاظتی استحکامات متزلزل ہو رہے ہیں۔ غالباً جرمنی ان حملوں
کا اب جلد ہی سختی سے جواب دینے والا ہے اور بلجیم، ہاتینڈ یا لکسمبرگ کسی نہ کسی طرف سے فرانس پر حملہ کرنیوالا ہے
انگلستان کی فوجیں بھی فرانس کی کمک کو پہونچ گئی ہیں اور خود ڈیوک آف ونڈسر (سابق شاہ ایڈورڈ ہشتم) بھی
اِس نازک موقعہ پر انگلستان واپس آگئے ہیں اور فرانس کی فوج کے ساتھ شریک جنگ ہیں۔
برطانیہ کے جنگی بیڑے نے تمام سمندروں پر تسلط قائم کرکے جرمنی کے اقتصادی وجود پر سکرات کا عالم طاری
کر رکھا ہے۔ اس کے ساتھ ہی جرمن آبدوز کشتیوں نے برطانوی جہازوں پر بھی حملے کئے ہیں اور کئی بڑے جہاز
ڈبو دئے ہیں۔ جن سے کروڑوں روپئے اور اس سے بھی قیمتی جانوں کا نقصان ہوا ہے۔ لیکن یہ بات اطمینان بخش ہے کہ
برطانیہ کے جنگی جہازوں نے جرمنی کا اتنا سامان پکڑ لیا ہے کہ وہ اُن کے نقصان سے بقدر ڈیڑھ لاکھ ٹن زیادہ ہے
برطانیہ کی مستعدی کا تازہ ثبوت یہ ہے کہ اگلے مارچ تک کیلئے پارلیمنٹ نے بیس اَرب پاونڈ جنگی مصارف
کے لئے منظور کئے ہیں جس کے لئے ادنیٰ اعلیٰ سبھوں نے غیر معمولی ٹیکس ادا کرنا منظور کر لیا ہے۔

(ہندوستان)

جنگِ یورپ اور ہندوستان | یورپ کی لڑائی ہندوستان کے لئے کم اہمیت نہیں رکھتی۔ چنانچہ ہمارے مُلک کے
اربابِ حل و عقد بھی مُلکی مسائل پر بغور و خوض کرکے انھیں طے کرنے کی کوشش کر رہے ہیں تاکہ ہندوستان
بھی دل و جان سے اس جنگ میں حصہ لے سکے۔ چنانچہ لڑائی چھڑنے کے ایک ہی دو روز بعد حضور وائسرائے
نے اہلِ ہند کے نام ایک پیغام شائع کیا۔ جسمیں آپ نے اُس جبر و تشدد کی طرف توجہ دلائی، جو ہر ہٹلر نے
پولینڈ کے ساتھ روا رکھا ہے اور جو ہٹلر کے سیاسی پروگرام کا ضروری جزو بن گیا ہے۔ یہی طریقہ اُس نے آسٹریا
چیکوسلاویکیہ وغیرہ ممالک کے متعلق بھی اختیار کیا تھا۔ بقول لارڈ لنلتھگو "اس رویہ سے جو ہٹلر نے اختیار کیا ہے

دُنیا میں انسان کا زندگی بسر کرنا ناممکن ہو جائے گا کیونکہ اس سے جبر و تشدد کی فتح ہو گی اور "جسکی لاٹھی اُس کی بھینس" کا اصول تقویت پائے گا۔ چنانچہ اس وقت ہمارے سامنے اُن اصولوں کی حفاظت کا سوال ہے۔ جن پر بنی نوع انسان کی آیندہ ترقی کا دار و مدار ہے۔ یہ اصول بین الاقوامی انصاف و اخلاق کے اصول ہیں اور اس بات کے متقاضی ہیں۔ کہ مہذب انسان بین الاقوامی تنازعات بھی باہمی گفتگو اور معقولیت و دلیل سے طے کرے نہ کہ جبر و تشدد سے۔ وائسرائے ہند نے یہ بھی لکھا ہے کہ روئے زمین پر ہندوستان سے زیادہ کسی ملک میں ان عظیم الشان اصولوں کی قدر دانی نہیں ہوتی ہے۔ اور یہاں ہر وقت اور ہر زمانہ میں انکی حفاظت ہوئی ہے۔ چنانچہ آپ نے اہل ہند سے لڑائی میں بلا تفریق نسل و ملت و سیاسی اختلافات کے برطانیہ کی امداد و اعانت کی اپیل کی ہے۔ حضور وائسرائے نے جو کچھ فرمایا ہے بالکل صحیح ہے۔ واقعی ہندوستان زمانہ قدیم سے انسانیت و روحانیت اور اخلاق و تہذیب کا مرکز رہا ہے اور اب جبکہ مادیت کے زہر نے تمام عالم کی فضا مسموم کر دی ہے۔ یہاں عدم تشدد اور امن پسندی کا جذبہ غالب ہے۔ مگر ہندوستان اُن اعلیٰ اُصولوں کی حفاظت جن کا ذکر حضور وائسرائے نے فرمایا ہے برطانیہ کی بقدر شوق اور بھرپور امداد اُسی وقت کر سکتا ہے جب وہ خود اُن بیجا قیود و بند سے جو اُسے عرصے سے جکڑے ہوئے ہیں آزاد ہو یا کم از کم اُسے یہ اطمینان ہو جائے کہ برطانیہ واقعی انھیں اُصولوں اور جمہوری حقوق کی حفاظت کے لئے ہندوستان سے امداد کا طالب ہے۔ چنانچہ کانگریس نے اس سلسلہ میں جو بیان شائع کیا ہے وہ اسی نظریہ کے مطابق ہے۔ کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے اپنے بیان میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ وہ اصول جو موجودہ جنگ میں قوم کے رہنما ہونے چاہئے کانگریس کی جانب سے بارہا ضبط تحریر میں لائے جا چکے ہیں۔ چنانچہ ایک ماہ قبل ہی کمیٹی نے اُن کا اعادہ کیا تھا اور ہندوستان کی طرف سے یہاں کی رائے عامہ پر بیجا اثر انداز ہونے کی برطانوی پالیسی پر اظہار ناپسندیدگی کیا تھا اور اسی پالیسی سے شدید اختلافات ظاہر کرنے ہی کے لئے کانگریسی ممبران کو مرکزی اسمبلی کے آیندہ اجلاس میں شریک نہ ہونے کی ہدایت کی تھی۔ اُس کے بعد جنگ چھڑ گئی ۔۔ برٹش گورنمنٹ نے ہندوستان کو ممبر بنا ۔۔ میں شریک قرار دیدیا اور گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں فوری ترمیم بھی کر دی جس سے صوبجاتی حکومتوں کے ۔۔ اختیارات بہت محدود ہو گئے ہیں۔

کانگریس بارہا فاسیت و نازیت کے طرز عمل اور اُصولوں کی مذمت کر چکی ہے اور ان کی جنگجوئی اور تشدد پسندی کی انسانیت کش پالیسی پر بھی اپنی ناپسندیدگی اور غم و غصّہ کا اعلان کر چکی ہے۔ کانگریس کے نزدیک فاسیت اور نازیت کے اندر بھی امپیریلزم کے وہی اصول کام کر رہے ہیں۔ جن کے خلاف ۔۔

ہندوستان میں سالہاسال سے برسرِ پیکار ہے۔ لہٰذا ورکنگ کمیٹی بلاپس وپیش نازی حکومت کے اس جبر و تشدد کی جو اُس نے پولینڈ کے ساتھ اختیار کیا ہے سخت مخالف ہے۔ اور اُن ملکوں کی ہمدرد ہے جو اُس کی روک تھام کے لئے اس وقت میدانِ جنگ میں صف آرا ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ اگر اس جنگ کا نتیجہ یہ نکلے کہ امپیریل مقبوضات اور مفادات و اغراض میں پہلے سے بھی زیادہ استحکام ہو جائے تو کانگریس اہلِ ملک کو اس جنگ سے علیحدہ ہی رکھنا پسند کریگی۔ لیکن اگر اس کے برعکس اس لڑائی کی بدولت دنیا میں جمہوری نظامِ حکومت کو فروغ دیا جائے تو ہندوستان کو اس جنگ سے بڑی دلچسپی ہوگی۔ کمیٹی کو اس بات کا یقین واثق ہے کہ ہندوستان کے جمہوری مفاد کا برطانیہ نیز تمام دنیا کے جمہوری مفاد سے کوئی تصادم نہیں ہے۔ اس لئے اگر برطانیہ واقعی جمہوری اصولوں کی حفاظت و توسیع کے لئے مصروفِ کار ہے تو اس کو اپنے مقبوضات کو بھی امپیریلزم سے آزاد کر دینا چاہئے۔ چنانچہ ہندوستان میں پوری جمہوری حکومت قائم کر دینا چاہئے اور اہلِ ہند کو نمائندہ اسمبلی کے ذریعہ اپنے ملک کیلئے آئین وضع کرنے کا اختیار دینا چاہئے۔ کانگریس نے اس مطالبہ کے ساتھ یہ بھی یقین دلایا ہے کہ آزاد جمہوری ہندوستان بخوشی جمہوریت کے تحفظ و استحکام کی جنگ میں دوسری جمہوری قوموں کے ساتھ برابر کا حصہ لیگا اور اُن کے ساتھ اقتصادی اتحاد و تعاون کی پالیسی پر بھی عملدرآمد کرے گا۔

ان حالات کے پیشِ نظر کہ دنیا کے لئے یہ ہنگامہ حد درجہ اہم ہے اور ایسی سرعت کے ساتھ واقعات ظہور پذیر ہو رہے ہیں کہ اکثر دل و دماغ کی محتاط پرواز پیچھے رہ جاتی ہے۔ ورکنگ کمیٹی نے یہی مناسب سمجھا ہے کہ سردست اپنا فیصلہ ملتوی رکھے تاکہ جنگ کے مقاصد زیادہ واضح اور روشن ہو جائیں۔ اسی خیال سے ورکنگ کمیٹی نے برطانی حکومت کو مدعو کیا ہے کہ وہ صاف وصریح الفاظ میں اپنے جنگی مقاصد کا اعلان کر دے اور یہ بات بھی واضح کر دے کہ وہ دنیا میں کس نظامِ حکومت کی حامی ہے، اور وہ اپنے جمہوری مقاصد کا ہندوستان پر کس طرح اطلاق کرنا چاہتی ہے اور فی الحال اُن پر کیا عملدرآمد ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی ورکنگ کمیٹی نے [illegible] جرمنی یا اہلِ جاپان یا کسی اور قوم سے کوئی مخاصمت نہیں ہے [illegible] نفرت ہے جو انسانی آزادی کو پابند میں رکھتے ہیں اور جن کا دارومدار جبر و تشدد پر ہے۔

کمیٹی نے اہلِ ہند سے یہ بھی اپیل کی ہے کہ وہ اس وقت تمام اختلافات باہمی کو بالائے طاق رکھ کر موجودہ خطرہ کے مقابلہ کے لئے متحدہ محاذ پیش کریں اور غیر متزلزل استقلال کے ساتھ اپنے ملک کیلئے دنیا کی آزادی کے وسیع تر دائرہ کے اندر آزادی حاصل کرنے کے لئے کوشاں ہوں۔

نیشنل لبرل فیڈریشن نے بھی اس موقعہ پر جو ریزولیوشن پاس کیا ہے اُسمیں اہل ہند اور ملک کی تمام سیاسی جماعتوں سے جنگ میں غیر مشروط طور پر برطانیہ کی اعانت کرنے کی اپیل کی ہے۔ لبرل لیڈران اِس وقت انگلستان سے کوئی مطالبہ کرنا پسند نہیں کرتے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انھوں نے بھی برطانی حکومت سے یہ اپیل کی ہے کہ گورنمنٹ اپنے طرز عمل سے ملک میں ایسی فضا پیدا کردے کہ سیاسی حیثیت سے تالیف قلب ہوجائے اور وہ شوق سے جنگ میں امداد دیں۔ چنانچہ اِس بات کی خاص طور پر اپیل کی گئی ہے کہ گورنمنٹ ہند میں عوام کی نمائندگی کا جس صورت سے بھی ممکن ہو پُورا انتظام کیا جائے۔ اور اہل ملک کی تمام بدگمانیاں رفع کرنے کی بھی کوشش کی جائے۔ لبرل فیڈریشن نے موجودہ فوجی پالسی تبدیل کرنے اور ہندوستان کے لئے اہل ملک کی حفاظتی فوج قائم کرنے کا مشورہ دیا ہے تاکہ ہم لوگ غیر ملکی حملوں کا مقابلہ کرنے کے قابل ہوجائیں۔

کانگریس اور لبرل پارٹی کے علاوہ فرقہ وارانہ جماعتوں نے بھی اس اہم مسئلہ پر اپنی اپنی رائیں پیش کی ہیں مثلاً ہندو مہاسبھا نے اپنے ریزولیوشن میں اِس بات پر زور دیا ہے کہ ہندوستان کی حفاظت برطانی حکومت اور اہل ہند دونوں کا مشترکہ مسئلہ ہے اور چونکہ اہل ملک بلا امداد اِس اہم ذمہ داری کو اپنے ذمہ نہیں لے سکتے ہیں۔ اِس لئے ہندوستان اور برطانیہ کے درمیان پُورا اتحاد باہمی ہونا چاہئے اور اُسکو موثر بنانے کے لئے اُس نے یہ مشورہ دیا ہے کہ مرکزی حکومت کو ذمہ دار حکومت بنادیا جائے کیپٹل آولڈ پر نظر ثانی کی جائے۔ ایکٹ اسلحہ میں ترمیم کرکے اسے انگلستان میں نافذ شدہ ایکٹ کے مطابق کردیا جائے انڈین ٹیریٹوریل فورس کی توسیع کا انتظام کیا جائے' فوج میں داخل ہونے کے متعلق تمام موجودہ قیود کو توڑ کر جس قدر جلد ہوسکے فوج کو پورے طور پر ہندوستانی بنادیا جائے' اور انڈین ملٹری اکیڈمی میں طلبا کو مکمل فوجی تعلیم دینے کا بندوبست کیا جائے۔

اِس ریزولیوشن میں اِس بات کی بھی سفارش کی گئی ہے کہ حکومت ہندوستانی کارخانوں کو ہوائی جہاز وغیرہ جدید اسلحہ جات کے تیار کرنے کے قابل بنادے تاکہ ملک کی تمام فوجی ضروریات ملک ہی میں پوری ہوجائیں۔

مسلم لیگ نے بھی بہت غور وخوض کے بعد اِس مسئلہ پر ایک ریزولیوشن پاس کیا ہے۔ جسمیں اُس نے عجیب رویہ اختیار کیا ہے۔ یعنی ہندوستان میں جمہوری طرز حکومت پر برٹش گورنمنٹ کو ترجیح دی ہے۔ اور صوبجاتی گورنمنٹوں میں بھی گورنروں سے مداخلت کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔

اُس نے ایک مرتبہ پھر یہ شکایت کی ہے کہ جن صوبوں میں کانگریسی حکومتیں قائم ہوئی ہیں۔

وہاں مسلمانوں کی بڑی حق تلفی ہوئی ہے اور لیگ کو شکایت ہے کہ گورنر صاحبان نے مسلمانوں کے حقوق کی کوئی حفاظت نہیں کی اور نہ وزراء صوبہ کے کاموں میں دخل دینا گوارا کیا۔

ملک کے مشہور انگلو انڈین اخبار "اسٹیٹسمین" نے اس ریزولیوشن پر رائے زنی کرتے ہوئے بجا طور پر لکھا ہے کہ "اگر واقعی کسی صوبجاتی گورنمنٹ نے مسلمانوں کے مذہبی، سیاسی، مجلسی یا اقتصادی مفاد کے خلاف کوئی کارروائی کی ہوتی اور گورنر صوبہ اس کے خلاف اپنے خاص اختیارات سے کام نہ لیتے، تو مسلم لیگ کی شکایت ضرور بجا ہوتی۔ لیکن اگر لیگ نے کانگریس پر کیچڑ اچھالنے کی غرض سے پیرپور کمیٹی کے سراسر بے بنیاد الزامات کی بنیاد پر یہ تجویز مرتب کی ہے تو ہمیں کہنا پڑے گا کہ صوبجاتی وزارتوں کو ختم کرنے کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی ہے۔ بہرصورت اسٹیٹسمین کی رائے میں کانگریس پر جو الزامات لگائے گئے ہیں انھیں کوئی ہوشمند انسان تسلیم نہیں کرسکتا۔"

مگر لیگ نے صرف صوبجات ہی میں جمہوری طرزِ حکومت کی مخالفت نہیں کی ہے بلکہ کل ہند کیلئے ایک فیڈریشن قائم کرنیکی اسکیم کی بھی مخالفت کی ہے اور برٹش گورنمنٹ سے مطالبہ کیا ہے کہ یہ خیال ہی ہمیشہ کے لئے ترک کردیا جائے اور لیگ کی منظوری کے بغیر کوئی دوسرا آئین بھی وضع نہ کیا جائے۔

بقول معزز اخبار اسٹیٹسمین لیگ کے اس مطالبہ کا صاف یہی منشا ہے کہ گو وہ ہندوستان کو آزاد دیکھنا چاہتی ہے لیکن قومی سلطنت کا قائم ہونا کسی صورت میں گوارا نہیں کرسکتی اور ہندوستان کو برطانیہ کے تسلط سے آزاد کرا کے وہ اس ملک کی مجموعی ہیئت باقی نہیں رکھنا چاہتی بلکہ مختلف قوموں اور فرقوں کی آبادی کے لحاظ سے اسکے سیکڑوں ٹکڑے کردینا چاہتی ہے۔ اس کے صاف یہی معنی ہیں کہ لیگ چاہتی ہے کہ مسلمان حب الوطنی سے دور کا بھی واسطہ نہ رکھیں۔ اس افسوسناک رویہ پر جسقدر افسوس کیا جائے کم ہے۔

۱۱ ستمبر کو مرکزی حکومت کے دونوں ایوانوں کے مشترکہ اجلاس میں حضور وائسرائے نے یہ اعلان کیا کہ گورنمنٹ نے موجودہ نازک حالت کے لحاظ سے جو جنگ کی وجہ سے پیدا ہوگئی ہے اور جس کی وجہ سے اسوقت ملک کی تمامتر توجہ جنگی امداد کی طرف مبذول ہونا چاہئے، فیڈریشن کی مجوزہ اسکیم کو معطل کردینے کا فیصلہ کیا ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ فیڈریشن کو جو ہمارا نصب العین ہے، اسے نظرانداز کیا جارہا ہے۔ اس اعلان کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ گورنمنٹ ہند کی مجوزہ اسکیم کا، جو کسی کو بھی پسند نہ تھی خاتمہ ہوگیا ہے اور اب گورنمنٹ برطانیہ کو عام رائے کے بموجب نیا آئین منظور کرنے کا پورا موقع ہے۔ چنانچہ خوشی کی بات ہے کہ اس وقت انگلستان کے اکثر ذمہ دار مدبران اور بعض بڑے بڑے اخبار نویس اس بات کی ہر روز سفارش کررہے ہیں کہ جہاں تک ممکن ہو اہلِ ہند کو آئینی حیثیت سے مطمئن کردیا جائے۔ البتہ وزیر ہند لارڈ زٹلینڈ نے کانگریس

ورکنگ کمیٹی کے مطالبے کو کسی قدر بے موقع قرار دیا ہے۔ لارڈ موصوف نے صوبجاتی حکومت خود اختیاری جاری ہونے کے موقعہ پر بھی کانگریس کے مطالبات سے اختلاف کیا تھا۔ جو ہمارے لیڈروں نے گورنران صوبہ سے کئے تھے۔ بہرحال دارالعوام کے کئی با اثر ممبروں نے اس بارہ میں جلد سے جلد صلح و صفائی کر لینے کی رائے دی ہے اور دارالامراء میں بھی اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ اس موقع پر برطانیہ کو غرور بیجا سے کام نہ لینا چاہئے۔ بلکہ جس طرح سے ہو سکے اہل ہند کی دلجوئی کرنا چاہئے۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے لارڈ زٹلینڈ کی تقریر کا مفصل جواب دیا ہے کہ ہم نے جنگ اور امن کے تقاضوں کا پورا لحاظ رکھتے ہوئے ہندوستان کے مسئلہ پر غور کرنے کی کوشش کی ہے اور اسی وجہ سے کانگریس نے برطانوی حکومت سے درخواست کی ہے کہ وہ اپنے مقاصد جنگ کا صاف و واضح الفاظ میں اعلان کر دے اور جہاں تک موجودہ حالات میں ممکن ہو اُس پر عملدرآمد کرے۔ پنڈت جی نے واضح کر دیا ہے کہ کانگریس اس وقت برطانیہ سے کوئی سودا کرنا نہیں چاہتی ہے اور نہ برطانیہ کی مشکلات سے فائدہ اٹھانے کا ہی خیال ہے لیکن ہندوستان اور دنیا کے نقطۂ نظر سے اشد ضروری ہے کہ جنگ کے مقاصد کی پوری وضاحت کر دیجائے تاکہ لوگوں کو حقیقت حال سے نہ صرف واقفیت ہو جائے بلکہ انھیں اسکا یقین بھی ہو جائے۔ آپ نے برطانیہ سے بجا طور پر یہ سوال کیا ہے کہ کیا بے شمار انسان یہ جانے بغیر کہ وہ کس لئے مر رہے ہیں موت کے منھ میں چلے جائیں؟ بقول پنڈت جی ماضی میں بھی جتنی لڑائیاں ہوئی ہیں اُن کی ابتدا میں پُر جوش اعلان کئے جاتے رہے ہیں۔ لیکن جنگ ختم ہوتے ہی وہ وعدے بھلا دیئے گئے ہیں۔ چنانچہ گذشتہ جنگ عظیم میں بھی ایسا ہی ہو چکا ہے۔

بہرحال آثار اُمید افزا نظر آرہے ہیں۔ حضور وائسرائے نے تمام ملکی لیڈروں سے تبادلۂ خیالات شروع کر دیا ہے۔ اس وقت تک آپ ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو۔ مہاتما گاندھی۔ پنڈت جواہر لال نہرو، مسٹر جناح، سردار پٹیل، بابو راجندر پرشاد وغیرہ سے ملاقات کر چکے ہیں۔

دہلی میں پنڈت نہرو اور مسٹر جناح کی بھی بات چیت ہو چکی ہے۔ اور اب وائسرائے نے مسٹر سوبھاش بوس، مسٹر ساوارکر صدر مہاسبھا، مسٹر راجہ لیڈر ڈیپرسڈ اقوام، مسٹر پرکاش نرائن سپرو صدر لبرل فیڈریشن کو بھی ملاقات کے لئے طلب فرمایا ہے۔ خدا کرے اس گفت و شنید کا ملک کے حق میں کوئی مفید و دیرپا نتیجہ نکلے۔
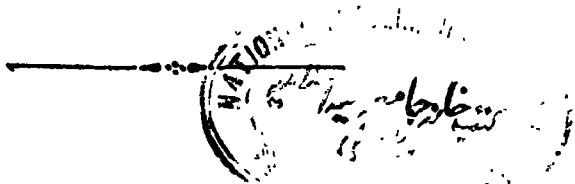
تاریخ و تنقید ادبیات اردو

مصنفہ حامد حسن قادری

جس میں اردو کی اہمیت، فضیلت، مقبولیت اور اردو، ہندی، ہندوستانی کے ناموں کے مسئلہ پر تفصیل کے ساتھ ۴۳ صفحوں میں بحث کی گئی ہے اس کے علاوہ اردو کی ساخت۔ دہلی، دکن، گجرات میں اردو قدیم کی رفتار۔ اردو شاعری کی عہد بعہد ترقی۔ شاعری کے اسکول۔ دہلی و لکھنؤ کی خصوصیات۔ جدید شاعری کی مختصر تاریخ۔ تنقید غزل جدید۔ شاعری کا رنگ۔ آگرہ اسکول اور سیماب اکبرآبادی۔ شاعری میں چوری وغیرہ عنوانات پر دلچسپ مضامین درج ہیں لکھائی، چھپائی۔ کاغذ سب عمدہ۔ حجم ۱۷۶ صفحات قیمت مجلد عہ

میری کہانی

پنڈت جواہر لال نہرو کی آپ بیتی کا ترجمہ، نہایت سلیس اور شگفتہ زبان اور اصل انگریزی کی طرح زور بیان۔ ہندوستان کی موجودہ سیاسی تاریخ پر ایک ے نظیر کتاب ہے۔ جس میں نوجوانوں کے قائداعظم نے ری تحریکوں اور ہمارے رہنماؤں کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ کتاب کی ضخامت تقریباً زیادہ سو صفحات ہے۔ لکھائی چھپائی، کاغذ سب عمدہ بہت سی تصویریں بھی دی گئی ہیں۔ قیمت مجلد [illegible] روپیہ

ملنے کا پتہ:۔ زمانہ بک ایجنسی کانپور

یادگار پریم چند

مشہور رسالہ زمانہ کانپور

(کا)

"پریم چند نمبر"

(جس میں)

منشی پریم چند کے پرانے دوستوں اور اردو کے بہترین انشا پردازوں اور شاعروں کے چونتیس ۳۴ مضامین نثر اور تیرہ ۱۳ نظمیں ہیں

منشی پریم چند کی زندگی اور ادبی کارناموں کا ایک جامع و مکمل مرقع پیش کیا گیا ہے۔

منشی جی کی تصانیف کی فہرست، انکا عکس تحریر اور مختلف اوقات کی آٹھ ہاف ٹون تصاویر بھی ہدیۂ ناظرین کی گئی ہیں،

حجم خالص مضامین ۲۵۶ صفحات
تصاویر و ٹائیٹل علاوہ

قیمت ڈیڑھ روپیہ (عہ) علاوہ محصول

المشتہر:۔ مینیجر زمانہ کانپور

یورپ کی حکومتیں

(مصنفہ)

نجم الدین جعفری بی۔ اے، ایل ایل ٹی و مظہر انصاری بی۔ اے (آنرز)

ہندوستان میں سیاسی بیداری بڑی تیزی سے پھیل رہی ہے اور خواص و عوام ایسے سیاسی لٹریچر کی تلاش میں رہتے ہیں جو انکی سیاسی تربیت کر سکیں۔ صوبجاتی خود اختیاری اور فیڈریشن اسکیم سامنے ہوتے ہوئے ہندوستانیوں کو یوروپ کی حکومتوں کے طرز حکمرانی سے باخبر ہونے کی سخت ضرورت ہے۔

اس کتاب میں برطانیہ، فرانس، اٹلی، سوئزرلینڈ اور جرمنی کے نظام حکومت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ ہر ملک میں حکومت کے مختلف شعبے کس طرح فرائض حکمرانی سے عہدہ برآ ہوتے ہیں۔ ہر ملک کے تذکرہ حالات سے پہلے اسکی سیاسی ارتقائی تاریخ بھی بیان کر دی گئی ہے۔

ضخامت ۲۲۵ صفحات، قیمت مجلد عہ

صدر دفتر:۔ **مکتبہ جامعہ، نئی دہلی**

شاخیں:۔ جامع مسجد دہلی۔ لوہاری دروازہ لاہور۔ امین آباد لکھنو

پرنسس بلڈنگ نزد جے۔ جے اسپتال بمبئی

پرنٹر:۔ خواجہ عبدالوحید، انقلاب

THE ZAMANA OCTOBER 1939. Rd. No. A 211.

مرتبہ: دیانرائن نگم، بی۔ اے۔

نمبر ۴	اکتوبر ۱۹۳۹ء	جلد ۷۳

فہرست

تصویر: طلسم فریب - رام چندرجی اور سنہا ہرن (رنگین)

قیمت سالانہ پانچ روپیہ

زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا

نمونہ سات آنے

بہارِ سخن:۔ پانسو چھیاسٹھ ہندو شعرا ماضی و حال کا نفیس تذکرہ ہے۔ جسمیں ان شعرا کے حالات مع انتخاب کلام بترتیب حروف تہجی درج کئے گئے ہیں۔ عیؔ

نصائح چانکیہ:۔ یعنی نامور ہند چانکیہ کے مشہور و معروف نیتی کا ترجمہ۔ از پنڈت ہنمنت راؤ صاحب ناظم خزانہ سرکار عالی گورنمنٹ نظام۔ قیمت ۶؍

اُردو مضمون نویسی:۔ مضمون لکھنے کے متعلق پروفیسر نانک پرشاد بی۔ اے مرحوم کی نہایت عمدہ کتاب ہے۔ اس سے بہت جلد مضمون لکھنے کی قابلیت پیدا ہو جاتی ہے اور ہر مضمون کا موضوع نہایت آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے۔ قیمت ۸؍

مثنوی سحر یعنی شکنتلا اور دشینتا کا اُردو ترجمہ حضرت سحر ہنگامی کے شاعرانہ کمال کا اعجاز۔ دوسرا ایڈیشن جس کی مصنف نے نظر ثانی کی ہے قیمت ۸؍

مرقع ادب:۔ حصہ اول و دوم۔ مرتبہ جناب صفدر مرزا پوری۔ اسمیں ہندوستان کے مشہور انشا پرداز اور شعرا کے وہ خطوط جمع کئے گئے ہیں۔ جو انھوں نے اپنے احباب وغیرہ کو لکھے ہیں قیمت حصہ اول عہ دوم عہ

پریم بتیسی یعنی اُردو کے مشہور فسانہ نگار منشی پریم چند کے بہترین قصوں کا مجموعہ۔ قیمت عہ

خیالات عزیز۔ مجموعہ مضامین مولوی عزیز احمد صاحب جس کی باضابطہ رجسٹری کی گئی ہے۔ حجم دو سو صفحات۔ ٹائیٹل خوشنما رنگین۔ لکھائی چھپائی اعلیٰ۔ مع تصویر مصنف قیمت مجلد عہ بلا جلد عہ

ملنے کا پتہ۔ **زمانہ بک ایجنسی کانپور**

اجلاس مسٹر شمبھو دیال سنگھ منصف شہر اعظم گڈھ

سمن واسطے ادخال بیان تحریری

(آرڈر ۵۔ قاعدہ ۱ و ۵)

نمبر مقدمہ ۲۸۷ ۱۹۳۹ء

عدالت منصف صاحب شہر اعظم گڈھ

باسط علی خاں مدعی

بنام

حامد حسن خاں وغیرہ

بنام:۔ شیخ نور الحق پسر محمد خلیل شیخ محمد معروف پسر حفیظ اللہ شیخ علی احمد پسر لال ساکنان موضع کھنڈواری پٹہ نندالوں پرگنہ نظام آباد ضلع اعظم گڈھ حال وارد شہر جوہر بارو دوکان روئی علے جان ڈیوک ریاست جوہر بارو براہ سنگاپور

ہرگاہ مدعی نے آپ کے نام ایک نالش بابت استقرار حق دائر کی ہے لہذا آپ کو حکم ہوتا ہے کہ آپ بتاریخ ۲۷ ماہ نومبر ۱۹۳۹ء بوقت ۱۰ بجے دن کے اصالتاً یا معرفت وکیل کے جو مقدمہ کے حالات سے قرار واقعی واقف کیا گیا ہو اور کل امورات اہم متعلقہ مقدمہ کا جواب دے سکے یا جس کے ساتھ کوئی اور شخص ہو کہ جو جواب ایسے سوالات کا دے سکے حاضر ہوں اور جوابدہی دعویٰ کی کریں اور آپ کو لازم ہے کہ اسی روز جملہ دستاویزات پیش کریں جن پر آپ بتائید اپنے جوابدہی کے استدلال کرنا چاہتے ہیں۔

نام عدالت۔ منصف صاحب شہر اعظم گڈھ
نمبر مقدمہ ۲۸۷ ۱۹۳۹ء
نام فریقین۔ باسط علی خاں بنام حامد حسن خاں وغیرہ

آپ کو اطلاع دی جاتی ہے کہ اگر بروز مذکور آپ حاضر نہ ہوں گے تو مقدمہ بغیر حاضری آپ کے مسموع اور فیصل ہوگا۔

بثبت میرے دستخط اور مہر عدالت کے آج بتاریخ ۲۶ اکتوبر ۱۹۳۹ء جاری کیا گیا۔

مہر عدالت دستخط حاکم بخط انگریزی

زمانہ کے بہترین مصنفین کا ادبی و پولیٹیکل لٹریچر

خود نوشت سرگذشت

(منصفہ)

مسولینی ڈکٹیٹر اٹلی صفحات ۲۹۶ کتابت طباعت عمدہ قیمت

مسولینی کیا ہے؟ کیا کرنا چاہتا ہے؟ اس کے مقاصد کیا ہیں؟ ان تمام سوالات کے جوابات آپ کو مسولینی کی زبان سے سننے چاہئیں۔ کتاب گیارہ ابواب پر مشتمل ہے۔ اور ہر باب ایک نئی سیاست کا آئینہ دار ہے۔ مسولینی کے سمجھنے کیلئے خود اس کی خود نوشت سرگذشت سے بہتر اور کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ ریویو زمزم' دنیا کے ہر مہذب ملک نے اسے اپنی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔

سیاسیات

سوانح حیات

فطرت نگار سدرشن، منشی پریم چند، منشی گوری شنکر اختر، مصنفین کی تصانیف کیلئے فہرست کتب مفت طلب فرمائیے۔

پبلشرز: میسرز لاجپت رائے اینڈ سنز تاجران کتب لوہاری دروازہ لاہور

بہار

مولفہ جناب الیاس احمد صاحب ایم اے ایل ایل بی مصنف گلدستہ بہار فارسی اور اردو شعرا کے چوٹی کے کلام خصوصاً غزلوں کا بہترین اور نایاب مجموعہ ہے یا یوں سمجھئے کہ شعرا کی پاکیزہ زبان میں حسن و عشق کی مکمل داستان ہے' اس داستان کے آغاز عشق سے لے کر انجام عشق تک جتنے عنوانات قائم ہو سکتے ہیں قائم کئے گئے ہیں، اور ہر عنوان کے تحت میں چیدہ چیدہ متحد المضامین اشعار درج ہیں۔ عنوانات سیکڑوں ہیں۔ اس گلدستہ کے ہوتے ہوئے شاید ہی کسی دیوان کی ضرورت ہو۔ علم ادب میں یہ گلدستہ ایک قابل قدر اور دلفریب اضافہ ہے۔ کتاب دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔ اہل ذوق ملاحظہ فرمائیں۔
قیمت علاوہ محصولڈاک صرف ہے ضخامت ۲۳۶ صفحات

چاول کی کھیتی (بالتصویر)

پسند فرمودہ محکمہ تعلیم گورنمنٹ پنجاب و گورنمنٹ یوپی جس کو سکرٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا کی لندن لائبریری میں جگہ دی گئی ہے۔ ہز ہائنیس مہاراجہ سندھیا د گوالیار نے مصنف کو انعام زر نقد عطا فرمایا ہے۔ مصنف کی سب سے مشہور اور مقبول عام کتاب ہے۔ اس کی کاشت سے کاشتکار بڑھیا اقسام کی فصل لیکر سونا پیدا کر سکتا ہے۔ عجیب و غریب مفصل طریقے غیر معمولی اور بڑھیا پیداوار کے بتائے گئے ہیں۔ زراعتی کتب کے مشہور مصنف بابو رام پرشاد مجسٹریٹ ... ہے یہ قیمت ... علاوہ محصول ...

طلسم فریب - رام چندر جی اور سنہرا ہرن

زمانہ

جلد ۷۳ — اکتوبر ۱۹۳۹ء — نمبر ۴

عرفیؔ ہندی زبان میں

(از جناب مقبول حسین صاحب احمدپوری، بی۔ اے، ایل ایل۔ بی)

دوسرے مشاہیر عہد مغلیہ کی طرح عرفیؔ بھی سنسکرت یا ہندی زبان نہ جانتا تھا، لیکن ہندوؤں کے رسم و رواج اور اُن کے عقائد کے متعلق عام باتوں سے واقف تھا۔ چنانچہ اُس نے اپنے اشعار میں جابجا اہلِ ہند کے رسوم کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور یہ دلفریب کنائے زیادہ تر اس کے غزلیات کے مجموعہ میں پائے جاتے ہیں۔

بہ حیثیت انسان عرفیؔ کی حقیقی خوبیاں پردۂ خفا میں رہیں۔ کیونکہ نقادانِ ادب نے اس کے ساتھ رواداری برتنے میں بہت بخل سے کام لیا ہے۔ خود ہمارے دور کے ایک وقیع مصنف یعنی مولانا شبلی نے شعرالعجم میں عرفیؔ کے کلام پر تنقید کرتے ہوئے کم و بیش اس کے اخلاق پر بھی نکتہ چینی کی جو عرفی کے معصر سوانح نگاروں کی ہمنوائی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ تاہم مولانا مرحوم کو بھی عرفیؔ کی جدتِ طبع کا اعتراف کرنا پڑا ہے۔ اور اگر وہ اس کے ہمعصروں کی تنقیدوں سے قطع نظر کرکے اپنے طور پر کوئی رائے زنی کرتے تو اُنھیں عرفیؔ میں محاسن ہی نظر آتے۔ لیکن مولانا نے رواروی سے کام لیا اور تنقید میں کوئی جدت

ملہ عرفی کا نام محمد جمال الدین تھا۔ اس کے باپ زین الدین علی ایک سرکاری عہدہ دار تھے! ایران میں یہ صفوی سلطنت کا زمانہ تھا۔ عرفیؔ دسویں صدی ہجری کے وسط میں شیراز میں پیدا ہوا۔ غالباً سیر و سیاحت کی غرض سے وہ ہندوستان آیا اور یہیں لاہور میں عین شباب میں مر گیا۔ فیضی اور ابوالفضل اس کے ہمعصر تھے۔ اس کے قدردانوں میں شہزادہ سلیم، ابوالفتح گیلانی اور عبدالرحیم خانخاناں کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

پیدا نہ کر سکے۔

اِس میں کوئی شک نہیں کہ عرفی کا دل بڑا غیور تھا، اوچھے پن کو اس کی سرشت میں بالکل دخل نہ تھا۔ وہ دن کو دن اور رات کو رات کہتا تھا۔ لگی لپٹی باتیں اُسے پسند نہ تھیں

بیشتر فارسی شعرا کی طرح عرفی کو ہندوؤں کے رسم و رواج سے دلچسپی تھی، اور جس طرح اُس نے ان کا ذکر کیا ہے اُس سے ہمدردی سی پائی جاتی ہے۔

عرفی کے خیالات دنیا کے لٹریچر میں جگہ پانے کے مستحق ہیں، کیونکہ افتادِ طبع نے اس کے خیالات میں ایک خاص ندرت پیدا کر دی تھی، اور اگر ہندی زبان میں اُس کے خیالات پیش کر دئیے جائیں تو وہ ایک مہا کوی یعنی بڑے شاعر کے خیالات معلوم ہونگے۔

عرفی کی یہ خصوصیت اُسکی انوکھی طبیعت کا نتیجہ ہے، جو خودداری، سنجیدگی اور آزادہ روی کا مجموعہ تھی اسی وجہ سے اُس کے اشعار میں غم و انبساط دونوں کے متضاد پہلو تاثیر اور دلفریبی کا باعث ہیں۔ لطف یہ کہ اس کے کلام کی تاثیر رلانے والی نہیں، بلکہ ہمت بندھانے والی ہے۔ اس کا مذاقِ سخن (Humour) "ظرافت" کے بجائے مزاح کا پہلو لئے ہوئے تھا۔ مثال کے طور پر ایک شعر لکھا جاتا ہے جو ان تمام خصوصیات کا مرقع ہے" وہ لکھتا ہے کہ:-

کفر نے، اسلام نے، اسلام کفر آمیز نے
حکمتِ ایزد ندانم چیست در احیاءِ ما

(ترجمہ: کفر نہیں، اسلام نہیں اور کفر ملا اسلام نہیں، میں نے یہ بھید نہ پایا کہ خالق نے مجھے کیوں بنایا)

عرفی کے ہمعصروں کو اس بات سے تعجب ہوتا تھا کہ وہ دوسروں کے برعکس کیوں دریوزہ گری کی زندگی سے بیزار رہتا ہے۔ اِس بے نیازی کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ زمانہ ساز لوگوں کی سطحی ذہنیت کو بخوبی سمجھے ہوئے تھا۔ اس زمانے میں سوسائٹی کے دو پہلو خاص طور پر نمایاں تھے، ایک عام دوسرا خاص بلکہ خاص الخاص ان میں سے ایک مذہب تھا اور دوسرا چاپلوسی، مذہب اور اس سے متعلق تاویلات کے بارے میں عرفی نے کیا خوب لکھا ہے کہ

حرم جویاں درے را می پرستند　　فقیہاں دفترے را می پرستند
برافگن پردہ تا معلوم گردد　　کہ یاراں دیگرے را می پرستند

ترجمہ

در کو پوجیں کعبے والے　　پنڈت پوجیں پوتھی
کھینچ لے پردہ، دیکھ لیں صورت　　نہیں وہ، دل میں جو تھی

یعنی حرم کعبہ کے خواستگار حقیقتاً ایک معمولی در (دروازۂ حرم) کے پرستار ہیں اور عالموں یا پنڈتوں کی وہی صورت ہے جو کتاب کے کیڑوں کی ہے۔ اگر حقیقت اپنے رخ سے نقاب ہٹا دے تو معلوم ہو جائے کہ ان میں کوئی حقیقت کا پرستار نہ تھا۔ بلکہ ہر شخص ایک مصنوعی پیکر کی پرستش کر رہا تھا جو اس کی خام خیالی نے ایجاد کی تھی۔
چاپلوسی سے عرفی کو دلی نفرت تھی۔ اس کا یہ مسلک تھا کہ حق مستحق کے لئے ہے نااہل یا منظورِ نظر کے لئے نہیں ہے۔ چنانچہ یہی مسلک عرفی نے ذیل کے شعر میں نمایاں کر دیا ہے:۔

گرفتم آنکہ بہشتم دہند بے طاعت ۔۔۔ قبول کردن و رفتن نہ شرطِ انصاف است

ترجمہ: ہم نے مانا باغِ جنت بے عبادت ہی ملے ۔۔۔ لیکن اس طرح وہاں جانا سراسر ظلم ہے

غالباً اسی اصول کو مدِ نظر رکھتے ہوئے عرفی نے بہت کم قصائد لکھے اور جو قصائد لکھے بھی وہ زیادہ تر پیشوایانِ دین کی مدح میں ہیں۔ اس نے اکّے دُکّے قصائد اُمرا کی مدح میں بھی لکھے جو غالباً اُسے مجبوراً لکھنا پڑے۔ کیونکہ بادشاہوں کے دربار میں نذر پیش کرنے کی رسم آدابِ دربار سے تھی۔ مگر شاعر عموماً نادار ہوتے تھے ان میں نذر کی استطاعت کہاں۔ اس کے علاوہ شاعروں سے نقد رقم کی صورت میں نذر قبول کرنا معیوب بھی سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے شاعروں کو خواہ مخواہ قصیدہ لکھنا پڑتا تھا۔ عرفی نے بھی اسی بنا پر چند قصیدے لکھے اور ان پر خاصہ انعام پایا۔
اپنی آزاد منش افتادِ طبیعت کی بنا پر عرفی کو خواجہ حافظ سے دلی عقیدت تھی۔ مگر دوسرے شاعروں سے بھی اُسے کوئی بیر نہ تھا۔ چنانچہ اُس نے کبھی کسی ہمعصر شاعر کی ہجو نہیں لکھی۔
چونکہ عرفی کے شباب کا زمانہ ہندوستان ہی میں گزرا اس لئے اہلِ ہند کی نگاہوں سے اُس کا کلام اوجھل نہ رہنا چاہیئے۔ ہم اسی جذبے کے ماتحت اس کے چند مشہور اشعار کو دوہوں کی صورت میں بہ تصرف ترجمہ کر کے یہاں لکھتے ہیں اور آسان ہندوستانی میں ایک غزل کا ترجمہ بھی بطور تتمہ دیئے دیتے ہیں تاکہ اہلِ ذوق اس بڑے شاعر سے بخوبی روشناس ہو جائیں۔ پہلے اس کے دو نہایت مشہور اشعار کا ترجمہ عام ہندوستانی میں پیش کیا جاتا ہے تاکہ عرفی کی علو ہمتی کا اندازہ ہو سکے۔ اس کے ایک مشہور قصیدے کا مطلع یہ ہے ؎

اقبالِ کرم می گزد اربابِ ہمم را ۔۔۔ ہمت نخورد نیشترِ لا و نعم را

ترجمہ: سادھو کے اکھمان کو دُکھ دیتی ہے دَیا دَیالوں کی
(دیال صاحب کرم)
ہاں اور نہیں سے دب نہیں سکتی شکتی ہمت والوں کی
(غیوریت)

اسی قصیدے میں ایک جگہ اور لکھتا ہے کہ

بے برگیِ من داغ نہد بردلِ ساماں ۔۔۔ بے مہریِ من زرد کند روئے درم را

ترجمہ: ہے کنگال پنے میں میرے شوبھا دولت والوں کی
کیچن مکھ پڑتا ہے پیلا دھیرج سے کنگالوں کی
(بے نیازی)

اِن اشعار کے بعد عرفی کے دوہے ملاحظہ ہوں۔ صحتِ کتابت کے خیال سے ہندی رسم خط بھی دے دیا گیا ہے اور ضروری فرہنگ بھی موجود ہے۔

(۱) نخورم زخم دراں کوچہ کہ مرہم باشد ۔۔۔ نہ شوم کشتہ دراں شہر کہ ماتم باشد

ترجمہ: میں وہاں چوٹ نہیں کھاتا جہاں مرہم ہو۔ اُس شہر میں قتل ہوتا ہوں جہاں ماتم برپا ہو۔)

دوہا ملہمُ دارو مل سکے جہاں گھاؤ وہاں مت کھاؤ
جس نگری میں بَین ہو مرتُ وہاں مت آؤ

मलहम दारू मिल सके जहां घाव वहां मत खाओ
जिस नगरी में बैन हो, मृत्यु वहां मति आओ

(۲) فغاں نہ شیوۂ اہلِ دل است اے بلبل
وگرنہ مَن زِ تو افزوں خروش می کردم

(اے بلبل نالہ و فریاد دل والوں کا دستور نہیں ہے ورنہ میں تجھ سے بھی زیادہ نالہ و فریاد کرتا۔)

دوہا۔ سُن رے پپیہے باوَرے، بانی پہ آئے نہ کوک
پریت نیَمُ کہتا یہی، سادھ لے مَن میں ہوک

(باورے معنی باولے، دیوانے، بانی معنی زبان، نیَم معنی دستور، پریت نیم یعنی دستورِ محبت)

सुन रे पपीहे बावरे, बानी पे आये न कूक
प्रीति नियम कहता यही, साध ले मन में हूक !

(۳) غیرتم بیں کہ بر آرندۂ حاجات ہنوز
از لبم نامِ تو ہنگامِ دعا نشنیدہ است

(میری غیرت دیکھو کہ دعا کے وقت بھی خدائے قاضی الحاجات نے تیرا نام میرے منھ سے نہیں سنا)

دوہا لاج ہماری دیکھیے، آپ کا اتنا پاس
نام بَرایا آپ کا ہَر سے جو مانگی آس

(لاج معنی غیرت شرم۔ ہریا ہرتا معنی خدا۔)

लाज हमारी देखिये, आप का इतना पास
नाम बराया आप का, हरि से जो मांगी आस

(۴) ما لذتِ فقریم سخا را نہ شناسیم
ناسورِ زِ زخمیم شفا را نہ شناسیم

(ہم فقیری کی لذت سے آشنا ہیں۔ اس لئے سخاوت کو نہیں پہچانتے، ہم ایسے زخم کے ناسور ہیں جو اچھا ہونا نہیں جانتا۔)

دوھا پریم بھکھاری ہم بنے، چھوڑ دَیا کی آس
پریت کے گھاؤ کو بھاجے نہ مَلہم کی بُو باس

"بھاجے نہ" سوافق نہیں ہوتی

प्रेम भिखारी हम बने, छोड़ दया की आस
पीत के घाव को भाजे ना मलहम की बु बास

(۵) در ملامت صبر کن عرفی کہ آخر فیضِ عشق
زیں چمن گلہا بدامانِ زلیخا کردہ بود

(عرفی ملامت کے موقع پر صبر کرو، کیونکہ آخرکار باوجود ملامتوں کے زلیخا کا دامن مرادِ عشق کی بدولت گلہائے مراد سے معمور کر دیا گیا تھا۔)

دوھا عُرفی دھیرج راکھیئے جو کوؤ نام دھرائے
پیت لگے جس شول کو، ترت پھول ہو جائے

(دھیرج معنی برداشت۔ تحمل۔ شول معنی کانٹا۔ ترت معنی جلد)

उरफ़ी धीरज राखिये जो कोऊ नाम धराय,
पीत लगे जिस शूल को तुरत फूल होजाय ।

(۶) کفن شویم بخونِ دیدہ نے در چشمۂ زمزم
پرستارِ صنم را ہست عُرفی زمزمے دیگر

(میں خونِ دیدہ یعنی آنسوؤں سے کفن دھوتا ہوں، زمزم کے پانی سے نہیں کیونکہ اے عرفی معشوق کے پجاری کے لئے دوسرا ہی زمزم چاہیئے)

دوھا پریت گنگ نیناں بھئے، پانی بھیو شریر
پریم پجاری کو لکھے نہ دوسر گنگا نیر

(پریت گنگ یعنی پریت کی گنگا۔ شریر یعنی جسم یعنی جسم پانی ہو کر بہہ گیا۔ لکھے معنی موافقت کرے)

प्रीत गंग नैना भये, पानी भयो शरीर,
प्रेम पुजारी को लखे न दूसर गंगा नीर ।

(۷) مفروش ناز و عصمت، قدحِ شراب درکش
کہ بہ است شرمِ عصیاں زغرورِ بے گناہی
(زاہد! ان بان نہ بیچو، جامِ محبت پیو، کیونکہ گناہ کی ندامت زہد کے غرور سے بالاتر ہے)

دوہا　آن بان کیوں بیچتے، پیو پلاؤ آج
بھگتی کے ابھمان سے، بھلی پاپ کی لاج
(غرور)

आन बान कियों बेचते, पियो पिलाओ आज
भक्ती के अभिमान से, भली पाप की लाज ।

(۸) گاہے بہ یادِ سرو قدے گریہ ہم خوش ست
تا کے زشوقِ سدرہ و طوبیٰ گریستن
(کبھی کبھی کسی حسین معشوق کی یاد میں رو لینا بھی غیر مناسب نہیں ہے، سدرہ و طوبیٰ کے شوق میں کب تک کوئی روئے یعنی تو بہ و استغفار میں رونے سے مطلب یہ ہے کہ خدا جنت دے، ایسا رونا تو بقول اقبال عبادت نہیں بلکہ سوداگری ہے)

دوہا　پیت دُکھن سے کبھو کبھو کھُل کھُل روئیں نین
کب تک سورگ کی چاہ میں کیا کرے کوؤ بَین!
(دُکھن معنی دردِ فرق۔ نین معنی آنکھیں۔ سورگ معنی جنت۔ بین معنی گریہ و زاری)

पीत दुखन से कभू कभू, खुलि खुलि रोएं नैन,
कब तक स्वर्ग की चाह में, किया करे कोऊ बैन !

(۹) ہر کرا دشمن شوم بر عیبِ خود محرم کنم
تا زبیمِ طعنہ با او کینہ جوئی کم کنم
(میں جب کسی سے دشمنی کرتا ہوں اسکو خود اپنے عیب سے آگاہ کر دیتا ہوں تاکہ اس کے طعنے کے خوف سے اُس کے ساتھ بغض و کینہ جوئی کم کروں)

دوہا　بَیری جو کوؤ جان لوں تا کو عیب بتاؤں
نام دھرن کی لاج سے بَیر سے بچتا جاؤں
(بیری معنی دشمن۔ بیر معنی دشمنی)

बैरी जो कोऊ जान लूँ ताको ऐब बताऊँ
नाम धरन की लाज से बैर से बचना जाऊँ

(۱۰) دیدہ عشانِ تعلّق بہست ہر ذرّہ
برآر دستے و بر دوش آفتاب انداز

(ہر کسی معمولی آدمی سے ساز باز نہ رکھنا چاہیے ہاں ہاتھ بڑھا کے آفتاب نے کاندھے پر دھرو
یعنی صحبت بڑوں کی اختیار کرو۔ بڑوں سے مطلب مالدار نہیں بلکہ عالی وقار لوگ)

دوھا: من بندھن باندھو نہیں ہر اوچھے کے ساتھ
سورج مکھ شریمان سے بڑھ کے ملاؤ ہاتھ

(سورج مکھ شریمان معنی سورج کی سی اہمیت رکھنے والے صاحب جلال و جمال اور صاحب دبدبہ لوگ)

मन बंधन बांधो नहीं हर ओछे के साथ
सूरज मुख श्रीमान से बड के मिलाओ हाथ

(۱۱) کفر و دین در کعبہ و دیر از ازل بودند لیک
صلح و جنگے بر سر تسبیح و زنارے نبود

کفر اور دین کعبے اور بت خانے وغیرہ جب تو ازل ہی سے تھے۔ لیکن یہ شیخ و برہمن کے جھگڑے کبھی نہ تھے۔ فرقہ وارانہ فساد کے باب میں عرفی کا یہ شعر خوب ہے ؎
نہ ماند قاعدۂ مہر و کین بہ جہاں ولے عداوتِ پیر دیرو کوہکن باقی است

دوھا دھرم ادھرم جگ میں رہے جب سے بنا سنسار
مالا ڈور کے کارنے مچا نہ ہاہا کار

(دھرم معنی دین، ادھرم معنی بے دینی۔ مالا یعنی تسبیح، ڈور یعنی زنار۔ کارنے معنی سبب۔ ہاہا کار معنی غل غپاڑہ)

धर्म अधर्म जग में रहे जब से बना संसार
माला डोर के कारने मचा-न हाहा कार ।

(۱۲) عرفی اگر بہ گریہ میسر شدے وصال
صد سال می توان بہ تمنا گریستن

(اے عرفی اگر رونے سے وصالِ یار ممکن ہوتا تو اس تمنا میں برسوں رویا جا سکتا تھا)

دوھا　عُرفی برہ کے کشٹ سے روئے دھوئے کا ہوئے
پریہ ملن کی آس ہو تو جنم گنواؤں روئے
(برہ کا کشٹ یعنی فراق کی تکلیف، پریہ یعنی معشوق)

उरफ़ी बिरह के कष्ट से रोय-धोय का होय
प्रिय मिलन की आस हो तो जनम गवाऊं रोय

(۱۳)　زبُت نہ گوشۂ چشمے نہ چینِ ابروے
بحیرتم کہ دلِ برہمن زکف چوں شد
(نہ بتوں میں ترچھی بانکی نگاہیں، نہ پیشانی پر بل، مجھے حیرت ہے کہ آخر برہمن کا دل ہاتھ سے کیوں جاتا رہا جو بتوں کا پجاری ہوا۔)

دوھا　نین پلک چتون نہیں، پاتھر گول سڈول　　نین یعنی
من (آنکھ) پنڈت کا کیوں بھیو بُت (پتھر) پر ڈانوا ڈول

नैन पलक चितवन नहीं, पाथर गोल सिडौल
मन पंडित का क्यों भयो बुत पर डांवा डोल।

(۱۴)　ہمرہ غیری و می گوئی کہ عرفی ہم بیا
لطف فرمودی بروکیں پلے را رفتار نیست
(تو غیر کے تو ساتھ ہے اور کہتا ہے کہ عرفی تو بھی آ، بڑی مہربانی کی جو اتنا بھی کہا، مگر تشریف لیجایئے میرے پیروں کو چلنے کی تاب نہیں ہے۔)

دوھا　سنگ (ساتھ) لگے تم غیر کے کہتے مجھے بلائے
آ، اور تو بھی ساتھ چل، عرفی پگ (قدم) نہ اُٹھائے

संग लगे तुम ग़ैर के, कहते मुझे बुलाय,
आ और तू भी साथ चल उरफ़ी पग न उठाय।

(۱۵)　بہر سو می روم بوئے چراغِ کشتہ می آید
مگر وقتے مزارِ کشتگانِ عشق بود آنجا
(جدھر جاتا ہوں مجھے چراغ کی بو آتی ہے، شاید کبھی اس جگہ شہیدانِ ناز کا مزار تھا۔)

دوھا جون دشا میں پگ دھروں، بجھے دیا کی باس
پیت کے دیپک جل گئے رہ گئی من کی آس

जौन दिशा में पग धरू बुझे दिया की बास
पीत के दीपक जल गये रह गई मन की आस ।

(۱۶) طغیانِ ناز بیں کہ جگر گوشۂ خلیل
آید بہ زیرِ تیغ و شہیدش نمی کنند!

یہ آن تو کوئی دیکھے کہ ابراہیم خلیل علیہ السلام کے جگر بند اسمٰعیل علیہ السلام تلوار کے نیچے لائے جاتے ہیں مگر اُسکو کُند کرکے شہید نہیں ہونے دیا جاتا۔ اسمیں ایک تلمیح ہے اہل اسلام میں عید الضحیٰ کی تقریب اسی واقعے سے تعلق رکھتی ہے۔)

دوھا، سیس دچھنا مانگتے، برچھی تلے دھرائے
یہ چھب دیکھ اچرج بھیو، چھری کُند ہوجائے

(سیس معنی سر۔ دچھنا معنی دان۔ نند بر چھی معنی تلوار۔ چھب معنی آن۔ ادا۔ اچرج معنی حیرت تعجب)

सीस दक्षिणा मांगते बरछी तले धराय,
यह छबि देख अचरज भयो छुरी कुंद होजाय

(۱۷) اُمید ہست کہ بیگانگیِ عرفی را
بہ دوستیِ سخنہائے آشنا بخشند

(یہ امید ضرور ہے کہ عرفی کی بیگانگی (یعنی یادِ حق سے لاپرواہی) کو دوست کی باتوں (یعنی نعتیہ قصائد) کے وسیلے سے بخش دینگے)

دوھا آس لگا رکھ پیت سے، رے عرفی! نجان
متر بچن کی چاہ بد شاید لیں پہچان

(متر بچن، دوست کی باتیں۔ بد معنی ذریعے سے)

आस लगा रख पीत से, रे उरफ़ी अनजान
मित्र बचन की चाह बद शायद लें पहिचान ।

(۱۸) ہر کس کہ ہائے و ہو نہ کشید اہلِ روزگار
گوشش رضا بہ گفت شنیدش نمی کنند

(جس کسی نے بھی اس دنیا میں غُل غپاڑہ نہ کیا، دنیا والوں نے اس سے بے اعتنائی برتی اور اس کی بات چیت کی طرف توجہ نہ کی)

دوھا بِنُ ہلہ گد کچھ نہیں، جَس جیون بِنُ پران
ہاہاکار مچائیے، سُنے جگت دَھر کان

(ہلہ گد یعنی غل غپاڑہ - پران معنی سانس یا جان - ہاہاکار معنی شور و غوغا)

बिन हल्ला गुद कुछ नहीं जस जीवन बिन प्रान
हाहाकार मचाइये, सुने जगत धर कान ।

اُن کے علاوہ راقم نے اور بھی اشعار کا ترجمہ کیا ہے جو زمانۂ حال کی بے اعتنائیوں کی وجہ سے بکھرے پڑے ہیں۔ یہاں اتنے اشعار جو لکھے گئے اُن کے ترجمے کا مقصد بابا تلسی داس نے اپنے اس دوہے میں بیان کر دیا ہے اس لئے راقم کو اور کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔

دوھا ترکی، عربی، فارسی، ہندی، جیتی آہ
جا میں مارگ پریم کو سبے سراہیں تاہ (تلسی داس)

तुर्की, अरबी, फ़ारसी, हिन्दी, जैती आहि
जामें मारग प्रेम को सबै सराहें ताहि ।

آخر میں عرفیؔ کی ایک غزل بھی اسی لب و لہجہ میں سُن لیجئے، وہ یہ ہے:-

(۱) زباں ز نکتہ فرو ماند رازِ من باقیست بضاعتِ سخن آخر شد و سخن باقیست

گُر بوجھن سے بانی ہاری بھید اپنا سب باقی ہے
مٹ گئی پونجی بات بچن کی اور دکھڑا سب باقی ہے

(۲) گماں مبر کہ چو تو بگذری جہاں بگذشت ہزار شمع بکشتند و انجمن باقی است

یہ نہ سمجھ تیرے مٹنے سے یہ سب جگ مٹ جائے گا
لاکھ دیئے جل جل بجھ جائیں پھر بھی سبھا سب باقی ہے

(۳) ز شکوہائے جفایت دو کون پُر شد لیک ہنوز رنگِ ادب بر رخ سخن باقی است

اس اُنیاؤ سے بھر گئے دونوں جگ تجھ سے اُلہنا (شکوہ) کون کرے
پریم بچن کا روپ منوہر تھا جیسا سب باقی ہے

(۴) کسیکہ محرمِ بادِ صبا است می داند کہ با وجودِ خزاں بوئے یاسمن باقی است

جو مدھو ماس کی ملیانل کا بھیدی ہے من میں اُسکے (بسنت) (باد بہاری)
پھول سوگندہ کی اِس پت جھڑ میں بھی آشا سب باقی ہے (آرزو)

(۵) نہ ماند قاعدۂ مہر کوہکن بجہان — وے عداوت پرویز و کوہکن باقی است

رام چندر کی ریت بھولائی، رنگ نیا سب راون کا
مٹ گئے لنکا دھن اور راون یدھ کتھا سب باقی ہے (جنگ)

(۶) مگو کہ ہیچ تعلق نماند عرفی را — تعلقے کہ نہ بودش بخویشتن باقی است

نہیں رہا سمبندھ کوئی عرفی کو مت رہ یہ نہ کہو (تعلق) (دوست)
تھا نہ سروپ کا وہ سمبندھی، وہ رونا سب باقی ہے (خودی) (تعلق رکھنے والا)

تیس سال پہلے

زمانہ بابتہ اکتوبر ۱۹۰۹ء میں دوسرے مضامین کے علاوہ "زلیخا" پر منشی پریم چند کا مضمون (نواب رائے کے نام سے) "دربار صاحب امرتسر" پر سید کرامت اللہ صاحب کا مضمون، "ابر بہار" پر منشی نوبت رائے نظر کی نظم، "عرض حال" پر حضرت نادر کاکوروی کی نظم شائع ہوئی تھیں۔ نظر صاحب کی ایک غزل اس پرچہ میں ہدیۂ ناظرین کی گئی تھی جس کے چند اشعار ناظرین زمانہ کی دلچسپی کے خاطر درج ذیل ہیں:-

یاس سے ویرانیٔ حسرت کبھی ایسی نہ تھی — دل میں سناٹا نہ تھا وحشت کبھی ایسی نہ تھی
اب تو دنیا کی ہوا اور روشنی آتی ہے صاف — جا بجا سے شق مری تربت کبھی ایسی نہ تھی
جان ہی لینے لگی مایوسیٔ صبحِ وصال — دل جگر میں درد کی شدت کبھی ایسی نہ تھی
ہجر میں دل اک مرقع تھا امید و بیم کا — تھی بہت ابتر مگر حالت کبھی ایسی نہ تھی
عیشِ رفتہ کا مصیبت میں کیا جب ہم نے ذکر — دل یہ بول اُٹھا تری قسمت کبھی ایسی نہ تھی
دل کے چھالے میں سمٹ کر حسرتیں سب مر گئیں — قابلِ عبرت کوئی تربت کبھی ایسی نہ تھی
دیکھ ڈالے زندگی میں وصل و فرقت کے طلسم — غم کبھی ایسا نہ تھا راحت کبھی ایسی نہ تھی
دل کو کیا سمجھا دیا نومیدیٔ جاوید نے — پردہ دارِ غم شبِ فرقت کبھی ایسی نہ تھی
زندگی کی کشمکش سے مر کے پائی کچھ نجات — اِس سے پہلے اے نظر فرصت کبھی ایسی نہ تھی

جشنِ بیچارگی

(از جناب احسان بن دانش)

ہے داغِ دل اک شامِ سیہ پوش کا منظر — تھا ظلمتِ خاموش میں شہزادۂ خاور
عالم میں مچلنے ہی کو تھے رات کے گیسو — انوار کے شانوں پہ تھے ظلمات کے گیسو
یہ وقت اور اک دخترِ مزدور کی رخصت
واللہ قیامت تھی، قیامت تھی، قیامت

نوشاہ کا جو سر پہ تھا باندھے ہوئے سہرا — بھرپور جوانی میں تھا اترا ہوا چہرا
اندوہ ٹپکتا تھا بشاشت کی نظر سے — مرجھائے سے رخسار تھے فاقوں کے اثر سے
کرتا بھی پرانا سا تھا، پگڑی بھی پرانی — مجبور تھی قسمت کے شکنجوں میں جوانی
نوشہ کے جو ساتھ آئے تھے دو چار براتی — ہر اک کی جبیں سے تھی عیاں نیک صفاتی
توقیر کے، الفت کے، شرافت کے مرقعے — ایثار کے، ایمان کے، غیرت کے مرقعے
ہمراہ نفیری تھی، نہ باجا تھا، نہ تاشا — آنکھوں میں تھا بے مہریٔ عالم کا تماشا
مجمع تھا یہ جس خستہ و افسردہ مکاں پر
تھا بھیس میں شادی کے وہاں عالمِ محشر

دالان تھا گونجا ہوا رونے کی صدا سے — اک درد ٹپکتا تھا عرقناک ہوا سے
اماں کی تھی بیٹی کی جدائی سے یہ حالت — چیخوں میں ڈھلے جاتے تھے جذباتِ محبت
تھا باپ کا یہ حال کہ اندوہ کا مارا — اٹھتا تھا تو دیوار کا لیتا تھا سہارا
وہ آپ کہیں اور تھا، جاں اور کہیں تھی — سینے میں کوئی شے تھی جو قابو میں نہیں تھی
افلاس کے آرے جو جگر کاٹ رہے تھے — ارمان سب اپنا ہی لہو چاٹ رہے تھے
لڑکی کا یہ عالم تھا کہ آپے کو سمیٹے
گڑیا سی بنی بیٹھی تھی چادر کو لپیٹے

تھی پاؤں میں پازیب، نہ پیشانی پہ ٹیکا — اس خاکۂ افلاس کا ہر رنگ تھا پھیکا
انصاف زمانہ تھا، کہ تقدیر کا چکّر — ماں باپ کو آیا نہ تھا، جوڑا بھی میسّر
یوں کہنے کو دولھن تھی یہ مزدور کی دختر — اماں کا دوپٹہ تھا تو ابا کی تھی چادر

آخر نہ رہا باپ کو جذبات پہ قابو
ملنے لگے خود ہونٹ، ٹپکنے لگے آنسو

کہنے لگا نوشہ سے کہ اے جانِ پدر سُن! — اے وجہِ سکوں، لختِ جگر، نورِ نظر سُن!
گرچہ مری نظروں میں ہے تاریک خدائی — حاضر ہے مری عُمر کی معصوم کمائی
کی لاکھ مگر ایک بھی کام آئی نہ تدبیر — مجبور ہوں مجبور، یہ تقدیر ہے تقدیر!
لیکن اسے انسان کی دولت ہی بہت ہے — لڑکی کے لئے چادرِ عصمت ہی بہت ہے
اس سانولے چہرے میں تقدس کی ضیا ہے — یہ پیکرِ عفت ہے، یہ فانوسِ حیا ہے!
اس کے لئے چکّی بھی نئی چیز نہیں ہے — بیٹی ہے مری، دخترِ پرویز نہیں ہے!
عزت میں یہ پیدا ہوئی غربت میں پلی ہے! — خودداری و تہذیب کے سانچے میں ڈھلی ہے!!
زنہار یہ زیور کی تمنا نہ کرے گی! — ایسا نہ کرے گی، کبھی ایسا نہ کرے گی!!
قسمت کی شکایت اسے کرنا نہیں آتا، — ادراک کی سرحد سے گزرنا نہیں آتا
ہے صبر کی خوگر، اِسے فاقوں کی ہے عادت — ماں باپ سے پائی ہے وراثت میں قناعت

اس کی بھی خوشی ہوگی، تمھاری جو رضا ہو
تم اس کے لئے دوسرے درجے پہ خدا ہو

پھر کے یہ بیٹی سے کہا، نرم زباں سے — بچّی مری رخصت ہے تو اب باپ سے ماں سے
اُمید ہے ہر بات کا احساس رہیگا — ماں باپ کی عزّت کا تجھے پاس رہیگا
آلام میں، کلفت میں وفادار ہی رہنا! — آئے جو قیامت بھی تو ہنس کھیل کے سہنا

دل توڑ نہ دینا کہ خدا ساتھ ہے بیٹی
لاج اس مری داڑھی کی ترے ہاتھ ہے بیٹی

آیا جو نظر مجھ کو یہ جاں کاہ نظارا — احساں نہ آنکھوں کو رہا ضبط کا یارا

تپنے لگی ہر سانس مری سوزِ نہاں سے
اتنا ہے مجھے یاد کہ نکلا یہ زباں سے

اے خالقِ کونین یہ تو نے بھی سنا ہے؟ دنیا کو گماں ہے کہ غریبوں کا خدا ہے!
تو جن کا خدا اُن کا ہو گردش میں ستارا!! کیا تیرے کرم کو یہ ستم بھی ہے گوارا؟
کس طرح نہ ہو دل کو بھلا رنج و محن دیکھ؟ مزدور کے اس زندہ جنازے کا کفن دیکھ!

احساس کبھی دل سے جدا ہو نہیں سکتا
انسان ہے انسان خدا ہو نہیں سکتا

انیس کا غیر مطبوعہ کلام

قاضی عبدالودود صاحب بیرسٹرایٹ لا، پٹنہ نے میر انیس مرحوم کی ایک مکمل غزل اور ایک مطلع نقل کر کے رسالۂ اردوئے دکن کے نذر کیا ہے۔ چنانچہ ہم ان دونوں کو ناظرین زمانہ کی دلچسپی کے لئے درج ذیل کرتے ہیں۔

مطلع

خموش اے بلبلِ شوریدہ اس میں کیا ہے بس میرا
یہ اپنی قسمت ہے چمن تیرا قفس میرا

غزل

شہیدِ عشق ہوئے قیسِ نامور کی طرح جہاں میں عیب بھی ہم نے کئے ہنر کی طرح
کچھ آج شام سے چہرہ ہے فق سحر کی طرح ڈھلا ہی جاتا ہوں فرقت میں دوپہر کی طرح
سیاہ بختوں کو یوں باغ سے نکال اے چرخ کہ چار پھول تو دامن میں ہوں سپر کی طرح
تمام خلق ہے خواہانِ آبرو یا رب چھپا مجھے صدفِ قبر میں گہر کی طرح
تجھی کو دیکھوں گا جب تک ہیں بیقرار آنکھیں میری نظر نہ پھرے گی تری نظر کی طرح

انیس یوں ہوا حالِ جوانی و پیری
بڑھے تھے نخل کی صورت گرے ثمر کی طرح

اُردو شاعری میں آمد اور آورد

از حضرت وصل بلگرامی

اگر کسی نے فارسی نہ بھی پڑھی ہو تو اتنا تو سبھی جانتے ہیں کہ "آمدن" کے معنی "آنا" اور "آوردن" کے معنی "لانا" ہیں۔ بس یہی معنی ان دونوں لفظوں کے شاعری میں بھی ہیں۔ اگر شاعری خود آپ کے پاس چلی آئے، تو یہ اُس کی آمد ہوئی اور اگر آپ اُسے جا کر زبردستی لائیں تو یہ آورد ہوئی۔ جو شخص خود آپ کے یہاں آئے تو یہ سمجھا جائے گا کہ اُس کو آپ سے کچھ نہ کچھ مناسبت ضرور ہے۔ اگر آپ کسی کو پکڑ لائیں تو وہ خواہ مخواہ منہ بسور کر بیٹھے گا۔ اور جو بھی اُس کو دیکھے گا سمجھ جائیگا کہ یہ صاحب خانہ کی زبردستی کا نمونہ ہیں۔

یہ بالکل ٹھیٹ قسم کی تعریف ہے۔ اب ذرا آمد اور آورد پر شاعرانہ نقطۂ نگاہ سے غور کیجئے

بعض ادیبوں نے جو شاعری کی تعریفیں کی ہیں وہ سراسر اسی آمد اور آورد کے امتیاز پر مبنی ہیں۔ مثلاً مشہور انگریزی شاعر ورڈس ورتھ نے شاعری کی تعریف یہ کی ہے کہ:۔

"جذبات کے بے اختیار اظہار کا نام شاعری ہے"

اس سے مراد یہ ہے کہ اگر جذبات اصل نہیں ہیں اور دوسروں کی کہانی اپنے الفاظ میں کہی جا رہی ہے یا فرضی تخیل کو نظم کے قالب میں ڈھالا جا رہا ہے تو وہ شاعری نہ ہوگی۔ مشرقی نقاد ایسے لوگوں کو شاعروں کی صف سے باہر تو نہیں نکالتے، بلکہ ایسی شاعری کو آورد کہہ کر چُپ ہو جاتے ہیں۔

تنقید کا باوا آدم ارسطو بھی شاعری کی یہی تعریف کرتا ہے کہ:۔

"شاعری جذبات کی ترجمانی کا نام ہے"

ہر حال شاعر حقیقت میں وہی ہے جو جذبات کی ترجمانی کرتا ہو۔ یوں تو موزوں جملوں میں کسی واقعہ کے بیان کو بھی شاعری ہی کہا جا سکتا ہے۔ خواہ جذبات کا اُس واقعہ سے کوئی تعلق ہو یا نہ ہو۔

یہاں اتنا اور عرض کرنا چاہتا ہوں کہ خواہ کسی نے وزن، قافیہ اور ردیف کو شاعری کے لئے لازم نہ بھی قرار دیا ہو۔ لیکن ان کے بغیر کسی کو شاعری کرتے نہیں دیکھا گیا۔ اِسی طرح شاعری اور

عروض و قوافی وغیرہ کا تعلق ہے۔ یہ چند جملے میں نے اس وجہ سے عرض کئے ہیں کہ آگے چل کر عروض اور شعر کی بحث کے ساتھ آمد اور آورد کا تعلق ہے بہت کچھ مدد دیں گے۔

بہرصورت شعر کے لئے جذبات کی براہِ راست ترجمانی اور موزونیت ضروری ہے اور موزوں الفاظ میں جذبات کی ترجمانی کا نام ہی شاعری ہے۔ خود میں نے اپنی نظم "لکھنؤ سے خطاب" میں ایک مقام پر عرض کیا ہے۔

کہتے ہیں جس کو شعر ہے تفسیرِ زندگی — الفاظ کے لباس میں تصویرِ زندگی
اُتری ہوئی دماغ سے تنویرِ زندگی — طرزِ بیاں کے دام میں تاثیرِ زندگی
آورد کی نہ قصۂ باطل کی بات ہے
کہتے ہیں جس کو شعر فقط دل کی بات ہے

اسی کے ساتھ یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ موزوں شعر ہم اُس کو کہتے ہیں جو ہماری مجوزہ بحروں میں سے کسی ایک میں پورا اُتر آئے۔ ہمارے یہاں ردیف اور قافیہ ایسی چیزیں ہیں۔ جن کی پابندی کوئی ضع کے لوگ سراسر آورد سمجھتے ہیں۔ یہ الجھن اسی وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ اکثر ہم کو ایسے اشعار ملتے ہیں۔ جن سے یہ اندازہ لگانا آسان ہو جاتا ہے کہ شاعر نے قافیہ ڈھونڈھ کر یا قافیہ کے لئے شعر کہا ہے۔ یہی حال طرحی غزلوں کا ہے کہ اسمیں انھیں قافیوں میں دماغ سوزی کرنا پڑتی ہے جو طرح میں آسکتے ہیں جو زبردستی کی شاعری ہوئی نہ کہ اپنی خوشی کی۔

اگر یہ کہا جائے کہ شاعری میں آمد کوئی چیز نہیں بلکہ اصل میں آورد ہی سب کچھ ہے اور یہی آورد جب اچھوتے پن کے انتہائی کمال تک پہونچ جاتی ہے تو آمد بن جاتی ہے۔ عمدہ سے عمدہ اور برجستہ سے برجستہ شعر بغیر غور و فکر کے وجود میں نہیں آتا۔ تو ہم یہ عرض کریں گے کہ آپ نے قافیہ کا خیال چھوڑ کر مضمون کو پہلے درجہ میں رکھا تو وہ بھی آورد ہی کی ایک شکل ہوئی۔ آمد کی یہ تعریف کرنا کہ جو خود بخود ذہن میں آجائے اور موزوں الفاظ میں ادا ہو جائے کہنے میں تو یہ تعریف بہت اچھی معلوم ہوتی ہے لیکن جب اس کو غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ صرف ایک مغالطہ ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ شاعری سیکھنے کے لئے ایک مبتدی کو استادوں کے دیوان کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ جب شعر کہے تو دوسرا مصرع ہمیشہ پہلے کہہ لے اور دوسرا مصرع بعد میں۔ ایک قافیہ لے کر اسمیں شعر کہے پھر اُس قافیہ کو لے کر کسی دوسرے خیال کے ساتھ باندھے۔ اسی طرح چار پانچ مرتبہ ایک ہی قافیہ پر طبع آزمائی کرے۔ تین چار مرتبہ تو وہ دوسرے کے خیالات کو نظم کرے گا۔ لیکن ایک ایسا وقت آجائے گا کہ اُسکے خیال میں ایک اچھوتا پن

نظر آنے لگیگا۔ اور وہ رفتہ رفتہ شاعر اور اُستاد ہوجائے گا۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے اصول بتائے گئے ہیں۔ ممکن ہے کہ کسی کی طبیعت کے لئے یہ اصول موافق و کارآمد ہوں۔ لیکن یہ کلیہ کہاں تک ماننے کے قابل ہے غور طلب بات ہے۔ شاعری سیکھنے کے معنی یہ ہوئے کہ صحیح معنی میں شاعری سیکھنے سے آسکتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ شاعری شروع ہی سے شعریت کا دماغ لے کر آتا ہے۔ اسکی خلقت اور فطرت شاعر ہوتی ہے اور وہ خود مجسم شعر بن کر آتا ہے۔ اُس کے لئے سیکھنے کی ضرورت نہیں۔ اس سے خود بخود شعر موزوں ہوجائے گا۔ ترنم اُس کی گھٹی میں پڑا ہوگا۔ اور وہ اسی دھن میں لگا رہیگا۔ ہاں! فن شعر اور فن موسیقی حاصل کرنا یہ شاعری اور موسیقی کی تکمیل ضرور ہے۔

اسمیں شک نہیں کہ عام طور سے غزلیں اُسی طریقے سے کہی جاتی ہیں جو اوپر بیان ہوا ہے اور کبھی دوسرا جیسا وقت ہو۔ اب آمد اور آورد میں فرق یہ رہجاتا ہے کہ اگر قافیہ اور ردیف شگفتہ ہے تو کہدیا کہ شعر میں آمد ہے ورنہ آورد۔ اس کو ایک مثال کے ذریعہ سے یوں سمجھئے۔ جناب منیر شکوہ آبادی کا جن کو مسلم الثبوت اُستاد مانا گیا ہے دیوان اُٹھاکر دیکھئے کیا کہتے ہیں۔ مطلع دیوان ملاحظہ ہو ؎

سہ تاج روح نام ہے رب کریم کا چوٹی عروس جاں کی ہے دنبالہ میم کا

اس دیوان کی طرحیں ملاحظہ ہوں۔ ع

بانکڑی مانگی تو حاضر کھنکھجورا ہوگیا

یہ اکیس شعروں کی غزل ہے اور شاید ہی کوئی قافیہ ایسا ہو جو نہ استعمال کیا گیا ہو۔ اب چند طرحیں اور سن لیجئے

"ہمارے اُن کے رہے پردہ کفن میں نشست۔" "چوب مورلنگ پر سیکھیں سواری بیڑیاں"
"نکل کر ناریل سے آگئی اکسیر خشکی میں"۔ "رکھنے نہ پھونک پھونک کے محشر میں صور پاؤں"
"سب سے عنقا کھیل یہ دیہی کبوتر کھیلتے"۔ "ڈھالی صراحی آہوئے مشکیں نے جست کی"
"شب کو خموشی دن کو تراش"۔ اسی طرح نہ معلوم کتنی طرحیں ہیں۔

آپ اس کو کُہنہ مشقی۔ کاوش۔ بلند خیالی اور اس سلسلے میں ہر شعر کو آمد کی ایک کڑی تصور کریں لیکن میں تو اس کو آورد ہی کہوں گا۔ یہیں پہونچ کر معلوم ہوجاتا ہے کہ شاعری اور چیز ہے اور کہنہ مشقی اور چیز۔ ذوق کی ایک غزل کا مطلع ہے ؎

بلبل ہوں صحن باغ سے دور اور شکستہ پر پروانہ ہوں چراغ سے دور اور شکستہ پر

آپ کہیں گے کہ یہ تو کچھ بھی نہ ہوا۔ میں کہوں گا بہت کچھ ہوا۔ بھلا اس خارستاں سے اور کون سے گلدستے بنتے۔ آپ سوال کریں گے کہ اس سے فائدہ۔ میں عرض کروں گا کہ پہلوان کی ورزش ہے

آخر میں ایک اُستاد کا یہ شعر بھی سن لیجئے ؎

آنکھ میں سرمے کا دنبالہ بنا کر بولے
کیوں عصا ٹیک کے ہو جائے کھڑی میری آنکھ

اس شعر میں ردیف "میری آنکھ اور کھڑی"۔ پڑی۔ لڑی وغیرہ قافیے میں۔ زمین مشکل ہے لیکن اتنی مشکل نہیں کہ ایسے خراب پھل نکلیں۔ یہاں اتنا فرض کر لینا پڑے گا کہ آنکھ کو نرگس بیمار بھی کہتے ہیں۔ نرگس کے لفظ کو شاعر نے نظر انداز کر دیا۔ صرف بیمار خیال میں رکھا۔ بیمار عصا ٹیک کر چلتا ہے۔ اسی طرح اور چیزوں کو جمع کیا۔ بس شعر بن گیا۔ شعر کتنا ہی بیکار کیوں نہ ہو۔ لیکن اُسے پڑھ کر آپ ہنسینگے ضرور، اور شاعر کی محنت کی داد بھی ضرور دیں گے۔ آنکھ کے سلسلے میں دو تین شعر ایسے بھی سن لیجئے، اور شاعری کی کسوٹی پر اُن کو جانچئے۔ اسوقت آپ کو معلوم ہو گا کہ یہ شعر کیسے ہیں۔ اصغر گونڈوی کہتے ہیں ؎

بکھری ہوئی ہو زلف بھی اس چشم مست پر
ہلکا سا ابر بھی سر میخانہ دیکھتے

بھلا کون کہے گا کہ اس شعر میں آمد نہیں۔ اسی مضمون کا ایک اور شعر سُنئے، جسمیں آمد اس سے زیادہ ہے

کیفیت چشم اسکی مجھے یاد ہے سوداؔ
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

لیکن میرؔ کے اس شعر میں آمد ہی آمد معلوم ہوتی ہے ؎

میرؔ ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

یہاں تک تو جو بحث ہوئی وہ اُردو شاعری کی اس قسم کی بابت ہوئی جسمیں ردیف اور قافیہ امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ مثلاً غزل، قصیدہ اور اسی قسم کی دوسری چیزیں ہیں۔ جنمیں وہی ردیف، قافیے بار بار دہرانے پڑتے ہیں۔ یہاں ہم کو یہ معلوم ہوا کہ شاعر قافیہ کو چھوڑ کر خیال سے شعر بناتا ہے۔ بلکہ قافیوں سے خیال قائم کرتا ہے۔ اور اس پابندی میں بھی شاعر اگر صحیح معنوں میں شاعر ہے تو اس کی طبیعت سے شگفتہ اور برجستہ شعر نکل جاتے ہیں۔ دو شعر جناب مجذوبؔ کے سنئے ؎

عیاں حالِ دل بے بیاں ہو رہا ہے
کہ عاشق سراپا زباں ہو رہا ہے

پلا دی ہے باتوں ہی باتوں میں اتنی
کہ آنکھوں سے دریا رواں ہو رہا ہے

جگرؔ مراد آبادی کے شعر ہیں ؎

نگاہوں سے چھپ کر کہاں جائیے گا
جہاں جائیے گا ہمیں پائیے گا

ہٹا کر ہمیں آپ پچھتائیے گا
کمی کوئی محسوس فرمائیے گا

جناب رضاؔ کے بھی تین شعر سن لیجئے :۔

متصل طفلی سے آغازِ شباب
خواب کے آغوش میں بیداریاں

دردِ دل اور جاں لیوا پرسشیں ایک بیماری کی تیمار داریاں
عشق اور قیدیں یہ رسم و راہ کی اے دُنیا اُف ری دنیا داریاں

آپ کہیں گے کہ ان کے قافیے مشکل نہیں ہیں۔ اچھا اب کچھ ایسے شعر بھی سن لیجئے جو باوجود مشکل قافیوں کے نہایت چست اشعار ہیں۔ فراقؔ گورکھپوری کا شعر ہے ؎

قفس سے چھٹ کے وطن کا سراغ بھی نہ ملا یہ رنگ لالہ و گل تھا کہ باغ بھی نہ ملا

غالبؔ کی بیسوں غزلیں ایسی ہیں کہ جن کی زمینوں میں سیکڑوں شعرا نے طبع آزمائی کی لیکن مشکل سے وہ غالبؔ کی برابری کر سکے۔ بھلا ذیل کے مطلعوں سے شروع ہونے والی غزلوں میں کون سا شعر ایسا ہے جس میں آورد معلوم ہوتی ہے ؎

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں
کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو
نکتہ چیں ہے غمِ دل اُسکو سنائے نہ بنے کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے
دستِ غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئینگے کیا

یہ صحیح ہے کہ شاعری اکتسابی چیز نہیں ہے بلکہ فطری ہے۔ شاعر بنائے نہیں جاتے بلکہ پیدا ہوتے ہیں۔ اسی بنا پر شعرا کو تلامیذ الرحمٰن کہا گیا ہے۔ لیکن تربیت، اکتساب اور مشق سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لوگ کہتے ہیں کہ انیسؔ کو فطرت نے شاعر بنایا تھا۔ اور دبیرؔ خود شاعر بنے۔ میں کہتا ہوں یہ درست ہے مگر دنیا دبیرؔ کے رنگ کا جواب بھی پیش نہ کر سکی۔ غرض فطرت کی فیاضیوں سے انکار نہیں ہو سکتا۔ اور تربیت اور اکتساب کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بعض مرتبہ شعر پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح درجہ بدرجہ ترقی کر کے شعر کو اس منزل پر پہونچایا گیا ہے۔ پہلے اس کا خاکہ یہ تھا پھر یہ ہوا اور پھر مکمل ہو کر فتنۂ قیامت بن گیا۔ لیکن اس قسم کی تنقید میرے خیال میں جہاں دلچسپ ہے۔ وہاں شاعری پر ظلم بھی ہے۔ اور شعر کے حسن کی مٹی پلید کرنا ہے۔ انگریزی شاعر براؤننگ نے اپنی محبوبہ کے نازک ہاتھ کی ایک اچھوتی اور لاجواب تشبیہ دی ہے۔ کہتا ہے کہ تیرے سفید بازوؤں میں سُرخی اس طرح جھلکتی ہے جس طرح سنگ مرمر پر گلاب کی روح چھڑک دی گئی ہو۔ اگر آپ اُس کے ہاتھ کا پوسٹ مارٹم کر کے اس کے حسن کا تجزیہ کریں تو میں کیا کہوں۔ بس اسی طرح یہ سمجھ لیجئے کہ شعر کا پوسٹ مارٹم کرنا اس شعر کی زندگی کو خاک میں ملا دینا ہے۔ یوں ڈاکٹروں کے لئے تو مردہ بھی کارآمد ہوتا ہے۔

غرض آمد اور آورد یہ ایک ایسی چیز ہے کہ جس کا امتیاز مشق سخن کے بعد ذرا مشکل ہوجاتا ہے۔ اسمیں کوئی شک نہیں کہ بعض بعض شاعر مشق سخن کی ایک صدی پوری کرکے بھی وہ بات حاصل نہیں کرسکتے جو ایک فطری شاعر بہت تھوڑے عرصہ میں حاصل کرلیتا ہے۔ اب اس کو آپ فطرت کی فیاضیاں کہئے یا کچھ اور۔ بہر حال واقعہ یہ ہے کہ کچھ شاعر پیدا ہوتے ہیں اور کچھ شاعر بن جاتے ہیں۔ آپ کہیں گے کہ آخرالذکر شاعر نہیں ہوتے۔ میں عرض کروں گا کہ جو اکتساب سے شاعر ہوتے ہیں وہ اُن لوگوں میں نہیں ہوتے ؎

کہ میں جا ہی ڈھونڈ تا تری محفل میں رہ گیا

بلکہ وہ بھی اپنے لئے ایک مستقل جگہ پیدا کرلیتے ہیں[1]۔

دُکھ کے لمحے

از مسٹر شانتی سروپ کیف

تارے ڈوبے، سُورج نکلا، رات گئی اور ہوا سویرا
ابتک ڈولت ہے آوارہ سا بِن ساجن کے مَن میرا
رات کٹی تھی نینوں میں اب دِن بِتانے ہے گھیرا

بیچ ندی کے، نیا اوپر، دُور بانسری کوئی بجاوے
دھیمی دھیمی بنسی کی لَے میرے دِل میں اُتری جاوے
ایسے میں پھر روگ برہ کا کُھن کی نیائیں مَن کو کھاوے

ساون روتے بیت گیا ہے، بھادوں دیکھیں کیسا آئے!
چین نہیں ہے مَن کو کہیں بھی ہردم اُسکی یاد ستائے
ایسا ہو، میں اُس کو بھلادوں اُسے سجن جو موہے بھلائے

---

[1] بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن لکھنؤ ۔ ا۔ز

نقشِ بے ثبات

(از شیخ محمد یوسف صاحب ظفر، بی، اے)

اُٹھا ہوں پچھلے پہر رات کی خموشی میں — فلک ہے محو ستاروں کی گرمجوشی میں
فلک پہ چاند ہے پہرے میں ابر پاروں کے — تمام پڑ گئے مدھم چراغ تاروں کے
مغنیوں کے پپوٹے ہیں نیند سے بوجھل — مچی ہوئی ہے فضاؤں نسیم سے ہلچل
سُبک سُبک ہے ہر اک چیز ماہ، نور، ہوا — شرابِ کیف میں ڈوبی ہوئی ہے اب دُنیا
وہ ایک حور نے آنچل اُٹھایا بادل کا — ہے چاند اوٹ میں اور رنگِ نور ہے ہلکا
چھلک رہی ہے خموشی شراب خانوں سے — گزر رہا ہے مسافر حسیں چٹانوں سے
چلی وہ نازسے بدلی، وہ سرسرائی ہوا — وہ پیڑ جھوم گئے وہ کلی کا دل دھڑکا
وہ نور خیز ہے مغرب شعاعِ ایمن سے — اُچک کے دیکھا وہ سایوں نے زرد چلمن سے
وہ ابر چاک ہوا، وہ کرن ادھر آئی — وہ مہ نے غرفۂ سیمیں سے شکل دکھلائی
وہ ماہ اُبھرا، وہ ظلمت نے پر سمیٹ لئے — گلوں نے نور کی چادر میں مُنھ لپیٹ لئے
وہ ٹمٹمائے ستارے، وہ تب بے خودی اُٹھی — وہ یاس ڈوب گئی، وہ اُمید جی اُٹھی

وہ چاند پھر ہے فسانہ نگارِ خاموشی
یہ دار، دارِ فنا ہے کہ دارِ خاموشی

عجیب حال ہے نقش و نگارِ ہستی کا — بلندیوں سے نکھرتا ہے رنگ پستی کا
یہاں نہیں ہے کسی شئے کو بھی قرار نہیں — خوشی خوشی ہے، یہاں غم بھی پائدار نہیں
کبھی ہے نور کے پرتو میں تیرگی کا خرام — کبھی ہے نار کے ہونٹوں پہ آہِ نیلی فام

کبھی سکوت نے پرچم فضا میں کھول لئے کبھی سرودِ شبینہ نے دل ٹٹول لئے
کبھی کبود ہے رنگِ فضا کبھی زریں کبھی فلک ہے زمیں پر کبھی فلک پہ زمیں
کبھی نیاز میں نازِ حبیب ہے مضمر نظر سے دُور تو دل کے قریب ہے مضمر
کبھی ہے مہر کی تابش کبھی ہے ماہ کا رنگ جہانِ زیست ہے گویا نگارِ شش از رنگ
گھڑی میں کچھ ہے گھڑی میں ہے کچھ خیالِ بشر جو محوِ خواب ہے اب کل ہے وہ شہِ خاور
جو کیفِ مے ہے نہیں ہے وہ کیفِ مدہوشی جُدا ہے لطفِ ترنم سے لطفِ خاموشی

ہے گرچہ ناظمِ فطرت کا انتظام وہی
نہیں ہے حسنِ سحر اور حسنِ شام وہی

سکون کہتے ہیں ہم جس کو بے سکون ہے وہ تغیرات کی ہر آرزو کا خون ہے وہ
اسی سے سلسلۂ کائنات جاری ہے اسی سے شغلِ حیات و ممات جاری ہے

ظفر یہ دل کے اُفق پر طلوع ہوتا ہے
کہ ہر فسانہ اسی سے شروع ہوتا ہے

اعجازِ کلام

(از مولوی محمد یعقوب خاں کلام بی اے)

عشق کی کائنات میں کون نہیں ہے کیا نہیں؟ دیر نہیں، حرم نہیں، بت نہیں، یا خدا نہیں
تجھ پہ دلِ ستم نصیب کون ہے جو فدا نہیں ناز نہیں، ادا نہیں، جور نہیں، جفا نہیں
دہر کے ذرہ ذرہ کی حسن تضاد ہے اساس درد نہیں، دوا نہیں، موت نہیں، بقا نہیں
کنجِ لحد بھی ہے عجب، گوشۂ عافیت نواز غل نہیں، غلغلہ نہیں، ڈر نہیں، دغدغا نہیں
عشق بغیر زندگی، خوانِ طعام ہے، مگر آب نہیں، نمک نہیں، لطف نہیں، مزا نہیں
واقفِ حالِ مرغِ دل کون نہیں ہے باغ میں گل نہیں، بلبلیں نہیں، غنچے نہیں، صبا نہیں

کس کو سنایئے کلام قصۂ وارداتِ دل
جوش نہیں، جگر نہیں، ہوش نہیں، وفا نہیں

پریم چند کی ادبی روش

از ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ ایم۔اے پی ایچ ڈی ڈی لٹ

پریم چند کے ہاں لکھنؤ میں مہمان تھا۔ رات کو بات چیت میں بارہ بج گئے۔ سوتے وقت آپ نے فرمایا۔ صبح کے بجے اٹھنا چاہتے ہو؟ میں نے عرض کیا۔ معمولاً ۷ بجے صبح اٹھتا ہوں۔ کل شاید ذرا دیر ہو جائے۔" فرمایا۔ "میری آنکھ صبح پانچ بجے کھل جاتی ہے"۔ میں پانچ کے قریب پیشاب کی حاجت سے اٹھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ آپ بیدار ہیں اور آلتی پالتی مارے ایک کمبل پر بیٹھے ہیں۔ سامنے منشیانہ وضع کا چھوٹا سا ڈیسک رکھا ہے اس پہ ایک رجسٹر ہے اور حضرت لکھ رہے ہیں۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ایک کہانی ختم کرنے کی فکر میں ہیں۔ اسکے بعد بچوں کے لئے جو رامائن لکھ رہے ہیں اُس پر ہاتھ صاف کریں گے۔ مجھے تعجب ہوا کہ کس طرح ایک شخص ایک ہی وقت میں متعدد مضامین اور مختلف موضوع پر خامہ فرسائی کر سکتا ہے۔ میری حالت یہ ہے کہ ایک دو بیٹھک میں جو چاہے لکھ لوں۔ اس سے زیادہ نشستوں میں دماغی تسلسل قائم نہیں رہتا۔ میں نے اُن کے پابندی اوقات اور تسلسل خیالات کی داد دی اور اپنی نااہلیت کا اظہار کیا ؎

دن کو بتوں کی یاد ہو شب کو خدا کی یاد ہو انضباطِ وقت تو لطفِ حیات ہے

(۲)

"یادگار پریم چند" میں جو دفتر زمانہ سے شائع ہوئی ہے دو چار ایسے اقتباسات ہیں۔ جن سے پریم چند کی روش ادب اور معراجِ ادب پر خوب روشنی پڑتی ہے۔ وہ بھی اس بات کے قائل تھے اور میرا بھی یہی عقیدہ ہے کہ بدی میں جو نظر فریبی ہے وہ نیکی میں نہیں۔ مگر طبعاً و فطرتاً وہ نیکی کی تحریک میں سعی کرتے تھے اور بندہ بدی کی ظاہری دلکشی کے پردے کو اُلٹنے کی فکر میں رہتا ہے۔ عملی حیثیت سے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ تو اچھے کریکٹروں کی تصویر کشی میں محو رہتے تھے اور میں سوسائٹی کے اوباشوں ملعونوں اور مطعونوں کو بے نقاب کرنے میں مصروف رہتا ہوں۔ یوں بھی زندگی میں انھوں نے سماج کے تاریک پہلوؤں سے کم واقفیت حاصل کی اور جیسے نیک خود تھے ویسے ہی نیکوں کے اعمال کا مطالعہ و مشاہدہ کیا۔ اُن کے اقوال ملاحظہ ہوں اور میرے اشعار۔ پھر ایک واقعہ اپنے نظریہ کے ثبوت میں عرض کروں گا۔

"یہ عجب بات ہے کہ نیکی میں جتنی نفرت ہوتی ہے بدی میں اتنی ہی رغبت"

"عالم عالم کو دیکھ کر، سادھو سادھو کو دیکھ کر، شاعر کو شاعر دیکھ کر جلتا ہے۔ ایک دوسرے کی صورت نہیں دیکھنا چاہتا۔ مگر جواری جواری کو دیکھ کر، شرابی شرابی کو دیکھ کر، چور چور کو دیکھکر ہمدردی جتاتا ہے، مدد کرتا ہے!"

فقیر نے لکھا ہے:۔

ہیچ دُنیا و کارِ دُنیا ہیچ ___ پھر بھی نیکی بدی سے بہتر ہے

نظرکش، دلفریب اور قوت افروز ___ مگر با ایں ہمہ کیا ہے بدی میں؟

رندوں میں باہم اگر ہے کسقدر ربط و سلوک ___ اجنبیت سی دکھائی پارساؤں میں ہیں

خود عوام آئیں گے صد شوق سے نیکی کی طرف ___ بے نقاب آپ بدی کرکے دکھائیں تو سہی

باہر ہوا محیطِ مشیت سے وہ کہاں ___ شیطان کی سرکشی ہے رضائے خدا کا راز

انہی دنوں جب پریم چند "مادھری" کی عنان ہاتھ میں لئے تھے۔ میرے ہندی افسانوں کا ایک مجموعہ کانپور سے "سدا گلاب" کے نام سے شائع ہوا۔ مرحوم گنیش شنکر میرے نفسیاتی تجزیہ کے بہت مداح تھے۔ خود پریم چند نے میرے ایک ہندی ڈرامہ "خدا اور شیطان" کو مادھری میں شائع کرتے وقت مجھے برنارڈ شا کی بعض خصوصیات پر حاوی، اور اُن کا حامل لکھا۔ مگر اس مجموعہ کے ریویو میں اُنھوں نے لکھا کہ:۔

"موہن سنگھ سنکیت کلا میں سدھستھ ہیں" (یعنی رمز و کنایہ اور اشارت میں کامل فن ہیں) لیکن سماج کو ایسے افسانوں کی کوئی ضرورت نہیں، جن کے ہیرو ڈو بیویوں کے خاوند کو کین فروش ہوں اور اپنی زیر تعلیم شاگردہ کو لے بھاگیں۔ پریم چند ایسے ہیروؤں سے دُور بھاگتے تھے۔ اُن کے ہیرو بدی میں اپنے کمال دکھانے سے قاصر رہتے ہیں۔ بدی سے اُنھیں اسقدر نفرت تھی کہ وہ اس کی دلفریبیوں سے بھی نہ زندگی میں کوئی واسطہ رکھنا چاہتے تھے اور نہ ادب میں۔ بدکاروں کے اعمال کی تہ میں کام کرنیوالے جذبات، واقعات، اسباب اور ذمہ داریوں پر وہ نظرِ غائر ڈالنے سے قاصر رہتے تھے۔ میں عمل بد کی تہ میں بہت سی سماجی، خلقی اور خدائی مجبوریاں پنہاں دیکھتا ہوں۔ اسی سے مجھے بُرائی سے ایک ہمدردی سی ہے۔ پریم چند نیکی کی طرف راغب کرنے کے لئے نیکی ہی کی خوش انجامی کے گُن گاتے تھے۔ میں بدی کو انسانی کمزوری، خامی و بدذوقی سمجھتا ہوں۔ وہ اسے گناہ تصور کرتے تھے۔ چنانچہ ہندو سماج اور مذہب کی کمزوریوں خامیوں اور بدذوقیوں کو وہ اپنے افسانوں میں جرأت کرنا سماج اور مذہب کے خلاف جُرم اور گناہ سمجھتے تھے۔[1]

---

[1] واقعات سے اس خیال کی تائید نہیں ہوتی۔ پریم چند ہندو سماج کی نکتہ چینی میں کبھی (باقی اگلے صفحہ کے حاشیہ پر)

اُن کی ناوقت موت کچھ ہی مدت پیشتر جب میں نے پریم چند کو پروگریسو رائٹرس ایسوسی ایشن سے وابستہ پایا تو مجھے بہت تعجب ہوا۔ وہی پریم چند جو ۲۶-۱۹۲۷ء میں میری کہانیوں کو ملک اور قوم کے لئے سم قاتل بتا چکے تھے۔ چند ہی سال کے بعد ایک ایسے حلقہ میں شامل ہو گئے۔ جس کا اگر واحد نہیں تو ایک خاص مقصد سماج کے تاریک سے تاریک پہلوؤں کو روشنی میں لانا ہے۔ مگر انقلابِ زمانہ سے کیا کیا رونما نہیں ہوتا۔

——— (۳) ———

لکھنؤ کے قیام یا کم سے کم ہماری ملاقات کے وقت تک پریم چند کے افسانوں کا صرف ایک مجموعہ "پریم پچیسی" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ دورانِ گفتگو فرمایا کہ "اب یہی ہوس ہے کہ ایک چالیسی اور شائع ہو جائے"۔ میں سن کر خاموش رہا۔ اور دل میں میں نے سراہا کہ تھوڑا لکھنا چاہتے ہیں مگر عمدہ۔ اپنی ایجی کی چیز سے واسطہ رکھتے ہیں اور ترجمہ اور اِدھر اُدھر کی کوڑی کے حصول سے پرہیز۔ ایک خط میں بھی لکھا ہے:

"یہ ضرور چاہتا ہوں کہ دو چار بلند پایہ کتابیں چھوڑ جاؤں۔ افسانوں اور ناولوں کے علاوہ جو کچھ لکھا وہ کسب روزی کے سلسلہ میں لکھا مگر بہ امر مجبوری اور بہت تھوڑا"۔

ورنہ انہی کے معاصرین میں درجنوں کو ہزاروں لاکھوں صفحات لکھکر بھی تشفی نہیں ہوئی۔ ہوس کی درازدستی کی حد نہیں، خصوصاً بڑھاپے میں تو ہوس عورت کی طرح مرد پر بے طرح غالب آجاتی ہے اور وہ اس بات کو بھول جاتا ہے کہ اب جوانی ہو چکی اور ادب کی ناز برداری اور اس سے کلیلیں کرنے کا وقت نہیں رہا۔ اب تو خامہ فرسائی اور دماغ سوزی اور رجانکاہی کے کفارہ کا وقت ہے۔ مگر اس بات کو کون سوچتا ہے؎

دیوانہ رُعبِ حسن سے چپ تھا شباب میں — پیری میں ہو کے شکوہ سرا چاہتا ہے کیا؟
کوتاہ دست جب خمِ پیری سے ہو چکے — حرص و ہوس کچھ اور درازآستین ہوئی

——— (۴) ———

"جب وقت آجائے گا تو معین و مددگار از خود پیدا ہو جائیں گے"۔

آجکل یہ حالت عام ہے کہ مصنف صاحب نے ناظرین اور آنے والی نسلوں کے ہاتھوں سے فیصلہ چھین کر مقدمہ نگار، تنقید نویس اور دیباچہ طراز سے منہ مانگی تعریف کرالی۔ مگر اس پر بھی پیٹ نہیں بھرتا۔ اور دوستوں سے تحریک کی جاتی ہے کہ رسالوں میں مضامین لکھیں۔ ریڈیو پر تقریر کریں۔ ادبی انجمنوں میں

(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ) پس و پیش نہیں کرتے تھے۔ البتہ اُن کی نکتہ چینی مجاہدانہ رنگ کی نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ ایک دردمند دل کی نکلی ہوئی آہ معلوم ہوتی تھی۔ دوسری شادی بال بدھوا سے کر کے انھوں نے عملی حیثیت سے بھی ہندو سماج کے ظلم و ستم کی علانیہ مخالفت کی۔ ایڈیٹر

مقالے پڑھیں اور درسی نصاب میں اُن مطبوعات کو داخل کرائیں۔ اِس طرح یہ بیچارے اپنی شہرت دوام کے ذلیل حقیر تھوڑے ہی عرصہ تک رہنے والی تجاویز پر عمل کراتے ہیں۔ پریم چند کی ادیبانہ روش اسکے بالکل برعکس تھی۔ وہ اتنا بھی نہ پوچھتے تھے کہ بھائی تم نے میری کونسی تصنیف دیکھی ہے کس کو پسند کیا؟ چہ جائیکہ ملاقات میں زبانِ شوق سے پہلا سوال یہی ہو: "کہئے صاحب ہمارا تازہ ترین افسانہ بھی آپ نے نگار میں دیکھا؟ آپ نے وہ مضمون بھی دیکھا جسمیں فراقؔ گورکھپوری نے میری زبان کی دل کھول کر داد دی ہے؟"

پریم چند سے میری خط وکتابت کافی عرصہ تک رہی۔ مگر اُنھوں نے کبھی مجھے اپنے بارہ میں لب کشائی کو نکھا نہ میری رائے چاہی۔ یہ نہیں کہ انھیں میری رائے کی قدر نہ تھی۔ بلکہ اُن کا عقیدہ یہ تھا کہ وقت آنے پر اُن کی تصانیف کی قدر ہو کے رہیگی، اور غیب سے اس کے سامان پیدا ہو جائیں گے یہ عقیدہ خُدا کے انصاف اور اپنی بے لوث خدمت میں یقین پر مبنی تھا۔ وہ خوب جانتے تھے کہ زمانہ بہترین مُنصف ہے۔ آیندہ والوں پر موجودہ تعلقات کا کوئی اثر نہ ہوگا بلکہ وہ ہر چیز کو مناسب نقطۂ خیال سے دیکھیں گے تو خود ہی دوستوں اور بہواخواہوں کی بیجا خوشامد کو بجا تعریف سے الگ کرلیں گے۔

خُدا کی کارسازیوں کے اسمیں چند باب ہیں ہے اور کیا ہماری باوقار داستاں میں

یقین ہے زینۂ معراج اپنا عمل کیا ہے عمل کی ہے جزا کیا

(۵)

میری دُعوت تا ملاحظہ ہو کہ آج تک پریم چند کی کہانیوں میں دس بیس سے زیادہ نہیں دیکھیں اور ناولوں کو تو چھوا بھی نہیں۔ اُس پر بھی زعم ہے کہ پریم چند کی نبض خوب پہچانتا ہوں اور اُس کی ادبی حدود ناپے بیٹھا ہوں۔ کس طرح؟ پریم چند سے ایک ملاقات اور ان کے ایک افسانہ کے مطالعہ کے بل پر۔ ستائیس برس پہلے کا واقعہ ہے۔ میں سیالکوٹ ہائی اسکول میں تعلیم پاتا تھا۔ وہاں سے اپنے ہم درس دوست پنڈت بہاری لال کے گاؤں میں گیا۔ جہاں مسٹر شیو لال چاولہ جو ہم سے ایک درجہ پیچھے تھے رہتے تھے۔ اُن کے گھر پہونچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک رجسٹر میں منجملہ دوسری چیزوں کے پریم چند کی ایک کہانی "گنگا کے چراغ" بھی منقول ہے۔

پریم چند کی ہمہ گیری ملاحظہ ہو اور چاولہ صاحب کا شوق۔ اُن صاحب کا شوق تو اب بھی جاری ہے چند سال ہوئے، شملہ میں ایک کاپی نکالی اور پنجابی زبان کے چند نہایت پُر لطف دیہاتی گیت پڑھکر سُنائے

Due Perspective. ۱؎

میں اُس کہانی پر ٹوٹ پڑا اور اُسے ختم کرکے دم لیا۔ اُس عہد کے یارانِ غار کی صورتیں دھندلی ہوگئیں، مگر میرے حافظ اور میرے دل میں اُس کہانی کا روشن اثر ابھی تک محفوظ ہے۔ دو باتیں قابلِ غور ہیں۔ پریم چند کی حُسنِ عقیدت وفرطِ اعتقاد اور اُن کی دیہاتی زندگی اور جوانی کی اثرگیری۔ اُنھوں نے جب یہ کتاب لکھی ہوگی تو اُن کی عمر تیس۳۰ سال کے قریب ہوگی عین شباب کا عالم تھا مگر اُس وقت بھی پر جہاں دیدہ کی پختہ مغزی کا جلوہ نمایاں تھا۔ نہ معلوم اُنھوں نے ہردوار کا کب سفر کیا اور کن حالات میں گنگا کے چراغ دیکھے۔ یا ممکن ہے، لبِ گنگا کسی اور شہر میں چراغ دیکھے ہوں۔ مگر سبحان اللہ کیا دیکھا اور کیا دکھایا۔

گذشتہ ستائیس۲۷ برس میں جب کبھی ہردوار جانا ہوا ہے تو وہاں کے بندر بھی دیکھے اور گنگا کے چراغ بھی یعنی کشاکشِ زیست کا بھی جلوہ دیکھا اور سکونِ مرگ کا بھی۔ دونوں اپنی جگہ پُرلطف ہیں۔ وہ مختصر کہانی اُس اتھاہ پیار کا طولانی ثبوت ہے جو پریم چند کو ہندو تہذیب کے تمام لطیف و موثر شعبوں سے تھا۔ وہ عوام کے نمایندے تھے اور عوام پر اثر ڈالنے کے لئے پرانے ہندوؤں نے جو رسمیات وضع کی تھیں اُن کی محبت ان کے رگ رگ میں ساری تھی۔ ذرا بتائیے کہ اُن سے پہلے کس ہندو مُصنف نے گنگا کے چراغ کی روح پرور رسم کو ادب سے روشناس کرایا ہے؟ میرا تو یہ عقیدہ ہے کہ پریم چند مرکر گنگا کا چراغ ہوگئے جو تٹ پر کھڑے لوگوں کی نظروں سے تو اوجھل ہوگیا ہے لیکن اب بھی اپنی ننھی سی ٹمٹماتی روشنی کی بھینٹ گنگا مائی کی نذر کر رہا ہے۔ ہم سے دور بہت دور ہے لیکن ہم اس کی روشنی کی جھلک دیکھ سکتے ہیں۔ بیوہ پریم چند اگر کبھی ہردوار جائیں تو میرا مشورہ ہے کہ پریم چند کی یاد میں گنگا کے چراغ کی رسم ضرور ادا کریں۔

(۶)

پریم چند نے صرف انھیں اشخاص واقعات اور موضوعات پر قلم چلایا ہے جن میں اُنکو اٹل شردھا تھی اس لئے کہ وہ خود بھی شردھا کے بندے تھے۔ اسی لئے صرف انھیں لوگوں سے ملتے تھے، جن سے مل کر طبیعت خوش اور روح شگفتہ ہو اور نیکی کی طرف طبیعت راغب ہو۔

کانگریس پر اُن کو بیحد شردھا تھی اس لئے کہ کانگریس کا رُخ مشرقی تہذیب و تمدن کے احیا اور دیہات سدھار کی طرف ہے۔ پریم چند دیہات اور ہندو زندگی کی بہترین روایات کو برقرار رکھنا (یا واپس لانا) چاہتے تھے۔ دیہات کی زندگی کا خاصہ سادگی اور ضروریات کی کمی، اخلاق کی پختگی اور سلامت روی ہے۔

کھانا کھا چکے تو پریم چند نے مجھ سے اپنی لڑکی کے لئے ور تلاش کرنے کو کہا۔ میں نے پوچھا۔ کیسا ور چاہیئے؟ کالج میں ہر طرح کے طالب علم موجود رہتے ہیں۔ ٹھیک یاد نہیں کہ انھوں نے کیا جواب دیا۔ مگر اتنا ضرور یاد ہے کہ انھوں نے کسی سادہ مزاج کفایت شعار اور بھلے گھر کے کائستھ کیلئے ہدایت کی۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک معمولی اوقات کا آدمی بھی اپنی لڑکی کے لئے ایک نہایت اعلیٰ اور متمول خاندان کے اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکے کو تلاش کرے جس کی آمدنی پانچ سات سو روپیہ سے کم نہ ہو۔ مگر نہیں پریم چند کو دیہاتی مقولہ یاد تھا کہ "بڑے گھر کی بیٹی چاہے لیلو۔ مگر اپنی بیٹی کو اپنے سے چھوٹے گھر میں دو۔" انھیں خانہ داری کے تجربات تلخ بھی تھے اور شیریں بھی۔ وہ ایک معمولی گھر کو جسمیں خواہ روپیہ کی آور دکم ہو مگر محبت کی آمد زیادہ ایک آئیڈیل گھرانہ سمجھتے تھے۔ ادب میں بھی انکا یہی معراج رہا۔ امیر گھروں کی تنزلزل روش سے وہ گھبراتے تھے۔ میں نے ایک دوست کے بھتیجے سے بات چھیڑی مگر انجام خاطر خواہ نہ ہوا۔ اب رسالہ میں دیکھا کہ لڑکی کئی بچوں کی ماں بن چکی ہے۔ خدا اُن سب کی عمر دراز کرے۔ متوسط درجے کے ہندو گھرانے کے مصائب زندگی سے پریم چند خوب آگاہ تھے اور اُن کی تصویر بڑے مزے سے کھینچتے تھے۔ وضعداری اس درجہ والوں کو بہت مہنگی پڑتی ہے۔ مگر پریم چند نے اسے خوب نبھایا۔

(۷)

پریم چند کی ٹکر کے لکھنے والوں میں پنڈت بشمبر ناتھ کوشک اور بدری ناتھ سدرشن گنائے جاتے ہیں۔ فقیر کو ان دونوں صاحبوں کے قریبی مطالعہ کے مواقع اور دوستانہ مراسم نصیب رہے ہیں۔ کوشک کو احباب کے مستقل حلقہ نے بنایا اور سدرشن کو جہاں نوردی نے۔ کوشک کی طبیعت لاأبالی اور رندانہ ہے۔ سدرشن برہمن ہیں مگر روپیہ کی ضرورت نے انھیں تجارت پیشہ بننے پر مجبور کر دیا ہے۔ ان دونوں کی ادبی روش ادب پریم چند سے مختلف ہے۔ سدرشن ایک حد تک پریم چند کے مقلد ہیں۔ کوشک شروع ہی سے امیرانہ و بے نیازانہ فرصت پرستی کے شیدائی ہیں۔ کبھی جی میں آیا یا کسی کی تحریک ہوئی تو کچھ لکھ دیا۔ کھانے پینے کو خدا نے کافی دے رکھا ہے۔ بھنگ ہے اور کیرم۔ دوستوں کی آؤ بھگت اور خوش گپیاں۔ سدرشن دوسروں کی تجارت چمکانے اور حلال کی کمائی کھانے میں مصروف ہیں۔ پریم چند کو نہ ایسے بے فکرے ادیبوں کی مستقل صحبت نصیب ہوئی اور نہ سیر و سفر ہی کے مزے نصیب ہوئے اور نہ طرح طرح کے مالکوں سے واسطہ پڑا[1]۔ کوشک اور سدرشن کی محرک ادبی یا تو دوسروں کی کہانیاں ہیں

[1] پریم چند جی کا دو تین سال منشی نولکشور پریس سے ملازمت کا تعلق رہا۔ مگر پروپرائٹر مطبع کی قدر شناسی کی بدولت انھیں کبھی ملازمت کی دقتوں سے سامنا نہیں رہا۔ انکی نا وقت وفات کے بعد البتہ وہ باہمی رقابت اور احباب کی ریشہ دوانیوں کے شکار ہو گئے۔ ایڈیٹر

یا دوستانہ تعلقات۔ آزادیٔ وطن کی جنگ میں دونوں نے دلچسپی تو لی لیکن دُور ہی سے لڑائی دیکھتے رہے۔ کھدر پہننے کی بھی نوبت نہیں آئی۔ جیل جاتے یا کسی دوسری قربانی کا کیا ذکر۔ انھیں وجوہ سے پریم چند کا درد ان کے حصّہ میں نہ آسکا۔ مگر عبارت دونوں کی خوب ہے۔ یوں بندہ اُردو والوں کی افسانہ نویسی کا سرے ہی سے قائل نہیں۔ عموماً انھیں نہ روانی ہوتی ہے اور نہ سرگرمی۔ مگر پریم چند کی خاص روش تھی۔ اپنے دل پسند کرداروں اور موضوعات پر وہ ہمیشہ گہری ہمدردی سے طبع آزمائی کرتے تھے۔ دوست بھی اُنھوں نے اپنے مطلب اور اپنی وضع کے منتخب کئے اور اُن سے بوقت ضرورت ہی ملے۔ یہی انتخاب اور تعین اُنھوں نے ادبی میدان میں بھی عام طور پر برتا۔ بات چیت میں جس شغف اور ظرافت سے سروکار تھا اُسی کو قصّوں اور ناولوں میں روا رکھا۔ لکھنے بیٹھے تو قصّہ کو مختصر ناول بنا دیا اور ناول کو ایک پھیلایا ہوا مختصر افسانہ۔ غرض اُن کی روشِ ادب، روشِ زیست کی مکمل آئینہ دار تھی ؎

لایا ہوں اپنے تجربہ کے گلستاں کے پھول خوشبوئے جذبۂ انہیں ہے انہیں چلن کا رنگ

پریم چند کے اقوال

حسد میں دوسروں کو مالدار سمجھنے کی خاص صفت ہوتی ہے۔

بُزدلی ضعف دماغ کی علامت ہے۔

غصّہ سے مدافعانہ قوت کا اظہار ہوتا ہے۔

ناکام مصنف نقاد بن جاتا ہے۔

استقلال کبھی زندہ دلی کی صورت اختیار نہیں کرتا۔ وہ دل پر ایک ایسا سانہ بیزاری کا رنگ پیدا کردیتا ہے وہ سوزِ دل جس سے آنسو تک خشک ہوجاتے ہیں۔

مرگ بے ہنگام ایشور کی سب سے بڑی بیرحمی۔ یہ مصیبت ہمارے اعتقاد کی جڑوں کو ہلا دیتی ہے۔ ہم کو منکر و ملحد بنا دیتی ہے۔ ہم مصیبت کے نظارے آئے دن دیکھا کرتے ہیں اور اُن کے عادی ہوجاتے ہیں لیکن ہماری غم نصیب آنکھیں اِس سانحہ کی متحمل نہیں ہوسکتیں۔ بے وقت موت ہمارے دلوں پر مشیت الٰہی کا سب سے قاتل وار اور ہماری خدا پرستی پر سب سے بڑا ستم ہے۔

جس طرح روشنی کی شعاعیں کسی کثیف شے سے گذر کر منقلب ہوجاتی ہیں۔ اسی طرح نیک ارادے غیر قومی حکومت کی سخت گیری اور حکام کی خود پروری سے مس ہو کر منقلب ہوجاتے ہیں۔ انصاف اور حق پیروں تلے آجاتا ہے۔ اور فرض اور زعم حکومت سر پر جا پہونچتا ہے۔

پریم چند

بندۂ فرض

(از منشی گورسرن لال ادیب لکھنوی، ایم۔ اے)

دنیا جسے کہتے ہیں وہ نیرنگ کی جا ہے — اک رنگ کبھی اس کا رہے گا نہ رہا ہے

شکلوں ہی میں کچھ فرق نمایاں نہیں ہوتا — ہر شخص کی افتادِ طبیعت بھی جدا ہے

کہتا ہے کوئی حسن سے رغبت نہیں اچھی — کہتا ہے کوئی حسن پرستی ہی روا ہے

اربابِ محبت سے جو پوچھو تو کہیں گے — ہر درد کی اک دردِ محبت ہی دوا ہے

کہتا ہے کوئی زہد کو لازم ہے بہر حال — اور بادۂ گلگوں پہ کوئی دل سے فدا ہے

کہتا ہے مساعی کو کوئی عین عبادت — کہتا ہے کوئی جادۂ حق صبر و رضا ہے

الہام کسی کے لئے ہے ویدِ مقدس — قرآن کسی کے لئے پیغامِ خدا ہے

کرتا ہے کوئی پیروی دینِ نصاریٰ — ایمان ہے جو فرمانِ مسیح ابن خدا ہے

کرتا ہے پرستش کوئی انوارِ سحر میں — اور آگ کے پردے میں کوئی پوج رہا ہے

جو ایک ہی مذہب کے کہے جاتے ہیں پیرو — ان میں سے بھی ہر شخص کا اک دین جدا ہے

ہے مجھ کو ادیب اُن سے نہ کچھ اِن سے سروکار — پیغامِ خدا میرے لئے دل کی صدا ہے

کافر ہوں کہ ہوں صاحبِ ایماں نہیں معلوم

میں فرض کا بندہ ہوں مرا فرض خدا ہے

آنکھیں

ہیں جام بکف کسی کی سرشار آنکھیں — ہیں مست و خراب پر ہیں ہشیار آنکھیں

دل لیتی ہیں دے دے کے فریبِ الفت — غافل ہیں مگر کتنی ہیں بیدار آنکھیں

منظور الحق کلیم

واردھا کی تعلیمی اسکیم

از مسٹر سری کرشن سنہا بی۔ اے عثمانیہ

ہندوستان پہلا ملک ہے جہاں روس کے بعد اپنے اقتصادی حالات کے مدِنظر ایک نیا تعلیمی نظام تمام ملک کے لئے تجویز کیا جا رہا ہے۔ ۱۹۱۷ء کے انقلابِ روس کا بانی لینن تعلیم کا حامی اور جہالت کا مخالف تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ ملک کی فلاح و بہبود کا انحصار زیادہ تر تعلیم پر ہے۔ خود ایک مرتبہ کہا ہے کہ:-

"کسی چیز کو زیادہ مقدار میں حاصل کرنے کے لئے اُس کا زیادہ پیدا کرنا ضروری ہے۔ جس کے لئے اِس بات کی ضرورت ہے کہ اُس کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کی جائے۔"

گویا لینن کو تمام ترقی کا راز علم کی اشاعت ہی میں ملا۔ اِسمیں اُس کو روس کی ترقی کے خواب کی تعبیر بھی معلوم ہوئی۔ اِسلئے لینن نے جہالت کی کالی گھٹاؤں کو دُور کر کے تمام ملک میں تعلیم کی روشنی پھیلا دی۔ چنانچہ اُس نے تعلیم کے پُرانے نظام کو یکلخت منسوخ کر دیا۔ کیونکہ اُس کا عوام کیساتھ دُور کا بھی لگاؤ نہ تھا۔ اور اس سے لوگوں کو صرف اوسط درجے کی تعلیم حاصل ہوتی تھی۔ چنانچہ لینن نے پہلے تو آٹھ برس سے سترہ برس کے لڑکے اور لڑکیوں کی تعلیم لازمی کر دی، اور اُس کے ساتھ ہی ہر ایک کے رُجحان کے مطابق دستکاری کی تعلیم بھی ضروری قرار دے دی۔ کیونکہ وہ خود (Learning by doing) یعنی عملی اکتسابِ فن کا قائل تھا۔

اب ہندوستان کے قومی لیڈران بھی تعلیمی نظام میں تبدیلی کرنے کے خواہاں ہیں۔ یوں تو ملک میں ایک زمانہ دراز سے مُفت اور جبری ابتدائی تعلیم کی کوشش تھی۔ چنانچہ مسٹر گوکھلے آنجہانی نے امپیریل کونسل میں اِس مسئلہ کو پیش کیا تھا اور گورنمنٹ سے پانچ کروڑ کی اسپیشل گرانٹ مانگی تھی اُس کے بعد ۱۹۱۶ء میں ہرٹاگ کمیٹی بھی اِسی مسئلہ پر غور و خوض کرنے کے لئے بیٹھی۔ چنانچہ اُس نے یہ تخمینہ کیا کہ برٹش انڈیا میں مُفت جبری ابتدائی تعلیم کے لئے دس کروڑ روپیہ کی ضرورت ہوگی۔ چونکہ گورنمنٹ ہند اِتنی کثیر رقم خرچ کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔ اس وجہ سے ایک عرصہ کے لئے

Lenin.[1]

یہ مسئلہ دب گیا۔ لیکن یہ ضروری مسئلہ کب تک دبا رہتا۔ دنیا کروٹ بدل چکی تھی۔ اسلئے یہاں بھی اکابران قوم چونکے اور کانووکیشن کے خطبات میں تعلیمی نظام کی تبدیلی پر زور دیا جانے لگا۔ گویا ہندوستان میں نظری بیداری ہو رہی تھی اور لوگ تعلیمی نظام کی تبدیلی ضروری خیال کرنے لگے۔ لیکن یہ سب پکار ہی پکار تھی۔ آگے بڑھنے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔

بالآخر مہاتما گاندھی نے جو علم و عمل دونوں میدانوں میں تیز گام شہسوار ہیں، اس طرف توجہ کی۔ ماہرین تعلیم کی ایک کمیٹی مقرر ہوئی جس کے صدر ڈاکٹر ذاکر حسین منتخب ہوئے۔ اس کمیٹی نے ۱۹۳۷ء میں اپنی اسکیم پیش کی جو واردھا اسکیم کے نام سے مشہور ہے۔ اب ہم اسکی خصوصیات کا ذکر کرینگے۔

اس اسکیم کی رو سے سات سال کا کورس ہوگا۔ جو ہر ایک بچے کے لئے سات سال سے شروع ہوکر چودہ سال کی عمر تک ختم ہو جائے گا۔ ہر ماہ میں چوبیس دن کام ہوگا، روزانہ ساڑھے پانچ گھنٹے تعلیم دی جائے گی۔ تین گھنٹے بیس منٹ صنعتی تعلیم اور دو گھنٹے دس منٹ بقیہ مضامین کے لئے مقرر کئے گئے ہیں۔

جو مضامین پڑھائے جائیں گے انمیں سب سے اول کوئی دستکاری ہوگی۔ دستکاری میں نجاری کاشتکاری، بڑھئی کا کام وغیرہ شامل ہیں۔ دستکاری کا مقصد صرف کاریگر پیدا کرنا نہیں بلکہ بچے کی دماغی تربیت ہے، اور دوسرے مضامین کی تعلیم کو دستکاری کی تعلیم سے ایسا جوڑ دیا گیا ہے کہ ہر بچہ جو کام کرے گا اس کے متعلق وہ یہ بھی جان سکیگا کہ یہ کام کیوں اور کس لئے کیا جاتا ہے؟

چنانچہ یہی طریقہ اسوقت جرمنی میں بھی رائج ہے۔ جرمنی میں صنعتی مدارس کے لئے بھی اسی قسم کا نصاب مقرر کیا جاتا ہے کہ جس سے طلبا کو پیشوں کی تعلیم میں مدد ملے اور سہولت ہو۔ مثلاً ایک طالب علم مالی بننا چاہتا ہے۔ تو اس کی ادبی درسی کتابوں میں زیادہ تر درختوں اور باغات کے حالات درج ہوں گے۔ جغرافیہ کی تعلیم میں یہ پڑھایا جائے گا کہ مختلف ممالک میں کون کون سے پھل پیدا ہوتے ہیں اور مختلف پھلوں کے درختوں کی کاشت میں کس قسم کی کھاد دینا چاہئے۔

پروفیسر ڈیوی نے اس طریقہ تعلیم کا نام "پراجکٹ متھڈ" رکھا ہے۔ چنانچہ واردھا اسکیم میں اس کو ملحوظ رکھ کر اس بات کی کوشش کی ہے کہ ہر بچے کو اتنی کافی ابتدائی تعلیم دی جائے کہ وہ آسانی سے روٹی کما سکے۔ اس طریقے میں دستکاری کو تعلیم کی جڑ مانا گیا ہے اور دیگر مضامین کو اسکی شاخیں اور پتے قرار دیا گیا ہے۔

دوسرے مضامین میں سب سے زیادہ اہم مادری زبان کی تعلیم ہے۔ مادری زبان سے مراد

"ہندستانی" زبان سے لی گئی ہے۔ جس کے معنی عام فہم اُردو یا ہندی کے ہوں گے۔ فارسی یا ناگری رسم الخط کا انتخاب ہر طالب علم کے لئے اختیاری ہوگا۔ لیکن "ہندستانی" کی تعلیم سب کیلئے لازمی ہوگی مادری زبان کا معیار خاصہ اونچا ہے۔

تیسرا مضمون ریاضی ہے۔ معمولی ضرب تقسیم کے علاوہ کسر اور کسر عشاریہ۔ سُود۔ پیمائش اور عملی ہندسہ کی تعلیم کافی سمجھی گئی ہے۔ لیکن بہی کھاتہ اور حساب کتاب لکھنے کی تعلیم بھی لازمی طور پر دیجائیگی۔ چوتھا مضمون سماج کے متعلق معلومات ہے۔ جسمیں تاریخ اور جغرافیہ کے عام معلومات کے علاوہ خاص خاص مضامین پڑھائے جائیں گے۔ آپسمیں اچھی اسپرٹ پیدا کرنے کی کوشش کی جائیگی۔ ملک سے ہمدردی اور ملک والوں کی خدمت کرنے پر زور دیا جائے گا۔

پانچواں مضمون سائنس کی معلومات ہے۔ کہانیوں کے پیرائے میں بڑی بڑی ایجادات اور موجدوں کے حالات زندگی بتائے جائیں گے۔ سائنس اور تاریخ کی تعلیم اس طرح ہوگی کہ بنیادی دستکاری سے اُنکا رابطہ ٹوٹنے نہ پائے۔ ان پانچوں مضمونوں کے ساتھ ساتھ ڈرائنگ اور موسیقی کی تعلیم بھی دی جائے گی۔

یہ رہا جبری ابتدائی تعلیم کا ذکر۔ اب ہم اعلیٰ تعلیم کی طرف اپنی توجہ مبذول کرتے ہیں۔ مہاتما گاندھی خود یونیورسٹیوں کی تعلیم کے اتنے موید نہیں جتنے کہ ابتدائی تعلیم کے ہیں چنانچہ بارہا انھوں نے اپنے لکچروں میں اس کا اعادہ کیا ہے کہ ہندوستان کو یونیورسٹیوں اور کالجوں کی اتنی ضرورت نہیں۔ اس لئے جو رقم ملک میں یونیورسٹی تعلیم پر صرف ہوتی ہے' اُسے کسی دوسرے تعمیری کام میں لگایا جائے تو مقابلتاً زیادہ فائدہ ہوگا۔ مثلاً مفت جبری ابتدائی تعلیم۔ اور ترک مسکرات کی تحریک کی کامیابی کے لئے' اگر یونیورسٹیوں اور اُن کے ماتحت کالجوں کو بند کرکے جو رقم اُن پر صرف کی جاتی ہے وہ ان دونوں چیزوں میں لگادی جائے تو اس سے کہیں زیادہ مُفید مطلب نتیجہ نکلے۔ واردھا اسکیم کے حامیوں نے بھی اس رائے سے اتفاق کیا ہے' اور حکومت کو اعلیٰ تعلیم سے کوئی سروکار نہ رکھنے کا مشورہ دیا ہے۔ صرف تھوڑے کالج تجویز کئے گئے ہیں۔ جو مختلف کارخانوں سے ملحق رہینگے۔ مثلاً ٹاٹا کے کارخانہ کے ساتھ انجنیری کالج قائم کیا جائے گا۔ اور مالک کارخانہ اس کالج کے تمام اخراجات کا کفیل ہوگا۔ اور وہ ضرورت کے لحاظ سے طالبعلموں کو داخل کرے گا۔ اور جب وہ فارغ التحصیل ہوجائیں گے تو انھیں اپنے کارخانہ میں جگہ دیدیگا۔ اسی طرح تجویز کیا گیا ہے کہ تاجران ہند کی انجمن سے ایک تجارتی کالج کھولنے کی فرمائش کی جائے۔

جسمیں تجارت کے متعلق تمام باتیں سکھائی جائیں۔ شفاخانوں کے ساتھ میڈیکل کالج قائم کئے جائیں اور اُن کے اخراجات روساء اور امراء کے ذمہ کئے جائیں۔

سرکاری یونیورسٹیاں بھی رہیں گی لیکن بہت کم۔ اُن کا کام امتحان لینا اور مرکزی شعبہ تعلیم کا قائم رکھنا ہوگا۔ حکومت اُن کو کوئی مدد نہ دے گی اور امتحانات کی فیس سے جو آمدنی ہوگی۔ اُس سے اُن کے مصارف چلیں گے۔

غرض وار دھا اسکیم نے اعلیٰ تعلیم والے کالجوں کی کوئی حوصلہ افزائی نہیں کی ہے۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلہ کو ابھی سلجھانا نہیں چاہتی بلکہ کارڈنیل نیومین کی رائے پر عمل کرنا چاہتی ہے کہ اعلیٰ تعلیم آسودہ حال طبقہ کے لئے موزوں ہے۔ بہرحال وار دھا اسکیم نے زیادہ تر ابتدائی تعلیم کی اشاعت پر اپنی توجہ مرکوز کی ہے۔

تعلیمی۔ نفسیاتی۔ سماجی اور معاشی نقطۂ نظر سے اس اسکیم میں بہت سی خوبیاں ہیں۔ اس میں موجودہ نظام تعلیم کے نقائص رفع کرنے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔

نفسیاتی نقطۂ نظر سے اسمیں بچوں کی فطرت کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ بچوں کو کھیلنے کودنے کا شوق پڑھنے سے کہیں زیادہ ہوتا ہے اور ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ ابتدائی تعلیم میں اس چیز کو خاص طور پر ملحوظ رکھا جائے اور تعلیم کو اس طرح ڈھالا جائے کہ بچوں کو محسوس ہو کہ اُن پر زبردستی کوئی چیز عائد کردی گئی ہے۔ بلکہ وہ خوشی خوشی اپنا کام کریں۔ چنانچہ بیشتر ممالک میں اس خیال کی پیروی کی گئی ہے۔ کنڈر گارٹن کے مقبول عام طریقہ تعلیم میں بھی اس کا کافی لحاظ رکھا گیا ہے اور وار دھا اسکیم میں بھی بچوں کو کھیل کود ہی کے پیرائے میں دستکاری کے اہم سبق دینے کی تحریک کی جاتی ہے تاکہ بچوں کو تعلیم کا کوئی بار محسوس نہ ہو۔ اور وہ کھیل ہی کھیل میں تعلیم کے اہم اہم نکات سمجھ لیں۔ ٹیگور نے اپنے ایک معرکۃ الآرا مضمون "My School" میں قدرتی طور پر تعلیم حاصل کرنے کے طریقے پر بہت زور دیا ہے، اور یہ لکھا ہے کہ اگر بچوں کی ابتدائی تعلیم یوں ہی دی جائے تو اس کا اثر بالکل اسی طرح قائم و دائم رہتا ہے جس طرح کہ جگنو کی روشنی اُس کی عمر بھر رہتی ہے۔

عملی کام کی وجہ سے بچہ کو اپنے تمام حواس سے کام لینا پڑتا ہے۔ مثلاً اگر

[illegible] ... only to Leisned Classes at Cardnial NewMann

بنوالیا جائے تو وہ پہلے دماغ سے سوچے گا۔ اور پھر اس نقشہ کو ذہن میں تیار کرکے اُن کو ہاتھوں سے بنائیگا اس طرح اُسے جو معلومات حاصل ہوگی وہ عمیق اور پائیدار ہوگی۔ اس کے برعکس منطقی اور درسی تعلیم کے ذریعہ جو معلومات بچّہ کو حاصل ہوتی ہیں وہ خارجی سطحی اور ناپائیدار ہوتی ہیں۔

سماجی نقطۂ نظر سے جو طریقۂ تعلیم واردھا اسکیم نے پیش کیا ہے وہ نہایت ہی مفید ثابت ہوگا۔ تعلیم یافتہ طبقے میں جسمانی کام کی طرف سے اس وقت عام طور پر جو حقارت پھیلی ہوئی ہے وہ دور ہوجائیگی سماجی تعلیم کی بدولت ہمارے بچّے آپس میں متحد رہنے کا سبق سیکھیں گے۔ تاریخ کی موجودہ شرانگیزیوں کا خاتمہ کرکے قومیت اور حبِ وطن کا احساس جاگزیں ہوگا۔ بچّوں کے دل میں مشاہیر عالم کی بلاامتیاز مذہب و ملت عزت و قدر بیدار ہوگی۔ اس طرح اس تعلیم کے پروردہ ہندو مسلمان لڑکے آپس میں شیر و شکر کی طرح رہیں گے اور اس طرح ہندو مسلم اتحاد کا سوال خود بخود حل ہوجائے گا۔ اور تاریخی پس منظر اور قومیت کی تعلیم کا جو نقصان ہندو مسلم اتحاد میں بہت بڑی حد تک مانع رہا ہے۔ وہ واردھا اسکیم کے ذریعہ پورا ہوجائے گا۔

معاشی نقطۂ نظر سے یہ نظام تعلیم اپنے اخراجات کا خود کفیل ہوگا۔ اگر پوری طور پر نہیں تو کم از کم اخراجات کا ایک معتدبہ حصّہ تو بچّوں کی مصنوعات بیچ کر نکالا جاسکتا ہے۔

اسمیں صنعتی، تجارتی اور زراعتی ترقی بھی مضمر ہے۔ کیونکہ اس طریق تعلیم میں دستکاری کو لازمی قرار دیا ہے جس سے گھریلو صنعتوں کو ترقی ہوگی۔ زراعت بھی سائینٹفک طریقہ پر کی جاسکے گی۔ ان سب چیزوں کی ترقی سے ہندوستان کی حالت بالکل بدل جائے گی۔ اور قدیم زمانہ کی برکتیں حاصل ہوں

اس طریقۂ تعلیم سے بیروزگاری کا بھی سدباب ہوگا۔ یوں تو بیروزگاری ایک زمانہ دراز سے رہی ہے۔ سودا کی مثنوی شہر آشوب اور اکبر الہ آبادی کے بیشتر شعر اس کے شاہد ہیں کہ ہندوستان میں بے روزگاری کی شکایت اسقدر عام ضرور رہی ہے کہ شعرا کی توجہ ہو۔ سپرو رپورٹ نے بھی بے روزگاری کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے روکنے کے طریقے بتلائے ہیں۔ لیکن وہ زیادہ تر تعلیم یافتہ طبقہ سے متعلق ہیں۔ بہرحال واردھا اسکیم کے ذریعہ بہت آسانی سے عام بیروزگاری کا خاتمہ ہوجائیگا۔ کیونکہ ہر شخص میں جسے اس طریقے سے تعلیم دی جائیگی کمانے کی قابلیت پیدا ہوگی۔ کچھ نہیں تو چرخہ کات کر ہی وہ اپنی بسر اوقات کرسکیگا۔

...ب بال کی کھال نکالنے والوں کی کبھی کمی نہیں رہی۔ بات بات پر لڑنا۔ اصولوں سے

قطع نظر جزئیات پر لعن طعن کرنا یہاں کا عام شیوہ ہے۔ ہم لوگوں میں فرقہ واری تعصبات اسقدر غالب ہیں کہ ہماری نظریں ایک دوسرے کی خوبیوں پر پڑتی ہی نہیں۔ اگر کچھ دکھائی دیتا ہے تو بس عیب اور دوسرے کے نقص۔ ایسی صورت میں اگر واردھا اسکیم پر بھی لعن طعن کی گئی، تو کوئی نئی بات نہیں۔ تعصب کی عینکیں لگا کر ہم ہر چیز کو دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ اس لئے واردھا اسکیم میں بھی ہم کو کوئی اچھائی دکھائی نہیں دیتی۔ لیکن اگر غائر نظر سے دیکھا اور انصاف سے غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ واردھا اسکیم میں خوبیاں زیادہ اور خرابیاں کم ہیں۔

سر ضیا آلدین جیسے اصحاب کی رائے میں واردھا اسکیم موجودہ تعلیمی نظام سے بھی زیادہ فرسودہ ہے۔ میں اتنا بڑا دعویٰ تو نہیں کر سکتا۔ لیکن میں نقائص کو جو یقینی بہت کم اور محض جزوی ہیں چھپانے کا بھی خواہاں نہیں ہوں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ جب اس اسکیم کے عملی تجربہ سے اچھے اور خوشگوار نتائج نکلیں گے تو مخالفین کا منہ خود بخود بند ہو جائے گا۔

واردھا اسکیم میں انگریزی تعلیم کو بالکل اڑا دیا گیا ہے۔ یہ امر مسلم ہے کہ غیر ملکی زبان کے سیکھنے میں دقت ہوتی ہے لیکن اسکے معنی یہ نہیں کہ اس کی بین الاقوامی اہمیت پر پردہ ڈال دیا جائے۔ ایک انگریز مصنف نے اپنی کتاب "The Task of Social Hygeine" نامی میں) یہ پیشگوئی کی ہے کہ آیندہ پچاس سال کے اندر انگریزی زبان بین الاقوامی سرکاری زبان ہو جائیگی۔ میرے خیال میں یہ پیشگوئی بڑی حد تک صحیح ثابت ہوگی۔ فی زمانہ بھی انگریزی زبان کو خاصی مقبولیت حاصل ہو چکی ہے۔ ایسی صورت میں واردھا اسکیم میں انگریزی زبان کا قطعی اخراج قرین مصلحت نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ہماری دیسی زبانیں ابھی عالم طفولیت میں ہیں۔ ضرورت ہے کہ انگریزی زبان کا علمی اور سائنٹفک ذخیرہ "ہندستانی" زبان میں منتقل کیا جائے۔

تعلیمی نقطۂ خیال سے بھی، اس اسکیم میں بعض نقائص نمایاں ہیں۔

کسی ماہر تعلیم کا مقولہ ہے کہ "انسان کی تعلیم کا آغاز اسی دن سے ہوتا ہے جب وہ شکم مادر میں آتا ہے اور خاتمہ اس وقت ہوتا ہے۔ جب وہ قبر کی آغوش میں سو جاتا ہے۔"

واردھا اسکیم میں سات برس سے چودہ ۱۴ برس کے ہفت سالہ وقفہ کے کوئی انتظام نہیں کیا گیا ہے۔ پیدائش سے سات برس تک بچہ کی تعلیم حالانکہ بقول مسٹر جیمس بچوں کی خصلت" ابھی یا کبھی نہیں" کے اُن کو اس وقفہ میں والدین زبان وغیرہ کی ذاتی طور پر تعلیم دیں

میں ناقابل تلافی نقصان ہوگا اب رہا دوسرا رُخ۔ کہ چودہ برس کے بعد تعلیم کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا۔ یوں تو کالج رہیں گے اور ذاتی استعداد کے لحاظ سے بھی تعلیم جاری رہ سکتی ہے لیکن واردھا اسکیم کی رُو سے گورنمنٹ سے اِس تعلیم کا کوئی واسطہ نہ رہے گا۔

معلوم ہوتا ہے کہ واردھا اسکیم کا منشا ہندوستان کو بالکل صنعتی اور بڑی حد تک مادی بنانا ہے اسی وجہ سے اسمیں پیشہ ورانہ تعلیم کا رنگ غالب رکھا گیا ہے۔ یوں تو زبان، سماجی، علم، ریاضی وغیرہ کے علاوہ دستکاری کی عملی تعلیم بھی دی جائے گی۔ لیکن اُن کے لئے اِتنا کم وقت رہیگا نہ کورس ہی مشکل سے ختم ہوسکیگا۔ اور دوسرے مضامین پر قدرت حاصل نہ ہوگی۔ ہم ہندوستان کو مادی بنانے کے خلاف نہیں ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی دیگر علوم پر کافی وقت اور توجہ دی جانا چاہئے۔

مولویوں اور پنڈتوں کی طرف سے ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ واردھا اسکیم میں مذہبی تعلیم کو نظرانداز کردیا گیا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ظاہر پرست اور ریاکار لوگ ہمیشہ مذہب کی آڑ کیوں لیتے ہیں؟ کیا اس وجہ سے کہ ہندو مسلمان جہلا کو مذہب کے نام پر آسانی سے بھڑکایا جاسکتا ہے یا اِس وجہ سے کہ وہ ہندوستان کو ایسی گری ہوئی حالت میں دیکھنا چاہتے ہیں؟ بہرکیف کچھ بھی ہو۔ مذہب کی ریتیلی زمین پر ہندوستان کی ترقی کی عمارت کبھی کھڑی نہ ہوسکے گی اور اگر کھڑی بھی ہوئی تو محض ہوا کے جھونکے اِسے منہدم کرنے کے لئے کافی ہوں گے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ ہندوستانی۔ سیاسی۔ معاشی اور سماجی ترقی کی خاطر نام نہاد مذہبیت کو پسِ پشت ڈال دیں اور چکبست کے ہمنوا ہوکر پکار اُٹھیں کہ ؎

شیدائے بوستاں کو سرو و سمن مبارک — رنگیں طبقوں کو رنگِ سخن مبارک
بلبل کو گُل مبارک گُل کو چمن مبارک — ہم بیکسوں کو اپنا پیارا وطن مبارک

غنچے ہمارے دِل کے اِس باغ میں کھلیں گے
اِس خاک سے اُٹھے ہیں اس خاک میں ملینگے

[illegible] اپنی طرف کھینچتی ہے۔ محبّت خود کھنچ جاتی ہے۔ خواہش خود پروری ہے۔ محبّت [illegible] خواہش میں عمل ہے۔ محبّت میں انتظار۔

پریم چند

شاعر اور پھول

از حضرت صبر بی۔ اے (سنگرور)

کھلا تھا کل ابھی اے پھول مرجھایا بھی جاتا ہے
کہیں دنیا میں آکر اس طرح جایا بھی جاتا ہے

یہاں ہر چیز ایسی ہے کہ کہتے بھی نہیں بنتی
کوئی دیکھے نہیں بنتی تو چھوڑے بھی نہیں بنتی

کوئی دن تو چمن میں لطف جینے کا لیا ہوتا
مزہ کچھ شبنم تازہ کے پینے کا لیا ہوتا

خیال ان تتلیوں کی ہی مروت کا کیا ہوتا
کم از کم پاس بلبل کی محبت کا کیا ہوتا

تھی نسبت شاخ کی تجھ سے تو گلشن کی نشانی تھا
ابھی جانے کی کیا تھی؟ یہ تو آغاز جوانی تھا

یہ کھلنا اور مرجھانا ہی ہے بس زندگی تیری
بتا کیا خاک ہو جانا ہی ہے بس زندگی تیری؟

سن اے شاعر کہ تجھ سے زندگی کا راز کہتا ہوں
ازل سے ہی میں اپنے فرض کا پابند رہتا ہوں

بساط دہر پر کھلتا ہوں، خوشبو بانٹ دیتا ہوں
میں اپنا کام کر کے پھر عدم کی راہ لیتا ہوں

مروت یہ نہیں ہے زندگی کو زنگ لگ جائے
محبت کیا محبت ہے فرائض میں جو فرق آئے

جمود زندگی سے کب کسی کو پیار ہوتا ہے
کہ اس انداز کا جینا زمیں پر بار ہوتا ہے

مرا یہ کام کھلنا اور مرجھانا ہی اچھا ہے
مرا یہ خاک ہونا اور کھو جانا ہی اچھا ہے

کہ اس تن سے چمن کی پھر زمیں زرخیز ہو جائے
مجھے آغوش میں لے کر عروس نوبہار آئے

مولانا شوکت علی مرحوم

از مسٹر ضیاء الدین احمد برنی بی اے

مولانا سے میری پہلی ملاقات سنہ ۱۹۱۱ء میں جنگ طرابلس کے زمانہ میں ہوئی تھی جب وہ ترکش زخمیوں کے لئے چندہ جمع کر رہے تھے۔ وہ زمانہ میرے طالب علمی کا تھا۔ یہ ملاقات بہت جلد دوستی میں تبدیل ہو گئی۔ جس کی محبت بھری یاد میرے دل میں تازیست تازہ رہے گی۔

شوکت علی سات ہی برس کے تھے کہ اُن کے والد عبد العلی صاحب کا ۳۲ برس کی عمر میں یکایک ہیضہ میں انتقال ہو گیا۔ اور بچوں کی تعلیم و تربیت کا سارا بوجھ اُن کی شفیق ماں کے کندھوں پر آن پڑا جنھیں سارا ہندوستان "بی اماں" کے محترم نام سے یاد کرتا ہے۔ درحقیقت وہ عجیب و غریب خاتون تھیں۔ انھوں نے اپنے دونوں لڑکوں شوکت اور ذوالفقار کو انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے لئے جسے اُس دور کے مسلمان نفرت کی نظر سے دیکھتے تھے، بریلی بھیجا۔ یہ اُنھیں کی بلند ہمتی تھی کہ اپنے محدود مالی ذرائع کے باوجود انھوں نے اپنے بیٹوں کو بہترین تعلیم دلوائی۔ یہی بلند ہمتی مولانا شوکت علی کے حصہ میں آئی۔

علی برادران کی سب سے بڑی بات اُن کی باہمی محبت تھی۔ جو نہ صرف علیگڈھ کے زمانہ طالب علمی میں قائم رہی بلکہ پبلک لائف میں بھی اک جان دو قالب ہو کر رہے۔ اُن کا یہ اتحاد آخر دم تک قائم رہا۔ تمام زندگی کبھی کوئی ایسا اختلاف رائے نہیں ہوا۔ جس سے اُن کی محبت پر اثر پڑتا۔

اس صدی کے ابتدائی حصہ میں مولانا شوکت علی نے ہز ہائنس سر آغا خان کے سکرٹری کی حیثیت سے مسلم یونیورسٹی کے پروپیگنڈے کے سلسلہ میں سارے ملک کا سفر کیا اور لاکھوں روپیہ جمع کیا۔ درحقیقت علیگڈھ مسلم یونیورسٹی کا قیام بہت بڑی حد تک انھیں کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ اِس بارہ میں اُنکی شاندار خدمات کبھی فراموش نہیں کی جاسکتیں۔

جنگ بلقان کے زمانہ میں مولانا شوکت علی اور اُن کے چھوٹے بھائی مولانا محمد علی نے ترکی فوجوں کے لئے ایک "فیلڈ ہاسپٹل" ترتیب دیا تھا۔ اس تجویز کی ابتدا تو محمد علی کی طرف سے ہوئی تھی۔ [illegible] کرنے کی خدمت شوکت علی نے اپنے ذمہ لی۔ چنانچہ دسمبر سنہ ۱۹۱۲ء میں یہ مشن

ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم کی رہنمائی میں بمبئی سے روانہ ہوا۔ اور ٹرکی میں مفید خدمات انجام دینے کے بعد ۱۹۱۳ء میں ہندوستان واپس آیا۔ انور پاشا مرحوم کو اس مشن کے ساتھ بڑی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی، اس مشن میں علیگڈھ کالج کے بہت سے "اولڈ بوائے" شریک تھے۔ وائسرائے ہند لارڈ ہارڈنگ نے اس مشن کے جذبہ انسانیت کی بہت کچھ تعریف و توصیف کی اور اس کے لئے ہر ممکن آسانی بھی بہم پہونچائی۔

اخبار "کامریڈ" اور روزنامہ "ہمدرد" کے دہلی آجانے کے بعد مولانا شوکت علی اس شہر کے حقیقی لیڈر بن گئے۔ اور ان کی آل انڈیا لیڈری کی ابتدا اسی زمانہ سے ہوئی۔ اس دور کے اکثر مسلمان لیڈران نمائشی لیڈر تھے۔ جن کی اصل غرض اپنے رشتہ داروں کے لئے ملازمتیں اور اپنے لئے خطابات اور دیگر اعزازات حاصل کرنے کے سوا اور کچھ نہ تھی۔ لیکن ان دونوں بھائیوں نے مسلم سوسائٹی کی کایا پلٹ دی۔ اور اسمیں ایک نئی روح پیدا کردی۔ میں اس زمانہ کے اسلامی جلسوں میں شریک ہوا کرتا تھا اور اپنے تجربہ کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ عوام کے دماغوں پر مولانا شوکت علی کی تقریروں کا بڑا حیرت انگیز اور دیرپا اثر ہوا کرتا تھا۔ یہی دو بھائی اس وقت مسلم سوسائٹی کے ترقی پرور عناصر کے صحیح نمائندے تھے چنانچہ گاندھی جی نے بھی اسی وجہ سے اُن کے ساتھ اشتراک عمل کیا۔

۱۹۱۵ء میں مولانا شوکت علی نے اپنے بھائی محمد علی کے ساتھ پہلے پہل مہرولی میں اور پھر چھندواڑہ میں نظربند کئے گئے بعد میں اُن کی یہ نظربندی (بیتول میں) قید کی شکل میں تبدیل کردی گئی۔ لیکن جیسا کہ پنجاب کے مشہور لفٹنٹ گورنر سر مائیکل اوڈوائر نے اپنی کتاب India As I Knew it میں تسلیم کیا ہے۔ "دونوں بھائی نہیں چاہتے تھے کہ ٹرکی جنگ عظمیٰ میں شریک ہو۔ اور انھوں نے نہایت دانشمندی سے اس بات کی کوشش کی کہ ٹرکی اور برطانیہ کی باہمی آویزش نہ ہونے پائے لیکن بدقسمتی سے ان کی کوششیں کامیاب نہ ہوسکیں۔ چھندواڑہ کے قیام کے زمانہ میں انھوں نے پبلک چندہ سے ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کی۔ جو اُن کے "قیام" کی بہترین یادگار ثابت ہو رہی ہے۔

اپنی رہائی کے بعد مولانا شوکت علی پورے طور پر سیاسیات میں داخل ہوگئے۔ کچھ عرصہ بعد انھوں نے بعض دیگر اصحاب کی امداد و اعانت سے خلافت کمیٹی کی بنیاد ڈالی جس کا مقصد یہ تھا کہ جنگ عظمیٰ کے بعد ترکوں کے لئے منصفانہ شرائط صلح حاصل کی جائیں۔ اس کے بعد انھوں نے مہاتما گاندھی کی لیڈری میں تحریک عدم تعاون میں زور شور کے ساتھ شرکت کی۔ اُن ہنگامہ خیز ایام میں مولانا نے ہندو مسلم اتحاد کے لئے جو مخلصانہ کوششیں کیں، وہ شکر گذاری کے ساتھ یاد رکھنے کی مستحق ہیں۔ چند سال بعد نہرو رپورٹ کے سلسلہ میں اُن کی کانگریس سے چپقلش ہوگئی۔ لیکن وہ ہندو مسلم اتحاد کے ہمیشہ خواہشمند رہے اور

پرائیویٹ اور پبلک حیثیت سے اس کو ہندوستان کی آزادی کی لازمی شرط سمجھتے رہے۔

انتقال سے کچھ عرصہ پیشتر مولانا کلیتاً مسلم لیگ کے ساتھ وابستہ ہوگئے تھے۔ وہ مسلمانوں کو ہر طریقہ سے منظم اور مضبوط دیکھنا چاہتے تھے۔ انھوں نے اپنے آپ کو مسٹر جناح کی ماتحتی میں اس طرح دیدیا تھا جس طرح سے عدم تعاون کے زمانہ میں وہ مہاتما جی کے پیرو تھے۔ ان دونوں موقعوں پر انھوں نے لیڈری کی خواہش نہیں کی بلکہ وہ آخر وقت تک اپنے آپ کو محض ایک کارکن، ایک معمولی سپاہی سمجھتے رہے۔

مولانا کے کیرکٹر کا ایک نمایاں پہلو یہ بھی تھا کہ جس میدان میں کام کرنے کے لئے نکلتے اسمیں اپنا دل و جان تک وقف کردیتے تھے۔ انھوں نے کوئی کام نیم دلی سے نہیں کیا۔ چنانچہ اپنی عمر کے آخری زمانہ میں انھوں نے جس شدت سے کانگریس کی مخالفت کی، اسمیں بھی اُن کی یہ شان پورے طور سے نمایاں تھی۔ چند سال پہلے انھوں نے سلطان ابن سعود کی بھی اسی شدومد سے مخالفت کی، اور آخر وقت تک اپنے رائے پر قائم رہے۔

مولانا کو اسلامی ممالک سے محبت تھی۔ مگر ترکی سے انھیں سب سے زیادہ محبت تھی۔ وہ خلیفہ عبدالمجید آفندی کا بھی بیحد احترام کرتے اور کہتے تھے کہ اس "بےگناہ انسان" کو اپنے پیش رووں کے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا پڑا ہے۔

مولانا شوکت علی کو فلسطین کے عربوں سے بھی بہت گہری محبت تھی اور اُن کی سرزمین سے انھیں اس درجہ اُنس تھا کہ انھوں نے مولانا محمد علی کو یہودیوں اور مسلمانوں کے پیغمبروں کے قریب میں دفن ہونے دیا۔ اس سے اُن کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستانی مسلمانوں اور عربوں کے درمیان تعلقات اور مضبوط ہوجائیں

مولانا یاس اور ناامیدی کو کبھی پاس نہ پھٹکنے دیتے تھے۔ نازک ترین موقعوں پر بھی وہ مستقبل سے کبھی مایوس نہیں ہوے۔ اپنی نظربندی کے زمانہ میں قرآن مجید اور ڈاکٹر اقبال مرحوم کی رزمیہ نظموں کے مطالعہ میں اپنا وقت صرف کیا کرتے تھے۔ معاہدۂ سیورے کے تاریک زمانہ میں انھوں نے کبھی شکست محسوس نہیں کی اور ہمیشہ یہ یقین رکھا کہ بالآخر ترکوں کے ساتھ انصاف ہوگا۔ وہ اپنی قوم کے متعلق بھی ہمت افزا خیالات رکھتے تھے۔ وہ اس کی کمزوریوں سے بخوبی واقف تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اُن کا یہ عقیدہ تھا کہ ہندوستان کی تاریخ میں مسلمانوں کا ہمیشہ نمایاں حصہ رہیگا۔ لیکن اس کے باوجود وہ مسلمانوں کے منھ پر اُن کی کمزوریاں بیان کرنے سے کبھی نہ جھکتے تھے۔

وہ آخر وقت تک تحریک سودیشی کے معتقد رہے۔ اپنی وفات سے چند سال پہلے، جب وہ صرف مسلمانوں ہی کے لئے کام کرتے تھے۔ انھوں نے ہمیشہ یہ تلقین کی کہ مسلمان اپنے بھائیوں کے ہاتھ کا بنا ہوا کپڑا پہنیں۔ وہ خود بھی انھیں کے ہاتھ کا بنا ہوا کپڑا استعمال کرتے تھے۔

مولانا شوکت علی کی طبیعت بہت ہی اشتعال پسند تھی۔ بعض اوقات اُن کا ظاہر بہت کھرا، تُرش اور خوفناک معلوم ہوتا تھا۔ لیکن اُن کا باطن ہمیشہ اس کے خلاف رہا۔ یہ سچ ہے کہ وہ ذرا ذرا سی بات پر غصہ میں آجاتے تھے۔ لیکن اُس کے فرو ہوتے ہی وہ پھر پہلے کی طرح سیدھے سادے، ہنسی مذاق کرنیوالے شوکت علی نظر آتے تھے۔ پرائیویٹ اور پبلک میں وہ ہر شخص سے مذاق کرنے کے عادی تھے۔ اُن کے چہرہ پر ہمیشہ مسکراہٹ نمایاں رہتی تھی۔

شوکت علی بلحاظ قابلیت اپنے چھوٹے بھائی سے بہت گھٹ کر تھے۔ وہ اعلیٰ درجے کے انشا پرداز بھی نہ تھے عموماً وہ انھیں باتوں کو دھرایا کرتے تھے۔ جو عین وقت اُن کے دماغ میں غالب ہوا کرتی تھیں اور اس میں وہ اس بات کا خیال نہ رکھتے تھے کہ ان خیالات کی اشاعت مناسب ہوگی یا خلاف مصلحت۔ ایک مرتبہ میں نے انھیں "خلافت" میں ایک نہایت مدلل، معقول اور مبسوط مضمون لکھنے پر مبارکباد دی۔ ایسے مضامین کبھی کبھار ہی اُن کے قلم سے نکلا کرتے تھے۔ بہرحال انھوں نے فوراً یہ جواب دیا کہ "بھئی میں محمد علی نہیں ہوں۔ میں جب لکھتا ہوں، تو اس کا خیال ہی نہیں کرتا کہ خیالات موتیوں کی طرح پروئے گئے ہیں یا نہیں"

پچیس سال پہلے وہ "اولڈ بوائے" نکالا کرتے تھے لیکن وہ بہت دنوں نہ چل سکا۔ "خدام کعبہ" کے نام سے بھی انھوں ایک رسالہ کے چند نمبر نکالے تھے۔ البتہ روزنامۂ خلافت" کے ساتھ اُن کا تعلق انتقال کے وقت تک قائم رہا۔

مولانا شوکت علی کی عجیب و غریب شخصیت تھی۔ لوگ انھیں عام طور پر بڑے بھائی کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ یہ محبت کا لقب تھا بعینہٖ اسی طرح جس طرح "بی اماں" احترام کا خطاب تھا۔ انھیں بہت سی ایسی خصوصیات تھیں جن کی وجہ سے لوگ اُن کے گرویدہ ہوجاتے تھے۔ بہرحال وہ صلح و جنگ دونوں حالتوں میں شریف آدمی کا سا برتاؤ کیا کرتے تھے۔ واقعی وہ بلند خیال اور پختہ ارادے کے آدمی تھے۔ اُن کی یہ بدقسمتی تھی کہ اُن کی زندگی میں اُن کے مخالف اُن کے متعلق غلط بیانیوں سے کام لیتے رہے۔ مثلاً انتقال سے کچھ عرصہ پہلے جو مشروط تعاون انھوں نے حکومت سے کیا تھا، اس کے بارہ میں اُن کے کتنے خواہ غلط فہمی رہی۔

اُن کی وفات پر ہندوؤں، مسلمانوں، پارسیوں اور سکھوں نے یکساں طور پر ماتم کیا۔ واقعی وہ ایک قابل اعتماد لیڈر، ایک وفادار دوست اور ایک بہادر دشمن تھے۔ وہ ایسے شخص تھے جو معاف تو کر سکتے تھے لیکن کسی بات کو بھولنا نہ جانتے تھے۔ بہرحال اس وقت ہندوستان کے طول و عرض میں ان کا مثل ملنا مشکل ہے۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

بیکار مزدور کی شام

(از مسٹر منظور الحق کلیم فارسی ٹیچر گورنمنٹ اسکول دیوریا)

خستہ و درماندہ دن بھر کا تھکا ماندا ہوا　　نقد محنت شومیٔ تقدیر سے ہارا ہوا
خاک بر سر، ہوش اُڑے، دُکھ درد کا مارا ہوا　　مالکِ عیش و طرب کے در کا ٹھکرایا ہوا

دیکھئے کس بیکسی سے آرہا مزدور ہے
شیشۂ دل جس کا سنگِ غم سے چکنا چور ہے

گھر کی جانب لوٹتا ہے حسرت و ارماں لئے　　عیش و عشرت سے الگ سوزِ غمِ پنہاں لئے
اپنی دن بھر کی کمائی فکرِ بے پایاں لئے　　بھوک کی شدت میں طوفانِ الم ساماں لئے

فکر میں ڈوبا ہوا ہے کچھ نہیں اس کو خبر
ڈوبتا سورج اُدھر ہے ڈوبتا ہے دل اِدھر

بھوک کی بیتابیوں میں جھڑکیاں کھائے ہوئے　　پیاس کی شدت کو خونِ دل سے بہلائے ہوئے
دل میں روکے شکوہ ہائے تا بہ لب آئے ہوئے　　آرہا ہے خستگی کے تیرِ غم کھائے ہوئے

ہو بُرا مایوسیوں کا کس قدر مجبور ہے
سامنے ہے جھونپڑی لیکن وہ کوسوں دُور ہے

ہے قسمت کا گلہ سرمایہ داروں کا تعب　　اُن کی بے مہری کا شکوہ چپکے چپکے زیرِ لب
دل بھرا ہے درد و غم سے ہے تہی دستِ طلب　　اپنے دل میں کہہ رہا ہے ہو کے مایوسِ طرب

کیا مرے افلاسِ بے حد کی دوا کوئی نہیں
ایشور تو ہی بتا میرا خدا کوئی نہیں

اس کے بچے دیکھکر آتا ہوا خرسند ہیں　　نام جن کے رام و لچھمن اور پرمانند ہیں
سختیوں کے جھیلنے والے سعادت مند ہیں　　گو یہ فطرت کے کھلونے جھونپڑی میں بند ہیں

دوڑ کر لپٹے قدم سے باپ کی آواز پر
کان گویا تھے لگے مہرِ پدر کے ساز پر

دل بھر آیا ہاتھ خالی دیکھ کر مزدور کا — اک مرقع بن گیا خود وہ دلِ مجبور کا
چہرہ شاہد بن گیا اس کے غمِ مستور کا — اپنی نظروں میں گھٹا منھ بڑھ گیا ناسور کا
شب کے فاقہ کا تصور سامنے آنے لگا
وہ قدم اپنا بڑھا کر گھر میں جب جانے لگا

خوردبین

از رائے سدھ ناتھ بلی صاحب فراقی دریاآبادی

ہوتی ہے قدر و زیب مکاں کی مکین سے
انگشتری کو فخر ہے حاصل نگین سے
شایاں یہ ہر طرح ہے امیروں کے واسطے
کیا ہم غریبوں کو ہے غرض شہ نشین سے
اندوختہ کبھی نہیں آتا ہے اپنے کام
مکھی کو فیض پہونچا ہے کیا انگبین سے
مشکل ہے ان کے جال میں پھنس کر چھٹے کوئی
یارب بچانا تو مجھے زن زر زمین سے
پیدا نگاہ کر تو کھلے عقدۂ وجود
چلتا ہے بال بال پتہ خوردبین سے
باتیں بناتا رہتا ہے عادت یہ اس کی ہے
مطلب نہیں ہے کچھ بھی فراقی کو دین سے

محمود اور فردوسی

از سید رضا قاسم مختار (پلاموں) پوسٹ چیلا

ستمبر ۱۹۳۸ء کے زمانہ میں میرا ایک مضمون فردوسی کے متعلق شائع ہوا تھا جس میں اس کے مختصر حالات لکھتے ہوئے سلطان محمود غزنوی کی وعدہ خلافی کا بھی (جو اس نے فردوسی سے کی تھی) ذکر کیا گیا ہے۔ جس سے مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہاؔ (وکیل میرٹھ) کو شدید اختلاف ہے اور فاضل ممدوح نے ایک تردید مقالہ بعنوان "فردوسی اور سلطان محمود" سپرد قلم فرمایا ہے جو زمانہ ماہ مارچ ۱۹۳۹ء میں شائع ہو چکا ہے۔

میں جواب الجواب لکھکر تلخی پیدا کرنا نہیں چاہتا اور یہ کام ملک کے دوسرے ارباب فکر کی توجہ پر چھوڑتا ہوں۔ اُمید ہے کہ اہل نظر حضرات میں سے کوئی صاحب بصیرت رسالہ زمانہ کے صفحات پر اپنے خیالات پیش کر کے اس گتھی کو سلجھانے کی زحمت گوارا فرمائیں گے تاکہ مصدقہ و مستند طور پر اطمینان ہو سکے کہ ملک کے وسیع النظر اصحاب کے نزدیک فردوسی کے ساتھ سلطان محمود کی وعدہ خلافی کا واقعہ کوئی تاریخی صداقت و اہمیت رکھتا ہے یا نہیں؟ لیکن اس کے ساتھ ہی اپنے پہلے بیان کے ثبوت میں یہاں پر صرف چند سطریں حوالۂ قلم کر دینا مناسب سمجھتا ہوں ؎

پیالہ خالی اُٹھا کر لگا لیا منھ سے کہ یاسؔ کچھ تو نکل جائے حوصلہ دل کا

تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ شاہنامہ کی تصنیف و تدوین اولین کے بعد عرصۂ دراز تک اسکی حفاظت و اشاعت کی کوئی صورت اختیار نہیں کی گئی حتیٰ کہ اس ضخیم و تجیم کتاب پر نظر ثانی بھی نہ کی گئی۔ سلطان محمود کے سامنے پیش ہوتے ہی سلطان اور مصنف کے درمیان ناگوار رنجش کا ایسا سلسلہ شروع ہو گیا کہ محمود کے عہد حکومت میں بھی اس کتاب کی جانچ پرتال نہ ہو سکی۔ البتہ اول اول جس شخص نے اس کتاب کی تصحیح و تدوین کی طرف توجہ کی وہ امیر تیمور کا پوتا بایسنقر خاں تھا۔ جس نے شاہنامہ کی تصحیح و تدوین کی طرف خاص توجہ کی اور اس مشکل کام کی انجام دہی کے لئے اچھے اچھے کاملین فن و ماہرین سخن کو مامور کیا جنھوں نے بڑی جد و جہد سے ایک صحیح نسخہ تیار کیا۔ اور شروع میں ایک طویل دیباچہ شامل کیا جس میں مصنف کتاب و متعلقات کتاب کی نسبت ضروری باتیں نہایت شرح و بسط کے ساتھ درج کی ہیں مثلاً

"سلطان محمود کا شغف۔ فردوسی کا بارگاہ سلطانی میں باریاب ہونا اور اعزاز و اکرام سلطانی کے ساتھ شاہنامہ کی تنظیم پر گراں بہا صلہ کا وعدہ۔ حسن میمندی کی رخنہ اندازی اور سلطان کے وعدے کا پورا نہ ہونے دینا۔ فردوسی کا دربار سلطانی سے نکلنا اور اس کی آوارہ گردی۔ اپنی وعدہ خلافی پر سلطان محمود کی پشیمانی اور آخرش عین اس کے انتقال کے وقت موعودہ صلہ کا پہنچنا وغیرہ" مندرج ہیں۔

اس کے علاوہ ہندوستان میں بھی ایسٹ انڈیا کمپنی نے ۱۸۱۱ء میں بمقام کلکتہ چند منتخب اشخاص کی نگرانی میں شاہنامہ کی ترتیب و تصحیح نہایت اہتمام و انتظام کے ساتھ شروع کی تھی اور ابتداء سے آغاز داستان سیاوش تک اس کے اجزا چھاپے جا چکے تھے[1]۔ مگر بعض وجوہ کی بنا پر کمپنی مذکور کو یہ کام ملتوی کرنا پڑا۔ اور کچھ دنوں کے بعد ایک باہمت و صاحب ذوق انگریز مسمی مسٹر ٹرنر میکن نے نہایت بلند ہمتی سے شاہنامہ کی ترتیب و تصحیح کا کام اپنے ذمہ لے کر کام شروع کر دیا مگر مصارف طبع طباعت کیلئے اس نے کمپنی مذکور ہی سے مدد کی درخواست کی کمپنی مذکور تو پہلے ہی ہمت ہار چکی تھی۔ اس لئے مسٹر ٹرنر کو وہاں سے نفی میں جواب ملا مگر دھن کے پکے مسٹر ٹرنر نے ہمت نہ ہاری اور اسی فکر میں لگا رہا۔

شدہ شدہ مسٹر ٹرنر کے عزم و استقلال اور اخراجات کی مشکلات کی خبر فرمانروائے اودھ نواب نصیر الدین حیدر کے کانوں تک پہونچی اور نواب ممدوح نے کمال فیاضی و دریادلی سے اس کام میں مسٹر ٹرنر کا ہاتھ بٹا کر اخراجات صحت و مصارف طباعت کی جانب سے اس کو پوری طرح مطمئن کر دیا مسٹر ٹرنر کو اس درمیان میں دو مرتبہ انگلستان سے ہندوستان آنے جانے کا بھی اتفاق ہوا۔ اور اثنار سفر میں وہ دونوں مرتبہ ایران بھی گیا۔ اور اپنے جمع کردہ نسخوں میں جو داستانیں' اشعار یا الفاظ مشکوک پائے، ان کی تصحیح و مقابلہ امرار ایران کے کتب خانوں کے مختلف نسخوں سے کیا۔ جس کے متعلق وہ یوں رقمطراز ہے:۔

"چوں قبل انطباع از گردش روزگار' اتفاق سیر دیار ہندوستان دو بار رو داد و اکثر نسخ دیگر در اثنار راہ بسرکار امرائے ایران بملاحظہ رسید ابیاتے کہ عند التصحیح مشکوک ماندہ باز بصحت انجامید"

مسٹر ٹرنر میکن نے شاہنامے کی تصحیح کا دار و مدار ایران کے قدیم نسخوں پر رکھا اور بلا ضرورت ہندوستانی

---

[1] کوئنس کالج بنارس میں شاہنامے کے ایک نہایت عمدہ مگر ناتمام نسخے کا پتہ ملتا ہے جو بڑے پیمانے کے عمدہ اور چکنے کاغذ پر بہت ہی خوب خط اور خوبصورت ٹائپ میں' جس کے داہنے صفحہ پر اصل متن اور مقابل میں بائیں صفحہ پر انگریزی ترجمہ چھپا ہوا تھا' گمان غالب ہے کہ یہ وہی ایسٹ انڈیا کمپنی کا مدون کردہ چھپا ہوا ناتمام نسخہ تھا' معلوم نہیں اب وہ کہاں اور کس حال میں ہے۔ (رضا قاسم)

نسخوں کی طرف توجہ نہ کی اور ایرانی نسخوں میں بھی کثرت و قلتِ توافق کا التزام رکھا یعنی جو قصے، اشعار یا الفاظ زیادہ نسخوں میں پائے گئے اُن کو اختیار کیا اور جو صرف معدودے چند نسخوں میں پائے گئے، اُن کو قلم انداز کر دیا۔ جیسا کہ خود اُسکا قول ہے۔

"ہموارہ محلِ اعتماد و مدارِ صحت و فساد بر کثرت توفق نسخ قدیم ایران بُود وگاہے بر نسخہ ہندوستان نظر بلا ضرورت نکشود، اگرچہ معانی ابیات آنہا روشن"

الغرض مسٹر ٹرنر میکن نے نہایت دقیق النظری و قابلیت کے ساتھ مصحح کے فرائض کو ادا کیا۔ اور نواب نصیر الدین حیدر نے جو مالی امداد اس جہت میں کی تھی، اُسکو اپنے تصحیح کردہ نسخہ میں اسطرح درج کیا ہے

"از انجا کہ مصارفِ طبع کتاب بسیار ست و بسبب انکار ہر متن صاحب دکہ دراں وقت یکے از صاحبان کونسل یعنی فرمانفرمائے ہندوستان بود) سرکار درین باب تنگدستی نمود۔ لہٰذا ایں کار ملتوی ماند بلکہ احتمال صورت نمی گرفت۔ اگر بادشاہ عالیجاہ ابوالنصر قطب الدین سلیمان جاہ نوشیروان ثانی نصیر الدین حیدر پادشاہ اودھ عجیب دستگیری نمی نمود و برخلاف رسم شاہ محمود کہ باوجود وعدہ بر مصنف راہ بخل سپردہ بود، ایں عالیجاہ بدون استدعا بر طرز عالی ہمتاں دست امداد بر مصحح کشود"

اِن شواہد معتبرہ کے پیشِ نظر تو سلطان محمود غزنوی کی وعدہ خلافی و دون ہمتی صاف طور پر ظاہر ہوتی ہے بفرض اگر بایسنقر خاں کے مرتب کردہ نسخے کے دیباچے کی عبارت (جس کا مختصر بیان اگلی سطروں میں کیا جا چکا ہے) شاید کسی وجہ سے ناقابل قبول سمجھی جائے، تو مسٹر ٹرنر میکن تو اجنبی قوم کے فرد ہیں اُنھوں نے جو کچھ کیا یا لکھا ہے وہ تو محض علم دوستی، ہنر پروری اور ادبی تقاضے کی بنا پر ہے۔

ظاہر ہے کہ اس کو کوئی ذاتی غرض نہ تھی، نہ سلطان محمود سے اس کا کسی قسم کا ذاتی بغض ثابت ہوتا ہے اور نہ اسمیں اس کی قومی حکومت کا کوئی فائدہ مضمر تھا۔ پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مسٹر ٹرنر نے سلطان محمود غزنوی کی وعدہ خلافی کی مثال نواب نصیر الدین حیدر کی فیاضی کے ضمن میں کیوں لکھی ؎

اندکے پیش تو گفتم غم دل ترسیدم کہ دل آزردہ شوی ورنہ سخن بسیار است

رُباعی

کیا چیز ہے زیست اِسکا منشا سمجھے یا رازِ حیات کو معمّا سمجھے
افسوس ہے آرزو ہوئی عمر تمام فانی دُنیا کو ہم ہمیشا سمجھے

شورج نراین نگم آرزو

دعاء

(از دلیسراج صاحب سروش)

یارب مری دعا کو منت کشِ کرم کر — دل کی کلی کو رشکِ صد گلشنِ ارم کر
میں کامیاب ہو کر دُنیا کے لطف لوٹوں — قسمت میں دشمنوں کی ناکامیوں کا غم کر
صبر و رضا کی مے سے بیخود بنا کے مجھ کو — جامِ سفال میرا برتر ز جامِ جم کر
دنیا میں بیکسوں کے غم کا علاج کرنا — اِک مشغلہ سا میرا، ہر شام و صبحدم کر
وحدت پسند ہو یا کثرت فروز ہو جا — یا مجھ کو راز دانِ بت خانہ و حرم کر

بعدِ فنا بھی زندہ رہتے ہیں جو سخنور
نامِ سروش اُن کی فہرست میں رقم کر

لطفِ کلام

(از حضرت لطیف انور)

نکتہ شناسیٔ نظر تہمت عام ہو گئی! — سجدۂ شوق کے لئے قیدِ مقام ہو گئی
بن کے بگڑ گئی یہاں عشق کی بات ہیگماں — میرے لئے مگر وہی حسن کلام ہو گئی
تیرے جمال کی طلب کون کہے کہ ہے غضب — آج نگاہ کیا اُٹھی، رونقِ بام ہو گئی
یا نہیں حلقۂ جنوں شاملِ اہلِ آرزو — یا تری تیغ جانستاں وقفِ نیام ہو گئی
عشق کی آرزو کہیں حسن کی آبرو کہیں — آہِ فسردہ جابجا تازہ پیام ہو گئی

انورِ تشنہ کام تک پہنچا نہ ایک جام تک
گردشِ دو جہاں مگر گردشِ جام ہو گئی

سنگ تراش

از منشی کرشن سروپ صاحب منشی فاضل

"صنعت صانع کا بہترین نمونہ" نوجوان سنگتراش کے منہ سے عالم بیخبری میں نکلا۔
اُس کا تمام جسم کانپنے لگا اور وہ ہاتھ جو سنگ تراشی میں مصروف تھے لمحہ بھر کے لئے رُک گئے۔

"اننت۔ تم اپنا کام کیوں نہیں کرتے۔ مجھے گھور گھور کر کیوں دیکھ رہے ہو؟" ایک شوخ مگر مترنم آواز نے اُس کو اِس عالم بیخبری سے بیدار کیا۔

"تم جانتی ہو پربھا" میں دیوی کی مورت بنا رہا ہوں۔ تمہارا لباس مجھے بہت پسند آیا ہے۔ میں دیوی کو تمہارا جیسا لباس پہناؤنگا" اننت نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

"اننت۔ اگر تم بُرا نہ مانو تو کہوں کہ مورت جیسی چاہئے ویسی خوبصورت نہیں بنی" یہ کہتی ہوئی پربھا خراماں خراماں محل کی طرف روانہ ہوئی۔

پربھا تلکھا کے ٹھاکر بکرما جیت کی اکلوتی لڑکی اور ماں باپ کی آنکھوں کا تارا تھی۔ دریائے نربدا اُن کے محل کے قدم چومتا ہوا بہتا تھا۔ ٹھاکر صاحب کا ارادہ محل کے نزدیک ہی ایک مندر بنوانے کا تھا۔ جس کی تعمیر کا کام اُنھوں نے شروع کر دیا تھا۔

اننت کا باپ اِس علاقہ کا مشہور سنگ تراش تھا جس نے اننت کو بھی سنگ تراشی سکھائی تھی۔ اور اُس نے چند ہی سال میں اِس فن میں اِتنی مہارت حاصل کر لی کہ اُس کا شمار اعلیٰ پایہ کے سنگتراشوں میں ہونے لگا۔ سنگ تراشی کے علاوہ وہ زیورِ علم سے بھی آراستہ تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ کہنہ مشق اُستادوں سے اِس فن میں گوئے سبقت لے گیا تھا۔

آفتاب غروب ہو چکا تھا۔ اننت اپنے مکان پر واپس آیا۔ آج کچھ کھویا ہوا سا معلوم ہوتا تھا۔ وہ خیالات کی رَو میں بہہ رہا تھا۔ پربھا کا حسین چہرہ اُس کے سامنے تھا۔ اُس کی وہی مترنم اور شوخ آواز بار بار اُس کے کانوں میں گونج رہی تھی "اننت اگر تم بُرا نہ مانو تو کہوں کہ مورت جیسی چاہئے ویسی خوبصورت نہیں بنی"۔ اُس کا دل ایک عجیب قسم کی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ اُس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ اب وہ

از سر نو دوسری مورت تراشے گا۔ اِس خیال کے زیر اثر وہ اُٹھا اور مندر کی جانب روانہ ہوگیا۔

رات کی سیاہ چادر، دن کے چہرے کو چھپائے ہوئے تھی۔ چہار طرف تاریکی ہی تاریکی نظر آتی تھی ہُو کا عالم تھا۔ اننت اِس تاریک رات میں مندر کی جانب جا رہا تھا۔ اُسے تقریباً دو فرلانگ راستہ طے کرنا تھا۔ یہ دو فرلانگ اُس کے لئے دو میل سے کم نہ تھے۔ تنفس بھاری ہوگیا۔ قدم لڑکھڑانے لگے۔ جوں توں کرکے وہ مندر تک پہونچا مورت کو اُٹھایا۔ اور ایک دھماکے کی آواز کے ساتھ مورتی پاش پاش ہوگئی۔ پھر وہ اپنے گھر واپس آکر دریائے فکر میں غوطہ زن ہوگیا۔

"دوسرے دن اننت نے ٹھاکر صاحب سے کہا" مورت رات کو نہ جانے کس طرح ٹوٹ گئی"۔

ٹھاکر صاحب نے کہا۔" اِس مرتبہ تم مورت کو حفاظت سے رکھنا۔ ایسا نہ ہو پھر ٹوٹ جائے۔

یہ کہتے ہوئے وہ اُٹھ کر کسی کام سے باہر چلے گئے۔

اننت، رات دن مورت بنانے میں مشغول رہتا تھا۔ اُسے اپنے تن بدن کا ہوش نہ تھا۔ وہ کسی ایسے جذبے کے ماتحت کام کر رہا تھا۔ جس نے اُسے دار فانی سے ہٹا کر محبت کے ایسے عالم جاودانی میں لیجا کر کھڑا کر دیا تھا۔ جہاں پہونچکر انسان اپنے آپ کو بھول جاتا ہے۔

پندرہ دن کی اَن تھک کوشش کے بعد اننت نے دلخواہ مورت بنالی۔ مورت کیا تھی، ہو بہو پربھا کا مجسمہ تھا۔ وہ حیران تھا کہ عالم بیخبری میں اُس نے کتنی زبردست غلطی کی ہے۔ اگر ٹھاکر صاحب نے تاڑ لیا، تو جان کی خیر نہیں اور نجانے بیقصور پربھا پر کیا کیا مصبتیں آئیں۔ اُسے اپنے متعلق تو کسی قسم کا خوف نہ تھا۔ مگر پربھا کی رسوائی وہ برداشت نہ کر سکتا تھا۔

محل میں مورت کے تیار ہوجانے کی اطلاع دیکر اننت وہاں سے روانہ ہوگیا۔ اور قریب کے قصبے میں سکونت اختیار کرلی۔ مگر یہاں اُس کا دل نہ لگا۔ یادِ محبوب دل میں چٹکیاں لینے لگی۔ اُس نے غم غلط کرنے کے لئے پربھا کا ایک چھوٹا سا مجسمہ بنانا شروع کر دیا۔ اب اُسکا کام آنسو بہانا اور مجسمہ بنانا تھا۔

اننت آج مجسمہ کو مکمل کر چکا تھا۔ اور تلکھا جانے کا ارادہ کر رہا تھا۔ کہ اُس کے ایک دوست نے کہا "اننت آج ٹھاکر بکرماجیت کی لڑکی کی شادی ہے کیا تم تلکھا نہیں چلوگے ؟"

"نہیں آج میری طبیعت اچھی نہیں ہے" اُس نے اپنے دوست کو ٹالتے ہوئے کہا۔

اننت کو اِس روح فرسا خبر سے روحانی اذیت پہونچی۔ اُس پر نیم بیہوشی کا عالم طاری ہوگیا۔ جب ذرا ہوش وحواس بجا ہوئے تو اُس نے مجسمہ کو کپڑے میں لپیٹا اور تلکھا کی جانب روانہ ہوگیا، اور تقریب آدھ گھنٹے بعد وہ وہاں پہونچ گیا۔

لکھنؤ عروس نو کی مانند سجا ہوا تھا۔ بازاروں میں دو رویہ آئینہ بندی کی گئی تھی۔ چوک چوک پر ٹھاکر صاحب کی طرف سے نوبتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ نفیری اور نقارہ کی صداؤں سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ اننت سیدھا محل میں پہونچا۔ اس وقت پربھا بدا ہو رہی تھی اور خویش و اقارب اُسے تحفے پیش کر رہے تھے۔ اننت آگے بڑھا اور لرزتے ہوئے ہاتھوں سے مجسمہ کو پیش کیا۔ پربھا نے اپنا مجسمہ دیکھا۔ اُسے فوراً مندر کی مورت کا خیال آگیا۔ وہ اننت کے جذبات بھانپ گئی اور اُس کے دل کو ٹھیس لگی اسکے جذبات میں زبردست ہیجان پیدا ہوا اور محبت کے آنسو آنکھوں سے ٹپکنے لگے

پربھا سسرال چلی گئی۔ پژمردہ اننت آنسو بہاتا ہوا اپنے گھر واپس گیا۔ مگر اب صبر و سکون کہاں تھا۔ راحت قلب اور تسکینِ دل نے اُسے خیر باد کہدیا تھا اُس نے جوں توں کر کے ایک مہینہ گذارا۔ پھر اُس قصبہ کی جانب روانہ ہوا جہاں پربھا بیاہی گئی تھی۔

اننت نے پتھروں کا ڈھیر اکٹھا کیا۔ اور پربھا کے مجسمے بنانے شروع کر دیئے۔ ڈیڑھ ماہ کے قلیل عرصہ میں پچاسوں مورتیں بنا ڈالیں۔ قصبے کے لوگ اننت کو پاگل سمجھتے تھے اور از راہِ ہمدردی اُسے کھانے کو دیدیتے تھے۔ بچے اُسے پاگل سنگ تراش کہتے تھے۔ آہستہ آہستہ اسکی شہرت پربھا کے کانوں میں بھی پہونچی۔ اُس کے دل میں ہزاروں قسم کے خیالات چکر لگانے لگے۔ محبت کی چنگاری ایک دفعہ پھر چمکی۔

"ہو نہ ہو یہ اننت ہے"۔ اس کے دل کی گہرائیوں سے آواز آئی، اور وہ بیقرار ہوگئی"

رات گئے پربھا چپکے سے اٹھی اور لوگوں نے جس طرف اننت کی جائے رہائش بتائی تھی اس طرف روانہ ہوگئی اب اننت اور پربھا ایک دوسرے کے سامنے تھے۔ دفورِ محبت میں دونوں کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ آخر پربھا نے قفلِ خاموشی توڑا اور کہا: "اننت تم جانتے ہو کہ میں راجپوت خاندان کی لڑکی اور بہو ہوں۔ ہماری محبت کا کوئی نتیجہ نہیں ہوسکتا اس لئے تم صبر و کرو اور مجھے بھلا دو۔ میں بھی جس طرح ہوگا زندگی کے دن ختم کردوں گی"

ناکام محبت اننت کا دل ڈوبا جا رہا تھا۔ رنج و غم اور دائمی مفارقت کے خیال نے اُس کے رو ئیں روئیں میں آگ لگادی تھی۔ اُس کا تمام جسم پھنکا جا رہا تھا۔ اُس نے ایک دلدوز چیخ لگائی اور دوڑتا ہوا نربدا کی آغوش میں کود پڑا۔

اُف کسقدر خوفناک منظر تھا۔ اِس منظر نے پربھا کو پاگل کردیا۔ وہ گھر لوٹی اور ایسی نیند سوئی کہ پھر بیدار نہ ہوئی۔ غم کے شدید حملے نے اُس کی حرکتِ قلب کو بند کردیا تھا۔

یہ تھا انجام سنگ تراش کی محبت کا

زمزمۂ مدہوش

(از پروفیسر سنت پرشاد مدہوش ایم۔ اے)

سلوک دنیا سے ہے یہ میرا عجیب مرِ دِغیور ہوں میں
قریب آئے قریب ہوں میں جو دُور بھاگے تو دُور ہوں میں

ازل سے ہوں بندۂ محبت حریفِ کبر و غرور ہوں میں
خودی شکستہ کا ہوں پیامی، مئے حقیقت میں چور ہوں میں

ازل کے دن جاگ اٹھی مجھی سے وہ منزلِ خفتۂ محبت
کئے فرشتوں نے مجھ کو سجدے خدا کی شان اور نور ہوں میں
بھرا ہے رگ رگ میں سوزِ الفت خمیر میں بادۂ محبت
رواں دواں خوں میں سیلِ آتش کہ شعلۂ برقِ طور ہوں میں

نہ رکھ مرے دل پہ ہاتھ دنیا کہ اک دہکتا شرار ہے یہ
جلا دیا ماسوا کو اس نے جو جل اٹھا ہے وہ طور ہوں میں
اُتر رہا تھا خمارِ ہستی کہا جو منصور نے انا الحق
عدوئے جاں تھا عدوئے جاں ہوں، عدوئے فسق و فجور ہوں میں
ریاضِ رحمت کی شامِ زنگیں میں بادۂ اطہرِ حقیقت
میں پی کے مدہوش ہو گیا ہوں غریقِ کیف و سرور ہوں میں

تنقید کتب

حیاتِ وکلیاتِ اسمٰعیلؔ

شاید ہی کوئی اُردو داں ہوگا۔ جس نے ؎

رب کا شکر ادا کر بھائی   جس نے ہماری گائے بنائی

یا

نہر پر چل رہی ہے پن چکی   دھن کی پوری ہے کام کی پکی

جیسی مشہور نظموں کے مصنف مولانا محمد اسمٰعیل میرٹھی کا نام نامی نہ سنا ہو۔ جن کا شمار نئے دور کے ادیبوں کی صفِ اول میں ہے۔ غالبؔ تک تمام اُردو شاعروں کا معراج اہلِ ایران کی تقلید تھا۔ لیکن مولانا حالیؔ اور شمس العلما آزادؔ نے نظموں کی بنیاد ڈالی۔ جس کے بعد قومی اور فطری شاعری کا دور شروع ہوا۔ جن حضرات نے مولانا محمد اسمٰعیل میرٹھی کی وہ اُردو ریڈریں دیکھی ہیں، جو عرصہ تک ہمارے اسکولوں کے کورس میں داخل رہ چکی ہیں۔ انھیں اس بات کا خوب اندازہ ہے کہ نثر و نظم دونوں لحاظ سے ان ریڈروں سے بہتر ریڈریں اب تک جاری نہیں ہوئیں۔ اگلی نسل کے اسکولی تعلیم یافتہ لوگ زیادہ تر مولانا محمد اسمٰعیل ہی کی تصانیف سے فیض اٹھائے ہوئے ہیں۔ "ہماری گائے"۔ "پن چکی"۔ "دل کی فریاد"۔ "گرمی کا موسم"۔ "برسات"۔ "دال چپاتی"۔ "طمع کی انگوٹھی" وغیرہ وغیرہ ایسی پیاری، دلچسپ اور دلکش نظمیں ہیں جو لاکھوں آدمیوں کی زبان پر چڑھی ہوئی ہیں، اور ان کے پڑھنے اور سننے سے اب بھی سب لطف اندوز ہوتے ہیں، مولانا اسمٰعیل کا کلام، سلاست و لطافت اور سادگی و برجستگی کا بہترین نمونہ ہے۔ انھوں نے جو لفظ جہاں رکھدیا، وہ اٹل ہے اور جو محاورہ استعمال کر دیا، برمحل ہے۔ مولانا کی جو کہانیاں نظم کی ہیں وہ بھی سب کی سب اخلاقی ہیں۔ مولانا کی منظوم حکایات پڑھکر Æsop's Fables. کا لطف آتا ہے۔

مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کے فرزند اصغر خان بہادر محمد اسلم سیفی نے کلامِ اسمٰعیل کا مکمل و خوبصورت ایڈیشن شائع کرکے اُردو ادب پر بڑا احسان کیا ہے۔ شروع میں مولانا اسمٰعیل کی مفصل سوانحعمری اور اُنکے کلام پر تنقید درج ہے۔ اور اس کے بعد مجموعہ کلام۔ غرض یہ کتاب ہر شخص کے مطالعہ کے قابل ہے۔

لکھائی چھپائی۔ کاغذ سب قابلِ قدر۔ حجم بڑی تقطیع کے ۴۱۶ صفحات۔ قیمت چار روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبۂ جامعہ۔ ملیہ دہلی۔

آبِ حیات کے لطیفے[1]

اِس وقت ہندوستان میں اُردو شاعروں کے درجنوں تذکرے موجود ہیں۔ جنھیں ایک سے ایک بڑھ کر دادِ تحقیق و تدقیق دی گئی ہے۔ لیکن شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد کے تذکرۂ "آبِ حیات" کو جو ہردلعزیزی حاصل ہے وہ آج تک کسی تذکرہ کو نصیب نہیں ہوئی۔ اس کی اصل وجہ آزاد کا دلآویز طرزِ تحریر ہے۔ جسکی تقلید میں بہت سے ادیب سر دُھنتے رہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اب تک کسی سے نہ ہو سکی۔ آزاد کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کسی بات کو لکھتے لکھتے، جگہ جگہ ایسی دلنواز اور خوش آیند چٹکیاں لیتے ہیں کہ پڑھنے والے کے مُنہ سے بیساختہ "واہ واہ" نکل جاتی ہے۔

مولانا کی آبِ حیات، دربارِ اکبری اور سخندانِ پارس میں اِس قسم کی نکتہ سنجیاں بڑی کثرت سے موجود ہیں۔ مگر ان تینوں میں بھی "آبِ حیات" میں اس "امرت جل" کی دھار کسی قدر زیادہ تیز اور گہری بہتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ اسے بار بار پڑھنے سے بھی طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ اِس دلچسپی اور دل بستگی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ اس تذکرہ میں نامور ادیبوں کے سیکڑوں نکتے و لطیفے یکجا کر دئیے گئے ہیں۔ مگر بہت سے لوگ ہیں جن کو "آبِ حیات" جیسی ضخیم کتاب کے پڑھنے کی مہلت نہیں۔ اُن کے لئے اب شمس العلماء آزاد کے نواسے مولانا محمد اشرف صاحب ایم۔ اے دہلوی نے "آبِ حیات کے لطیفے" کے نام سے اِس ضخیم کتاب کے تمام دلچسپ نکتوں اور لطیفوں کو چُن کر کتابی صورت میں شائع کر دیا ہے۔

پُوری کتاب دو حصوں میں منقسم ہے۔ شروع کے نو جزو میں مولانا آزاد کے مفصل سوانح حیات درج ہیں اور دوسرے حصہ میں نو جزو کے اندر "آبِ حیات" کے دلچسپ لطائف و نکات درج کئے گئے ہیں۔ یہ کتاب شائقین ادب کی تفریحِ طبع کے لحاظ سے بہت قابلِ قدر ہے۔ اس کا حجم چھوٹی تقطیع کے اٹھارہ جزو ہے۔

اُردو کے سَو شعر

مکتبۂ جامعہ ملیہ دہلی نے زمانہ قدیم و حال کے مشہور اُردو شاعروں کے سَو سَو منتخب اشعار کا ایک بہت دلچسپ سلسلۂ کتب شائع کیا ہے۔ چنانچہ اب تک مختلف شعرا کے سَو اشعار علیحدہ علیحدہ شائع ہو چکے ہیں مگر اب شاعری کے پانچ دَور مقرر کر کے ہر دَور کے سَو سَو چیدہ غزل کے اشعار ایک چھوٹی کتابی صورت میں شائع کئے گئے ہیں۔ کسی ایک دَور سے صرف سَو اشعار انتخاب کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے مگر اس سلسلے کے قابل مؤلفوں نے ہر مشہور شاعر کے کچھ اشعار اپنے انتخاب میں ضروری شامل کر لئے ہیں

[1] قیمت سوا روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ حالی پبلشنگ ہاؤس کتاب گھر، دہلی۔

جن سے اُس دور کی شاعری کی خصوصیات پر روشنی پڑتی ہے۔ اسی قسم کی ایک کتاب میں ایسے تقریباً شعر درج کئے ہیں جو بطور ضرب الامثال مروج ہیں۔ یہ نسخہ بھی خوب ہے اور اشعار کا انتخاب بہت اچھا کیا گیا ہے۔ لکھائی چھپائی عمدہ۔ لیکن قیمت چار آنہ کسی قدر زیادہ معلوم ہوتی ہے۔

خیالات آزاد (حیدرآبادی)

یہ کتاب مولوی سید محمد حسین آزاد حیدرآبادی کے مجموعہ کلام کا دوسرا حصہ ہے۔ جسمیں زیادہ تر حصہ نظموں کا ہے جو چائے، سگرٹ وغیرہ وغیرہ مختلف عنوانوں پر لکھی گئی ہیں۔ فاضل مصنف نے سگرٹ پر جن خیالات عالیہ کا اظہار فرمایا ہے۔ اسی سے مصنف کی شاعری کا اندازہ کر لیجئے ؎

دم نہیں مارتا چٹّا بھی جلے گر سگرٹ | سامنے اس کے یہ بیڑی کی حقیقت کیا ہے
بند کر دیتا ہے اُس کو بھی سلگ کر سگرٹ | حقہ دیتا ہے اگرچہ کہ دھواں دھار اپیچ

خضر منزل

یہ چھوٹا سا رسالہ مولوی محمد عبدالشکور خان صاحب بی۔اے۔ بی۔ٹی (علیگ) اکبرآبادی کا دلچسپ سفرنامہ ہے۔ جس میں ریاست کشمیر، شمالی ہند، بنگلور، سرزمین دکن، اجمیر، آگرہ، دہلی، لاہور وغیرہ کی سیر و سیاحت کے دلچسپ حالات تحریر کئے گئے ہیں۔ سفرنامہ بہت پُرلطف اور دلچسپ ہے۔ جگہ جگہ مختلف اہم مقامات کے فوٹو بھی دیئے گئے ہیں۔ چھوٹی تقطیع کے ۲۰۷ صفحات ضخامت۔ قیمت ایک روپیہ کسی قدر زیادہ ہے۔

یادگار

یہ چھوٹی سی کتاب مولوی محمد اسحٰق صاحب مائل انصاری خیرآبادی ضلع سیتاپور کے کلام کا دلچسپ مجموعہ ہے۔ جس میں چند غزلیات، چند قومی نظمیں اور چند قطعات ہیں۔ مولنا مائل نوعمر شاعر معلوم ہوتے ہیں، مگر خوب کہتے ہیں۔ ناظرین کو ذیل کے چند شعروں سے اُن کے کلام کا اندازہ ہو جائے گا ؎

خزاں رسید چمن کی طرح نہ زرد رہے | ہزار رنج و مصائب میں مرد مرد رہے
جہاں میں واقف اسرار گرم و سرد رہے | ہمیشہ کرتا رہے تجربے بشر حاصل
بشر وہ ہے جو تہ تیغ حق نبرد رہے | کبھی طریقہ باطل نہ اختیار کرے
جگر میں سوز رہے دل میں اُن کا درد رہے | تونگری میں رہے دھیان فاقہ مستوں کا

---

[1] ملنے کا پتہ:۔ درویش منزل مستعد پورہ، آزاد منزل فلک نما حیدرآباد دکن۔
[2] "چٹا" دکھنی زبان میں دیسی عیسائیوں کو کہتے ہیں۔ [3] ملنے کا پتہ:۔ قصر الادب آگرہ۔
[4] حجم چھوٹی تقطیع کے ۶۴ صفحات۔ قیمت چھ آنہ۔ ملنے کا پتہ:۔ (۱) مصنف صاحب (ب) مومن بکڈپو مومن گنج سیتاپور

جدید دستور کا خاکہ

یہ قانون حکومت ہند مجریہ ۱۹۳۵ء کا خاکہ ہے جس کے ماتحت برطانوی صوبوں میں اندرونی طور پر خودمختار حکومتیں قائم ہوگئی ہیں اور فیڈریشن کا قیام ابھی باقی ہے۔ زین العابدین صاحب بی۔ایس سی' پی۔ایچ۔ڈی لنڈن نے ضخیم قانون کا ضروری اور مفید خلاصہ کیا۔ جس کو مولوی شفیق الرحمن قدوائی' بی اے (جامعہ) نے اردو کا لباس پہنایا ہے اس زمانہ میں جبکہ آئین جدید کا دور شروع ہوا ہے۔ اس چھوٹی سی کتاب کا مطالعہ بہت مفید ثابت ہوگا۔ لکھائی چھپائی' کاغذ معمولی۔ بڑی تقطیع کے ڈیڑھ جزو ضخامت۔ قیمت ڈیڑھ آنہ۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی۔

مہاپرش محمد صاحب[1] (ہندی)

یہ کتاب کمار بشن پال سنگھ۔ نے ہندی زبان میں لکھی ہے اور اسمیں پیغمبر اسلام کی زندگی اور اُن کی تعلیمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصہ میں محمد صاحب سے پہلے عرب کے حالات درج ہیں۔ دوسرے حصہ میں محمد صاحب کی زندگی کے حالات کا خلاصہ ہے' اور تیسرا حصہ آنحضرتؐ کے اپدیشوں اور اسلام کے اصولوں کے لئے وقف کیا گیا ہے۔ درحقیقت مصنف نے ہندی جاننے والے ونیز ہندؤں کے لئے مسلم کلچر کی تصویر سامنے رکھنے کی کوشش ہے اور اسمیں وہ کامیاب بھی رہے ہیں۔ اس ہندو مسلم کشیدگی کے زمانہ میں اس قسم کی کتابوں سخت ضرورت ہے۔ کاغذ و لکھائی عمدہ۔ قیمت ۵ آنہ ۶ پائی۔

جوہر اقبال[2]

رسالہ جوہر' لاہور کا اقبال نمبر ایک مستقل کتابی صورت میں مجلد شائع ہوا ہے۔ اس میں ملک کے مشہور اہل قلم نے علامہ اقبال پر تقریباً ڈیڑھ درجن گرانمایہ مضامین لکھے ہیں جنمیں اقبال مرحوم کی سوانحعمری' اُنکی شاعری' اور دیگر امور متعلقہ پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ نظم و نثر دونوں قسم کے مضامین ہیں۔ مضمون نگاروں میں سید سلیمان ندوی' ڈاکٹر سید عابد حسین' پروفیسر محمد مجیب' پروفیسر رشید احمد صدیقی' پروفیسر خواجہ غلام السیدین' ڈاکٹر عبدالحمید زبیری' پروفیسر محمد عاقل ایم۔اے وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ شروع میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مولینا ابوالکلام آزاد' مہاتما گاندھی' ڈاکٹر رابندرناتھ ٹیگور' سر اکبر حیدری' سر تیج بہادر سپرو' ڈاکٹر راجندر پرشاد صدر کانگریس وغیرہ کے پیغامات درج ہیں۔ بہرحال اقبال کی شاعری کے متعلق یہ مجموعہ مضامین نہایت بیش بہا

[1] ملنے کا پتہ:۔ The Seminar for Comparative Religions, Baroda College, Baroda.

[2] قیمت درج نہیں۔ ملنے کا پتہ:۔ انجمن اتحاد' جامعہ ملیہ۔ دہلی۔

رفتار زمانہ

جنگ یورپ

پولینڈ کے حصے بخرے ہو جانے کے بعد جنگ عملی طور پر رکی تھمی سی ہے۔ مغربی محاذ میں جو تھوڑی بہت جنگی کارروائی فرانس اور جرمنی نے جاری کر رکھی تھی وہ بھی بارش شروع ہو جانے کی وجہ سے معطل ہو گئی ہے۔ فرانسیسی فوجیں اُس جرمن علاقہ سے جو اُنھوں نے آغاز جنگ سے ابتک فتح کیا تھا ہٹ آئی ہیں۔ جس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ اگر وہ ایسا نہ کرتیں تو دریاؤں کی طغیانی کی وجہ سے دلدل میں پھنس کے رہ جاتیں۔ اب تمام فرانسیسی فوجیں اپنی سرحد پر مورچہ بند ہو گئی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے، جرمنی نے بھی یہی تہیہ کر لیا ہے کہ وہ اب فرانس کے خلاف جنگ بند کر کے برطانیہ پر شدت کیساتھ ہوائی حملے کریگا۔ خبر ہے کہ اس کے متعلق ہٹلر نے مسولینی سے بھی مشورہ کیا ہے۔

تجارتی جہازوں کے خلاف آبدوز کشتیوں کے حملے جاری ہیں اور جرمنی، برطانیہ کے دو بڑے جنگی جہاز اور متعدد دوسرے جہاز غرق کر چکا ہے۔ رائل اوک نامی مشہور جنگی جہاز تو اپنے مستقر میں غرق کیا گیا۔ جرمنی کے ہوائی جہاز بھی اسکاٹ لینڈ اور انگلینڈ کے مشرقی ساحل کے شہروں اور بندرگاہوں پر موقع پاکر حملے کر کے بھاگ جاتے ہیں۔ لیکن ابھی تک ہوائی جنگ شدت کیساتھ شروع نہیں ہوئی اور جرمنی کی دھمکیاں بفضلہ پوری نہیں ہوئیں

برطانیہ نے جس طریق عمل کا اعلان کیا ہے وہ جرمنی کی درآمد تجارت بند کر دینے کی پالیسی ہے۔ چنانچہ جہانتک واقعات و حالات سے واضح ہو رہا ہے برطانیہ کو اسمیں خاصی کامیابی ہوئی ہے۔ پچھلی جنگ عظیم میں بھی جرمنی کو اسوجہ شکست ہوئی تھی کہ اس کی تجارت مسدود ہو گئی تھی۔ اور اُسے کچا مال اور غلہ ملنے کی کوئی راہ باقی نہیں رہی تھی۔ مگر اس مرتبہ ایک بڑا فرق ضرور ہے کہ جرمنی کو روس کی رفاقت سے بہت طرح کا کچا مال کافی مقدار میں ملنے کی توقع ہو گئی ہے

ہٹلر اور مسولینی نے صلح کی بہت کوشش تو کی لیکن ہٹلر اپنی شرائط پر صلح کرنا چاہتا ہے اور پولینڈ کے مسئلہ پر کسی مصالحت کے لئے تیار نہیں ہے۔ اس لئے برطانیہ و فرانس نے جرمنی کی پیشکش کو ٹھکرا دیا اور کہا کہ جب تک پولینڈ کی تقسیم شدہ ہڈیوں، گوشت اور خون کو جمع کر کے اور اس پیکر میں جان ڈال کر روس اور جرمنی اس سے دست بردار نہیں ہو جاتے صلح کے مسئلہ پر غور نہیں کیا جاسکتا۔ اسوقت عوام برطانیہ کی بھی یہی رائے ہے حالانکہ لائڈ جارج کی پر زور سفارش ہے کہ جرمنی نے امن و صلح کی جو کانفرنس منعقد کرنا تجویز کی ہے۔ اس کو انگلستان کو منظور کر لینا چاہئے۔ لیکن اس رائے کی عام طور پر مخالفت کی گئی ہے اور جرمنی نے بھی اس مسئلہ پر دوبارہ غور کرنے سے انکار کر دیا ہے حالانکہ مسٹر چیمبرلین نے اپنی تجاویز کا جو خاکہ پیش کیا ہے اُس پر جرمنی کو غور کر کے اپنی طرف سے دوبارہ نئی تجاویز پیش کرنی چاہئے تھا۔ بہرحال موجودہ طرز عمل سے جنگ جاری رہنے کی ذمہ داری جرمنی پر قائم رہتی ہے۔

ہٹلر جنگ کو شدت کیساتھ شروع کرنے میں ابھی تک پس و پیش کر رہا ہے۔ مگر یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ پولینڈ میں جو علاقہ روس نے لیا ہے وہاں سویٹ طرز پر تنظیم کی جاری ہے اور اس حصہ ملک کو روس میں ملانے کی پوری کاروائی ہو چکی ہے۔ اس لئے اب یہ امید کرنا کہ روس اس علاقہ سے دست بردار ہو جائے ذرا مشکل نظر آتا ہے اور چونکہ روس کو پولینڈ کے حصے بخرے سے فائدہ ہوا ہے اس لئے اس نے جرمنی کی ہمنوائی شروع کر دی ہے اور روس کے وزیر خارجہ نے بھی اپنی تازہ ترین تقریر میں جنگ جاری رکھنے کی تمام تر ذمہ دار برطانیہ اور فرانس پر ڈالتے ہوئے اس بات کو بڑے زور و شور سے دہرایا ہے کہ پرانا پولینڈ اب کسی حکمت سے بھی دوبارہ زندہ نہیں ہو سکتا ہے۔ [illegible] پالیسی کا ذکر کرتے ہوئے وزیر موصوف نے کہا ہے کہ روس بین الاقوامی معاملات میں ہر ضروری کاروائی کے لئے اپنی آزادی برقرار رکھنا چاہتا ہے اور جنگ کو جلد سے جلد ختم کرنیکا خواہشمند ہے مگر خود غیر جانبدار رہے گا۔ اس اثنا میں روس نے ریاستہائے بلقان پر بھی اپنا اثر بہت بڑھا لیا ہے جس کی وجہ سے یورپین سیاست میں اب اس کو خاصہ دخل ہو گیا ہے۔ مگر حال ہی میں [illegible] خاص باتیں برطانیہ کے حق میں ہوئی ہیں۔ اول یہ ہے کہ برطانیہ کا ترکی کے ساتھ دوستانہ معاہدہ ہو گیا ہے۔ جس میں ترکی نے اس بات کو صاف کر دیا ہے کہ وہ روس کے خلاف جنگ میں شریک نہ ہوگا اٹلی اور جرمنی میں اس معاہدہ پر بہت کچھ غم و غصہ کا اظہار کیا گیا ہے لیکن روس نے اس پر علانیہ کوئی اظہار ناپسندیدگی نہیں کیا ہے۔ البتہ یہ بات ضرور قابل لحاظ ہے کہ روس و ترکی کے درمیان جو معاہدہ کی گفتگو ہو رہی تھی وہ منقطع ہو گئی ہے۔ [illegible] ادھر تین چار روز سے [illegible] خبریں آ رہی ہیں کہ روس ناراض ہو کر ترکی و رومانیہ کے خلاف [illegible] کی تیاریاں کر رہا ہے اور جرمنی نے بھی مغربی جانب سے اسکی مدد کا وعدہ کیا ہے۔ [illegible] اگر روس ترکی یا رومانیہ پر حملہ کرے تو اسی [illegible] جرمن فوج [illegible] پر شدید حملہ کر دے تاکہ برطانیہ و فرانس کو ترکی و رومانیہ [illegible] کا موقعہ نہ مل سکے۔ لیکن روس اور ترکی دونوں [illegible] بعد اس [illegible] میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ روس و جرمنی کے حال [illegible] کوئی اعتبار نہیں [illegible] ضرور کہا جا سکتا ہے کہ رومانیہ یا ترکی پر [illegible] آسان کام نہ ہوگا کیونکہ روس [illegible] باسفورس کے دروازے فوراً کھل جائیں گے اور رومانیہ کو برابر مدد پہنچ سکیگی۔ دوسرے ترکی پر [illegible] ساحل [illegible] کی طرف سے حملہ ہو سکتا ہے اور ان [illegible] میں کسی بڑی فوج کا [illegible] نقل و حرکت [illegible] کے موسم میں کوئی آسان کام نہیں ہے [illegible] کے ساحل پر [illegible] سہل نہیں ہے [illegible] چند آبدوز کشتیاں اور تین چار جنگی جہاز [illegible] روسی بیڑہ کا خاتمہ کر سکتے [illegible] وزیر خارجہ کی تازہ ترین تقریر سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ روس جنگ میں اپنی غیر جانبداری برقرار رکھنا چاہتا ہے [illegible] رہتی ہے برطانیہ اور ترکی کے درمیان جو معاہدہ ہوا ہے [illegible] سب سے اہم شرط یہ ہے کہ اگر کوئی [illegible] یورپین طاقت کی جارحانہ کارروائی سے بحیرہ روم میں جنگ پھیل جائے اور ترکی کو اس [illegible] برطانیہ ترکی کی مدد کریگا اس طرح اس معاہدہ کی [illegible] اٹلی کی [illegible] گیا ہے۔

دوسرا اہم واقعہ امریکن سینیٹ میں قانون غیر جانبداری کی ترمیم ہے جس کی [illegible] ہر فریق جنگ کے ہاتھ جنگی سامان فراہم کر سکتا ہے۔ اس ترمیم کو اتحادیوں کی فتح کے [illegible] کوئی شک نہیں کہ اس سے برطانیہ و فرانس کو [illegible]

جواب

مضمون زیربحث کے راقم سید مقبول حسین صاحب نے اعتراضات بالا کا مختصراً یہ جواب دیا ہے:-

ہندی سے میرا مطلب اُس زبان سے ہے جو عام ہندوستانی یعنی برہمن، چھتری، ویش، شودر، چنڈال، مچھ وغیرہ سب بولتے ہیں۔

زبان کی "خدمت" ارادتاً آجکل کے زمانہ سے پہلے کبھی نہیں کی گئی۔ آجکل زبان کی خدمت نے سیاسی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ ورنہ زبان خود پیدا ہوتی ہے اور اُس کا بولنا ہی اُسکی خدمت ہے۔

مسلمانوں نے اِس ہندی کے لئے اپنی مادری زبان ترک کردی اور اسی کے ہو رہے یہ کیا کم خدمت ہے؟

اگرچہ اُنھوں نے یہ ارادہ کرکے فارسی نہیں چھوڑی کہ وہ ہندی کی خدمت کر رہے ہیں تاہم اُنھوں نے خدمت ضرور کی

ڈاکٹر رابندر انگریز زبان کے شاعر نہیں ہیں۔ اگر اُنھوں نے اپنے بنگالی نغموں کا انگریزی میں ترجمہ کیا تو محض اِس لئے کہ اُن سے اہلِ مغرب بھی روشناس ہو جائیں۔ چنانچہ اُنھوں نے بھی بظاہر انگریزی کی خدمت نہیں کی۔ مگر دراصل یہی خدمت ہے۔ اسی لحاظ سے ہر انگریزی دان ہندوستانی انگریزی کی خدمت کر رہا ہے اور واقعی ہم لوگ "انگریزی" کی خدمت اپنی نام نہاد قومی زبان سے کہیں زیادہ کر رہے ہیں۔ اگرچہ یہ خدمت کسی خاص ارادے سے نہیں ہوتی ہے۔ بہرحال ہمارے حالات اور واقعات ہی خدمت کرا لیتے ہیں اور مجبوریاں ہی خالقِ تہذیب ہو جاتی ہیں۔

عہدِ اسلامی میں ہندو شعرا کو جو مراعات حاصل تھیں۔ ان کی تفصیل کے لئے علیحدہ تصنیف کی ضرورت ہے موقر معصر "ہمایوں" لاہور میں "اُردو ہندی اور ہندو مسلمان" کے عنوان سے (مارچ ۱۹۴۰ء میں) ایک مضمون شائع ہوا ہے جس سے اِس سوال کا کچھ جواب ملتا ہے۔

اُردو کی ابتدا ایک تاریخی واقعہ ہے جسمیں جدت کی گنجائش نہیں۔ "ٹھیٹھ ہندی" دراصل کوئی زبان نہیں۔ البتہ ہمارے نام نہاد قوم پرست اب نئی ہندی ایجاد کر رہے ہیں۔

اِس مسئلہ پر اخبار پانیر نے اپنے ایڈیٹوریل مورخہ ۱۹ر مارچ ۳۹ء میں مزید روشنی ڈالی ہے۔ اور ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو نے بھی جامعہ عثمانیہ کے کنووکیشن ایڈریس میں اِس مسئلہ پر مفصل بحث کی ہے۔

(۲) حضرت اثر عظیم آبادی

از سید نصیر الدین حیدر رضوی ڈپٹی کلکٹر میمن سنگھ (بنگال)

صوبہ بہار کے مشہور ادیب سید رضا قاسم صاحب مختار کا گرانقدر مقالہ بعنوان "حضرت اثر عظیم آبادی" مطبوعہ رسالہ زمانہ ماہ جنوری ۱۹۴۰ء میری نظر سے گذرا۔ جسمیں موصوف نے تحقیق و تدقیق سے کام لے کر حضرت اثر مرحوم کے حالات قلمبند فرمائے ہیں۔ لیکن اُنھوں نے اس کی نسبت کچھ نہیں لکھا کہ جناب اثر مرحوم کو شعر و شاعری میں کس سے شرفِ تلمذ حاصل تھا؟

ممکن ہے کہ فاضل مضمون نگار کو اس ضمن میں مصدق طریق پر کوئی واقفیت حاصل نہ ہو سکی۔ جسکی بنا پر آپ نے اس کی نسبت کچھ لکھنا مناسب نہ سمجھا ہو۔ مجھے بھی اس امر کے متعلق کوئی علم نہ تھا لیکن حال ہی میں

نواب سید نصیر حسین خاں خیالؔ عظیم آبادی مرحوم کی ایک تحریر نظر سے گذری۔ جس سے معلوم ہوا کہ حضرت اثرؔ عظیم آبادی مرحوم کو جناب شاہ الفت حسین صاحب فریادؔ عظیم آبادی مرحوم سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ چنانچہ ناظرین زمانہ کی آگاہی کے لئے متذکرہ تحریر کا اقتباس درج ذیل کیا جاتا ہے۔

نواب خیالؔ مرحوم تحریر فرماتے ہیں کہ:-

"....... شاہ الفت حسین فریادؔ میاں اشکیؔ کے بھانجے اور شاگرد تھے۔ فریادؔ کا مذاق شاعری دردؔ سے ملتا ہوا تھا اور زبان بھی وہی قدیم دہلوی۔ فریادؔ ایک سال بعد تک مرشد آباد میں وہاں نواب زادوں کے استاد اور اتالیق رہے۔ بعد کو سفیر مرشد آباد کے سفیر ہو کر کلکتہ آئے۔ وہاں بھی زمانہ تک رہے۔ نواب امیر علی خان باڑھ والے اور شمس العلما مولوی عبد الرف (کلکتہ) جناب شاہ صاحب کے نامی شاگردوں میں سے تھے۔ عظیم آباد واپس آنے پر شہر کے ممتاز لوگ حضرت کے شاگرد ہوئے۔ شادؔ مرحوم کے علاوہ جناب نواب شمس العلما سید امداد امام صاحب اثرؔ کے ایسے استاد بھی فریادؔ ہی کے شاگرد ہیں۔ شاہ صاحب کے فرزند جناب سید ہمایوں مرزا صاحب عرصہ سے حیدر آباد دکن میں مقیم ہیں۔ پٹنہ کے مشہور فارسی گو شاعر و ادیب جناب خان بہادر احمد علی خاں صاحب فریادؔ کے نواسے ہیں آپ کو تاریخ گوئی میں وہ ملکہ حاصل ہے۔ جس کی نظیر ملنا مشکل ہے .... الخ"

(۳) اُردو۔ہندی۔ہندستانی

ح۔ی۔ع صاحب کا جواب از حضرت جگرؔ بریلوی بی اے

ح۔ی۔ع صاحب نے اس بحث کے سلسلہ میں جو مضمون سپرد قلم فرمایا ہے اُسمیں چند جملے میری ذات سے متعلق ہیں۔ پہلے انھیں کے متعلق کچھ عرض کر دوں۔

"ح۔ی۔ع" صاحب کی عبارت کے صاف معنی یہ ہیں کہ جگرؔ اس بحث کے بہانہ اپنی اُردو خدمات کی داد چاہتا ہے۔ جس کی کوئی قسط آپ بغیر ناپ تول کے دینا یا دلانا نہیں چاہتے۔ افسوس کہ "ح۔ی۔ع" صاحب نے اپنی دانست میں بات تو پتہ کی کہی تھی مگر ذرا ناپ تول کے نہیں کہی۔ اُردو دُنیا میں ذاتیات پر حملے کرنا کوئی نئی بات نہیں۔ لیکن ناظرین خود جانتے ہیں کہ اس قسم کے حملے کیا وقعت رکھتے ہیں۔ جگرؔ کی بحث تو یہ ہے کہ اُردو ادب ہندوؤں کی قومی خصوصیات سے یکسر خالی ہے۔ دوسرے اُردو میں ہندوؤں کو ہمیشہ پست و حقیر سمجھا گیا ہے، اور اُن کے مٹا دینے کی مسلسل کوششیں جاری ہیں۔ اس بحث کی تائید میں ناقابل تردید دلائل اور ثبوت پیش کئے گئے ان کا جواب "ح۔ی۔ع" صاحب یہ دیتے ہیں کہ جگرؔ کو اس بحث سے اپنی اُردو خدمات کی داد مطلوب ہے۔ اسکے معنی یہ ہوئے کہ کبھی کسی ہندو خدمتگذار اُردو کو ہندوؤں کی حق تلفی کے متعلق زبان کھولنے کی ہمت نہ کرنا چاہئے ورنہ اُس کا یہ فعل ذاتی خدمات کی داد طلبی پر محمول ہوگا۔ اس منطق کا کوئی جواب ممکن نہیں البتہ! اس سے فاضل مضمون نگار کی تنگ نیتی اور خوش فکری پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

اب سے پہلے اُردو نے ہرگز وہ اہمیت حاصل نہیں کی تھی جو اب اُسے حاصل ہو رہی ہے اور قبل اسکے کہ

ملک کے لئے کوئی خاص زبان تسلیم کی جائے اُردو کے متعلق ہمارے معروضات پر ارباب حل وعقد کو اور نیز اُردو کے علمبرداروں کو ٹھنڈے دل سے غور کرنا ہوگا۔ زبان کے متعلق جو مسائل میں نے پیش کئے ہیں، وہ یہ کہہ کر نامے نہیں جا سکتے کہ اُن کے پردے میں میری یا کسی دوسرے شخص کی داد طلبی کی خواہش کام کررہی ہے

مسائل زیر بحث کے متعلق ن۔ ی۔ ع صاحب ارشاد فرماتے ہیں کہ:-

"بات دراصل یہ ہے کہ آزاد نے محض اُن شاعروں کو اپنے تذکرے میں جگہ دی ہے جو اُس کے نزدیک اُستاد گذرے ہیں۔"

مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی نے بھی آزاد کی حمایت میں یہی عذر پیش کیا تھا۔ اُس کا جواب میرے نومبر ۱۹۲۸ء والے مضمون میں شائع ہو چکا ہے اور احسن کے متعلق خود آب حیات سے اقتباسات پیش کرکے ثابت کردیا گیا ہے کہ یہ کہنا قطعی غلط ہے کہ آزاد نے انھیں شعراء کو اپنی کتاب میں جگہ دی، جو اُن کے بلند معیار پر اُترے۔ اس کے متعلق مزید ثبوت درکار ہو تو یہ بھی حاضر ہے۔

آزاد کو میر اور سودا کے ساتھ مظہر کا نام لیتے ہوئے تامل ہوتا ہے۔ ضاحک کے متعلق آزاد لکھتا ہے۔" دیوان اب تک نظر سے نہیں گذرا جس پر کچھ رائے ظاہر کی جائے۔ خواص میں جو کچھ شہرت ہے اُن ہجوؤں کی بدولت ہے جو سودا نے اُن کے حق میں کہیں۔"

اب انصاف پسند حضرات غور فرمائیں کہ میر وسودا کے ساتھ مظہر کا نام لینے میں خود آزاد کو تامل ہے اور ضاحک کے متعلق گو وہ کوئی رائے قائم نہیں کرسکتے۔ پھر معلوم نہیں اُن کو آب حیات میں کیوں جگہ دی گئی؟ اور یہ کہنے والے کیونکر کہتے ہیں کہ آزاد نے صرف انھیں شعراء کا تذکرہ لکھا ہے، جو اُن کے بلند معیار پر پورے اُترے ہیں یا جو اُستاد تھے۔ یہ ہٹ دھرمی نہیں تو اور کیا ہے؟

لیکن بفرض محال یہ تسلیم بھی کرلیا جائے تو کیا ہندوؤں میں کوئی اُستاد کسی دور میں نہیں گذرا جسکو آزاد اپنی بارگاہ میں جگہ دیتے۔ اب اگر ہر دور کے ہندو مشاہیر کو اُن کی اُستادی کی شہادت اور ثبوت کیساتھ پیش کرتا ہوں تو یہ سلسلہ نامتناہی ہو جائے گا۔ اس لئے میں نے کسی پچھلے مضمون میں متقدمین میں سے تمثیلاً صرف ایک، دیوانہ کی بلند پائیگی کے ثبوت میں بحوالہ نغز مرتبہ حکیم قدرت اللہ سے ایک عبارت پیش کی تھی مگر ن۔ ی۔ ع صاحب نے اُس پر توجہ نہیں فرمائی۔

میر حسن نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ "رائے سرب سنگھ المتخلص بہ دیوانہ شاعر زبردست فارسی است اُستاد ریختہ گویان لکھنؤ۔ چنانچہ میاں حسرت، حیدر علی حیران و دیگر ہا، شاگرد اویند۔"

مولوی محمد حبیب الرحمٰن خاں صاحب شیروانی نے بھی تذکرہ میر حسن کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ "میر حسن کے تذکرے میں کئی بہت ہندو شعراء کا ذکر ہے جنمیں سے بعض جگت اُستاد تھے مثلاً رائے سرب سنگھ دیوانہ......"

غرض آب حیات سے پہلے تقریباً تمام تذکرہ نویسوں نے کم سے کم دیوانہ کو جگت استاد تسلیم کیا ہے۔ لیکن آزاد اس جگت اُستاد کو بھی اپنی محفل میں شرف باریابی نہیں بخشتے۔ اور احسن، مضمون، ضاحک، مظہر وغیرہ کے مقابلہ میں

لہ آب حیات صفحہ ۱۳۱ مطبوعہ نولکشور پریس لاہور ۱۹۰۷ء ۔ ٭۲ ایضاً صفحہ ۱۷۲

قابلِ اعتنا نہیں سمجھتے۔ اِن واقعات کے روبرو میرا یہ اعتراض کہ آزاد نے ہندوؤں سے اسی طرح بچنے کی کوشش کی ہے، جیسے کوئی وبائی امراض سے بچتا ہے، کسی کے اُٹھائے اُٹھ نہیں سکتا۔

میں نے خود اپنے ابتدائی مضمون مطبوعہ ماہ اپریل ۱۹۳۸ء میں اعتراف کیا ہے کہ آبِ حیات سے پہلے بہت سے تذکروں میں ہندو شعرا کا ذکر ہے۔ نہیں معلوم کہ ح۔ ی۔ ع صاحب نے اس کے دہرانے میں کیا مصلحت سمجھی کہ میر تقی میر، میر حسن، مصحفی، شیفتہ اور قدرت اللہ کے تذکروں میں ہندو بھی موجود ہیں؟ میرا التماس تو یہ ہے کہ قدیم تذکروں کے بعد جو دور شروع ہوا، اس میں۔ لہٰذا نہ کو اُردو کا واحد موجد و مختار مان کر بحث کی گئی ہے اور محمد حسین آزاد نے جو بے انصافی کا طریقہ اختیار کیا، وہی بعد کے تذکرہ نویسوں کے لئے شمعِ ہدایت بن گیا۔ چنانچہ آٹھ کتابوں میں جو آبِ حیات کے بعد کی تصنیف ہیں، ہندوؤں کی سخت حق تلفی کی گئی ہے۔ آبِ حیات و شعر الہند، سیر المصنفین سے کافی و وافی شہادتیں پیش کر چکا ہوں۔ اُن کے بعد عبدالقادر سروری صاحب نے اپنی کتاب جدید اُردو شاعری میں چار دور قائم کئے ہیں اور پہلے دور میں پینتالیس[۴۵] جلیل القدر شعرا گنائے ہیں۔ مگر ان میں ہندو ایک بھی نہیں۔ دوسرے دور میں بھی کوئی ہندو نہیں۔ تیسرے دور یعنی "درمیانی زمانہ" میں صرف شاد ایک ہندو نظر آتے ہیں۔ چوتھے دور یعنی عصرِ حاضر میں سرور جہان آبادی اور چکبست صرف دو ہندوؤں کا نام لیا گیا ہے۔ حالانکہ اس کتاب میں بہت سے ایسے حضرات شامل ہیں۔ جن پر کبھی شاعر ہونے کا اطلاق ہی نہیں ہو سکتا اور جن کو سوا ناظم اور متشاعر کے کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔

آبِ حیات، شعر الہند، جدید اُردو شاعری تین کتابوں سے مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر تھوڑا تھوڑا سا مسالہ میں نے اپنے معروضات کے ثبوت میں پیش کیا ہے۔ اب اس کے بعد جو تصنیف "ح۔ ی۔ ع" صاحب تجویز فرمائیں اسی کا جائزہ لے کر مزید ثبوت کے طور پر کچھ عرض کیا جائے۔

میں نے اپنے کسی پچھلے مضمون میں عرض کیا ہے کہ جہاں ہندوؤں کی ادبی فضیلت کے متعلق کسی نے [illegible] چھیڑی فوراً معیار کا ہوا پیش کر کے اُن کو مرعوب کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ چنانچہ "ح۔ ی۔ ع" صاحب نے بھی بار بار اپنے مضمون میں معیار کا آلہ استعمال کیا ہے۔ لطف یہ ہے کہ اس معیار کے بانی اور قائم کرنے والے بھی وہی لوگ ہیں جنہوں نے اُردو ادب سے ہندوانی عناصر خارج کر دینا مناسب سمجھا گیا۔ ایسے معیار کو اس زبان کے ادب کی صحیح کسوٹی کہا جا سکتا ہے جو ہندو مسلم دونوں قوموں کی زبان بتائی جاتی ہے؟ ادب عبارت ہے [illegible] قوم کی تمام خصوصیتوں کی تفسیر و تشریح سے۔ اس لئے اگر اُردو ادب اس کلیہ سے مستثنےٰ نہیں تو ہندوانی خصوصیات کا فقدان یقیناً اس کے ادبی معیار کے ناقص و نامکمل ہونے کی دلیل ہے۔ لیکن اگر رفعِ حجت کے خیال سے یہ معیار بھی تسلیم کر لیا جائے تو بھی اسی پر پورا اترنے والے ہندو ہر دور میں ہوئے ہیں۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ ادب کے اجارہ داروں اور خود ساختہ خداوندانِ معیار نے اُن کو مٹا ڈالا اور جو مٹانے پر بھی نہیں مٹے، اُن کو کم حقیقت اور پست ثابت کرنے کی کوشش برابر جاری ہے۔

ہندوؤں کی تہذیب کی اُردو ادب میں نمائندگی کے متعلق "ح۔ ی۔ ع" صاحب نے سودا، ساغر اور

[۴۵] اگر جدید اُردو شاعری [illegible] کے ساتھ [illegible] بھی [illegible] جاتے ہیں [illegible] سب سے پہلے [illegible] جلد

اقبالؔ کے تین چار ایسے شعر پیش کئے ہیں جنمیں ارجنؔ، ساونؔ، راونؔ، جمنا کا نام آگیا ہے۔ اور دو چار ایسی نظمیں بتائی ہیں جو بعض مسلم شعرا نے نانک، سوامی رام تیرتھ، رامؔ وغیرہ پر لکھی ہیں۔ اس کی نسبت میں عرض کرونگا کہ اگر ایسے تین چار شعر یا بفرض محال تھوڑے پچاس شعر یا دس بیس نظموں سے ہندو قوم کی تہذیب و معاشرت کی کافی نمائندگی ہوجاتی ہے تو یا تو ہمارے دوست ہندو قوم کی خصوصیات سے واقف نہیں اور اگر واقف ہیں تو یقیناً زبان و قوم کے باہمی رشتہ سے ناواقف ہیں۔ کسی قوم کی زبان اُس قوم کی تمام جسمانی، دماغی اور روحانی خصوصیات کی ترجمان اور محافظ ہوتی ہے۔ انہیں سے ایک ایک شعبہ میں ہندوؤں کی فتوحات اور کارنامے متمدن دُنیا کے لئے ہمیشہ باعث فخر اور قابل تقلید رہیں گے۔ ان پر ہر شعبہ میں دفتر کے دفتر لکھے جانیکے بعد بھی کچھ نہ کچھ کمی رہ جائے گی۔ اب اگر کوئی شخص یہ کہے کہ نہیں اُردو کے تھوڑے پچاس ہی شعر یا دس بیس نظموں سے ہی ان تمام خصوصیات کی کافی نمائندگی ہوجاتی ہے اور بہ حیثیت قوم ہندوؤں کے حقوق اُردو زبان ادا کردیتی ہے تو اُس کی عقل و ہمت پر سوا آفرین کے اور کیا کہا جائے۔

طلسم فریب

اس پرچہ میں مندرجہ بالا عنوان سے جو رنگین تصویر ہدیۂ ناظرین کی گئی ہے وہ اُس وقت کی ہے جبکہ راونؔ نے سیتا ہرن کے لئے فریب کا جال اس طرح بچھایا تھا کہ اپنے ایک راکشش کو ایک نظر فریب ہرن کی صورت میں اس مقام پر بھیجا تھا جہاں سری رامچندرؔ جی، لکشمنؔ جی اور سیتاؔ جی بن میں مقیم تھے۔ سیتاؔ جی کو اس مصنوعی طلسمی ہرن کی ادائیں کچھ اسقدر پسند آئیں کہ انھوں نے رامچندرؔ جی سے اُسکے زندہ گرفتار کرنے کی درخواست کی۔ چنانچہ وہ اُس کے تعاقب میں گئے۔ اور جب وہ نظروں سے اوجھل ہوگئے تو تھوڑی دیر بعد جنگل کی اوٹ سے "ہائے لکشمن! ہائے سیتا!!" کی آواز آئی۔ لکشمنؔ جی اُسے رامچندرؔ جی کی آواز سمجھ کر بے قرار ہوگئے اور بھائی کی مدد کو چل دئے۔ سیتاؔ جی تنہا رہ گئیں۔ اور راونؔ کو ان کو لے جانیکا موقعہ مل گیا۔

Insurance Vade Mecum.

اس کتاب کو جو تیرہؔ سال سے برابر سالانہ شائع ہورہی ہے۔ مسٹر ایس۔ ایل۔ تُلی نے بڑی محنت اور دیدہ ریزی سے مرتب کیا ہے۔ موصوف نے اسمیں ملک کی مختلف بیمہ کمپنیوں کی سرگرمیوں کا حال بیان کردیا ہے جنمیں ہندوستانی اور غیر ملکی دونوں قسم کی کمپنیوں کے متعلق تمام ضروری معلومات بہم پہونچائی گئی ہیں۔ اور ۱۵۳ ہندوستانی اور ۲۹ غیر ملکی بیمہ کمپنیوں کی شرح پریمیم بھی درج کردی ہے۔ اس کے علاوہ اور بہت سے اعداد و شمار بھی دئے گئے ہیں۔ جو انشورنس کمپنیوں کے ایجنٹوں کے لئے خاص طور پر کارآمد ہوں گے۔ بہرحال بیمہ کمپنیوں سے دلچسپی لینے والے حضرات کے لئے یہ کتاب بہت سی مفید معلومات سے پُر ہے۔ ملنے کا پتہ:۔ انشورنس پبلسٹی کمیٹی لمیٹڈ ۱۳ میکلوڈ روڈ لاہور

ممیرہ اور سچے موتیوں کا سفید سرمہ

مصدقہ جناب نامی گرامی ڈاکٹر آر۔ کرابر صاحب بہادر سی۔ آر۔ ایس فیلو آف کیمسٹری لندن جس کی بابت لندن، کلکتہ، پنجاب۔ آگرہ میڈیکل کالج کے سند یافتہ ڈاکٹروں، نوابوں اور راجاؤں معزز حکمار صاحبان، ڈپٹی کلکٹران و معزز یوروپین انگریزوں نے بعد تجربہ لکھا ہے کہ "ممیرہ اور سچے موتیوں کا سفید سرمہ آنکھوں کی بیماری اور ترقی روشنی کے واسطے مفید ہے اور زود اثر دوا ہے۔" ملک روس و افریقہ کے معزز ڈاکٹروں اور ہندوستان کے ویدوں اور حکیموں نے آنکھوں کی بیماری میں اور دوا کو چھوڑ کر اس سرمہ کو استعمال کیا ہے۔

ہمارے سرمہ کا امتحان اور اسمیں کامیابی

نگاہ ناپ کر سرمہ لگائیے۔ دو ہفتہ میں روشنی بڑھ جائیگی اور جملہ نقائص دور ہو جائیں گے۔ عینک کی ضرورت نہیں رہتی۔ دھند۔ ڈھلکا۔ آنسو بہنا۔ سوزش۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا۔ پلکوں کے اندر سرخی کو ہانی دور ہو جاتی ہے۔ کمزور نگاہ سے سوئی میں تاگا بہت جلد ڈال لیجئے۔ پربال، سبل، پھولا، جالا، ناخونہ، ابتدائی موتیا بند، آنکھوں کے سامنے اندھیرا و ڈورا سا آنا بند ہو جاتا ہے۔ لکھنے پڑھنے سے آنکھوں کی تکان اور سرخی بہت جلد صاف کرتا ہے اور امراض چشم سے محفوظ رکھتا ہے۔ قیمت فی تولہ تین روپیہ محصول ۲ر نمونہ ایک روپیہ سے کم قیمت پر نہیں ملتا۔ ملنے کا پتہ:- منیجر نگم کمپنی، نیا چوک۔ کانپور

ہاف ٹون عکسی تصاویر

ملک معظم جارج پنجم۔ شہنشاہ جارج ششم مع ملکہ الزبتھ۔ سابق شاہ ایڈورڈ ہشتم۔ لارڈ ارون۔ لارڈ لنلتھگو۔ ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور۔ سر صاحب جی مہاراج۔ سر علی امام۔ سری۔ وی۔ رمن۔ مسٹر سچدانند سنہا۔ مولانا محمد علی۔ ایشور چند ودیا ساگر۔ سوامی شردھانند۔ ٹیپو سلطان۔ اکبر۔ شہنشاہ جہانگیر۔ نادر شاہ۔ سور داس۔ راجہ مان سنگھ۔ عبدالرحیم خانخاناں۔ شیواجی۔ رام داس گرو۔ وقت نزع۔ غسل کی تیاری۔ شیر محمد قوال۔ لیلیٰ مجنوں۔ بھکارنی۔ ہمدردی۔ مسیح اور کانٹوں کا تاج۔ ذبح عظیم۔ عشق و زندگی۔ بخیل۔ ہڑتالی مزدور۔ کثرت میں وحدت۔ (ماگھ، پھاگن وغیرہ موسمی تصاویر) قیمت فی تصویر تین پیسہ (۳ر) ملنے کا پتہ:- زمانہ بک ایجنسی۔ کانپور

ایڈیٹر و پبلشر: منشی دیا نرائن نگم۔ | پرنٹر: خواجہ عبدالوحید، انتظامی پریس، کانپور

The ZAMANA, NOVEMBER, 1939 REGD. No. A211

مرتبہ : دیا نراین نگم بی ۔ اے ۔

جلد ۷۳ | نومبر ۱۹۳۹ء | نمبر ۵

تصویر :- ۱ ۔ نماز مغرب

قیمت سالانہ پانچ روپیہ

زمانہ پریس کانپور سے شایع ہوا

نمونہ سات آنے

زمانہ کے پرانے فائل

دفتر ہذا میں ۱۹۲۶ء سے پرانے فائل موجود ہیں۔ زمانہ کے تشنگانِ ادب خوب واقف ہیں کہ شمالی ہند کا یہ قدیم ترین اور مشہور رسالہ چھتیس ۳۶ سال سے اردو زبان و ادب کی کسقدر انہماک و سرگرمی سے خدمت کر رہا ہے اس کے نقادانہ مضامین اور گرانپایہ نظمیں ملک کے بڑے بڑے نقادوں سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ زمانہ کے پرانے فائل لائبریریوں میں رکھنے قابل چیز ہیں۔ صرف چند فائلیں باقی رہ گئی ہیں۔ خریداروں سے حسب ذیل رعایت کی جائے گی:-

۱- بارہ ۱۲ سال کے مکمل سٹ کے خریدار سے ۳۰
۲- چار ۴ سال کے خریدار سے تین ۳ روپیہ فی فائل
۳- ایک سال کے خریدار سے ۴ علاوہ محصول ڈاک۔ آرڈر کے ہمراہ چوتھائی قیمت پیشگی بھیجئے۔

فائل ۱۹۲۸ء میں جوبلی نمبر باقی نہیں ہے۔ ۱۹۳۴ء ستمبر کا پرچہ موجود نہیں۔ ۱۹۰۷ء سے ۱۹۲۵ء تک مختلف پرچے بھی آرڈر آنے پر مل سکتے ہیں۔

منیجر زمانہ کانپور سے طلب فرمایئے

واردات

منشی پریم چند مرحوم کے تیرہ ۱۳ افسانوں کا مجموعہ، جو نہایت محدود تعداد میں شائع ہوا ہے۔ شائقین جلد طلب فرمائیں۔
قیمت صرف ایک روپیہ ۔ محصول ڈاک علاوہ
ملنے کا پتہ:- **زمانہ بک ایجنسی، کانپور۔**

ایک جوان اور حسین بیوی

ہر شوہر کیلئے سرمایۂ فخر ہوتی ہے
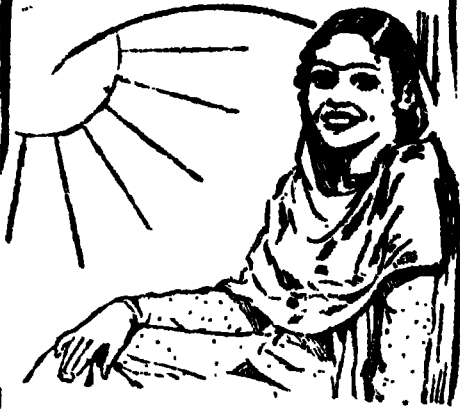
بہت سی عورتیں قبل از وقت بڑھیا ہو جاتی ہیں کیونکہ گھر کے سخت کام دھندے، پریشانیاں، بچوں کی بیماریاں اور بہت سی دیگر باتیں ان کی درخشان جوانی کو چوس لیتی ہیں۔ صرف بیوی ہی کو تکلیف نہیں ہوتی بلکہ ایلی زندگی اور شوہر کی مسرتیں بھی بیوی کی خستگی اور کمزوری کے باعث خراب ہو جاتی ہیں۔ آپ کو چاہیے کہ اپنی بیوی کو کچھ دن تک سناٹوجن استعمال کرائیں۔ اسمیں تندرستی ہی تندرستی ہے۔ یہ چیز کمزور جسم اور خون کے ذروں کو غذائیت دیتی ہے، پٹھوں کو قوی کرتی ہے، ہاضمہ کو بڑھاتی ہے اور از سر نو تندرستی کو جوان اور خوشی کو بحال کر دیتی ہے۔ بہت سی عورتوں کی شباب کی سی صورت سناٹوجن کے روزمرہ استعمال کی وجہ سے قائم ہے۔ سناٹوجن سے وہ زائد صحت اور طاقت حاصل ہوتی ہے جس سے ایک عورت از سر نو جوان اور طاقتور بن جاتی ہے۔

ہالینڈ سے منگائی جاتی ہے
تمام دوافروشوں اور بازاروں سے ملتی ہے

SANATOGEN

THE TRUE TONIC FOOD

موازنہ

برف کی طرح سفید۔ گھوڑے کی طرح مضبوط۔ قارون کی طرح دولتمند۔ یہ وہ چند استعارات ہیں جو روزمرہ کی زندگی میں جوانوں اور بوڑھوں کی زبانی ہم سنتے ہیں۔ زبان نہ جانے کیا شے ہوتی اگر استعارات میں وجود نہ ہوتا۔ اگر لفظ "مانند" کا وجود نہ ہوتا تو ہم اپنے خیالات کا اعادہ کیونکر کرتے؟

جب کبھی ہم کسی چیز کو خوبصورتی یا بدنمائی کی توضیح پیش کرتے ہیں تو ہم استعارات سے مثالیں قائم کرتے ہیں اور لفظ "مانند" کا استعمال اس طرح ہر لحظہ جاری ہے۔

مسٹر ہنری گڈنی نے بھی اپنے سامعین سے ملیریا جیسے عذاب عظیم کی اندوہناکیوں کو جتانے کیلئے ایک استعارہ استعمال کیا تھا اور وہ یوں ہے:۔

اگر برطانوی ہندوستان کے ملیریا زدہ انسانوں کی لاشوں کو یکے بعد دیگرے بچھانا شروع کر دیا جائے تو ہندوستان کے جنوبی سرے سے شمالی سرے تک کا تمام زمین ان لاشوں سے بھر جائے گی۔

اگرچہ یہ مثال کچھ مشکوک سی معلوم ہوتی ہے تاہم صداقت سے خالی نہیں۔ ہندوستان کے تخمیناً کروڑ باشندوں میں سے بیس لاکھ ہر سال ملیریا کے ہاتھوں فنا ہو جاتے ہیں اور نو کروڑ اس کے شکار ہوتے ہیں۔ یہ تو ملیریا کی اس عظیم الشان تباہ کاری کی محض ادنیٰ سی مثال ہے جو سارے جہان پر اس وجہ سے نازل ہوتی ہے۔ یہ وہ عذاب عظیم ہے جس کے گھائلوں کی تعداد نہایت خونیں جنگوں اور بدترین وباؤں کے اثر زدہ انسانوں سے کہیں زیادہ ہے۔

پھر جب ہم اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں اس وقت ملیریا کی روک تھام کرنے والے تدابیر کے یعنی عالم انسانیت کی اہمیت بھی ہماری سمجھ میں آجاتی ہے۔

مجلس بین الاقوام کی کمیشن نے جو ملیریا کی تحقیقات کے لئے مقرر کی گئی تھی۔ انجام کار یہ فیصلہ کیا کہ ملیریا کے پورے موسم کے دوران میں چھ گرین کونین کا استعمال اس مصیبت سے محفوظ رہنے کے لئے بہت کافی ہے۔

ملیریا زدہ لوگوں کے علاج کے متعلق مذکورۂ بالا کمیشن نے سفارش کی ہے کہ ہر روز پندرہ سے بیس گرین تک کی خوراک پانچ سے سات دن تک مریض کو دینا چاہئے۔ کسی مزید علاج کی قطعاً ضرورت نہیں۔ البتہ اگر دورہ عود کر آئے تو پہلے کی طرح پھر علاج شروع کر دیں۔

مثنوی سحر۔ یعنی پنڈت کالی داس کی مثنوی کا اردو ترجمہ، حضرت سحر ہنگامی کے شاعرانہ کمال کا اعجاز۔ دوسرا ایڈیشن، جسکی مصنف نے نظرثانی کی ہے۔ قیمت ۸ر

حدیث حسن:۔ جوان سال ادیب حضرت شمیم احمد فطرت کی دلکش و دلآویز نظموں کا مجموعہ ہے۔ کلام پڑھنے سے طبیعت میں شگفتگی پیدا ہوتی ہے۔ قیمت صرف عہ ر

طریق دولتمندی۔ دولت کی چاہ سب کو ہے لیکن دولت کمانے کے طریقوں سے بہت سے لوگ ناواقف ہیں۔ اس کتاب میں دولت حاصل کرنیکے طریقے نہایت خوبی سے بتلائے گئے ہیں۔ قیمت صرف ۸ر

ترجمہ راماین منظوم۔ بال کانڈ کے اصلی دوہے اور چوپائیاں ہندی ترجمہ اردو اشعار میں۔ مترجمہ منشی سورج پرشاد تصور۔ قیمت ۱عہ

خیالات مہاتما گاندھی۔ یہ وہ لاجواب کتاب ہے، جسمیں مسٹر سی۔ ایف اینڈریوز نے مہاتما گاندھی کے مذہبی، سماجی اور سیاسی خیالات شرح و بسط کے ساتھ درج کرکے دنیا پر احسان عظیم کیا ہے۔ قیمت حصہ اول ۱ر۔ دوم ۱عہ

سیر گل:۔ یعنی مسٹر جلیل قدوائی کے مختصر افسانوں کا مجموعہ وہ کتاب جس نے مصنف کو دور حاضرہ کے اہل قلم کی صف اول میں جگہ دلائی ہے۔ آج روسی افسانوں کو عموماً اور چیخوف کے افسانوں کو خصوصاً اردو ادب میں ایک عام شہرت حاصل ہے۔ اُن کے اولین پیش کرنے والے کی تحریر کا اعجاز دیکھنا ہو تو سیر گل ملاحظہ فرمایئے۔ قیمت صرف عہ

محمد بہادر شاہ ظفر:۔ خاتم السلاطین مرزا سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر کے سوانح حیات اور شاعری پر سیر حاصل تبصرہ، از منشی محمد امیر احمد علوی بی۔ اے۔ اس کتاب میں غدر ۱۸۵۷ء کے حالات بھی درج ہیں، جس نے کتاب کی اہمیت اور بھی زیادہ ہوگئی ہے۔ قیمت ۱عہ

کمال داغ:۔ حضرت داغ دہلوی کے تمام دیوانوں کا انتخاب مع مقدمۂ تنقیدی۔ مرتبہ مولانا حامد حسین صاحب قادری۔ اردو غزل گوئی پر جدید زاویہ نگاہ سے تنقید کرکے تغزل کے قدیم و جدید محاسن و معائب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کتاب میں داغ مرحوم کے دیوان گلزار داغ، آفتاب داغ، مہتاب داغ اور یادگار داغ کا بہترین انتخاب ہے۔ قیمت ۱عہ

نقش و نگار۔ شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی کی کیف آور نظموں کا دوسرا مجموعہ ہے۔ نہایت خوبصورت جلد اور ڈسٹ کور۔ قیمت ۶ر

فکر و نشاط:۔ حضرت جوش کی نظموں کا تیسرا مجموعہ ہے جو حال ہی میں مکتبۂ جامعہ نے خاص اہتمام سے شائع کیا ہے۔ بہترین جلد۔ قیمت عہ ر

مرقع ادب:۔ مرتبہ جناب صفدر مرزاپوری۔ اسمیں ہندوستان کے مشہور انشا پرداز و شعرا کے وہ خطوط جمع کئے گئے ہیں جو انھوں نے اپنے احباب وغیرہ کو لکھے ہیں۔ قیمت حصہ اول عہ۔ حصہ دوم ۶ر

فلسفۂ جنگ:۔ ایک مشہور و معروف روسی تصنیف کے تحت میں فلسفۂ جنگ پر عالمانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ قیمت ۱ر

ملنے کا پتہ:۔ **زمانہ بک ایجنسی کانپور**

جلد ۷۳ نومبر ۱۹۳۹ء نمبر ۵

ہندی شاعری

(از پنڈت ونشی دھر ودّیا النکار اسسٹنٹ پروفیسر سنسکرت و ہندی۔ جامعۂ عثمانیہ)

ہندی شاعری سے ہماری مراد اُس زبان کی شاعری سے ہے جو راجپوتانہ، مالوہ، ممالک متحدہ (یو۔پی) بہار اور صوبۂ متوسط (سی۔پی) کے اوپر کے علاقوں میں مقامی طور پر بولی جاتی ہے۔ ان تمام جگہوں میں ہندی بولی کی بہت سی صورتیں ہیں، لیکن ان میں ایک ایسی صورت بھی ہے جو ادبی سانچہ میں ڈھل گئی اور جس میں سالہا سال تک شاعری ترقی کرتی رہی۔ راجپوتانے کی بولی کو ڈِنگل، یو۔پی ہندوستان کے مغربی علاقوں کی بولی کو پِنگل یا برج بھاشا۔ اودھ اور سی۔پی کے اوپر کے علاقوں کی بولی کو پوربی اور بہار کی بولی کو بہاری کہا جاتا ہے۔ ڈِنگل پِنگل، پوربی اور بہاری۔ ان تمام بولیوں میں ہندی شاعری کی تخلیق ہوئی ہے۔ اور اسی لئے ہندی شاعری کی سرزمین بہت وسیع ہو گئی ہے۔ ان بولیوں میں بھی پِنگل یعنی برج بھاشا اور پوربی ہندی میں ہندی کی شاعری زیادہ ہے۔ ہندی کی ادبی زبان کو بنانے میں ان تمام مقاموں کی بولیوں کا بہت بڑا حصہ ہے۔

ہندی شاعری میں سب سے پرانی جو شاعری ملتی ہے وہ ڈِنگل یعنی راجپوتانہ کی ہندی ہے۔ اس زبان میں زیادہ تر "راسو" اور "ویر گیت" یعنی Ballads لکھے گئے ہیں۔ ان راسو اور ویر گیتوں میں راجاؤں کی لڑائی، بہادری اور ان کے مختلف کارناموں کا بیان کیا گیا ہے۔ ان نظموں کے لکھنے والے راجاؤں کے درباری شاعر چارن یا بھاٹ ہوتے تھے۔ یہ درباری شاعر جہاں محبت اور دوسرے رسوں سے بھری نظمیں

گیتے تھے وہاں ان کی بہادری کے کارناموں کو بھی پسند کرتے تھے۔ خاص خاص موقعوں پر وہ ایسی شاعری کرتے تھے جس سے مردہ دلوں میں بھی جان آ جاتی تھی جس طرح "مارو" وغیرہ باجے لڑائی میں جوش پیدا کرتے ہیں اسی طرح یہ نظمیں بھی بہادرانہ جوش پیدا کرتی تھیں۔ ان راسوں میں کئی راسو جیسے کھمان راسو، بیسل دیو راسو، پرتھوی راج راسو وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ ویر گیتوں میں "آلہا اودل" کے گیت بہت مشہور ہیں۔ یہ گیت شمالی ہندوستان میں برسات کے دنوں میں بادلوں کے گرج کی تال پر آج بھی بڑے چاؤ اور شوق سے گاؤں گاؤں میں گائے جاتے ہیں۔ ان راسو اور ویر گیتوں کی بنیاد پر یہ کہا جاتا ہے کہ ہندی شاعری کا جنم لڑائی کے میدانوں میں ہوا۔ ان ویر گیتوں کو راجپوتانہ کے گاؤں کے گیتوں کی شکل میں اکٹھا کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ انکی سیدھی سادی بے ساختہ بولی میں کچھ ایسی بجلی بھری ہوئی ہے کہ ڈرپوک سے ڈرپوک آدمی کے دل میں آناً فاناً بہادری کے جذبات ابھر آتے ہیں۔

یہ ہندی شاعری کا پہلا تاریخی پہلو ہے۔ اس کے بعد جو ہندی شاعری کی تخلیق ہوئی اس میں زیادہ تر سنتوں اور مہاتماؤں کا حصہ ہے۔ وہ ہر جگہ گھومتے پھرتے تھے۔ اس لئے ان کی بولی میں ہندی کی بہت سی بولیوں کا میٹ مل گیا ہے۔ لیکن اس میں آہستہ آہستہ پوربی بولی کو زیادہ اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔ اس کو ایک نہایت اونچے معیار پر ادبی شکل میں پیش کرنے والوں میں مہاتما اور مہاکوی کبیر داس تھے۔ کبیر داس نے اپنی بولی کے بارے میں کہا ہے:-

"میری بولی پوربی تاہی نہ چینھے کوئے"

یعنی میری بولی پوربی ہے۔ اس بات کو کوئی نہیں پہچانتا۔

کبیر داس کی بولی روزمرہ کی بولی ہے۔ بہت سادی بہت آسان لیکن اس میں جن خیالات کو پیش کیا گیا ہے وہ بہت گہرے ہیں۔ ان کے خیالات اور شاعری کا زبان اور سوسائٹی ہر دو پر بہت گہرا اثر پڑا ہے۔ خصوصاً سوسائٹی پر اس قدر گہرا کہ ان کی شاعری محض ایک مذہبی تلقین کی حیثیت سے دیکھی جانے لگی۔ اور اس کا ادبی پہلو نظرانداز ہو گیا۔ ان کی شاعری کے مذہبی شکل میں بدل جانے کا سبب اُن کے خیالات کی پاکیزگی اور بلندی ہے۔ اُن کی زبان بھی ایسی بے ساختہ اور سیدھی سادی ہے کہ آسانی سے سمجھ میں آ جاتی ہے۔ اس کے اس طرح مذہبی شکل میں بدل جانے اور زبان کی سادگی کی وجہ سے (جیسا کہ میں نے اوپر بیان کیا ہے) شاعری کا پہلو نظر سے بہت کچھ اوجھل ہو گیا ہے۔ لیکن در حقیقت اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں ہے کہ کبیر کے مقابلہ کا شاعر جس کے کلام میں اتنی سادگی، لطافت، جذبات کی گہرائی اور خیالات کی بلندی ہو۔ ہندی نے دوسرا نہیں پیدا کیا۔ ان کی شاعری کی عظمت امتداد زمانہ

کے ساتھ دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ "دوہا" جو کہ ہندی کی ایک مشہور صنف ہے کبیر داس سے پہلے بھی لکھا جاتا تھا، لیکن کبیر داس نے اس میں وہ خوبی اور کمال پیدا کر دیا کہ "دوہے" میں ایک نیا حسن اور بانکپن آ گیا۔ ان کے بعد دوہے کی مقبولیت لگاتار بڑھتی چلی گئی اور آج "دوہا" ہندی شاعری کی ایک خاص مثال ہے۔ دوہے جتنے چھوٹے ہوتے ہیں، معانی و مطالب میں اتنے ہی وسیع اور گہرے ہوتے ہیں۔ مختصر ہونے کی وجہ سے یہ زبان پر جھٹ چڑھ جاتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ دوہا ہندی کی ایک بے مثل چیز ہے۔

کبیر داس کے بعد کبیر کے طرز پر بہت سے شاعروں نے لکھا لیکن وہ رتبہ کسی کو حاصل نہ ہو سکا۔ کبیر کا رنگ سب پر چڑھ گیا لیکن کبیر کا رنگ کوئی پیدا نہ کر سکا۔ یہ ہماری بدنصیبی ہے کہ ایک شاعر اعظم کی حیثیت سے یعنی ادبی نقطۂ نظر سے کبیر کی جو قدر اور عزت ہونی چاہیئے تھی وہ نہیں ہوئی۔ اس کے بہت سے وجوہات ہیں۔ لیکن جوں جوں وقت گزرتا جائیگا ادبی نقطۂ نظر سے بھی کبیر کی شاعری کی قدر اور عزت بڑھتی چلی جائیگی۔ اس کا کچھ اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر ربیندر ناتھ ٹیگور نے کبیر کی سو نظموں کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ یہ ترجمہ انھوں نے پروفیسر کشتی موہن سین کے ذریعہ کبیر کے اکٹھے کئے ہوئے گیتوں کی بنیاد پر کیا ہے جو انھوں نے بنگالی میں شائع کئے تھے۔

اس کے کچھ عرصہ بعد ہندی شاعری کی زبان کا مرکز بدل گیا، اور برج بھاشا کی باری آئی۔ چنانچہ برج بھاشا کے ذریعہ ہندی زبان میں جو مٹھاس، لطافت حسن اور نغمہ پیدا ہوا آج بھی ہندوستان میں اس کا جواب نہیں ہے۔ برج بھاشا کی وجہ سے ہندی بھاشا میں ایک لوچ پیدا ہوا اور اس میں ایسا سنگیت تھا جس نے ایک نئی موسیقی کو جنم دیا۔ اسی موسیقی کی وجہ سے ہندی کے گانے ہندوستان کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پھیل گئے۔

ہندی کی ڈنگل بولی میں کچھ کرختگی تھی، پوربی زبان میں کچھ ایسا سیدھاپن تھا جو علمی زبان کی خصوصیتوں میں ہے۔ لیکن اس برج بھاشا میں ایک عجیب نزاکت تھی، ایک عجیب لطف تھا، ایک عجیب حیرت انگیز چلبلاپن تھا اور اس کی ہر ایک ادا میں کچھ ایسا انوکھا موہنی منتر تھا کہ اسے جس نے سنا وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

برج بھاشا کے لطف اور مٹھاس کی سینکڑوں کہانیاں اور لطیفے مشہور ہیں۔ اسی مٹھاس اور لطف کی وجہ سے ہندی کی مختلف بولیوں میں برج بھاشا کو ایک خاص درجہ حاصل ہوا جو کسی دوسری مقامی زبان یا بولی کو نہ ملا۔ چنانچہ برج بھاشا ہندی میں ایسی چھا گئی کہ ہر جگہ اسی کا بول بالا ہو گیا۔

یہاں تک کہ ہندی شاعری سے مراد برج بھاشا کی شاعری لی جانے لگی۔ اب بھی برج بھاشا کی شاعری کا ایسا گہرا اثر ہے کہ ہندی شاعروں میں آج ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا ہے جس کی رائے میں ہندی شاعری برج بھاشا میں ہی ہونی چاہیئے۔

برج بھاشا میں بڑے بڑے صاحب کمال شاعر ہوئے ہیں، لیکن ان میں سُور داس کا درجہ سب سے اونچا ہے۔ یہ متھرا کے رہنے والے تھے۔ اس لئے یہ اُن کی اپنی ہی بولی تھی۔ اُنھوں نے ہندی میں بہت سی نظمیں لکھی ہیں۔ ان کی مشہور کتاب "سور ساگر" ہے۔ سور داس کے پدوں میں جو مٹھاس لوچ اور سنگیت ہے وہ لاجواب ہے۔ بہت سے نقاد سور داس کو ہندی کا سب سے بڑا شاعر مانتے ہیں۔ اُن کی نظموں میں ایسی کسک بھری ہوئی ہے اور ان میں بے بسی اور لاچاری کے جذبات اس خوبصورتی سے نمایاں ہوئے ہیں کہ اس کا دل پر گہرا اثر پڑتا ہے۔

بہرحال برج بھاشا کی مقبولیت یہاں تک بڑھی کہ مغل دربار میں بھی اس کی بڑی عزت ہوئی۔ بہت سے امیر امراء اور وزیر برج بھاشا میں شاعری کرتے تھے، جن میں کئی بہت اچھے شاعر تھے۔ ان میں عبدالرحیم خانخاناں، راجہ بیربل، راجہ ٹوڈرمل، ابوالفیض وغیرہ کے نام خاص طور پر مشہور ہیں۔ یہ خود بھی شاعر تھے اور ان میں یہ بھی خوبی تھی کہ دوسرے شاعروں کی قدر کرنے والے تھے۔ سچی قدر ہونے پر شاعری ہمیشہ پھلنے پھولنے لگتی ہے۔ یہ قدردانی یہاں تک بڑھی کہ ایک دوہے پر خوش ہو کر جے پور کے مہاراجہ مان سنگھ نے ایک لاکھ روپیہ انعام میں دیدیے تھے۔ کہتے ہیں کہ عبدالرحیم خانخاناں نے کوی گنگا پرشاد کو اس کے ایک شعر پر خوش ہو کر چھتیس[۳۶] لاکھ روپیہ دیا تھا۔ کچھ ہو ان باتوں سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ برج بھاشا کی بڑی قدر ہوئی اور اس کی ترقی ہوتی چلی گئی۔

برج بھاشا کی اس مقبولیت کا ہندی شاعری پر یہ اثر ہوا کہ اس کے بعد جس کسی مقامی بولی میں بھی شاعری کی گئی برج بھاشا کا اثر اُس پر حاوی رہا۔

سُور داس کے بعد جس شاعرِ اعظم کا نام بہت مشہور ہوا وہ "تلسی داس" تھے، یوں تو تلسی داس کی شاعری کی زبان پوربی ہے لیکن اس میں برج بھاشا بہت ملی ہوئی ہے۔ تلسی داس نے اپنی رامائن سے ہندی شاعری میں ایک نئی جان ڈال دی۔ اگر مقبولیت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو ہندی میں تلسی داس سے بڑا کوئی شاعر نہیں ہوا۔ آج بھی ہندوستان میں ہندی شاعری کی کتابوں میں جتنی تلسی کرت رامائن پڑھی جاتی ہے اتنی اور کوئی کتاب نہیں پڑھی جاتی۔ تلسی داس کی رامائن ہندوستان کے شہروں اور گاؤں میں اس شوق سے گائی اور سُنی جاتی ہے کہ اب وہ لوگوں کی روزانہ زندگی کا

ایک خاص جزو بن گئی ہے۔

اگر خیالات کی بلندی، زبان کی سادگی اور قوت تخلیق کے لحاظ سے دیکھا جائے تو ہندی شاعری میں کبیرداس کا کوئی ثانی نہیں ہے، اور اگر زبان کی مٹھاس، لطافت اور موسیقی کو پیش نظر رکھا جائے تو سورداس بے نظیر ہیں۔ اور اگر مقبولیت کے نقطۂ خیال سے دیکھا جائے تو گوسوامی تلسی داس کو کوئی شاعر نہیں پہونچ سکتا

ہندی کی مختلف مقامی بولیوں میں برج بھاشا نے ایک طرح کی یکسانیت پیدا کر دی جب تلسی داس کی رامائن عوام میں مقبول ہوئی تو اس سے زبان کی یکسانیت کو اور مدد ملی۔ جوں جوں اس زبان میں یکسانیت آتی گئی بہت سی مقامی بولیوں نے مل کر ایک ایسی ادبی شکل اختیار کی جو معیاری ہوگئی اور ہر جگہ شاعری میں استعمال ہونے لگی۔

معیاری شکل اختیار کرنے سے اس میں پختگی بھی آگئی۔ ہندی شاعری کی زبان کی پختگی اور شستہ پن ہندی کے آخری زمانہ کے شاعروں کے کلام میں زیادہ واضح نظر آتا ہے کیشوداس دیو کوی، متی رام بھوشن وغیرہ شاعروں کی زبان میں اس کا ثبوت ملتا ہے۔ زبان کی یہ شستگی اور بانکپن بہاری لال کی شاعری میں کمال کے درجہ کو پہونچ جاتی ہے

اس طرح ہندی کی شاعری ایک اسٹیج سے دوسرے اسٹیج پر بڑھتی ہوئی لگاتار ترقی کرتی چلی گئی۔ ہندی کی شاعری کا زمانہ اندازاً دسویں صدی سے شروع ہوا اور آج تک جاری ہے ہزاروں شاعر پیدا ہوئے اور اپنے کلام سے زبان کو سنوارتے اور مالامال کرتے گئے۔

ظاہر ہے کہ زمانہ کے تبدل و تغیر کے ساتھ زبان میں بھی تبدیلیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ آج کل کا زمانہ نثر کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ نثر کی زبان میں زیادہ یکسانیت کی ضرورت ہے۔ اس لئے زبان میں یکسانیت کا آنا لازمی تھا۔ اب بھی ہندی میں ان سب بولیوں کا استعمال ہوتا ہے، لیکن ہر جگہ ایک ہی ادبی زبان کا استعمال ہونے لگا ہے۔ نثر اور نظم کی ایک ہی زبان ہو گئی ہے، اس کا ایک ہی روپ قائم ہو گیا ہے۔ اس بولی کو کھڑی بولی کہتے ہیں۔ یہ بات نہیں ہے کہ پہلے اس بولی کا ہندی نظم میں استعمال نہیں ہوتا تھا، ضرور ہوتا تھا لیکن بہت کم۔ اب اس کا استعمال روز بروز بڑھتا جا رہا ہے ہندی کے شاعر اس میں خوبی اور کمال پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ چنانچہ بہت سی عمدہ اور اعلیٰ پایہ کی نظمیں لکھی گئی ہیں اور لکھی جا رہی ہیں لیکن ابھی تک یہ کھڑی بولی وہ بلندی اور مقبولیت حاصل نہیں کر سکی جو پرانی ہندی کی شاعری نے حاصل کی تھی۔ مگر ہم سمجھتے ہیں کہ وہ دن زیادہ دور نہیں ہے جب کھڑی بولی کی شاعری بھی اس بلند پایہ حسن و کمال کو حاصل کر لیگی اور پھر اسی طرح مقبول ہو جائیگی جیسے کہ پرانی ہندی کی شاعری ہوئی تھی۔

کیلاش پربت

(از پرنسپل رام پرشاد کھوسلہ ناشاد، ایم۔ اے)

رات دن پیشِ نظر ہے برف کا منظر جہاں　　　دیوتاؤں کے لئے قدرت کا ہے مندر جہاں

بادلوں میں پربتوں کی چوٹیاں مستور ہیں　　　بادۂ حق سے جہاں ارض و سما مخمور ہیں

جس جگہ ہے پربتوں کے شاہ کا جھنڈا گڑا　　　تاج ہے الماس کا سر پر ہماچل کے دھرا

جس جگہ رہ کر فضا میں دل کو آتا ہے سرور　　　جس جگہ کیفِ نظر ہے قدرتِ حق کا ظہور

جس جگہ لطفِ سماعت راگ سیاروں کا ہے　　　جس جگہ آسودہ منزل کا وہاں تاروں کا ہے

جس جگہ جو شے نظر آتی ہے سیم اندام ہے　　　کالعدم سورج کی کرنوں سے تپش کا نام ہے

روشنی مہتاب کی ہے جس جگہ نکھری ہوئی　　　اور بوئے عنبریں ہر سمت ہے بکھری ہوئی

نورِ عرفاں رات دن رہتا ہے جس جا آشکار　　　گلشنِ قدرت میں ہر دم ہے جہاں فصلِ بہار

جس جگہ بھولے سے انساں کا قدم جاتا نہیں　　　اور فرشتوں کے سوا کوئی جہاں آتا نہیں

طائرِ فردوس نے جس جا بنایا آشیاں　　　اور پہنچ سکتا نہیں انسان کا وہم و گماں

رحمتِ باری کے ہیں دریا نکلتے جس جگہ　　　رات دن ہیں نور کے چشمے ابلتے جس جگہ

مست ہو کر جس جگہ بادِ صبا ہے گھومتی　　　جس جگہ اٹھ کر زمیں ہے آسماں کو چومتی

جس جگہ دھرتی سے ہر دم ہمکنار آکاش ہے
جس جگہ شو جی کا آسن ہے وہاں کیلاش ہے

غالب اور رشک

از مسٹر اعجاز انصاری

یوں تو رشک غیر اردو شاعری کا ایک مستقل باب ہی ہے اور ہمارے شعراء میں ولی اور میر سے لے کر اقبال اور جگر تک کون اس جذبۂ انسانی کے اظہار کرنے والوں کی فہرست میں جگہ پانے کا مستحق نہیں؟ چنانچہ مرزا غالب بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں۔ لیکن سطور ذیل میں میں قارئین کو مرزا غالب کے اشہب تخیل کی اُن ندرت آفریں جولانیوں سے لطف اندوز ہونے کی دعوت دینا چاہتا ہوں جو عام طور سے جمہور کے موافق ہونیکے باوجود اپنی انفرادی حیثیت کی آئینہ دار ہیں۔ اسمیں شک نہیں کہ غالب اکثر رشک غیر کو رسماً بھی باندھتے ہیں۔ اور اپنی ایجاد آفرینی سے زیادہ کام نہیں لیتے تاہم اپنی طرز ادا سے اپنی انفرادیت ضرور قائم رکھتے ہیں مثالیں ملاحظہ ہوں

عشق میں بیداد رشک غیر نے مارا مجھے
کشتۂ دشمن ہوں آخر گرچہ تھا بیمار دوست

مصرعہ اولیٰ تو جمہور ہی کی ترجمانی ہے لیکن مصرعۂ ثانی۔ "اگرچہ بیمار دوست تھا" لیکن "کشتۂ دشمن ہوں" غالب ہی کے لئے مخصوص تھا۔ اور یہی مصرعہ اُن کی انفرادیت پر دال ہے ؎

رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف
عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

پہلے تو جمہور کا ہم زبان ہو کر "رشک غیر" پر آمادہ ہو جانا عام بات تھی لیکن عقل نے "اس بے مہر" کی عالمگیر بے مہریوں کا جس مخصوص انداز سے انکشاف کرتے ہوئے رشک کو تسلی دی ہے وہ غالب ہی کا خاص حصہ تھا اور یہی وہ مقام ہے جہاں اُن کی انفرادیت کا پتہ چلتا ہے ؎

عدو کے ہو لئے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو
یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں

غالب کا محبوب رقیب سے اپنے ربط و ضبط رکھنے کو غالب کی وفاداری کے امتحان سے تعبیر کرتا ہے، اس پر رشک ہونا تو کوئی نئی بات نہیں۔ لیکن موصوف نے محبوب کی اس رقیب دوستی کو جس خاص انداز میں اپنے ستانے کا ذریعہ قرار دیکر امتحان محبوب سے بچنے کی تدبیر نکالی ہے وہ غالب ہی کے لئے تھا۔

کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی
بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو

محبوب کا غیر سے ملنا اور عاشق کا جذبۂ رشک سے مغلوب ہو کر اس کو معشوق کے لئے رسوائی کا باعث

بنا! تو عام بات تھی۔ لیکن محبوب کے مقولہ "کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی" کا جس رشک آموز طرز سے مصرعہ ثانی میں مذاق اُڑایا گیا ہے وہ غالب ہی کے لئے مخصوص تھا۔ ؎

غیر لیں محفل میں بوسے جام کے ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے

غیروں کا محبوب کی محفل میں شراب پینا غالب کیلئے سوہانِ روح ضرور ہے اور دوسرے شعرا بھی ایسی رقیب نوازی سے خوش نہ ہوں گے لیکن مصرعہ ثانی میں غیروں کی اس نوازش کے مقابلہ میں اپنے کو محفل میں بلائے بھی نہ جانے کو "پیغام کا تشنہ لب" کہنا سوائے غالب کے کسی دوسرے کو نصیب نہ ہوا۔

یا میرے زخم رشک کو رسوا نہ کیجئے یا پردۂ تبسم پنہاں اُٹھائیے

محبوب کا پوشیدہ طور سے رقیب کو دیکھ کر متبسم ہونا غالب کے لئے باعث رشک ہے۔ اُن کا محبوب اِن کی اس "رشک پروری" سے جل کر رقیبوں سے ان کی شکایت کرتا ہے۔ غالب کو معشوق کا یہ رویہ پسند نہیں آتا۔ اور یہ اپنے مخصوص انداز میں "یا پردۂ تبسم پنہاں اُٹھائیے یا میرے زخم رشک کو رسوا نہ کیجئے" کہہ کر نہ صرف معشوق کو یہ جتلا دیتے ہیں کہ وہ محبوب اور رقیب کے "درپردہ ربط نہانی" سے باخبر ہیں بلکہ یہ بھی بتا دیتے ہیں کہ جب تک رقیب پر یہ پوشیدہ عنایتیں صرف کی جائیں گی عاشق کو رشک ہونا ضروری ہے۔

اوپر کے چھ سات شعروں میں تو "رشکِ غیر" پھر بھی جمہور ہی کے موافق ظہور پذیر ہوا ہے۔ اب دیکھئے کہ غالب کے دل و دماغ پر خصوصیت کے ساتھ اِس قسم کے رشک نے اور کیا کیا نئے نئے تاثرات کئے ہیں۔ اُن کو یہ تو یقین ہی ہے کہ وہ "بے مہر کسی کا آشنا نہیں" اس لئے رقیب کو اُسکی "ہمدمی آساں نہیں" لیکن وہ یہ بھی گوارا نہیں کرتے کہ "رقیب آرزوئے دوست" کا بھی حامل ہو سکے ؎

نہیں گر ہمدمی آساں، نہ ہو یہ رشک کیا کم ہے نہ دی جاتی خدایا آرزوئے دوست دشمن کو

معمولی قسم کے عشاق، معشوق کی زبان سے رقیب کی شکایتیں سُن کر خوش ہوں گے۔ غالب چونکہ معمولی قسم کے لوگوں سے بہت بلند ہیں، اس لئے وہ معشوق کی اس قسم کی حرکت سے خوش نہیں بلکہ رنجیدہ ہوتے ہیں، وہ یہ پسند نہیں کرتے کہ اُن کا محبوب اُن کے رقیب کا نام بھی اپنی زبان پر لائے، خواہ "بر سبیل شکایت ہی کیوں نہ ہو" ؎

ہے مجھ کو تجھ سے تذکرۂ غیر کا گلہ ہر چند بر سبیل شکایت ہی کیوں نہ ہو

ذرا اور دیکھئے۔ کہتے ہیں ؎

رات کے وقت مے پئے ساتھ رقیب کو لئے آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یوں

عام شعرا رشک کے اِس درجہ کے نام سے بھی واقف نہیں، اُن کے لئے تو معشوق کا آجانا ہی ہزار نعمت ہے، تا کہ رات کا وقت ہو اور محبوب اپنی میگوں آنکھوں کو دخترِ رز کی وساطت سے جامِ صہبا کی دو آتشگی

بخشش کرا جائے۔ غالب ان تمام کیف افزا تخیلات سے پناہ مانگتے ہیں اور محض اسی وجہ سے کہ رقیب کی محبت میں ہو کے

یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے ورنہ خوف بد آموزیٔ عدو کیا ہے

"بد آموزیٔ عدو" سے کون نہ پناہ مانگے گا؟ لیکن غالب کو اس کی پروا نہیں۔ رشک ہے تو صرف اس بات پر کہ بد آموزیٔ عدو رقیب کیلئے ان کے محبوب سے ہم سخن ہونے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

(۲)

یہاں تک تو غالب کے "رشک غیر" کا اندازہ دیکھا۔ اب ذرا دیکھئے کہ غالب کا رشک رفتہ رفتہ کن رتعالی منازل سے گذرتا ہوا کس درجہ تک پہونچ جاتا ہے۔ حافظ شیرازی فرماتے ہیں:-

صبا بہ لطف بگو آں غزال رعنا را که سر بکوه و بیابان تو داده ما را

اور ہمارے اکثر شعرا انھیں کے ہمنوا ہیں۔ جلیل کہتے ہیں:-

ہماری بیخودی کا حال گر پوچھیں تو اے قاصد یہ کہنا ہوش اتنا ہے کہ تم کو یاد کرتے ہیں

لیکن ذرا غالب کو دیکھئے۔ وہ قاصد سے بھی رشک کرتے ہیں۔ اس رشک ہی کا نتیجہ ہے کہ وہ "مسرت پیغام یار" سے بھی پورا لطف محظوظ نہیں ہوتے۔

گذرا اسد مسرت پیغام یار سے قاصد پہ مجھ کو رشک سوال و جواب ہے

حالانکہ ان کو معلوم ہے کہ یہ "سوال و جواب" انھیں کی وکالت ہے۔

قاصد کو اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریئے اس کی خطا نہیں ہے یہ میرا قصور تھا

وہ قاصد کو محبوب کے ہاتھوں قتل ہوتا ہوا دیکھ کر اس کی جان بخشی کی سفارش کرتے ہیں۔ لیکن اس لئے نہیں کہ ان کو قاصد کے احسانات کا پاس ہے بلکہ اس لئے کہ وہ یہ نہیں دیکھ سکتے کہ ان کے ہوتے انکا محبوب اپنے نازک ہاتھوں سے کسی دوسرے کو شہید ناز کرے۔

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

غالب نہ صرف اس ندیم سے کبیدہ خاطر ہیں جس نے ان کے لئے ایک ایسا نامہ بر تلاش کیا جو ع

بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

کے مصداق ہونے کے لئے مجبور ہو گیا۔ بلکہ وہ نامہ بر کے لئے "سلام کہیو" کے جذبات پیش کرتے یعنی پناہ مانگتے ہیں۔ حالانکہ اور شعرائے اردو مثلاً شاہ حاتم آبرو قاصد کو اپنا ہمدرد، رازدار اور بہی خواہ خیال کرتے ہیں۔

میرا پیغام وصل اے قاصد کہیو سب سے اسے جدا کر کے

قاصد تو خیر محبوب کے قرب جسمانی سے بہرہ اندوز ہونے کی وجہ سے معرض رشک میں آ ہی جاتا ہے، غضب

تو یہ ہے کہ غالب اپنے ہمنشین یا دوسرے رازدار سے بھی اس بات پر رشک کرتے ہیں کہ ان کو تسکین اور تسلی دینے میں وہ اُن کے محبوب کا نام کیوں لیتا ہے۔

غیرت نے تمام ان کا دیا کیوں کہ سب ہیں رشک آتا ہے کہ لیا نام نہ اُن کا مرے آگے

حالانکہ مومن ایسا عشقِ مجازی کا مردِ میدان جس کو کہ فطرتاً اس قسم کے رشک سے متاثر ہونا چاہیئے، اس راستہ سے کافی دور ہے۔

اُس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

دُشنامِ یار طبعِ حزیں پر گراں نہیں اے ہمنشیں نزاکتِ آواز دیکھنا

ممکن ہے کہ ہمنشین، ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا، سے اسقدر متاثر ہوا ہو کہ اُن کے محبوب کے نادیدہ عاشقوں میں شمار کئے جانے کا متمنی ہو گیا ہو۔ لیکن معشوق کے نام رقیبوں کی طرف سے خط لکھنے والے لوگ تو اس قربِ روحانی سے بھی قطعی بہرہ اندوز نہیں ہو سکتے۔ تاہم اِن کے رشک کی یہ کیفیت ہے کہ غالب یہ بھی پسند نہیں کرتے کہ اُن کے علاوہ کسی دوسرے کی تحریر بھی اُن کے محبوب کے زیبِ نظر ہو سکے۔

مگر لکھوائے کوئی اس کو خط تو ہم سے لکھوائے ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

(۳)

قاصد پر رشک، سوال و جواب ہونا، ندیم سے محبوب کے نام لینے کو منع کرنا، دشمن کو آرزوئے دوست کا دیا جانا۔ یہ تمام باتیں تو اس لئے باعثِ رشک ہیں کہ ان صورتوں میں قاصد، ندیم اور دشمن تینوں کسی نہ کسی طور سے حظِ روحانی حاصل کرنے کا موقع پاتے ہیں اور بیچارے غالب کو یہ سب کہاں نصیب؟ اُن کا اُٹھنا اور اُٹھ کے پاسباں کے قدم لینا بھی اُن کی شامت کا باعث ہو جاتا ہے۔ لیکن غالب صرف اسی رشک پر اکتفا نہیں کرتے۔ وہ تو یہ بھی گوارا نہیں کرتے کہ اُن کا معشوق ظلم بھی اُنکے علاوہ کسی اور پر صرف کرے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ رشک اور محبت کی بدگمانیوں کے زیرِ اثر وہ تمام دُنیا کو اپنا رقیب خیال کرتے ہیں اور دُنیا کے کسی بھی فردِ بشر کو مظالمِ معشوق دیکھ بہرہ اندوز ہوتا نہیں دیکھ سکتے۔ سطورِ ذیل میں اُن کے چند اشعار تمام دُنیا کے لوگوں سے رقیبانہ رشک قائم کر لینے کی مثال میں پیش کئے جاتے ہیں۔

رہا بلا میں بھی میں مبتلائے آفتِ رشک بلائے جاں ہے ادا تیری اِک جہاں کے لئے

قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو کاش کہ تم مرے لئے ہوتے

کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو جفا رکتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھکر

اس سلسلہ کی دو دو دلچسپ کڑیاں اور ملاحظ ہوں:-

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالب کسی پر راہ چلتے چلتے عاشق ہو گئے اور شاید "دو ایک بار" بر سر راہ سے گاہے گاہے ملنے کا شرف حاصل کر لینے سے بھی محروم نہیں رہے۔ لیکن اس کے بعد عشق کے پینگ بڑھے اور دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ ہمہ وقت "ہم ہوں اُن کے سامنے اور وہ ہمارے سامنے" مکان کا پتہ نہیں اس سے پوچھ چکے تھے۔ مکان تلاش کرنے نکلے اب بالکل کسی سے دریافت کئے ہوتے کہ فلاں محلہ میں فلاں شخص کس مکان میں رہتا ہے۔ اس زمانہ میں کسی اجنبی کا مکان ایسے ملتا... ان چیزوں کی فراوانی اور اس کا جا و بیجا استعمال تو آجکل ہوا ہے، غدر سے قبل یا اس پاس کب رائج ہوتا) یہاں انکو رشک کے باعث لوگوں سے محبوب کے گھر کا پتہ پوچھنا بھی پسند نہ آیا کہ مبادا کوئی دوسرا اِس دربارِ محبوبیت تک رسائی حاصل کرے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نام تو لیتے نہیں، ایک ایک آنے جانے والے سے یہی پوچھتے پھرتے ہیں کہ کہاں جاؤں کدھر کو جاؤں؟ ایسا بھی ممکن ہے کہ اُن کا محبوب کرایہ کے مکان میں رہنے کا خوگر ہو اور اُس نے حال ہی میں مکان بدلا ہو، اس لئے یہ اُسکے نئے مکان کی جستجو میں "کدھر کو جاؤں اور کہاں جاؤں" کا وظیفہ پڑھ رہے ہوں۔ بہرحال شعر کے مبالغہ سے قطع نظر کرکے اُن کے اشہبِ رشک کی جدت روی قابل داد ضرور ہے۔

اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن بعد قتل میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

عشاق میں سر فہرست اُنکا نام شاعری میں "ہر چہ فخر تست آں ننگ من است" ان کا دعویٰ اور اسمیں شک نہیں کہ وہ اس دعوی کے "مدعی" نہیں بلکہ مستحق ہیں) پھر غالب کے نام سے کون نہ واقف ہوگا؟ یہی سبب ہے کہ معشوق کی گلی میں قبر بنوانے سے ڈرتے ہیں۔ اُن کو اس بات کا رشک ہے کہ کہیں اُن کے پتہ سے لوگ اُن کے محبوب کے گھر کا پتہ نہ پا جائیں حالانکہ تقریباً اور تمام شعرائے اردو "غبار رہِ محبوب" و "مدفون کوچۂ قاتل" ہونے کی تمنا کیا کرتے ہیں۔ یہ ہیں اُن کے جذبۂ رشک کی جدت طرازیاں!

(۴)

یہ سب تو خیر رقیب ہونے کی صلاحیت رکھنے کے ساتھ ساتھ اس قابل بھی ہیں کہ عاشق ان سے رشک کرے۔ لیکن غالب کے بلند عشق کی گہرائیوں کا ہمیں اسوقت پتہ چلتا ہے جبکہ وہ نہ صرف جاندار بلکہ بے جان چیزوں پر بھی رشک کرتے ہیں، جن کو قرب محبوب حاصل ہے ؎

تیرے جواہر طرف کُلہ کو کیا دیکھیں ہم اوج طالع لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

لعل و گہر کے طالع کی بلندیوں کو دیکھنا رشک سے خالی نہیں۔ عاشق کی قسمت اتنی پست کہ محبوب کے

در ناز تک اُس کی رسائی بھی دشوار ہے اور بقول غالب شاید رضواں دربار کا دربان ہوتا تو بعد یک عمر ورع در یار تک رسائی بھی ممکن تھی۔ لیکن یہاں تو ساری عمر صرفِ دعا ہوگئی اور دروازے تک پہونچنے کا بھی موقع نہ ملا۔ یہی سبب ہے کہ اگر کبھی حُسنِ اتفاق سے درگاہِ محبوبیت میں بار مل گیا ہے تو غالب کو جتنی دعائیں یاد تھیں سب بیاد رفتہ اور رائیگاں ہوگئیں یہ تو اُن کی قسمت اور وہ ہے لعل و گہر کی قسمت، جن کو ہر وقت رخسار یار کا قرب حاصل ہے۔ یہی سبب تو تھا کہ غالب ستارہ گوہر فروش کے اوج پر بھی رشک کئے بغیر نہ رہ سکے ؎

گوہر کو عقدِ گردنِ خوباں میں دیکھنا — کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے

پھر دیکھئے اہلِ تمنا کا ایک طرفہ یہ عالم ہے کہ اُن کے لئے "شمشیر کا عریاں ہونا عید نظارہ ہے" ہم غالب اس حال میں بھی اپنی اس خوش قسمتی پر کہ اُن کا محبوب اپنے ہاتھوں سے قتل کرنے والا ہے، ناز کرنا بھول جاتے ہیں اور اُن کو اس بات کا رشک شروع ہو جاتا ہے کہ آخر تلوار اُن کے ہاتھوں سے کیوں مس ہو رہی ہے جبکہ اُن کی جبینِ نیاز اپنے سیکڑوں تڑپتے ہوئے سجدوں کے ساتھ ساتھ محبوب کی خاک پا سے مس ہونے کے شرف سے محروم ہے ؎

آتا ہے میرے قتل کو پر جوشِ رشک سے — مرتا ہوں اُس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر

غالب کوہِ طور اور برقِ تجلیٔ ایزدی کا قصہ سنتے ہیں اور جوشِ رشک سے بیتاب ہو جاتے ہیں۔ یہ عاشق تھے اور یہ برق اُن کا حصہ تھی۔ اُن پر گرتی تو یہ اس کی قدر کرتے اور اس کی تیزیوں کی تاب بھی لا سکتے۔ بھلا ایک مٹی کا تودہ جو روزِ ازل ہی میں بارِ امانت "اُٹھانے کی صلاحیت نہ رکھتا تھا، برقِ جمالِ الٰہی سے کیا محظوظ ہوا ہوگا۔ اور وہ اس کی ان تیزیوں کو کہ جسکے باعث رنگِ سنگ سے لہو ٹپک پڑتا کب برداشت کر سکتا تھا

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر — دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

سنگِ درِ یار کا محبوب سے جو قرب ہے اور صبح و شام جس طرح وہ محبوب کے پائے ناز سے مس ہوا کرتا ہے وہ ظاہر ہے اور اس کے مقابل میں غالب ایسے رقیق القلب عاشق کا اس سے بُعد بھی عیاں ہے پھر اُن کو اس پتھر پر بھی رشک نہ آئے تو کیا ہو؟ چنانچہ کہتے ہیں ؎

دائم پڑا ہوا تیرے در پر نہیں ہوں میں — خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

اور یہی تو تھا جس نے غالب کو لبِ شکایت وا کرنے کی ضرورت محسوس کرا دی ؎

رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ — رتبہ میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں

ساری زندگی اُن کا معشوق اُن کے زخمِ دل کو کُرید کُرید کر اپنے ناخن سُرخ کیا کرتا تھا اور باوجودیکہ یہ دردافزا تھا۔ تاہم تسلی بخش بھی تو تھا کہ وہ "قتالِ جہاں" سوائے اُن کے اور کسی سے سامانِ آرائش طلب

نہیں کرتا۔ لیکن آخر یہ بھی انسان تھے۔ دل کے زخم کا مدتوں ہرا رہنا اور پھر اُن کی زندگی۔ یہ کیسے ممکن تھا؟ جان بحق تسلیم ہو گئے۔ معشوق نے اُن کی عدم موجودگی میں اپنے ناخن سُرخ کرنے کے دوسرے ذرائع اختیار کیے۔ مہندی بھی گئی اور ہاتھ رنگے گئے۔ غالب بھلا اس کو کب برداشت کر سکتے تھے جو ہر پر رشک سے کبھی بیتاب اٹھے کہ ہائے وہ ناخن جو ہمیشہ سوائے میرے خونِ دل کے اور کسی دوسرے سامانِ آرائش کے ممنون منت نہ تھے آج حنا کے محتاج ہو گئے ہیں اور اس طرح حنا کو بھی قربِ محبوب حاصل ہو گیا ہے

اُن کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد	خوں ہے دل خاک میں احوالِ بتاں پر یعنی

(اس موقع پر ایک غلط فہمی کی طرف اشارہ کر دینا بھی بیجا نہ ہوگا۔ اکثر معزز شارحین دیوانِ غالب "محتاج" کو "محروم" کا مرادف سمجھ بیٹھے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اُنھوں نے غالب کے اس لطیف معنی کو غلط فہمی کی قربان گاہ پر بڑی بے دردی سے ذبح کر ڈالا ہے۔ ان حضرات نے

نگہِ ناز ہے سرمے سے خفا میرے بعد	درخورِ عرض نہیں جوہرِ بیداد کو جا

کی مناسبت سے غالب کے "خوں ہے دل خاک میں" کی علت معشوق کا سوگ میں ترکِ حنا کر دینا قرار دیا ہے)

—:(۵):—

آیئے اور اب غالب کے جذبۂ رشک کے ایک نادر الوقوع پہلو پر بھی نظر ڈال لیجئے اور انصاف کیجئے کہ یہ جذبہ ان کی ذاتی اپنی اور ہم مشربوں سے منفرد اور ممتاز ہے یا نہیں؟ رقیب کے قرب محبوبی پر جلنا، نامہ بر کا محبوب کی رسائی پر رشک کرنا۔ لعل، گہر اور عطر و حنا کے اوجِ طالع کو رشک آمود نظروں سے دیکھنا یہ سب کچھ بھی عجیب نہیں اور میدانِ شعر میں ان تمام مضمونوں سے کم خصوصیت باندھ دینا تو پھر بھی جیز امکان سے باہر تھا لیکن خود کردہ رشک تو اپنی ذات سے بھی رشک کرتے ہیں۔ اور یہ میدان انھیں اور صرف انھیں کے ہاتھ رہا ہے

میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے	دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
وہ دیکھا جائے کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے	آہ طرفِ نظارگی میں بھی سہی لیکن
مرتے ہیں ولے اُن کی تمنا نہیں کرتے	ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے

اب ستم ظریفی تو دیکھئے کہ غالب پہلے تو

دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر	گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر

کہتے تھے کہ اپنے ظرف کو کوہِ طور کے ظرف سے بہتر سمجھتے تھے اور یہ بھی خیال تھا کہ برقِ جمالِ یار کی تاب لا سکتے ہیں اور کوئی نہیں۔ چنانچہ یہ خیال درست نکلا۔ "رخِ یار" اُنکے سامنے ہوا اور "تابِ رخِ یار"

ے کو وہ طور کی طرح جیسے جلے مگر ان کے رشک نے انھیں اس حال میں بھی خوش نہ رکھا اور اب یہ طرفہ تماشہ ہوا
ان کو اپنی طاقت دیدار پر رشک آنے لگا ؎

کیوں جل گیا نہ تابِ رُخِ یار دیکھکر　　جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھکر

——————:(۷):——————

رشک کی انتہا تک پہونچنے کے لئے اب ایک ہی درجہ باقی رہ گیا تھا۔ میر صاحب کہہ گئے ہیں ؎

پہونچا جو آپ کو تو میں پہونچا خدا کے تئیں

ورنہ من عرف نفسہ فقد عرف ربہ بھی اسی بات کا اعلان کرتا ہے کہ اپنی ذات کو پہونچنا (سمجھ لینا) خدا تک پہونچنے (خدا کے سمجھ لینے) کے مرادف ہے۔ غالب نے اپنی ذات سے تو رشک کرنے سے گریز کیا۔ اب صرف ایک ذات باقی رہ گئی تھی خدا کی۔ انھوں نے خدا سے بھی رشک کیا اور اس کو جس خوبی سے نبھایا ہے وہ اہلِ ذوق کی باریک بین نظروں سے پوشیدہ نہیں۔ سنئے۔

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہمسفر غالب　　وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

——————

فکرِ لطیف

(از خواجہ عبد اللطیف شمیم بھیروی)

مغنی! ساز اُٹھا، موسم کا کچھ نذرانہ ہو جائے　　ترا نغمہ فروغِ محفلِ رندانہ ہو جائے
گھٹا اُٹھی، ہوا بہکی فضائیں رقص میں آئیں　　اس عالم میں ذرا شغلِ مے و مینا نہ ہو جائے؟
سرودِ سرمدی بن کر وہ مجھ پر چھائے جاتے ہیں　　مرا ساز نظر پھر زندگی آرا نہ ہو جائے
نہ چھیڑ اے لذتِ آسودگی کچھ روز جینے دے　　علاجِ زخمِ دل سے عاشقی رسوا نہ ہو جائے
جنونِ شوق کو منظور تجدید تمنا ہے　　مزا ہے حسنِ بے پروا اگر دیوانہ ہو جائے
کوئی دیکھے سُروں گاتا ہے میرے دل کے پردوں میں　　سنبھل ذوقِ خودی محشر کہیں برپا نہ ہو جائے
حجاب اُٹھنے لگے ہیں، مرگِ ذوقِ ناتمامی ہے　　قریبِ دوست ہو جاؤں کہیں ایسا نہ ہو جائے
مکافاتِ سکوں ناآشنائی ہے یہی ساقی　　گناہِ زندگی غرقِ خم و مینا نہ ہو جائے
شمیم اُن کی نگاہِ ناز کو اس سے نہیں مطلب　　کوئی دیوانہ ہو جائے کوئی فرزانہ ہو جائے

——————

(از حضرت محمود اسرائیلی)

آئینۂ دوشیزۂ قدرت ہے یہ دریا		یا نغمۂ تابندہ کا لبریز خزانا

تنویرِ سرِ طور
اسرار سے معمور
یا عکسِ رخِ حور

ہنستے ہیں بیساختہ دریا کے کنارے		کس ناز سے کرتے ہیں یہ ہر سمت اشارے

ٹہنی کو جھکا کر
پتوں کو اٹھا کر
عارض کو دکھا کر

رومال ہلانے لگیں پانی پہ ہوائیں		اور لینے لگیں چہرۂ دریا کی بلائیں

موجوں کے کھلے لب
جنبش میں ہوئیں اب
اور گانے لگیں سب

کیا اُن کی زبانوں پہ ہیں مبہم سے فسانے		داؤد کے وہ شیریں جاں بخش ترانے

گائے کوئی جیسے
خیام کی لے سے
اور رومی کی نے سے

زینت کی پوشاک ہے ہر گل کے بدن پر		سورج نے بٹھایا ہے اسے اپنی کرن پر

کس درجہ چمک ہے
رگ رگ میں جھلک ہے
ہر پتی دھنک ہے

عکس آب میں بھی تو کانپتے اور جھوم رہے ہیں جھک جھک کے یہ ساحل کا قدم چوم رہے ہیں
دیکھا ہے تہ آب
اک منظر نایاب
اک گلشن شاداب
پانی میں جو کچھ اپنے کھڑے کانپ رہے ہیں وہ سینۂ دریا کا عمق ناپ رہے ہیں
مرغاب ہیں جنباں
گرداب ہیں رقصاں
جو شئے ہے وہ شاداں
افکار جہاں یاس فزا و غم انگیز قدرت کے مناظر ہیں سکوں بخش و طرب خیز
گو صورت مدہوش
آبادی سے روپوش
ہر وقت ہیں خاموش

غزل

(از پروفیسر سنت پرشاد مدہوش ایم۔ اے)

مہمل نہیں ہے عشق ستودہ صفات ہے عقدہ کشائے راز حیات و ممات ہے
رتبہ گناہ عشق کا آدم سے پوچھیے سجدے میں تھے فرشتے ابھی کل کی بات ہے
کیونکر خوشی خوشی نہ اٹھائیں غم و الم سر پر ہمارے پیر طریقت کا ہاتھ ہے
رنج و محن سے بھاگ نہ عیش و طرب پہ جا ناپائدار رنج، خوشی بے ثبات ہے
صبح شب فراق ہوئی ہے اجل کی شام سویا ہے نیند موت کی عاشق کی رات ہے
ہر اہل دل کا سن کے بڑھا ہے مذاق عشق لذت چشیدۂ غم الفت کی بات ہے
مدہوش کا کلام ہے کیونکر اثر نہ ہو
راز آشنائے درد محبت کی بات ہے

ڈاکٹر نذیر احمد بحیثیت نثر نگار

از حضرت وصل بلگرامی

شمس العلماء ڈاکٹر مولوی حافظ نذیر احمد کی ضلع بجنور کے ایک گاؤں رہڑ میں ۱۸۳۶ء میں پیدائش بتائی جاتی ہے۔ ابتدائی تعلیم انھوں نے اپنے والد مولوی سعادت علی صاحب سے حاصل کی اور اس کے بعد بجنور کے ڈپٹی کلکٹر مولوی نصر اللہ خاں صاحب سے، پھر دلی آکر مولوی عبد الخالق صاحب کے شاگرد ہو گئے۔ دلی اُن کے لئے ایک ایسی جگہ تھی۔ جہاں اُنکے ذہن اور دماغ کو نشو و نما کا اچھا موقع ملا۔ مولوی عبد الخالق صاحب نے ہونہار دیکھ کر اپنے بیٹے مولوی عبد القادر صاحب کی صاحبزادی سے اُن کی شادی کر دی۔ اُس وقت سے انھوں نے دہلی کو اپنا مسکن بنالیا۔

۱۸۵۴ء تک انھوں نے دہلی کالج میں عربی تعلیم حاصل کی۔ اور وہیں سے فارغ التحصیل ہوئے۔ اُس کے بعد ملازمت کا خیال ہوا۔ پہلی ملازمت اُن کی کنجاہ ضلع گجرات کے ایک سکول کی مدرسی سے شروع ہوتی ہے۔ لیکن ذاتی قابلیت کی وجہ سے زیادہ زمانہ نہیں گذرا کہ کانپور میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہو گئے۔ پھر الہ آباد آئے اور وہاں انسپکٹر مدارس مقرر ہوئے۔ الہ آباد آکر انھوں نے مختلف ذریعوں سے انگریزی پڑھنا شروع کیا۔ رفتہ رفتہ اتنی ترقی کی کہ بی۔ اے والوں سے مقابلہ کرنیکی ہمت ہوگئی۔ اور انگریزی کتابوں کے مطالعہ کو برابر جاری رکھا۔ چنانچہ غالباً جب ۱۸۶۱ء میں انڈین پنل کوڈ یعنی مجموعہ تعزیرات ہند کے ترجمہ کی ضرورت ہوئی تو اوروں کے ساتھ ان کو اس خدمت میں شامل کیا گیا اس کام کو انھوں نے اس خوبی سے کیا کہ اُن کو تحصیلدار مقرر کر دیا گیا۔ اس کے بعد ضابطۂ فوجداری کے ترجمے کے صلے میں ۱۸۶۳ء میں ڈپٹی کلکٹر کا عہدہ حاصل ہوا۔ اور یہ محکمہ بندوبست کے افسر ہوگئے اسی زمانہ میں علم ہیئت کی ایک انگریزی کتاب کا بھی ترجمہ کیا جس پر ایک ہزار روپیہ انعام ملا۔

اب آپ کی شہرت دُور دُور پھیل گئی تھی۔ چنانچہ سالار جنگ بہادر نے گورنمنٹ ہند سے آپ کی خدمات حاصل کرلیں اور وہاں بھی یہ افسر بندوبست ہوگئے۔ یہاں ایک بات اور عرض کرنے کے قابل ہے کہ ڈاکٹر کو علم حاصل کرنے کا شوق ابھی تک تھا۔ چنانچہ اسی زمانہ میں قرآن شریف حفظ کیا۔

جس سے اُن کی غیر معمولی ذہانت کا پتہ چلتا ہے۔ حیدرآباد میں عہدہ اور تنخواہ کے لحاظ سے آپ نے نمایاں ترقی کی۔ ملازمت ختم کرنے کے بعد دہلی آگئے جس کو آپ نے اپنا وطن قرار دے لیا تھا اور عمر کا باقی حصہ تالیف و تصنیف اور ملک و قوم کی خدمت میں صرف کر دیا۔

آخر کار ایک نہایت کامیاب اور مشغول زندگی بسر کرنے کے بعد ۳ مئی ۱۹۱۲ء کی شب میں دنیا کو چھوڑ کر اُردو ادب اور دنیائے ادب کو اپنا سوگوار بنا گئے۔

یہ ہے اس شخص کی زندگی کا مختصر سا خاکہ جس نے صرف اپنی ذاتی قابلیت سے دنیا میں عزت کی جگہ پیدا کر لی اور اپنی متعدد تالیف و تصنیف کی بدولت ادب اُردو میں اپنا نام چھوڑ گیا۔

اس کے علاوہ انھوں نے اپنی ادبی سرگرمیوں کے لئے ایک وسیع میدان منتخب کیا تھا جس میں ناول و حکایات مذہبی اور اخلاقی کتابیں، قانون، فلسفہ، تاریخ اور ترجمے سبھی آجاتے ہیں۔

اُن کی طباعی سب سے زیادہ اُن کے ناولوں اور کہانیوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس ذیل میں اُنکی کتابیں مراۃ العروس، بنات النعش، توبۃ النصوح، ابن الوقت، محصنات، ایامیٰ، رویائے صادقہ اور منتخب الحکایات سب سے زیادہ مشہور ہیں۔

اس سلسلے کی سب سے پہلی کتاب مراۃ العروس ہے جس کو انھوں نے ڈپٹی کلکٹری کے زمانہ میں تصنیف کیا تھا۔ اسمیں نہایت صاف اور سادی زبان استعمال کی گئی ہے اور عورتوں کے محاورات اور بول چال کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ اسمیں دکھایا گیا ہے کہ ایک جاہل اور بے پڑھی لڑکی شریف خاندان میں آکر کیونکر دُرست ہوئی۔ یہاں اُن تمام معاشرتی واقعات کو دکھایا گیا ہے جو شادی کے بعد لڑکیوں کو پیش آتے ہیں۔ اسمیں پُرلطف طریقے سے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ایک لڑکی دوسرے گھر میں جاکر اپنی، اپنے شوہر اور اُس کے خاندان کی زندگی کیونکر کامیاب بنا سکتی ہے۔ یہ ایک ایسی دلچسپ کتاب ہے کہ جو عورت پڑھی ہوئی نہیں وہ بھی اسے شوق سے سنتی ہے۔ حالانکہ یہ کتاب ایک مسلمان گھرانے کی زندگی کا نمونہ ہے۔ لیکن ہندو مسلمان دونوں میں اس کی بڑی قدر ہوئی، کیونکہ اس کی غرض صرف درستی اخلاق ہے۔ ابھی تک اور آیندہ بھی جو کتابیں لکھی گئیں، انمیں دلچسپی پیدا کرنے کے لئے عشق و عاشقی کے مضامین درج کرنا ضروری سمجھا گیا تھا۔ لیکن یہ کتاب اس امر کی کافی دلیل ہے کہ ان چیزوں کے بغیر بھی دلچسپی قائم رہ سکتی ہے۔ کتاب کی مقبولیت یہ کیا کم ہے کہ اس کا ترجمہ ملک کی اکثر دیسی زبانوں میں ہو چکا ہے۔

اس قسم کی دوسری کتاب بنات النعش ہے اسمیں بھی عورتوں کی تعلیم کی طرف توجہ دلائی گئی ہے

بھر لطف یہ ہے کہ مفید و دلچسپ معلومات اور سائنس کے مسئلے بات چیت کی شکل میں سمجھائے گئے ہیں۔

آپ کا تیسرا ناول جس کو آپ کا شاہکار کہنا چاہئے توبۃ النصوح ہے۔ اس کتاب میں یہ زور دیا گیا ہے کہ شروع میں اولاد کی نگہداشت کی سخت ضرورت ہے۔ بگڑے ہوئے لڑکے بڑے ہو کر کبھی سیدھی راہ پر نہیں آتے۔

"ابن الوقت" میں ایک ہندوستانی کا قصہ ہے، اس کو غدر کے زمانہ میں کچھ خدمتوں کے صلے میں ایک بڑا عہدہ مل جاتا ہے اور وہ اپنے ہندوستانی بھائیوں کی صحبت چھوڑ کر یوروپین لوگوں کے ساتھ مل جاتا ہے۔ لیکن یہ سب یوروپین دوست چلے جاتے ہیں۔ تو وہ پھر اپنے لوگوں میں آنے کی کوشش کرتا ہے مگر اسے کوئی نہیں پوچھتا۔

محصنات یا "فسانۂ مبتلا" میں تعداد ازدواج کی خرابیاں دکھائی ہیں۔ مبتلا ایک شریف وضع نوجوان ایک بری عورت کے پھندے میں پھنس کر تباہ ہو جاتا ہے۔

ایامیٰ میں انھوں نے بیوہ عورتوں کی شادی پر بہت زور دیا ہے اور ہندوستانی مسلمانوں کی رسم کو غلط اور غیر اسلامی ثابت کیا ہے۔

رویائے صادقہ میں مسلمانوں کے چند عقائد کی بحث ہے اور ان کو اپنی رائے اور اپنے خیال کے مطابق ثابت کرنا چاہا ہے۔

اسی طرح آپ کی اس قسم کی اور تصنیفات بھی ہیں جو کسی نہ کسی نتیجے کی غرض سے لکھی گئی ہیں۔ ان کا مقصد ملک و قوم کو فائدہ پہونچانا ہے۔

ناول نویس ہونے کے علاوہ ڈاکٹر صاحب مذہبی حیثیت سے بھی قابل ذکر ہیں۔ آپ کی کتاب امہات الامۃ جو ایک عیسائی کی کتاب امہات المومنین کے جواب میں لکھی گئی ہے، اسکی گواہ ہے۔

آپ کا سب سے بڑا مذہبی کارنامہ قرآن شریف کا اردو ترجمہ ہے جس کو آپ نے کئی عالموں کی مدد سے تیار کیا۔ اسی زمانہ میں اس کی اصلاح کے لئے بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ باوجود اس کے اس دور میں بہت مشہور اور نئے تعلیم یافتہ انگریزی داں مسلمانوں میں خصوصیت کے ساتھ قبول ہوا۔ سب سے بڑی خصوصیت اس میں یہ ہے کہ اس کی زبان بہت سادہ اور بامحاورہ ہے۔

آخر عمر میں آپ نے اور کئی مفید کتابیں لکھیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سب کو ماننا اور کہنا پڑا کہ ڈاکٹر صاحب کیا بحیثیت مؤلف، کیا بحیثیت مصنف اور کیا بحیثیت مترجم ایک خاص درجہ رکھتے ہیں۔ آپ نے اسکول کے کورس اور بچوں کے لئے جو مفید کتابیں لکھی ہیں وہ آپ کی یادگار ہیں۔

ملازمت سے کنارہ کشی کے بعد آپ کو لکچر دینے کا بھی بہت موقع ملا۔ آپ کی تقریریں پُر زور اور معلومات کا خزانہ ہیں۔ جنمیں ظرافت کی چاشنی اور بھی لوگوں کو محظوظ کرتی ہے۔ مجھ کو بھی غالباً ۱۹۰۵ء میں "حمایت اسلام لاہور" کے جلسہ میں آپ کی زیارت کا شرف حاصل ہوا ہے اور آپکی زبان سے کچھ سُننے کا موقع ملا ہے۔

ہمارے ڈاکٹر صاحب جب بوڑھے ہوئے تو جوانی کے مشغلوں سے دلچسپی شروع کی یعنی شاعری نے بھی بہت گدگدایا اور شعر کہنے لگے۔ ہم کو اسوقت آپ کی شاعری سے بحث نہیں کرنا ہے۔ اسلئے ہم اس کو یہیں پر چھوڑتے ہیں۔ یہاں ہمیں اُن کو بحیثیت نثر نگار پیش کرنا ہے اس لئے ہم انکی صرف نثر کی تصنیفات کا تذکرہ کیا ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو جو مراتب حاصل ہوئے وہ نثر کی بدولت۔ جس قدر خطابات ملے وہ نثر کی کارفرمائی کی وجہ سے۔

ڈاکٹر صاحب اپنے معاصرین میں شہرت کے لحاظ سے سب سے بازی لے گئے ہیں۔ کیونکہ اُنکی تصانیف ہر لائن میں ہیں، اور ہر جگہ اُنھوں نے اپنی قابلیت کے جوہر دکھائے ہیں۔ قانون کی کتابوں کے ترجمے کرنیکے سبب سے گورنمنٹ میں اُن کی شہرت ہوئی، ملازمت ملی اور ترقی پر ترقی حاصل ہوئی۔ قرآن شریف کے ترجمہ نے اُن کو مسلمانوں میں بہت مشہور کیا۔ لیکن سب سے زیادہ شہرت کے ذمہ دار ان کے ناول ہیں۔ خصوصاً وہ جو عورتوں کے لئے لکھے گئے ہیں۔ ان ناولوں نے ڈاکٹر صاحب کے نام کو ہر گھر میں پہونچا دیا۔

اُن کی شہرت کی وجہ ایک یہ بھی تھی کہ اُن کا طرز تحریر نہایت سادہ اور پُر اثر تھا۔ اسمیں شک نہیں کہ بعض جگہ عربی، فارسی کے بڑے بڑے الفاظ استعمال ہو گئے۔ لیکن بہت کم۔ اُن کی خصوصیت یعنی ظرافت ان کے ہر کارنامہ میں موجود ہے۔ اس مضمون میں اتنی گنجائش نہیں کہ ہم اُن کی نثر کے نمونے پیش کر کے اُن پر کسی رائے کا اظہار کر سکیں۔ لیکن اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ جس وقت ڈاکٹر صاحب نے اُردو لکھنے کے لئے قلم اٹھایا ہے۔ اُس زمانہ کو دیکھتے ہوئے، اور خوبیوں کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر صاحب آپ اپنی نظیر ہیں۔ گو بعض تذکرہ نویس ادیبوں کی رائے ہے کہ اُن کی نثر نگاری کا کوئی خاص ایسا طرز نہیں جس کو ہم اُن سے منسوب کر سکیں۔ جس طرح آزاد اور غالب کی تحریروں کو دیکھ کر کہہ اُٹھتے ہیں کہ یہ اُن کا طرز ہے۔ دوسری طرف مولانا حالی کی رائے کا خلاصہ سنیئے:۔

"مولانا نذیر احمد نے اپنی عام تصنیف سے جو احسان اُردو لٹریچر پر کیا ہے، اور اپنے

جادو دا اثر لکھ دوں سے جو سکہ جمہور کے دلوں پر بٹھایا ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ مشکل سے مشکل اور آسان سے آسان مطلب کے بیان کرنے پر جو غیر معمولی قدرت اِس شخص کو اپنے اسٹائل میں تھی وہ اِس قادر الکلامی سے کسی طرح کم نہ تھی جو سر سید مرحوم کو اپنے سیدھے سادے اسٹائل میں حاصل تھی۔

غرض ڈاکٹر صاحب نذیر احمد بحیثیت نثر نگار وہ پایہ رکھتے تھے جس پر آج اُردو ادب جس قدر ناز کرے وہ کم ہے اور اس بنا پر ہم کو یہ کہنے میں ہرگز تامل نہیں ہو سکتا کہ جب تک دنیائے ادب قائم ہے نذیر احمد کا نام کبھی بھلایا نہیں جا سکتا۔

اگر ہمارے سامنے کسی شخص کی مصیبت کا حال درد انگیز لفظوں میں بیان کیا جائے تو اس واقعہ کے ادراک کے ساتھ ہم پر ایک اثر طاری ہوگا۔ اِس قسم کے اثروں کا نام جذبات یا احساسات ہے۔ اور جو چیز ان جذبات اور احساسات کو برانگیختہ کر سکتی ہے وہی شاعری ہے۔ منطقی حیثیت سے شاعری کلام کی وہ قسم ہے جس سے جذبات انسانی برانگیختہ ہوں اور اُس کے مخاطب حاضرین نہ ہوں بلکہ انسان خود اپنا آپ مخاطب ہو، اسی کا نام شاعری ہے۔　　حالی

شعر کا طبیعت پر اثر کرنا ایک فطری بات ہے۔ شعر دراصل دو چیزوں کا نام ہے، مصوری اور موسیقی۔ اور یہ دونوں چیزیں فطرتاً انسان کے دل پر اثر کرتی ہیں۔　　شبلی نعمانی

ارسطو کے نزدیک شعر ایک قسم کی مصوری اور نقالی ہے۔ فرق یہ ہے مصور صرف مادی اشیاء کی تصویر کھینچ سکتا ہے۔ بخلاف اس کے شاعر ہر قسم کے خیالات، جذبات اور احساسات کی تصویر کھینچ سکتا ہے۔　　شبلی نعمانی

بے علم بادشاہ ملک اور بے علم زاہد دین کا دشمن ہوتا ہے۔　　پریم چند

دوستی لطف و کرم سے اور بادشاہی انصاف سے ترقی کرتی ہے　　پریم چند

---

* یہ مضمون لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے براڈکاسٹ ہوا۔ اب ڈاکٹر صاحب کی عنایت سے ہدیۂ ناظرین زمانہ ہو رہا ہے۔ (ا-ز)

جہانِ عشق کی دیوالی

(از مسٹر رام جوایا خندال)

جہانِ عشق میں غم لے کے آئی دیوالی　　چراغ داغ جلا کر منائی دیوالی
ہزار بار تماشا کیا چراغاں کا　　سماں ہے اور ہی کچھ داغہائے خنداں کا
یہ داغ وہ ہیں جو آنکھوں پہ جمکتے ہیں　　یہ وہ شرار ہیں جو رات بھر دہکتے ہیں
جگر کے خون کا روغن بنایا جاتا ہے　　چراغِ سوزِ محبت جلایا جاتا ہے
جو پھول بن کے اڑے داغ دل بہاروں میں　　تڑپ رہے ہیں وہ جگنو سے سبزہ زاروں میں
تحیرات میں ہے حیرتِ نظارہ گم　　تجلیات میں ہے غرق محفلِ انجم
کسی کی یاد میں مجبوریوں سے رو نہ سکے　　یہ داغ وہ ہیں جنھیں آنسوؤں سے دھو نہ سکے
مٹیں جو آہ سے وہ داغ دل کے داغ نہیں　　ہوائیں جن کو بجھا دیں یہ وہ چراغ نہیں

فروغِ حسنِ ازل دیکھ دل کے داغوں میں
چراغِ طور کا پرتو ہے ان چراغوں میں

دیپ مالا کی رات

یہی وہ رات ہے جلوؤں کا ساماں جس میں ہوتا ہے　　یہی وہ رات ہے جشنِ چراغاں جس میں ہوتا ہے
یہی وہ رات ہے روشن شبستاں جس میں ہوتا ہے　　یہی وہ رات ہے عالم فروزاں جس میں ہوتا ہے

یہ وہ شب ہے ضیائے صبح خنداں بھی ہے مات اس سے
یہ وہ شب ہے کہ تاریکی بھی ہے روشن صفات اس سے

اودھ میں جیت کر لنکیش کو جب رام آئے تھے　　تو گھر گھر جشن بھارت ورش میں سب نے منائے تھے
مکاں اپنے سجا کر آئینہ خانے بنائے تھے　　وفورِ شادمانی سے دیئے گھی کے جلائے تھے

یہی وہ رات ہے جو یادگارِ فتح لنکا ہے
یہی وہ رات ہے ہر سال بجتا جس کا ڈنکا ہے

ہندوستان کی اقتصادی پستی اور اُسکا حل

(از مسٹر علیم سلیمی ایم اے مونگیر)

ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں ایک ہیجان سا برپا ہے۔ اس سیاسی بیداری اور علوم و فنون کی ترقی کے باوجود قدم قدم پر اقتصادی پستی کا اثر نمایاں ہے۔ ہمارے نوجوانوں کی نظر میں تو وسعت پیدا ہوتی جارہی ہے اور اپنے آپ کو صرف اپنے ملک کا باشندہ نہیں سمجھتے جو تین طرف سے سمندر سے گھرا ہوا ہے اور ایک طرف سے ہمالیہ کی پہاڑی دیوار سے ملک پناہ گزین ہے۔ بلکہ اُن کی نظروں کے سامنے جاپان کی زندہ مثال موجود ہے جو اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے بعد اپنے حدود سلطنت بڑھانے کے درپے ہے اور تمام دنیا کی نظروں میں خار کی طرح کھٹک رہا ہے۔ ہمارے نوجوان ہندوستان کے بازاروں میں غیر ممالک کی بنی ہوئی اشیا کا انبار دیکھتے ہیں اور جب اُن کی نظریں ملکی چیزیں تلاش کرتی ہیں تو مایوسی کے ساتھ جھک جاتی ہیں۔ ان کے کانوں میں ممالک غیر سے جنگ کے بلند نعرے سنائی دیتے ہیں وہ سنتے ہیں کہ چین کو جاپان کھا گیا۔ اٹلی حبشہ کو نگل گیا، جرمنی نے آسٹریا کو محض دھونس میں الحاق کر لیا۔ جب حساس دل رکھنے والا نوجوان ان ساری باتوں کو سنتا دیکھتا اور غور کرتا ہے تو اس کی پریشانی اور ندامت کی کوئی حد باقی نہیں رہتی۔ یہی وہ باتیں ہیں جن کی وجہ سے ہمارے نوجوانوں کے سرد خون میں قومی بیداری کی حدت پیدا ہورہی ہے۔ اور وہ بے چین و سراسیمہ نظر آرہا ہے۔ اس لئے یہ کہنا درست نہیں کہ ہندوستان والوں کو صرف روٹی کے سوال نے پریشان کر رکھا ہے۔ یہ سوال تو زراعتی ترقی کے ذریعہ سے حل کیا جاسکتا ہے۔ مگر ہماری پیچیدگیوں کا حل زراعت کو نہیں قرار دے سکتے۔

نوجوانوں کے خاموش کرنے کی بہت سی صورتوں پر غور کیا جارہا ہے۔ ملک میں امن اور شانتی پھیلانے کی تمام امکانی کوشش ہورہی ہے۔ کانگریسی وزارتیں بھی اس پر اپنے محدود اختیارات کے ساتھ بڑے غور و شور سے غور کر رہی ہیں۔ حکام بھی اپنے سر کھپا رہے ہیں اور حد ہوگئی کہ مرکزی حکومت کو بھی ہندوستانیوں کی فلاح و بہبود کا خیال پیدا ہوچلا ہے اور مدبران انگلستان کو بھی ہندوستان کے ساتھ ہمدردی کے جذبہ نے پریشان کر رکھا ہے۔

ان سارے مسائل کا حل دو تین باتوں کے اندر پوشیدہ ہے:-

اول، صنعتی تعلیم کی وسیع پیمانہ پر ترقی، دوم زراعت میں امکانی ترقی، سوم ملک کی تجارت کو فروغ۔ چنانچہ قوم کے بڑے بڑے نکتہ رسوں نے اکثر یونیورسٹیوں میں صنعتی تعلیم کا انتظام شروع کر دیا ہے، جس میں بنارس یونیورسٹی خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔ علیگڈھ یونیورسٹی میں بھی تھوڑا بہت کام شروع ہو گیا ہے۔ حکومت کو بھی اس کا احساس ہو گیا ہے کہ موجودہ تہذیب و تمدن کی ملمع گری نے ہندوستانیوں کو اپنی روزانہ کی ضروریات کے لئے ممالک غیر کا نہ صرف محتاج بلکہ بے دست و پا بنا دیا ہے۔ اسی کے ساتھ ہر سال ملک کے کالجوں اور یونیورسٹی کی امداد سے فاقہ مست عیش پسند اور مغرب پسند ہندوستانی نوجوانوں کی بڑی فوج نکلتی رہتی ہے جو تکمیل تعلیم کے بعد اپنے اور روٹی کمانے کے ذریعوں کو بند پاتی ہے، اور ان کو ہر طرف مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کامیابی کے ہر دروازے پر تالے پڑے ہوئے نظر آتے ہیں

۱۸۱۳ء میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی کا چارٹر تبدیل کیا گیا تھا تو دار العوام میں یہ تجویز پیش ہوئی تھی کہ ہندوستان کے عوام میں ہر امکانی کوشش کے ساتھ بہبودی اور خوشحالی پھیلائی جائے۔ مگر اسی کے ساتھ ان ذرائع پر بھی غور کیا گیا تھا جن پر عمل کرنے کے بعد ہندوستان کی صنعت تباہ ہو جائے، اور اس کے بجائے برطانوی صنعتوں کی مانگ ہندوستان میں زیادہ ہو جائے۔ مگر اب حکومت کے اس رویہ میں تبدیلی ہوتی جا رہی ہے اور ہندوستانی صنعت و حرفت کو بیرونی مقابلہ سے حفاظت کرنے کی تدابیر پر غور کیا جا رہا ہے۔ مگر بیرونی تجارت سے میرا مطلب صرف جاپانی اور جرمنی کا مال ہے، ورنہ برطانیہ کو یہ کب گوارا ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کی منڈی اُس کی صنعتوں سے خالی ہو جائے۔

ہندوستان میں سودیشی تحریک نے ۱۹۰۵ء سے ترقی کی جس سے بہت سے بیکاروں کو روٹی کا سہارا ہو گیا، اور غریب جلاہوں کو اپنی بسر اوقات کا کچھ ذریعہ ہاتھ آ گیا۔ آج کل ملک کے گوشہ گوشہ میں سوتی کاروبار تیزی کے ساتھ ترقی کر رہا ہے۔ گاؤں والوں نے اپنی ضروریات کے لئے خود ہی چیزیں بنانے کی ترکیبیں شروع کر دی ہیں۔ لیکن غیر ملکی اشیاء کی ارزانی نے ملکی صنعت کو اپنے پیروں پر قائم رہنے سے مجبور کر دیا ہے۔ کانپور اور دھاریوال کے اونی کپڑوں کی کھپت جاپانی اور دیگر بیرونی ممالک کے کپڑوں کے مقابلے میں مایوس کن ہے۔

بہر حال نوجوانوں کی بیکاری رفع کرنے کے متعلق اصل سوال یہ ہے کہ حکومت اس کے لئے کون سی تدابیر عمل میں لائے۔

اس کے دُہرانے کی ضرورت نہیں ہے کہ ہندوستان ایک زراعتی ملک ہے۔ اس لئے یہاں کے لوگوں کو زراعت کی ترقی کی طرف رجوع ہونا چاہئے۔ لیکن ہم اپنی انتہائی نادانی کا ثبوت دیں گے اگر اوسط درجہ کے طبقہ والوں سے یہ اُمید رکھیں کہ وہ خود جا کر کھیتوں میں ہل چلائیں اور اپنی روزی کما کر کھائیں۔ اس کا ہرگز یہ مقصد

نہیں ہے کہ وہ ایسا نہیں کر سکتے بلکہ وہ ایسا نہیں کریں گے۔ کیونکہ ان کی سماجی نگاہوں میں فرق آگیا ہے۔ وہ اس پیشے کو اپنے لئے ذلیل سمجھنے لگے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی اہم مسئلہ ہے کہ ہماری زراعت کا انحصار بارش پر ہے اس لئے پانی کا ایسا انتظام کیا جائے کہ خدائی دین کے بجائے اپنے قابو کی چیز ہو جائے۔

ہندوستان کے باشندے طبعاً مشقت پسند اور قانع واقع ہوئے ہیں لیکن اگر ان کے نوجوانوں پر توجہ دی جائے تو پھر دیکھئے کہ یہ کیا کچھ نہیں کر دکھاتے۔ اُن کے اندر ایک روح پھونکنے کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ سرمایہ کی فراہمی بھی لازمی ہے لیکن اوسط درجہ کے طبقے کے نوجوانوں کے لئے کیا کیا جائے۔ یورپ کی طرح فوج اور جہاز میں یہاں کے نوجوانوں کی کوئی خاص کھپت نہیں ہے۔ کلرکی کی جگہیں بھی قریب قریب بھر چکی ہیں۔ کاروباری کارخانے بھی ہندوستان میں معدودے چند ہیں اس لئے وہاں بھی اُن کی گنجایش کا کوئی سامان نہیں۔ اس لئے ان کا مستقبل انتہائی تاریک نظر آتا ہے۔ سماجی تعلق اور ذات پات کی تمیز ڈھیلی پڑ جانے سے اور بھی دقتیں بڑھ گئی ہیں۔ جہاں کہیں بھی روٹی ملنے کی اُمید پائی جاتی ہے وہاں ہندو (برہمن چھتری شودر) اور مسلمان سب کی درخواستیں موجود ہو جاتی ہیں۔ برہمنوں کو جوتوں کی دوکان پر کام کرنے میں عذر نہیں اور ریلوے اور دیگر کارخانوں میں چھوٹے سے چھوٹے ذات کے نوجوانوں کے ساتھ اونچی ذات کے نوجوان بھی خلاصی چپراسی کے کام کرتے نظر آتے ہیں۔ اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان میں رفتہ رفتہ ایک سماجی انقلاب بھی آ رہا ہے جس کے آثار روزمرہ نمایاں ہیں۔

میں بتلا چکا ہوں کہ سودیشی تحریک کی ناکامی کے بہت سے وجوہ ہیں۔ حکومت نے اس تحریک کا خلوص سے ساتھ نہیں دیا اور سرمایہ کی کمی سے بھی اس کی ترقی کو کافی صدمہ پہونچا۔ چند لوگوں نے دیا سلائی اور اس طرح کی دوسری چیزوں کے کارخانے قائم کرنے کے لئے سرمایہ لگانا چاہا مگر وہاں بھی حکومت نے ساتھ نہ دیا۔ ریلوے ڈپارٹمنٹ نے بھی مدد نہ کی۔ اس کے علاوہ ماہرین فن کی کمی نے بھی ان کوششوں کو سرسبز نہ ہونے دیا اور ناتجربہ کاری اور خلوص کی کمی سے بھی اس تحریک کو نقصان پہونچا۔

ظاہر ہے کہ ہندوستان بہت دولتمند ملک نہیں ہے اس لئے یہاں پر آسانی کے ساتھ جوٹ اور سوت کے بڑے بڑے کاروبار نہیں شروع کئے جا سکتے لیکن اگر مشترکہ کاروبار شروع کیا جائے تو آسانی کے ساتھ چلایا جا سکتا ہے اور اگر اتنا کافی سرمایہ نہ حاصل ہو سکے تو کم سے کم چھوٹے کاروبار تو آسانی کے ساتھ شروع کئے جا سکتے ہیں۔ اگر چھوٹے چھوٹے کارخانے ہی ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیل جائیں۔ اور اپنی ضروریات کو پورا کرنے کی صلاحیت پیدا کر لیں تو سرمایہ کی کمی کا سوال بھی خود بخود حل ہو جائے۔

مارشل کا بیان بالکل صحیح ہے کہ اگر چھوٹے چھوٹے سرمایہ داروں کا سرمایہ اور عقلمندوں کی قابلیت ایک

دوسرے کی معین و معادن ہوں تو بڑے سے بڑے کاروبار کے شروع کرنے میں کوئی وقت باقی نہ رہے۔

بہر حال ملک میں کئی قسم کی صنعتیں تو فوراً شروع کی جا سکتی ہیں:-

(۱) گھریلو صنعتیں جس میں بہت ہی کم سرمایہ کی ضرورت ہے۔

(۲) ایسی صنعتیں جن کے لئے کافی سرمایہ کی ضرورت ہے، لیکن ہندوستان ایسے ملک میں بہت سی ایسی صنعتیں اپنی ابتدائی حالت میں ہیں۔ اور جن کو حکومت کی امداد کی سخت ضرورت ہے۔ حکومت چاہے ان کی مالی امداد کرے یا ان کی چیزوں کو خرید کر ان کی امداد کرے۔

اب سوال یہ باقی رہتا ہے کہ حکومت ہندوستان کی صنعتوں کو کس طرح ترقی دے سکتی ہے۔ حسب ذیل طریقے کارآمد اور مفید ثابت ہونگے۔

(۱) صنعتی کاروبار کے سرمایہ داروں کو ایک مخصوص سود کی ضمانت۔

(۲) کم شرح سود پر سرمایہ کی فراہمی۔

(۳) بعض صنعتوں کی خاص طور پر امداد۔

(۴) ملک کے ایک حصہ سے دوسرے حصہ تک خام مال پہونچانے کے ذرائع میں خاص سہولتیں پہونچائی جائیں۔

(۵) بیرونی ممالک کی اشیاء پر ڈیوٹی لگا کر ان کی درآمد روکی جائے۔

(۶) قرض دینے والی انجمنیں قائم کی جائیں۔

(۷) ہندوستانی مال کو بیرونی اشیاء پر ترجیح دی جائے۔

سرمایہ کے تحفظ اور منافع کے تعین کے طریقہ نے ہندوستان میں کافی ترقی حاصل کی ہے۔ یہاں کی ریلوں کی تعمیر زیادہ تر اسی طریقہ سے ہوئی۔ اب بھی چھوٹی چھوٹی ریلیں اسی طریقہ کے سرمایہ سے بنائی جارہی ہیں اور ان سے اچھی خاصی آمدنی ہورہی ہے مگر اس کے لئے بہتر یہ ہے کہ ہندوستان ہی کا سرمایہ لگایا جائے نہ کہ برطانیہ سے روپیہ قرض لے کر یہاں کی پریشانی میں اضافہ کیا جائے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ حکومت انجمنوں کو یا خاص خاص لوگوں کو کچھ مالی امداد دے تاکہ وہ کاروبار میں لگا کر ہندوستان کی تجارت اور صنعت کو ترقی دے سکیں۔ اس سلسلہ میں روپیہ کے تحفظ کا سوال ضرور پیدا ہوتا ہے مگر روپیہ کی واپسی سے کافی اُمید ہوتی ہے کہ اس طرح کے قرض کا روپیہ بھی بآسانی واپس کیا جاسکتا ہے۔

(۳) جن صنعتوں کی ترقی کے امکانات پائے جائیں اُن کی خاص طور پر امداد کرنا حکومت کا فرض ہونا چاہیے۔

اِس طرح ملک کی ابتدائی صنعتیں کافی ترقی کر سکیں گی۔

(۴) ذرائع آمد و رفت کی سہولتیں مہیا کرنے سے حکومت کو کوئی خاص نقصان نہیں پہونچ سکتا کیونکہ جہاں دیکھا جائے کہ خام مال کم قیمت پر مل سکتا ہے وہاں سے ریلوے یا سڑکوں کے ذریعہ مال منگانے کا آسانی سے انتظام کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح خام مال کی پیداوار میں بھی ترقی کی جا سکتی ہے۔ اور سڑک کی آمدنی کی بھی صورت نکل سکتی ہے۔

(۵) بیرونی ممالک کی چیزوں پر ڈیوٹی لگا کر اُن کی درآمد کو کم کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں کپڑے اور دیگر اشیا کی وجہ سے ملک کو جو کچھ فائدہ ہوگا اس کا اندازہ آسانی کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔

(۶) قرضہ دینے کی انجمنیں حکومت آسانی کے ساتھ اور بلا کسی عذر کے بنا سکتی ہے اور اس سے ملک کو بہت فائدہ پہونچ سکتا ہے۔

(۷) ہندوستان کی حکومت کو کافی سامان کی ضرورت ہوتی ہے مگر بدقسمتی سے حکومت کو زیادہ تر انگلستان ہی کا بنا ہوا سامان پسند آتا ہے۔ بجٹ کے موقع پر حکومت کے اس رویہ کی اکثر مذمت کی جاتی ہے مگر اب تک اس پر کوئی دھیان نہیں دیا گیا۔ اگر حکومت بھی کے ہندوستانیوں کا خیال کرتے ہوئے ہندوستان ہی کی بنی ہوئی چیزیں خریدنے لگے تو بہت سی صنعتوں کو یقینی طور سے ترقی ہو جائے مثلاً ممالک متحدہ کی کانگریسی حکومت نے دیسی کاغذ کا استعمال شروع کر دیا ہے جس کے سبب کاغذ کی صنعت میں خاصی ترقی ہونے کا امکان پیدا ہو گیا ہے۔

بہر حال یہ چند طریقے ہیں جن پر عمل کرنے سے ہندوستان کی صنعت کو یک گونہ ترقی ہو سکتی ہے مگر اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ خلوص سے کام کیا جائے۔ صرف اخباری پروپیگنڈا اور لیڈری حاصل کرنے کے لئے جو کام کیا جاتا ہے اُس سے فائدہ کے بجائے نقصان کا ڈر ہے۔ چھوٹی چھوٹی صنعتوں کو سارے ملک میں جال کی طرح پھیلا دینا چاہیئے۔ تاکہ بیکار نوجوانوں کو پیٹ پالنے کا ذریعہ ہاتھ لگ جائے اور ایمانداری اور سعادتمندی کے ساتھ ملک و قوم کے کام آسکیں۔ صنعت و تجارت کے سلسلہ میں ہندوستان کے سرمایہ دار جو روپیہ لگائیں گے اس سے یقینی منافع حاصل ہوگا کیونکہ ہندوستان میں سودیشی تحریک کے لئے کانگریسی حکومت بہت کارآمد ثابت ہوگی اسی سلسلہ میں یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ اگر ہندوستان کے سرمایہ داروں کو اس بات کا یقین ہو جائے کہ حکومت ان کی ہر ممکن امداد کے لئے تیار ہے تو پھر وہ فراخدلی اور دریا دلی کے ساتھ ہندوستانی صنعت کی طرف رجوع ہو جائیں۔

ہندوستان کی لاچاری سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ہندوستانی لوگوں کے وہم و گمان سے

بھی زیادہ خستہ حال ہو رہا ہے اور اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ ہم اپنی روزمرہ کی ضروریات کی چیزیں بیرونی امداد کے بغیر پوری نہیں کر سکتے۔ ہم بیرونی اشیاء کے استعمال کے غلام ہو چکے ہیں۔ اور اگر فوری کوئی تدبیر عمل میں نہ لائی گئی تو مجھے شبہ ہے کہ ہندوستان سے اپنی پستی کا احساس بھی فنا ہو جائیگا اس لئے حکومت اور مدبران ملک دونوں کو ہندوستان کو اس قعرِ مذلت سے نکالنے کے لئے متوجہ ہونا چاہیئے تاکہ ملک کو بیرونی اشیاء کی غلامی سے نجات مل جائے، اور ہندوستان کے بیکاروں کو روٹی کا سہارا ہو جائے۔

اس سلسلہ میں یہ بتلانا بھی ضروری ہے کہ صنعتی اسکولوں اور کالجوں کا قائم کرنا بھی اشد ضروری ہے تاکہ ہندوستان کے نوجوان اس میں تعلیم حاصل کر کے ملک کی ترقی کرنے والی صنعتوں میں کامیابی کے ساتھ کام کر سکیں۔ مگر اس سلسلے میں یہ بات ضرور پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ صنعتی تعلیم جس قدر کم خرچ ہو گی اُسی قدر اُس سے ملک کو زیادہ فائدہ پہونچے گا۔ ورنہ غریب طبقہ کے نوجوان آسانی کے ساتھ تعلیم حاصل نہ کر سکیں گے۔ ہم کو غریب اور اوسط درجہ کے طبقے کا خیال رکھنا زیادہ ضروری ہے، کیونکہ یہی وہ طبقہ ہے جس کو حوادث سے زیادہ دوچار ہونا پڑتا ہے۔ صنعتی درسگاہوں کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ مغربی انداز کی اعلیٰ شاندار عمارتوں کے اندر تعلیمی کام انجام دیئے جائیں بلکہ ہندوستان کی غربت کا خیال رکھتے ہوئے چھوٹے چھوٹے کاروبار اور چھوٹی چھوٹی صنعتوں کے لئے معمولی معمولی اسکول بنائے جائیں، تاکہ آس پاس کے بچے ان سے فیض یاب ہو سکیں۔

بہرنوع اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہندوستان میں صنعتی ملک بننے کی پوری صلاحیت موجود ہے۔ یہی وہ ملک ہے جو کبھی بہترین ململ اور ادنی سوتی کاروبار کے لئے دنیا میں مثال کے طور پر پیش کیا جاتا تھا۔ کشمیر کی شال اور دریاں اب بھی قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ اگر ہمارے نوجوانوں کو کام کرنے کا موقع دیا جائے اور ان کے لئے ضروری سہولتیں مہیا کی جائیں تو پھر ہندوستان ایک نمونہ نہ بن سکے۔

رُباعی

ہم ہیں کہ یہ اک پیکرِ زندانی ہے　　برباد حیات و نقد انسانی ہے
یہ قید ہے یا عذابِ دوزخ یارب　　یا لعنتِ جسمانی و روحانی ہے

جگر بریلوی

تالاب کا سماں

(از حضرت ممتاز نونہروی)

شاعر کی مست نظریں اور شام کا سماں تھا
سرشار تھیں فضائیں مخمور آسماں تھا

ٹھنڈی ہوا کی مستی عالم پہ چھا رہی تھی
نیرنگیوں میں دُنیا غوطے لگا رہی تھی

سورج کی زرد کرنیں کروٹ بدل رہی تھیں
تالاب کی فضائیں سونے میں ڈھل رہی تھیں

اک ماہ وش، پری رُخ، رنگیں ادا، ستمگر
ظالم، حسین صورت، کافر حسین پیکر

طے کر کے سیڑھیوں کو پانی تک آ رہی تھی
کچھ خوف کھا رہی تھی، کچھ ہچکچا رہی تھی

پازیب کی صدائیں بلبل کے چہچہے تھے
نازک سی ٹھوکروں میں جلوے تڑپ رہے تھے

ناز و ادا سے اکثر یوں مسکرا رہی تھی
رنگینیوں میں دنیا غوطے لگا رہی تھی

کیفِ نظر فضا میں کروٹ بدل رہا تھا
پانی شراب بن کے پیہم اُچھل رہا تھا

فطرت بھی ہر طرف سے مسحور ہو رہی تھی
سرشار ہو رہی تھی، مخمور ہو رہی تھی

اُف کس ادا سے ظالم پانی میں جا رہی تھی
لہریں جو چھیڑتی تھیں وہ تن چُرا رہی تھی

تھی گدگدی بدن میں رہ رہ کے کانپتی تھی
شرم و حیا کی ماری۔ زوروں میں ہانپتی تھی

حُسنِ شباب رنگیں پردہ کئے ہوئے تھا
بادل سمٹ کے اپنا سایہ کئے ہوئے تھا

لہروں سے وہ خراجِ رعنائی لے رہی تھی
فطرت سنبھل سنبھل کے انگڑائی لے رہی تھی

تاریکیوں کی ناگن ہر سمت ڈس رہی تھی
تالاب کی فضا میں مستی برس رہی تھی

پانی میں چاند آ کر نظریں لڑا رہا تھا
کچھ خوف کھا رہا تھا کچھ تھرتھرا رہا تھا

تاروں کی شوخ نظریں حسرت سے پڑ رہی تھیں
لیکن فضا کے اندر آپس میں لڑ رہی تھیں

شاعر کی مست نظریں سرشار ہو چکی تھیں
بدمست ہو چکی تھیں بیکار ہو چکی تھیں
جذبات میں تلاطم تخئیل پہ تھی ہلچل
احساس کی فضا میں اُڑتے ہوئے تھے بادل
اِک بیخودی کا دریا طوفاں اُٹھا رہا تھا
ہوش و حواس اپنی رَو میں بہا رہا تھا

جب ہوش آیا، دیکھا سب کچھ گزر چکا تھا
بیتابیوں کا مارا پانی ٹھہر چکا تھا
حدِ نظر سے گویا وہ حور مِل رہی تھی
تاریکیوں میں دھندلی تصویر ہِل رہی تھی

یورشِ رنج

از حضرت گلشن (دگرلی)

یورشِ رنج بے حساب نہ پُوچھ
ضبط بھی دے گیا جواب نہ پُوچھ
ماجرائے شبِ شباب نہ پُوچھ
کس قیامت کا تھا وہ خواب نہ پُوچھ
دیکھ، میری تباہ حالی دیکھ
میرے اعمال کا حساب نہ پُوچھ
امتحانِ وفا میں اے ہمدم
کون کہتا ہے کامیاب نہ پُوچھ
بحرِ اُلفت میں ڈوبنے والے
معنیِ عقدۂ حباب نہ پُوچھ
آرزوؤں کا خون کرتا جا
آرزوے دلِ خراب نہ پُوچھ
زندگی سے نہ دل کی پیاس بجھی
تابشِ جادۂ سَراب نہ پُوچھ
میری نظروں کی داد دے ظالم
"کیوں کیا تجھکو انتخاب نہ پُوچھ"
جلوہ ہائے جمالِ جاناں دیکھ
رازِ بربادیِ شباب نہ پُوچھ
شغل ہو جس کا خونِ دل پینا
اُس سے کیفیت شراب نہ پُوچھ
جائزہ لے مِری خطاؤں کا
اپنے الطاف کا حساب نہ پُوچھ
پُھک گئے جان و دل بھی اے گلشن
آتشِ غم کا التہاب نہ پُوچھ

ہندو مسلم اتحاد کی تدابیر

(از منشی رام پرشاد ماتھر بی۔ اے، بی۔ ای۔ ایس (ہیڈ ماسٹر پنشنر)

ہر نیک دل ہندوستانی چاہتا ہے کہ ہندو مسلمان برادرانہ زندگی بسر کریں، دونوں کسی صورت میں جُدا نہیں ہو سکتے۔ یہ امر نہایت اطمینان بخش ہے کہ دیہات میں دونوں قومیں نہایت محبت سے زندگی بسر کرتی ہیں، مگر بدقسمتی سے شہروں میں جہاں تعلیم یافتہ طبقہ زیادہ پُر اثر ہے منافقت نظر آتی رہتی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس حالت کی جوابدہی ہمارے مدارس کی تعلیم پر ہے جس کو حاصل کر کے برادرانِ وطن ایک دوسرے سے محبت قائم نہیں رکھ سکتے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ باہمی نفاق کے وجوہ دریافت کئے جائیں اور اُن کو رفع کرنے کی تدابیر پر غور کیا جائے۔

اس افسوسناک اور فضول نفاق کی تین وجوہ ظاہر ہیں:۔

اوّل تاریخ ہند کی موجودہ کتب تعلیم اور اُن کو پڑھانے کا طریقہ۔

دوم اردو ہندی کا بے معنی قضیہ،

سوم۔ بعض قومی اخبارات کی دلشکن تحریریات اور ان کا لا متناہی سلسلہ۔

(۱) تاریخ کی تعلیمی کتب گو تیس یا چالیس سال پیشتر کی کتابوں سے ضرور بہتر ہیں، مگر ہندو مسلم اتحاد کے واسطے صریحًا ناکافی ہیں۔ لیکن کتابیں خواہ کیسی ہی ہوں اُن کو پڑھانے کا طریقہ بھی درست ہونا چاہیئے اور اس کی جوابدہی اساتذہ پر ہے۔ ہر استاد کا فرض ہے کہ تاریخ کی تعلیم کے وقت وہ اپنی قومیت کے خیال کو بالائے طاق رکھے اور یہ نہ خیال کرے کہ شیواجی یا اورنگ زیب میں اس کا کون ہم قوم یا ہم مذہب تھا اور کون مخالف۔ بعض اوقات مجھکو یہ خیال کر کے بہت ہنسی آتی ہے کہ شیواجی اور اورنگ زیب کو مرے ہوئے سینکڑوں برس گذر گئے اور ان کے گوشت و پوست کا قبر یا سمادھ میں پتہ بھی نہ ہوگا اور اُن کی اولاد کا پتہ بھی بمشکل ملتا ہے لیکن یہ لوگ جو نہ اُن کے رشتہ دار ہیں نہ کسی قسم کا تعلق اس کے سوا رکھتے ہیں کہ ان میں ایک ہندو تھا اور دوسرا مسلمان، اب صدہا سال بعد کٹے مرتے ہیں۔ اور اُن کی مثال پیش کر کے خیال کرتے ہیں کہ ان میں فلاں بھلا یا بُرا تھا اس لئے اس کی تمام قوم بھلی یا بُری ہو گئی اور صدہا برس بعد وہ قوم اب بھی نہایت اچھی یا نہایت بُری ہے۔ میں نہیں جانتا

کہ تعلیم یافتہ حضرات کس منطق سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں۔ ہر شخص اپنے ذاتی فعل کا خود جوابدہ ہے اس کی تمام قوم نہیں۔ اس کے علاوہ اگر کسی شخص سے کوئی فعل شنیعہ سرزد ہوا تو اس سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ اس نے تمام عمر خراب کام ہی کیا۔ پھر کوئی بادشاہ کسی قوم کا فرد نہیں اور اس پر سعدی کا یہ شعر عاید نہیں ہو سکتا کہ ؎

چو از قومے یکے بیدانشی کرد نہ کہ را منزلت ماند نہ مہ را

بلکہ رموز مملکت خویش خسرواں دانند

مصلحت ملکی ہر کہ ومہ نہیں سمجھ سکتا۔ اس لئے فضول خراب نتیجہ نکال کر سینکڑوں برس بعد اب باہم لڑنا نادانی نہیں تو کیا ہے؟

اُستاد کو سمجھنا چاہیئے کہ جس طرح ہر جاندار کا لڑکپن جوانی اور بڑھاپا ہوتا ہے اسی طرح ہر قوم وسلطنت کا بھی حال ہے۔ انسان بچپن میں چیزوں کو توڑ پھوڑ کر تجربہ حاصل کرتا ہے، لیکن بڑا ہونے پر ہر چیز کو احتیاط اور انتظام سے رکھتا ہے اور بڑھاپے میں قویٰ مضمحل ہو جانے پر احتیاط و انتظام نہیں کر سکتا اور چیزیں خراب ہونے لگتی ہیں۔ یہی حالت قوم وسلطنت کی ہے۔ اس کی دوسری عمدہ مثال عمارت سے دی جا سکتی ہے۔ آپ کیسی ہی عمدہ عمارت بنوائیں، پہلے پھاوڑے سے کام لینا اور زمین درست کرنا یا پہلی بوسیدہ عمارت کو منہدم کرنا پڑیگا، یہ تعمیر کا بچپن ہے۔ اس کی جوانی کا وقت عمارت کا بنیاد پر کھڑا کرنا اور اس کو خوبصورت اور بود و باش کے قابل بنانا ہے۔ اور اس ذریعہ سے خود آرام حاصل کرنا اور دوسروں کو آرام دینا۔ جب عمارت بوسیدہ ہونے لگتی ہے تو اُس کا بڑھاپے کا زمانہ آجاتا ہے اور بود و باش مشکل ہو جاتی ہے۔ بالآخر خواہ وہ خود گر پڑتی ہے یا اس کو منہدم کر کے دوسری عمارت کا کام شروع ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح ہر قوم کو اپنی سلطنت کی بنیاد مضبوط کرنے کے لئے اول سختی کے ساتھ جنگ و جدل اور انتظام کرنا پڑتا ہے اور رعیت اس باعث سختی اور ظلم برداشت کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔ لیکن انتظام ہو جانے پر یہی سختی رحمدلی اور انصاف سے بدل جاتی ہے اور رعیت خوشحال اور فارغ البال ہوتی ہے۔ مگر آخر میں جب سلطنت کمزور ہو جاتی ہے تو پھر بد انتظامی کے باعث ظلم پیدا ہوتا ہے اور اسی پر نئی سلطنت کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔

آجکل تعلیم یافتہ نوجوان کسی سلطنت کا ابتدائی زمانہ پڑھکر اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ اس قوم نے ہمیشہ ظلم کیا۔ دوسرا فریق تسلط کا زمانہ کے کر کہتا ہے کہ نہیں ہمیشہ انصاف رحمدلی اور ہمدردی کا برتاؤ ہوا اور نہایت عمدہ انتظام رہا۔ تیسرا فریق سلطنت کی کمزوری کے زمانہ کا حال سنا کر کہتا ہے کہ اس قوم نے کبھی نہ انتظامی قابلیت

دکھائی۔ بادشاہ یا ناظم برا یا چھوٹا ہمیشہ رعیت کو ستایا اور اُن کے حقوق پامال کئے۔ حالانکہ تینوں فریق غلطی پر ہیں۔ نہ ہمیشہ ظلم ہوا نہ ہمیشہ انصاف اور ہمدردی۔ لیکن ظلم اور انصاف کا معیار ایک حد تک مدت سلطنت ہے۔ کیونکہ ظالم کی عمر زیادہ نہیں ہوتی۔ مثلاً اگر کوئی قوم واقعی ظالم تھی تو وہ چھ سات سو برس تک ہندوستان پر حکومت نہیں کر سکتی۔ اسلامی حکومت و برطانیہ کی سلطنت کے ابتدائی زمانہ کے مطالعہ اور تعلیم کے وقت تاریخ ہندوستان میں ان اصول کو مدّنظر رکھنا چاہیئے۔ اور ہر حاکم کی خوبیوں کو نظرانداز نہ کرنا چاہیئے۔

تاریخ کو ٹھیک سمجھنے اور خاصکر اُس زمانہ کی اصلی حالت دریافت کرنے کے واسطے جب بادشاہ خود مختار تھے پیشتر یہ معلوم کرنا نہایت ضروری ہے کہ

(۱) بادشاہ کی تخت نشینی سے پیشتر ملک کی کیا حالت تھی ؛

(۲) رعایا کس قسم کے رسم و رواج کی پابند اور کیسی جزا و سزا کی عادی تھی ؛

(۳) بادشاہ کے ہمنشین اور با اثر اہالی و موالی کس مزاج کے تھے اور اُن کا رُجحانِ طبع کس جانب تھا یا اُن کا رعایا اور بادشاہ تک کس قدر رسوخ تھا ؟

(۴) بادشاہ کس انتظام پر مجبور تھا اور کس پر آزاد ؟ اور

(۵) کسی سخت انتظام میں بادشاہ کی کیا نیت تھی ؟

مثلاً اورنگ زیب نے اپنے بھائی مراد بخش کو دعوت کے بہانے بُلا کر گرفتار کر لیا اور چپ چاپ زیر حراست قلعہ گوالیار بھیجدیا۔ دونوں کی فوجیں موجود تھیں لیکن کسی کو خبر نہ ہوئی۔ بعض مخالف اس کو دھوکہ دہی کی مثال کے طور پر پیش کرتے ہیں لیکن یہ خیال نہیں کرتے کہ اس طریقے سے اُس نے ہزاروں آدمیوں کی جان بچا دی اگر مراد بخش کو خاموشی سے گرفتار نہ کیا جاتا تو باہم کشت و خون ہوتا۔ نہ معلوم کتنے سپاہی مارے جاتے کتنی عورتیں بیوہ ہو جاتیں اور کتنے بچے یتیم۔ اس کے علاوہ آزمودہ کار سپاہیوں کی موت سے فوج کمزور ہو جاتی اور اس کا نتیجہ نہ معلوم کیا ہوتا۔ غرض بادشاہ کی نیت نیک تھی، گو بظاہر اس پر دھوکہ دہی کا الزام دیا جاتا ہے لیکن درحقیقت وہ ثواب کا مستحق ہے۔ یہ مثال غلط فہمی رفع کرنے کی غرض سے پیش کی جاتی ہے۔ کسی بادشاہ کی طرفداری کے لئے نہیں۔

اس کے بعد تاریخ کو درست سمجھنے کے واسطے دیکھنا چاہیئے کہ :

(۶) بادشاہ کے انتظامات سے رعایا کے رسم و رواج عادات و خیالات میں کیا تبدیلیاں ہوئیں ؛

(۷) اس کے مصاحبین و ہمنشین کس قسم کے پیدا ہوئے ؟

(۴) ورثائے سلطنت کی تربیت کس قسم کی ہوئی اور وہ سلطنت کا بار اٹھانے کے قابل کس طرح بنائے گئے یا اُن کی تربیت میں کیا خامی رہ گئی اور کیوں؟ اور

(۵) بادشاہ کے انتظامات کا اُن پر کیا اثر پڑا جس کے باعث وہ تخت نشین ہونے پر کامیاب یا ناکامیاب رہے

بدقسمتی سے اس قسم کی کتابیں موجود نہیں ہیں نہ اساتذہ کا طریقہ تعلیم ہی درست ہے۔ ایک معلم کسی بادشاہ میں تمام دنیا کی خوبیاں پاتا ہے تو دوسرا تمام خرابیاں۔ یہ تعلیم نہیں بلکہ طلبہ کو دھوکا دینا ہے اور ہندو مسلم منافقت پیدا کرنا۔ غیر متعصب ہندو مسلم مصنف اپنی جدید تصنیفات سے طلبا کو صحیح نتیجہ پر پہونچنے کا موقع دے سکتے ہیں لیکن اصلی کام اُستاد کا ہے کہ وہ نہایت ایمانداری سے طلبا کو صحیح نتیجہ پر پہونچا دے۔

ایک امر نہایت ضروری ہے تاریخ کی ابتدائی تعلیم میں طلبا کو بادشاہوں کے حالات کہانی کے طور پر بتانا چاہئیے اور تعلیم کو دلچسپ بنانا چاہئیے لیکن کسی کے عیوب بتانے سے ذرا دیر میں دلچسپی نفرت سے تبدیل ہو جاتی ہے اور جس کے عیوب بتائے جاتے ہیں اس کا حال پڑھنے یا سننے کو دل نہیں چاہتا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طلبا کو سبق ہی سے نفرت ہو جاتی ہے اور وہ اُس پر توجہ نہیں کرتے۔ اس لئے ابتدا میں کسی بادشاہ کے عیوب نہ بتائے جائیں بلکہ اُس کی خوبیاں ظاہر کی جائیں تاکہ طلبا اُس کے زیر اثر خود بھی نیک اور ہمدرد بننے کی کوشش کریں اور ہندو مسلم منافقت پیدا نہ ہو۔

(۶) ہندی اُردو کا قضیہ بالکل فضول اور بے معنی ہے۔ موجودہ شکل میں نہ اُردو ہندوستانی زبان کہلانے کی مستحق ہے نہ ہندی۔ اُردو داں اصحاب ہندی الفاظ کو گنواروں کی بولی (slang) سمجھتے ہیں۔ اور اُن کے استعمال کو غیر فصیح خیال کرتے ہیں۔ اس کے خلاف ہندی داں سنسکرت کے مشکل الفاظ کو اُردو یا فارسی کے مستعمل الفاظ پر ترجیح دیتے ہیں۔ اور حتی المقدور عبارت کو غیر مانوس الفاظ سے بھر دینا فصاحت و بلاغت خیال کرتے ہیں۔ حالانکہ ہندوستان کے سربرآوردہ مصنفین اور نامی گرامی شعرا مثلاً حالی، سر محمد اقبال و تلسی داس جی وغیرہ نے ہندی، اُردو اور عربی فارسی، سنسکرت الفاظ کو اس خوبی سے جا بجا چسپاں کیا ہے کہ گویا عبارت میں جان ڈال دی۔ اُن کی یہ تحریرات ضرور ہندوستانی کہلانے کی مستحق ہیں۔ خاصکر مولانا الطاف حسین حالی کی مناجات بیوہ اور امیر خسرو کی خالق باری کی زبان یقیناً اُردو یا ہندی کے بجائے ہندوستانی زبان ہے۔ تلسی داس جی نے رامائن میں غنی غریب، عبیر، صاحب دغیرہ وغیرہ بہت سے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ مولانا حالی نے قریب قریب ہر نظم میں ہندی الفاظ کو استعمال کیا ہے۔ اُن کا مشہور ترکیب بند جس کو انھوں نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس بمقام میں سنایا تھا اور جس کا پہلا شعر یہ ہے:

زمانہ دیر سے چلّا رہا ہے اے مسلمانو | کہ ہے گردش میں میری غیب کی آواز پہچانو

جابجا ہندی الفاظ سے بھرا ہوا ہے۔ آخر میں کالج کے اسٹاف کی فرداً فرداً خوبیاں مولانا نے اسی ترکیب بند میں ظاہر کی ہیں مثلاً علامہ شبلی کی بابت لکھا ہے:۔

ادب اور مشرقی تاریخ کا ہو دیکھنا مخزن — تو شبلی سا وحید عصر یکتائے زمن دیکھیں

ور آخر میں سر سید احمد خاں کے بارہ میں چند اشعار تحریر کئے ہیں۔ مثلاً

ہم اُن کے بعد دیکھیں گر ترقی اپنے بچوں کا — تو اک بچوں سے بڑھکر زندہ دل پیر کہن دیکھیں
خوشی یہ ہے کہ میں صحت میں ہماری ہیں کھونگئے ہیں — اُسے جب آ کے دیکھیں قوم کی دُھن میں مگن دیکھیں

ناظرین دوسرے شعر پر غور فرمائیں تو معلوم ہوگا کہ خاص ہندوستانی زبان میں ہے۔ جس میں ہندی اور اُردو الفاظ مناسب موقع پر چسپاں ہیں اور ہندی الفاظ نے شعر میں جان ڈال دی ہے منشی مواری لال شعلہ مرحوم نے اپنی کتاب بزم برندابن میں ہندی اور اُردو کے الفاظ یکجا کرکے دلچسپی اور اثر کو دوبالا کر دیا ہے:۔ مثلاً

عجیب ہے کچھ مری حالت کا اظہار — سراسر ہوں ادھم پاپی گنہ گار
بُرا وہ وقت ہے جس کا کہ ڈر ہے — سماں یہ ہے کہ جو پیش نظر ہے
جب آ کے آنکھ میں دم پران پیارے — لگا ہو دھیان چرنوں میں تمھارے
اگر اِس جسم کا آخر میں سماں ہو — مرا مرنا حیات جاوداں ہو
دوشالے کی عوض ہو برج کی دھول — پڑیں اُترے ہوئے سنگھار کے پھول
ملے چلنے کو لکڑی برج بن کی — بنے اکسیر نوں پھونک کر بدن کی
نہیں ہوں مانگنے لائق کسی طور — مجھے کیا چاہیئے اس کے سوا اور
وہی جھانکی سری رادھا رمن کی — وہی دو ہاتھ بھومی برج بن کی
نہیں میرا عملہ گوہر فشانی — مگر کچھ پریم کا آنکھوں میں پانی

غرضیکہ اُردو زبان میں ہندی کے مروج الفاظ کا استعمال ایک قسم کی صلاحیت خوبی اور فصاحت کا باعث ہوگا اور اُس وقت وہ ضرور ہندوستانی زبان کہلانے کی مستحق ہوگی۔ اس کے واسطے یہ امر نہایت ضروری ہے کہ ہندوستانی زبان کی ایک مبسوط لغت تیار کی جائے جس میں اُردو اور ہندی کے مترادف الفاظ موجود ہوں اور اساتذہ کو اُس کے استعمال پر مجبور کیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی موجودہ اُردو و ہندی کتب تعلیم سے خواہ مضامین اخذ کرکے علیحدہ ہندوستانی کورس تیار کئے جائیں یا اُردو اور ہندی دونوں کی تعلیم پر طلبا کو ترقی دی جائے۔ اور جو طلبا بوقت امتحان دونوں میں کامیاب

ثابت ہوں اُن کو درجہ بڑھایا جائے۔ اُردو ہندی رسم الخط میں تبدیلی کی چنداں ضرورت نہیں بلکہ اس کے بجائے اگر ہندی کتب تعلیمی کو اُردو رسم الخط میں اور اُردو کتب کو ہندی حروف میں بھی طلبا رو اساتذہ کی آسانی کی غرض سے طبع کردیا جائے تو کچھ مضائقہ نہیں۔

میرے یہ خیالات پاینئر بابت یکم مئی ۱۹۳۴ء میں شائع ہوئے تھے اور ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو اور ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد نے ان کو پسند فرمایا ہے، بلکہ مہاتما گاندھی نے بھی ان پر توجہ فرمائی ہے، اور یہ امر باعث مسرت ہے کہ ڈاکٹر راجیندر پرشاد اور مولانا عبدالحق صاحب کی باہمی تجاویز سے اس کے متعلق کارروائی کی جا رہی ہے۔

(۳) بعض ہندو مسلم اخبارات کی ذریدہ دہنی نہایت قابل افسوس ہے۔ اس کی دو وجوہ ظاہر ہیں، یعنی اول اڈیٹر اور اسٹاف کی بے لگامی، دویم ناظرین اخبار کا بے لگام شوق۔ اخبارات دل شکن مضامین لکھ لکھ کر ناظرین میں اُسی قسم کا شوق اور مذاق پیدا کر دیتے ہیں، اور پھر اس خوف سے کہ اگر اس قسم کے چٹ پٹے مضامین نہ لکھے گئے تو خریداروں کی تعداد کم ہو جائیگی دلشکن تحریرات پر مجبور ہوتے ہیں۔ اس طرح بدی کا دائرہ (Viciaus circle) پیدا ہو کر ہندو مسلم منافرت ترقی پاتی ہے، جو ملک کے زوال کا یقینی باعث ہے۔ میری رائے میں اس کا علاج یہ ہے کہ اڈیٹوریل اسٹاف میں اگر اڈیٹر ہندو ہو تو نائب اڈیٹر مسلمان، اور اگر اڈیٹر مسلمان ہو تو نائب ہندو۔ اس طرح نہ صرف اسٹاف کی بے لگامی ایک حد تک کم ہو گی بلکہ ملازمت حاصل کرنے کی غرض سے مسلمانوں کو ہندی اور ہندوؤں کو اُردو تعلیم کا شوق پیدا ہوگا، اور ہندی و اُردو ہندوستانی زبان کی صورت اختیار کریں گی۔ اخبارات کی وقعت بڑھ جائے گی اور اتحاد میں ترقی ہوگی۔ لکھنؤ کا اودھ اخبار غالباً ساٹھ برس یا اس سے زیادہ عرصہ سے جاری ہے، اس کے مالک ہندو ہیں لیکن ہیڈ اڈیٹر عرصہ تک مسلمان رہے ہیں۔ اسی باعث اخبار کی وقعت معزز ہندو و مسلم ناظرین میں یکساں ہے۔ اور اکثر معزز رئیس و تعلقدار صاحبان اس کو شوق سے پڑھتے ہیں۔ اگر باقی اخبارات و رسالہ جات کے مالک اس کی پیروی کریں اور ہندو اور مسلمان دونوں کو اسٹاف میں مقرر فرمائیں تو بہت جلد ہندو مسلم منافرت کی بلا سے آزادی ممکن ہے۔

رُباعی

کیا موت کو مانگتا ہے آئیگی وہ کیا زیست کو روتا ہے کہ جائیگی وہ
اصلاح خیال و طبع لازم ہے جگر جنت تیرے لئے بنائیگی وہ

جگر بسوانی

حافظ شیرازی کی ایک غزل

ہندستانی زبان میں

(از مسٹر مقبول حسین احمد پوری بی اے ایل ایل بی)

اگر آں ترکِ شیرازی بدست آرد دلِ ما را — بخالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

نینہ نگر کے موہن پیارے اب جو کہیں مل جائیں گے — انکے کومل چرنوں پر بنگالہ دیس چڑھائیں گے

بدہ ساقی مے باقی کہ در جنت نخواہی یافت — کنارِ آبِ رکناباد و گلگشتِ مصلےٰ را

ساقی بھر دے پریم کا پیالہ، پیا نہ تو پچھتائیں گے — سورگ میں پریم کے رس کی بہتی گنگا کہاں سے لائیں گے

فغاں کیں لولیانِ شوخ و شیریں کارِ شہر آشوب — چناں بردند صبر از دل کہ ترکاں خوانِ یغما را

رام دہائی ان بانکی اور چنچل[1] چتون والوں سے — پریت کا بھوگ سمجھ کے دل سے یہ دھیرج لیجائیں گے

ز عشقِ ناتمامِ ما جمالِ یار مستغنی است — بہ آب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را

روپ رنگ سیندور ٹیکے سے کام نہیں سندرتا کو — اپنا ادھورا پریم دھیان میں ساجن کبھی نہ لائیں گے

حدیث از مطرب و مے گو و رازِ دہر کمتر جو — کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معما را

بول نچن سنگیت اور مدھ کے ٹوہ نہ لے اس جیون کی — جیون بھید کھلن نہیں چاہے ہمیں سر نہ کھپائیں گے

من از آں حسنِ روز افزوں کہ یوسف داشت دانستم — کہ عشق از پردۂ عصمت بروں آرد زلیخا را

سندر مکھڑے والے کنھیا کی سندرتا کو سمجھا — برج دلیش کی بیاکل رادھا کو وہ پل میں رجھائیں گے

نصیحت گوش کن جاناں کہ از جاں دوست تر دارند — جوانانِ سعادتمند پندِ پیرِ دانا را

یہ اپدیش سنو جی ساجن دھیان دھرو اس پر دل سے — شبد بڑے بوڑھوں کے تمکو اتم گیان سکھائیں گے

بدم گفتی و خورسندم عفاک اللہ نکو گفتی — جوابِ تلخ می زیبد لبِ لعلِ شکر خا را

مجھکو برا کہتے ہو، خوش ہوں، ٹھیک ہے ایشور چھما کرے — کڑوے شبد منوہر مکھ سے مصری گھول پلائیں گے

غزل گفتی و در سفتی بیا و خوش بخواں حافظ — کہ بر نظمِ تو افشاند فلک عقدِ ثریا را

مہاکوی حافظ کی کویتا لڑی گندھی ہے موتی کی — اس پہ نچھاور ہونے کو آکاش سے تارے آئیں گے

---

[1] محبوبانِ مجازی

آغوشِ سکوں

(از حضرت ثاقب چکوالی بی اے ایل ایل بی)

ایک مدت ہو گئی ہے تجھ سے منہ موڑے ہوئے
ایک مدت ہو گئی ہے تیرا در چھوڑے ہوئے

ایک مدت ہو گئی ہے ٹھوکریں کھاتے ہوئے
ایک مدت ہو گئی ہے دل کو بہلاتے ہوئے

ایک مدت ہو گئی کھوئے ہوئے تسکینِ دل
ایک مدت ہو گئی بھولے ہوئے آئینِ دل

دفعتاً کس شوق سے لپکا تھا دنیا کی طرف
تیری گودی سے نکل بھاگا تھا دنیا کی طرف

چھوڑ کر تجھکو اُسی کا ہو گیا دیوانہ وار
اُس کی خدمت میں کٹے کتنے مرے لیل و نہار

میں اُسی کا بندۂ بے دام ہو کر رہ گیا
طائرِ آزاد رہنِ دام ہو کر رہ گیا

جس میں تھی انجمِ جذبات کی تابندگی
گلشنِ تخئیل کے تازہ گلوں کی زندگی

میں نے اُمیدوں کی دنیا میں بسایا تھا اُسے
اپنے ارمانوں کی شہزادی بنایا تھا اُسے

میں نے پہنایا تھا اُس کو تاجِ صد رنگِ خیال
میں سمجھا تھا اُسی کو معنیٔ حسن و جمال

درحقیقت بھول تھی میری، خیالِ خام تھا
میں اسیرِ حلقۂ جادوگرِ ایام تھا

وہم کو سمجھا حقیقت، میں حقیقت کو جنوں
جوئے شیر اس کو سمجھ بیٹھا جو تھا دریائے خوں

زندگی کو خواب سمجھا اور حقیقت خواب کو
مفت کھویا وقت ایسے گوہرِ نایاب کو

یاد پھر آئی ہے گھر کی پھر سکوں کی ہے تلاش
مر رہا ہوں پھر وہی دن لوٹ کر آ جائیں کاش

خواب پھر دیکھوں وہی جس پر ہے بیداری نثار
آخری دم تک رہے گا جس کا مجھکو انتظار

خواب اچھا تھا کہ بیداری سے گھبرایا ہوں میں
چیز جو جان دیکے لی تھی، بیچنے آیا ہوں میں

پھر ہوں طالب کیفِ آغوشِ سکوں پرور کا میں
کیا کہوں لوٹا ہوا ہوں رہزنِ درہبر کا میں

چچا چھکن کا وارث

از پروفیسر دیوندر دت کٹاریہ ایم۔ اے

(۱)

سیٹھ چھکن لال کو لکشمی نواس میں رہتے عرصہ گذر چکا تھا، یہیں پیدا ہوئے یہیں پروان چڑھے، یہیں نرم نرم گدیوں پر بیٹھ کر انھوں نے اتار چڑھاؤ دیکھے اور یہی کھاتے میں حسب منشا تغیر و تبدل کرتے ہوئے انھوں نے اپنی تجارت کو اتنا فروغ دیا کہ آج دروازے پر ہاتھی جھومتا تھا۔ کئی منیب کام کرتے تھے اور نوکر چاکر اور اونگھنے والے دربانوں کا بھی ٹھٹھ لگا رہتا تھا۔ مگر آج سیٹھ جی جو کئی دنوں سے بیمار تھے اس دار فانی سے کوچ کرنے والے تھے۔ زر سے انسان دنیا کی بڑی سے بڑی نعمت خرید سکتا ہے مگر موت کے فرشتے کو کوئی نہیں خرید سکا۔ ان کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا، ہاتھ پاؤں پر سوجن آ گئی تھی۔ تجارت کو فروغ دینے والا دماغ اب تو خیال سے بھی خالی تھا۔ کاروباری دنیا میں تہلکہ مچا دینے والے ہاتھ بے سکت ہو چکے تھے۔ چاروں طرف تاریکی اور پژمردگی چھائی ہوئی تھی

دن رات باہم بغلگیر ہو رہے تھے۔ آفتاب جمنا کے پار درختوں کی اوٹ ڈھونڈھ رہا تھا۔ موٹروں کی آوازیں بھی خاموش ہو رہی تھیں۔

"کیا لڑکے آ گئے؟" بھرائی ہوئی آواز میں سیٹھ جی نے دریافت کیا اور بے نور آنکھوں میں قدرے روشنی سی آ گئی۔

"[illegible] بھتیجے صاحب تو آ گئے ہیں، وہ [illegible] ......"

اس [illegible] دلکش آواز کو سن کر چھکن نے بے صبری سے کہا:

[illegible] یا تو تینوں ساتھ آئیں یا پھر میں کسی سے نہ ملوں گا۔ میں ان تینوں کی موجودگی ہی میں [illegible] کا فیصلہ کرنا چاہتا ہوں۔ میری جائداد بڑے گاڑھے پسینے کی کمائی ہے۔ میں خود آنکھوں سے دیکھ کر [illegible] مستحق سمجھوں گا اسی کو دونگا، جب سب آ جائیں تو میرے پاس لے آنا ورنہ نہیں۔"

"[illegible] شاید صبح تک سب آ جائیں گے۔"

"اچھا پریشیور مجھے تب تک ...... "
جھکی ہوئی آنکھیں نیم بیہوشی کے عالم میں محو خواب ہوگئیں، اور بوڑھا سیٹھ خراٹے لینے لگا۔

(۲)

ہوا کی شیشیوں کو توڑنے سے رکھا چمپا گول کمرے میں آگئی جہاں سریندر کمار کی متجسس نگاہیں اُس کی راہ دیکھ رہی تھیں۔ سریندر جوان رعنا تھا، مگر اُس کے لباس سے بے پروائی اور غربت مترشح تھی انگریزی وضع کی ٹوپی کے نیچے گھنگھریالے بال اُس کی شان شخصیات کو دوبالا کر رہے تھے!

"آخر تشریف لے آئیں!"

ہاں آتی کیوں نہ، مگر کوئی امید افزا بات طے نہیں ہوئی، آپ کے چچا جان آپ سے اُس وقت ملیں گے جب آپ کے دوسرے بھائی بھی آجائیں"

"اچھا کوئی مضائقہ نہیں مگر کہیں بڈھا ڈھلک نہ جائے۔"

چمپا کو سریندر سے محبت تو تھی، مگر یہ بے موقعہ بے تکلفی اُسے ناپسند ہوئی۔

جو دو گھڑی کا مہمان ہے اُس کی شان میں ایسے الفاظ زیبا نہیں"

"بیشک زیبا تو نہیں مگر میں بھی مجبور ہوں، ریا کار میں نہیں کہ جھوٹا افسوس ظاہر کروں۔ چچا صاحب پرلے سرے کے کنجوس ٹھہرے، جب وہ چل بسیں گے تو دو ایک کلمۂ خیر بھی ان کے حق میں کہہ دونگا، لیکن یہ ریاکاری مجھ سے نہ ہوگی کہ اُن کی موت پر بناوٹی آنسو بہاؤں، یہ وہی تو ہیں جنھوں نے مجھے محض اس بات پر دھتکار دیا تھا کہ میں نے ان کی سود خواری کی آمدنی کو اچھا نہ سمجھا تھا، لیکن اگر میں کھسیانا منہ بنالوں یا جھوٹا رنج دکھاؤں تو کیا تم اسے پسند کرو گی؟"

چمپا بھی اس کی صاف گوئی اور سچائی کی معترف تھی، امیر کا یہ کنگال بھتیجا، یہ بانکا بیلا نوجوان جس کے چہرے سے ہمیشہ صداقت ٹپکتی تھی، جو کرایہ کے مکان میں رہ کر تصویریں بناتا تھا اور سرد بازاری کے باوجود اپنی دُھن میں لگا تھا۔ اس بانکے نوجوان کی صداقت نے چمپا کے دل میں گھر کر لیا تھا۔!

سریندر نے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا "اگر چچا جان اپنا تمام ترکہ مجھکو دے جائیں جس کی ایک کوڑی بھی اُنھوں نے اپنی زندگی میں نہیں دکھائی تو میں اُن کا شکریہ ادا کرونگا، مگر افسوس مجھ سے خواہ مخواہ بیزار رہے! میں صدق دل سے چاہتا تھا کہ میرے بھائی ان کی دکانوں کا انتظام کریں اور میں اُن کی خدمت کروں، اس طرح تم سے بھی مل بیٹھنے کا .... "

الفاظ درد اور اثر سے پُر تھے، اس طعن و تشنیع میں رنج کی بھی جھلک تھی، مگر چمپا نے زندہ دلی سے کام لیا

"اچھا تو اب آپ مجھے جانے دیں، ابھی مجھے کئی کام کرنا ہیں"
سریندر: "آہ یہ گھر کے کام دھندے تو ہوتے ہی رہیں گے۔ کیا میں ایک بار پھر پوچھ سکتا ہوں کہ زندگی کی کشمکش میں ہم تم ایک کیوں نہ ہو جائیں؟"
چمپا نے پہلے کی طرح شانہ ہلا کر جواب دیا "اجی یہ دنیا داری کی باتیں۔ ہٹنے دیجئے"
جب چمپا اٹھ کر چلی آئی تو اُس نے دل ہی دل میں کہا کہ "اگر میں ہاں کروں تو دنیا یہی کہے گی کہ دولت کی خاطر ہاں کی۔"

(۳)

کالی چرن کلکتہ میں شکر کے کارخانے کا منیجر تھا، اور بنداسرن کراچی میں سیمنٹ کے کارخانے کا۔ دونوں دوسرے دن صبح نو بجے دہلی پہونچے۔ اسٹیشن پر سریندر اُن کے استقبال کے لئے موجود تھا۔ دونوں نے نفیس اپ ٹو ڈیٹ سوٹ زیب تن کئے تھے۔ اور ان کی شکل و شباہت بھی اس طرح ملتی تھی گویا ایک سیب کے دو ٹکڑے ہیں۔ سریندر نے انھیں مدتوں کے بعد دیکھا تھا اسلئے یہ نہ جان سکا کہ ان میں کون بنداسرن ہے اور کون کالی چرن اُس نے دونوں کے نام پوچھے۔
بنداسرن بولا: "بھئی اس میں تو کوئی شک نہیں کہ تم ہم دونوں سے نرالے ہو" یہ سریندر کے لباس پہ چوٹ تھی جس پر کالی چرن نے اضافہ کیا "اور آپ کام کیا کرتے ہیں؟"
موٹر میں سوار ہوئے تو کالی چرن نے کہا "سریندر! چلو تم آگے بیٹھ جاؤ، تمھارے کوٹ میں پہلے ہی سے شکنیں پڑی ہوئی ہیں، اس کے زیادہ خراب ہونے کا اندیشہ نہیں" بندو! ہم تم پیچھے بیٹھیں گے! کھڑکیاں کھول دو، دہلی والوں کو معلوم تو ہو جائے کہ کوئی آیا ہے!"
ڈرائیور کو لکشمی نواس چلنے کی ہدایت ہوئی، اور گاڑی تیزی سے چلنے لگی .....
سریندر اپنے ان بھائیوں کو "مہاجن بھائی" کے لقب سے ملقب کرتا تھا۔ بہرحال ان دونوں نے اس کے لباس کا خوب غور سے معائنہ کیا، کوٹ کے بٹن نہ تھے، پتلون میں کئی پیوند لگے تھے، ٹائی تھی تو ضرور مگر بار بار جھلنے سے اُس کا رنگ بھی پھیکا پڑ گیا تھا۔ ان کی نظریں ملیں تو کالی چرن نے کہا، "سریندر! تم کہاں رہتے ہو تمھیں تو سب باتیں معلوم ہونگی، آخر کیا معاملہ ہے؟"
"چچا جان تو دو ہی چار گھڑی کے مہمان ہیں"
اس کی طرز گفتگو میں متانت بھی تھی اور درد بھی تھا۔
بندا: "اچھا تو جائداد کا کیا ہوا؟ یہی تو سوال ہے!"

سریندر نے جواب دیا: "مجھے کچھ علم نہیں"

مہاجن بھائیوں نے نگاہوں ہی نگاہوں میں ایک دوسرے کے دلی جذبات کو بھانپنا چاہا۔

کالی: ہمیں تو یہ اطلاع ملی ہے کہ وہ ہم تینوں کا امتحان لیں گے، اور اس کے بعد جس کو پسند کریں گے وارث بنائیں گے، ٹھیک ہے نہ؟"

سریندر: "شاید ایسا ہی ہو، تو کو ٹھی آ گئی"

بندا: "ذرا ایک منٹ، پیشتر اس کے کہ ہم لوگ چچا صاحب سے ملیں کالی چرن اور میں تم سے کچھ تصفیہ کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں ایک ترکیب سوجھی ہے!"

سریندر نے دونوں کے چہروں پر نگاہ ڈالی، وہ حیران تھا کہ دیکھئے کیا گل کھلتا ہے؟

کالی: "جب تک چچا جاگیں آؤ ذرا چائے پی لیں"

چنانچہ تینوں بھائی میز پر بیٹھ گئے، اور چائے نوش کرنے لگے۔

بندا کا اشارہ پا کر کالی نے کہا: "ہم بنیوں کا تو اصول یہی ہے کہ بات جتنی مختصر ہو اتنی ہی اچھی۔ اس سے رائطہ نہیں بڑھتی، بڈھا لالہ تو ہم میں سے صرف ایک ہی کو اپنا وارث مقرر کرنا چاہتا ہے اور باقی دو کو کوڑی بھی نہیں دینا چاہتا، اس لئے ہر ایک کو تین چانس میں صرف ایک ہی ملتا ہے۔"

"واقعی"

"اچھا، تو بندو اور میں نے تو ساجھا کر لیا ہے، تم بھی چاہو تو اس ساجھے میں شریک ہو جاؤ۔"

"یہ کیسے؟"

بندا نے اپنچی کیس میں سے تین ٹائپ شدہ کاغذ نکالے اور کہا "اس طرح" "یہ ہے ہمارا اقرارنامہ (پڑھتے ہوئے) ہم اقرار کرتے ہیں کہ چچا چھکن لال کی وصیت کی رو سے جتنا ورثہ جس کو ملے وہ ہم برابر برابر آپس میں تقسیم کر لیں گے۔ ہم تینوں اس پر دستخط کر کے نقصان سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ تم متفق ہو نہ......"

سریندر کو تجارتی معاملات کا کوئی تجربہ نہ تھا، اس تجویز کو سمجھنے میں اسے دقت لگا، مہاجن بھائیوں نے اس کی اور وضاحت کی: "موجودہ صورت میں ہم میں سے دو کو چچا کے ترکہ میں سے کچھ نہ ملے گا، لیکن اس اقرارنامہ کو ہم لوگ منظور کر لیں تو ایک تہائی رقم تو ضرور مل جائیگی"۔ سریندر سوچ رہا تھا اور مہاجن بھائیوں کی شوق بھری نگاہیں اس کے چہرے پر لگی ہوئی تھیں۔

"کیوں جی! پسند ہے نہ!"

"تو پھر ان تینوں کاغذوں پر دستخط کردو۔"

"اور ہم بھی دستخط کئے دیتے ہیں!"

میز پر اقرارنامے رکھ دیئے گئے اور قلم دوات بھی۔ مگر سریندر نے کہا:

"نہیں، نہیں، مجھے منظور نہیں!!!"

"کیا پاگل ہو گئے ہو؟"

"آخر انکار کی وجہ؟"

"نہیں۔ نہیں، یہ کسی طرح مناسب نہیں کہ ہم بچا کو ان کے مرتے وقت دھوکا دیں، انصاف اور ایمانداری دونوں کا تقاضا ہے کہ ہم بڈھے کو دھوکا نہ دیں۔"

مہاجن بھائیوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر سریندر کے پیچھے پڑ گئے۔

"کیا تمھارے دماغ میں فتور ہے؟ کیا تم اتنے تارک الدنیا ہو کہ تمھیں دولت کی کوئی پرواہ نہیں کیا تمھارے دل میں یہ سمائی ہے کہ فنِ مصوری سے تمھیں کوئی دولت مل جائیگی۔ بہرحال آیندہ کبھی ہمارے آگے دستِ سوال دراز نہ کرنا اور اپنے بالاخانے ہی پر پڑے سڑتے رہنا۔"

(۴)

مہاجن بھائیوں نے بیچارے سریندر کو خوب آڑے ہاتھوں لیا۔ مگر جس قدر انھوں نے زیادہ کوشش کی اسی قدر وہ زیادہ اکڑ گیا۔ اس کی نگاہوں میں بھائیوں کی ضد بے جا اور عقل سے بعید تھی۔

بندا سرن اب کے نرم لہجہ میں بولا "بھائی سریندر ہم تمھارے دل کو اب بھانپ گئے"

"اس کا مطلب؟"

کالی چرن، "تم کتنے بھولے بھالے بنتے ہو، میں تو تمھیں اتنا چالاک نہیں سمجھتا تھا۔"

بندا سرن: "اور نہ میں تمھاری ہوشیاری کو پا سکا۔"

سریندر اور زیادہ برہم ہوا، اور بھائیوں سے ایک بار پھر مشورہ چاہا۔

بندا سرن: ہم دونوں تو کلکتہ اور کراچی میں بچا جان کے کام میں لگے رہے، اور تم یہاں دہلی میں تھے کہیں بڈھے کو منانے کا تو موقعہ نہیں مل گیا، اور وصیت تو نہیں لکھا لی ہے، پھر ہمیں ذلیل کرنے کے لئے یہ ڈرامہ کھیلا جارہا ہے۔"

کالی چرن: "کیوں حضرت! خوب دھوکا دے رہے ہو!"

اِن الفاظ نے سریندر کے شیشۂ دل پر نوکِ سنان کا کام کیا، مگر پھر بھی وہ ہنسکر بولا:

"یہ سفید جھوٹ ہے، نہ میں چچا سے کبھی ملا اور نہ میرے پاس کوئی وصیت نامہ ہے، میرا چانس تم سے کسی طرح زیادہ نہیں"

"اس کا ثبوت؟"

"ہاں ہاں، اس کا ثبوت؟"

"بھلا میں اس بات کو ثابت کیسے کروں!"

اقرار نامے پھر آگے دھرے گئے "تو بس ان پر دستخط کردو"

"ہاں دستخط کردو، ورنہ ...."

صداقت پسند سلامت رو مسٹر ہینڈر نے اب دونوں پر نگاہ ڈالی کہ دونوں غصہ سے لال ہو رہے تھے پھر اس نے تینوں اقرار ناموں پر دستخط کر دیئے۔ اور ایک اقرار نامہ اپنی جیب میں ڈال لیا اتنے میں ایک نوکر نے آکر اطلاع کی کہ سیٹھ صاحب نے آپ لوگوں کو یاد کیا ہے۔

(۵)

چھکن لال بستر مرگ پر استقلال کے ساتھ دم واپسیں کا انتظار کر رہے تھے، وہ محسوس کر رہے تھے کہ شاید ہی رات بھر کی مہلت ملے، چمپا کی طرف اپنا سر سرکایا۔ آنکھ کے اشارے سے وہ ان کے دلی جذبات کو بھانپ گئی۔ اس نے نہایت سنجیدگی سے اطلاع کی کہ "لڑکے آ گئے ہیں" اور تینوں کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ تینوں بھائی بستر کے ارد گرد آ کھڑے ہوئے کالی چرن اور بندا سرن اپنے نفیس سوٹوں میں ملبوس تھے ہی، ان کے چہرے سے سنجیدگی ترشح ہوتی تھی۔ بیچارہ مسٹر ہینڈر وہی دقیانوسی کوٹ پہنے ہوئے تھا، جس پر ان رنگوں کے داغ بھی تھے جن سے وہ نقاشی کیا کرتا تھا۔ اس کا چہرہ بھی حسب معمول پژمردہ تھا۔

بڈھے سیٹھ نے جو چراغ سحری کی طرح ایک آدھ جھونکے کا منتظر تھا، دھیمی آواز سے بولا:

"عزیزو، میں نے تمھیں اس لیئے بلایا ہے کہ تمھیں جی بھر کر آخری بار دیکھ لوں، تمھارے خیالات بھی جاننا چاہتا ہوں، یہ کمبخت دولت کسی کے ساتھ نہیں جاتی ہے، آخر اسے کسی نہ کسی کو سونپنا ہی پڑے گا یہ بتاؤ کہ تم کو مل جائے تو کیا کرو گے؟" کالی چرن! اگر میں تمھیں یہ ساری دولت سونپ دوں تو تم کیا کرو گے؟"

کالی چرن کا دل بلیوں اچھلنے لگا، کالر کو داہنے ہاتھ کی انگلیوں سے سرکا کر (جن کے ناخن سلیقہ سے کٹے ہوئے تھے) بولا:

"چچا جان آپ ابھی سے ہی رخصت کی بات چیت کرنے لگے، ہم تو چاہتے ہیں کہ ابھی ...

دستِ شفقت ہمارے سروں پر رہے۔ مگر آپ کے فرمان کے مطابق اگر مجھے یہ خزانہ مل جائے تو میں اسے شکر کی تجارت میں لگادوں اور اس میں خوب اضافہ کروں۔"

بوڑھے سیٹھ نے اب بنداسرن کی طرف متجسس نگاہوں سے دیکھا اور زبانِ حال سے کہا:

"تم بنداسرن!"

بنداسرن نے آہ سرد بھری "چچا صاحب، آپ کو تکلیف میں دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا ہے، دل پر ایک چوٹ سی لگتی ہے، کلیجہ منھ کو آتا ہے۔ بھائی کالی چرن کی طرح میں بھی دست بدعا ہوں کہ آپ جلد شفایاب ہوجائیں۔"

"اگر ایسا نہ ہوا تو......"

"چچا صاحب میں تو سیمنٹ کی تجارت کو فروغ دینے کی کوشش کرونگا۔"

اب بوڑھے سیٹھ نے سریندر کمار سے پوچھا "تمھارا کیا خیال ہے؟"

"چچا جان! میری خواہش آپ سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔ میں اس کو دیر مندرہ کرونگا ور منوری بھی کرتا رہونگا۔"

مہاجن بھائیوں کے چہرے پہ ہلکی سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی، اور وہ دل میں چھتا رہے تھے کہ اس بیوقوف کو خواہ مخواہ ساجھے میں شریک کیا۔ لیکن سیٹھ جی جو نفسیات کے ماہر تھے تاڑ گئے کہ کون ریاکار ہے اور کون صداقت پسند ہے۔

"تو تینوں میں سے دیانتدار تمھیں ہو۔"

———— (۶) ————

سب پہ محویت طاری تھی، سیٹھ جی کا چہرہ زبانِ حال سے کالی چرن و بنداسرن کی ریاکاری پر لعنت بھیج رہا تھا، اور سریندر کی صداقت کی داد دے رہا تھا۔ لمحہ بھر کے توقف کے بعد انھوں نے کہا "کاغذ لے آؤ اور چمپا کو بلالاؤ تاکہ وہ میری وصیت کو لکھ لے اور میں بھی اس پر دستخط کردوں۔"

مصور خوشی سے پھولا نہ سمایا۔

سریندر مصیبت و مایوسی سے اتنا مانوس ہوچکا تھا کہ اس کو یہ خواب میں بھی خیال نہ آسکتا تھا کہ کبھی یہ دن بھی پھریں گے!

[illegible] ن بھائی بھی کم متحیر نہ تھے، مگر اپنی ہوشیاری پر نازاں تھے کہ ہم نے کس طرح اقرار نامے پر دستخط [illegible] تدبر، دُور اندیشی سے کام نہ لیا ہوتا تو اس بڈھے کے آخری فیصلے نے ہمیں برباد کرنے میں

کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی تھی۔

ایک بھائی تو چمپا کے بُلانے کے لیئے دوڑا، دوسرے نے قلم دوات میز پر دھر دی، اور سریندر نے جو عالم حیرت و استعجاب میں کھڑا تھا اپنی جیب سے وہی کاغذ نکالا جس پر اقرار نامہ لکھا ہوا تھا۔

لاغر ہاتھوں نے کاغذ کے اس پرزے کو حسب عادت کھولا، چمپا کے لئے کرسی لانے میں ایک منٹ لگا، اور اس قلیل عرصے میں سیٹھ چھکن لال کی نگاہ اُس تحریر پر پڑی۔

ایک بوڑھے کی جو آواز سُنائی دی بے حد کرخت تھی۔

"یہ کیا مذاق ہے! یہ کیا مذاق ہے!"

لاغر ہاتھ کانپ رہے تھے اور کاغذ کا پرزہ بھی۔

"تم تینوں نے یہ اقرار نامہ لکھا ہے اور آج ہی؟"

کالی چرن نے کاغذ چھیننے کی کوشش تو کی مگر بعد از وقت، بندا سرن نے بڈھے کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لئے کہا "چچا جان! یہ تو محض دل لگی تھی"

"اچھا دل لگی ہی تو اس دل لگی کا خمیازہ اب تم تینوں کو بھگتنا پڑے گا"

چمپا سیٹھ چھکن لال کے کانپتے ہوئے جسم سے چمٹ گئی، اور سریندر سے کہا "دوڑو، پروہت اور ڈاکٹر دونوں کو بُلا لاؤ!"

———————(۷)———————

گھنٹہ بھر سریندر گول کمرے میں بیٹھا رہا، مہاجن بھائی رخصت ہو چلے تھے، وہ اپنی مکاری پر اتنے نہ جھلّائے تھے جتنے کہ سریندر کی بیوقوفی پر برافروختہ ہو رہے تھے۔

کالی چرن: "تمھیں نے سب کو تباہ کر دیا"

بندا سرن: "افسوس قارون کا خزانہ ہاتھ سے جاتا رہا"

سریندر: "نہ میرے پاس کچھ تھا نہ میں نے کچھ کھویا، جیسا پہلے تھا ویسا ہی اب بھی ہوں"

تاہم اس کو بھی رنج ضرور تھا، اور وہ اتنا ضرور محسوس کرتا تھا کہ میں نے تینوں شخصوں کی ہمت کو اپنی غلطی سے برباد کر دیا۔ میری وجہ سے بوڑھے چچا کو یہ خیال ہوا کہ ہم تینوں مکار، ریاکار اور سازشی ہیں، مجھ سا بے وقوف کون ہوگا؟"

آخر دروازہ کھُلا، ڈاکٹر کے چہرے سے معلوم ہوا کہ چراغ سحری ہمیشہ کے لئے بجھ چکا ہے۔ پروہت جی بھی ساتھ تھے، وہ چمپا کو تسلی دے رہے تھے، مگر چمپا زار و قطار رو رہی تھی۔

جب ڈاکٹر اور پروہت چلے گئے تو سریندر چمپا کے پاس آیا اور بولا: "چچا جان کے چل بسنے کا مجھے بہت رنج ہے۔ ان کو میری بیوقوفی سے سخت قلق ہوا ہوگا۔"

چمپا نے کہا "تمھیں تو اس لئے افسوس ہے کہ تمھاری قسمت بنکر بگڑ گئی۔"

"مجھے اس سے انکار نہیں، مگر مجھے زیادہ تر اسی لئے رنج ہے کہ چچا جان کو یہ یقین ہوگیا کہ ہم خود غرض اور ناہنجار ہیں۔"

اس صداقت پر چمپا کے دل کی کلی کھل گئی۔

منہ ہاتھ دھوکر چمپا نے ایک نیلے کنارے کی سفید ساڑی پہنی سریندر کو اس کا نکھرا ہوا حسن بہت ہی بھایا۔

چمپا: سریندر! اب افلاس سے کیسے نپٹو گے؟

سریندر کے چہرے پر اداسی چھاگئی، بولا "میں مصوری کرتا رہونگا اور امید کا رشتہ بھی نہ چھوڑونگا لیکن میں ہمیشہ نادار ہی رہونگا اور ان حالات میں اپنی دلی آرزو پھر کبھی ظاہر نہ کرونگا۔"

چمپا کے رخسار آگ کی تپش سے اور بھی چمک اٹھے "تو کیا اہل ثروت ہی محبت میں کامیاب ہوتے ہیں؟"

سریندر کے چہرے پر پھر امید کی جھلک نظر آئی۔ اس نے پوچھا:

"چمپا! اس سے تمھارا مطلب؟"

چمپا نے سریندر کی طرف دیکھا مگر شرم سے آنکھیں نیچی ہوگئیں، یہ نگاہ ہزاروں الفاظ سے زیادہ معنی خیز تھی۔

سریندر عالم محویت میں تھا اور اس کی زبان سے بے اختیار یہ کلمہ نکلا "چمپا! سچ مچ چمپا"

چمپا کے چہرے کی خوبصورتی کو دو گستاخ زلفیں اور بھی دوبالا کر رہی تھیں۔

"جب میں ایک غریب بھکارن تھی اور تم ایک رئیس کے وارث تھے تو تمھاری یہ آرزو کچھ وقعت نہ رکھتی تھی"

چمپا کی والدہ چائے لائی، چمپا آگ کے پاس سے اٹھ کھڑی ہوئی اور بڑے پیار سے بولی:

"اماں! سنا! سریندر کیا کہتے ہیں؟"

"ہاں بیٹی! تو تم نے کیا جواب دیا؟"

چمپا: "ہاں! ہاں!! ہاں!!!

سر ہینڈرز کے دل پر سے ایک بوجھ سا اُتر گیا۔ وہ کہنے لگا "اب میں مصوری چھوڑ کر کوئی اور ذریعہ معاش اختیار کروں گا۔ اب اسے چھوڑنے میں مجھے کوئی رنج نہیں!"

چمپا: "یہ تو تم نے بڑی اچھی بات کہی مگر سچ کہتے ہو؟"

سر ہینڈرز: "بے شک"

چمپا: "خیر، خیر! تم شوق سے مصوری کرتے رہنا۔"

سر ہینڈرز: "لیکن اس سے ہم دونوں کی گذر کیسے ہوگی؟"

چمپا: "اب نہ آپ ہی کو فکر معاش میں پڑنے کی ضرورت ہے اور نہ مجھکو۔"

سر ہینڈرز نے محسوس کیا کہ اس میں کچھ راز پنہاں ہے، پوچھا

"تو اس سے تمھارا کیا مطلب ہے؟"

چمپا: "آپ کے چچا آپ کا پورا انتظام کر گئے ہیں۔"

"ہیں! کس طرح؟"

"اس طرح کہ جب سیٹھ جی نے تم سب کو وراثت سے محروم کر دیا تو ڈاکٹر اور پروہت کی موجودگی میں یہ سب مال و متاع وہ اپنی خادمہ چمپا یعنی آپ کی محبوبہ کو دے گئے۔"

تیس سال پہلے

زمانہ بابتہ نومبر ۱۹۰۹ء میں سب سے پہلا مضمون "شاہراہ حیات" پر مہاراجہ سر کشن پرشاد صاحب کے۔ سی۔ ایس آئی سابق وزیر اعظم حیدر آباد دکن کا ہدیۂ ناظرین ہوا تھا۔ جس کا مختصر اقتباس درج ذیل ہے:۔

اللہ اللہ انسان بھی عجب طلسمات کا پتلہ ہے بدو شعور کے بعد اسکی ہر آن و دم تک لاکھوں آرزوؤں کی کشمکش میں گذرتی ہے اور اسکی وجہ یہی ہے کہ انسان جب اپنی کسی اُمید کی پیروی میں ہر طرف تگ و دو کر کے تھک جاتا ہے اور مایوسی کا ابر اسکے دل پر چھا جاتا ہے تو ناوک فکر سے زخمی ہو کر بیچین ہو جاتا ہے اور ہزاروں آرزوئیں اور تمنائیں اُمنڈ اُمنڈ کر ہر طرف سے ہوا کرتی ہیں۔ ایسی حالت میں انسان دریائے حیرت میں غرق ہو جاتا ہے اور اسکی سمجھ میں نہیں آتا کہ کس آرزو کو ترجیح دے اور کونسی اُمید کے ساتھ وابستہ ہو جائے۔ کسکی پیاری صورت سے نظر پھیر لے اور کس دلکش [illegible] لبھانیوالی تصویر کو مرکز نظارہ بنالے۔ کسکی مخشر پا کرنیوالی رفتار پر دل و جان کو صدقے کرے۔ جستجو کرے تو کسکی اور کونسا انمول ہیرا ڈھونڈھ کر نکالے۔ بہر حال ایک آئینۂ حیرت آنکھوں کا پردہ بنجاتا ہے اور عقل و حواس بھی اس نظارہ سے وابستہ ہو کر ایک روح ایک قالب [illegible] اسکی لذت اُسی دل سے پوچھئے جو اس منزل کا دلدادہ ہو یا اسکا نشانہ بنا ہو۔ لیکن یہ ساری آفتیں جو ہمارے سر پڑ جاتی ہیں اسکی وجہ [illegible] ہماری نافہمی اور بے دست و پائی ہے اس لئے کہ ہماری زندگی زمانہ کی نیرنگیوں کے ساتھ اس طرح اُلجھی ہوئی ہے جیسے دامن خار [illegible] نظر آئینہ کے ساتھ دنیا کی ہزار دلچسپیوں اور بے شمار دلبستگیوں سے ہر وقت مقابلہ ہوتا ہے اور ہر ایک نیرنگی ہم کو محو حیرت بنا دیتی ہے۔ [illegible] تمیز باقی نہیں رہتی۔

کہ میں ابھی نہیں سمجھا تری خوشی کیا ہے

جو آپ نے کہی ہیں وہ کیجئے ثبوت کیا اُس کا مجھے تو آپ نے کیا کیا نہ آزما دیکھا
یقین آپ نے تو کر لیا ہی ہوا غرض یہ کرنا جو آپ سے نہ بنیں گے وہ امتحاں دوں گا
وفا شریک محبت ہے تو کمی کیا ہے

یہ نفس تو ایسے اور آپ وفہم کا دشمن غضب ہے گھیرے ہوئے مجھکو فکر نارسن
بھٹکتا راہِ تمنا میں ہے یہ اپنا من ابھی کہاں ترے جلوے سے دل ہوا روشن
ابھی موت سے پہلے یہ بیخودی کیا ہے

جنوں کی بات ہے کہہ دی خفا نہ ہو صاحب تمھیں کہو یہ روش کیا ہے اور کیا ہے ڈھب
مجھے تو ہوتا ہے دیکھ اور سُن کے سخت عجب ہر ایک بات پہ چون و چرا کا کیا مطلب
سمجھ میں کچھ نہیں آتا یہ فارسی کیا ہے

خیال کر تو ذرا دل میں اپنے اے غافل فضول بحث سے ہوگا نہ آہ کچھ حاصل
خبر نہیں تجھے اس کی ہے ہو قصد و جدل کبھی نظارۂ بر رو کبھی خیال بدل
ہزاروں روز مسرت ہیں عید ہی کیا ہے

حضور سمجھیں نہ ایسا کبھی خیال ہے خام جو عرض کر رہا ہوں میں نہیں ہے اسمیں کلام
یہ جانتے نہیں کیا ہے حلال کیا ہے حرام شراب و حور کا سُن آئے ہیں کسی سے نام
جنابِ شیخ کو جنت سے آگہی کیا ہے

نہیں ہے آہ شکایت کی اس میں بات کوئی کہوں گا میں تو ہمیشہ مگر خدا لگتی
نہیں ہے راس یہ تقدیر ہی مجھے میری ہوا بگڑ گئی ناپائدار دُنیا کی
ہزار میرے مخالف ہیں، موت ہی کیا ہے

ہزار بار وہ فرما چکے ہیں یہ مجھ سے یہ کس کا منہ ہے مرے آگے جو زباں کھولے
اگر ہے عقل سے بہرہ تو پہلے خود سمجھے پرائے بس میں ہو جو اس کو دل نہیں کہتے
جو مستعار ملی ہو وہ زندگی کیا ہے

فراقی آپ سے کچھ جھوٹ ہم نہیں کہتے بزرگ آتے نظر میں ہیں شاذ ہی ایسے
سنا تھا ذکر ملاقات کو جو ہیں پہونچے بہت ہی خوش ہوئے ہم آج مل کے بیخود سے
خودی کو جو نہ مٹا دے وہ آدمی کیا ہے

تنقید کتب

ارمغانِ بازؔ

ارمغان بازؔ کے نام سے محمد تراب علی خاں صاحب بازؔ حیدرآبادی کا ایک مختصر مجموعۂ کلام شائع ہوا ہے۔ اسکے پہلے جزو میں ایک مختصر سا مقدمہ ہے۔ باقی دو جزو میں حضرت بازؔ کا کلام ہے۔ آخری جزو میں عنایت علی صاحب ہلالؔ قریشی نے کلام بازؔ پر ایک تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ بازؔ صاحب کی شاعری پرانی وضع کی شاعری ہے، مگر کلام سے پختگی برستی ہے۔ ذیل میں چند اشعار نمونتاً درج کئے جاتے ہیں۔ جن سے ناظرینِ زمانہ بازؔ صاحب کی شاعری کا خود ہی اندازہ فرمالیں گے ؎

تعینات کے پردے اُٹھا نہیں سکتے　　خُدا کو دیکھتے ہیں پر دکھا نہیں سکتے

بندہ ہوں کہ اصل میں خُدا ہوں　　سمجھا نہیں آج تک میں کیا ہوں

نہ میں درد سے تڑپتا نہ وہ غمگسار ہوتا　　یہ سکوں کہاں سے مِلتا جو نہ بیقرار ہوتا

طے کئے ہم نے بھی وحشت میں بیاباں کتنے　　ٹوٹ کر پاؤں میں ہیں خارِ مغیلاں کتنے

ایسے دو دن کی بہاروں سے خزاں اچھی ہے　　ہم اُجڑتے ہوئے دیکھے ہیں گلستاں کتنے

چھپتی نہیں کسی کی کبھی شرمسار آنکھ　　دُنیا میں کوئی لاکھ ملائے ہزار آنکھ

ہم نے حضرت بازؔ کے یہ چند اشعار سرسری نظر میں اٹھائے ہیں۔ پانچویں شعر کے دوسرے مصرعہ میں لفظ "ہم" بمعنی "ہمنے" استعمال کیا گیا ہے۔ آخری شعر کے دوسرے مصرعہ میں "لاکھ" کے بعد "ہزار" لایا گیا ہے۔ یہ محاورے کم سے کم شمالی ہند میں مروج نہیں ہیں۔ اس مجموعہ میں غزلوں کے علاوہ بعض مشہور شعرا کی غزلوں تضمینیں بھی ہیں۔ شروع میں بازؔ صاحب کی قلمی تصویر کا ہاف ٹون فوٹو بھی دے دیا گیا ہے۔

تنقیدات عبدالحق

ڈاکٹر مولوی عبدالحق سکرٹری انجمن ترقی اُردو ہماری تعریف و تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ آپ

ملنے کا پتہ:- محمد تراب علی خاں بازؔ "کاشانۂ باز" بازار گھانسی میاں، حیدرآباد دکن۔

ہندوستان کے مسلمان اب تم دو شہور ہندو ہنگئے اردو ہیں۔ اور ہندوستان کے اکثر اہل قلم اپنی تصنیف وتالیف پر آپ سے مقدمہ لکھانا باعث فخر سمجھتے ہیں۔ چنانچہ مولانا نے بہت سی کتابوں کے مقدمے لکھے ہیں اور بہت سی کتابوں پر تنقیدیں کی ہیں جو اس سے پہلے کتابی صورت میں یکجا کر کے شائع ہو چکی ہیں۔ اب انجمن ترقی اردو دہلی نے ان کی دس تنقیدوں کا ایک مختصر سا مجموعہ شائع کیا ہے جو ہماری رائے میں یونیورسٹی تعلیم نصاب میں شامل ہونے کے لائق ہے کیونکہ مولانا جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں تنقید کا حق ادا کر دیتے ہیں۔ اور آپ کی تنقید ہمیشہ مثالی اور سبق آموز ہوتی ہے۔ جس کے مطالعہ سے ہمارے اسکولوں اور کالجوں کے طالبعلموں کو تنقید نگاری کا سلیقہ حاصل ہو سکتا ہے۔ اس کی قیمت بھی معقول رکھی گئی ہے یعنی صرف آٹھ آنہ میں انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی سے پانچ جزو کی ادبی تنقیدوں کی یہ چھوٹی سی کتاب مل سکتی ہے۔

ہندوستان کا دیہی قرض

ہندوستان کی نوے فیصدی آبادی دیہات میں رہتی ہے لیکن سب سے زیادہ زبوں حالت دیہات اور وہاں کے رہنے والے لوگوں کی ہے یہ لوگ بہت تکلیف میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ اگر پیٹ کو روٹی ملتی ہے تو تن کو لتا نہیں اور اگر تن کو کپڑا ہے تو پیٹ کو روٹی نہیں۔ اس کے اسباب ظاہر ہیں کہ ہمارا کھیتی باڑی کا طریقہ دقیانوسی ہے اور کسانوں کی حالت ناگفتہ بہ ہے کیونکہ ان کو قرضداری ہی سے کبھی نجات نہیں ملتی۔ اس قرضداری کے کیا اسباب ہیں؟ اور اس کی ادائیگی کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟ اس موضوع پر اس چھوٹی سی کتاب میں پروفیسر محمد عاقل صاحب ایم۔ اے استاد معاشیات جامعہ ملیہ دہلی نے خوب سیر حاصل بحث کی ہے۔ کتاب بہت مفید اور غور سے پڑھنے کے قابل ہے۔ خصوصاً دیہات کی ترقی چاہنے والوں کو اس کو ضرور پڑھنا چاہئے۔ حجم چھوٹی تقطیع کے ساڑھے تین جزو۔ قیمت چار آنہ۔ ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی

حیات اجتماعی[1]

انسان آپس میں مل جل کر زندگی بسر کرنے کا عادی ہے۔ اسی باہمی میل جول کو انگریزی میں سوشل لائف اور ہندستانی زبان میں سماجی زندگی کہتے ہیں۔ اسی کا وسیع نام تمدن ہے۔ سید اکبر علی ایم۔ اے ایل ٹی نے اس چھوٹی سی کتاب میں سوشل لائف کے تمام ابتدائی مدارج پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ یہ کتاب گویا "سیاست مدن" کی ایک ابتدائی کتاب ہے۔ جس کا مطالعہ نتیجہ خیز اور سبق آموز ہوگا۔ اصطلاحات اور زبان اگر اور زیادہ سلیس اور عام فہم ہوتی تو یہ رسالہ بہت زیادہ مفید ہوتا۔ جو لوگ میونسپل و ڈسٹرکٹ بورڈ اور لوکل سلف گورنمنٹ کے معنی اور غرض و غائت سمجھنا چاہتے۔ وہ اس چھوٹی سی کتاب کا ضرور مطالعہ کریں

---

[1] قیمت چار آنہ۔ ملنے کا پتہ: سید نجم الحسن نقوی، تاجر کتب، چوک لکھنؤ۔

مباحثہ

اُردو، ہندی، ہندوستانی

از حق پرست

"ہماری مزدوروں کی حیثیت اس سے ثابت ہے کہ ہمارے شعرا نے بڑے بڑے ادیبوں نے اپنے طبعزاد کلام میں پرمیشور نہیں اللہ یا خدا ہی کہا۔ جنیو کو زنار اور سنکھ کو ناقوس کہا۔ اُن کی شاعری میں ہندوستانی تہذیب و تمدن یا ادبیت کی کوئی خصوصیت نہ آئی۔ ترکیب میں نہ دوہے آئے نہ چھند نہ کبت نہ سورٹھے۔ تخیل و تشبیہات میں وہی غیر ملکی چیزیں رہیں۔ محبت کیلئے لیلا مجنوں، شیریں و فرہاد، گل و بلبل، سخاوت کیلئے حاتم، دولت کے لئے قارون کا خزانہ، غرض کہیں ہندو ادبیت، ہندو تہذیب اور ہندو تمدن کا نام و نشان تک نہیں" (اقتباس از زمانہ بابت اپریل ۱۹۳۶ء)

مکرمی جگر بریلوی نے زمانہ بابتہ اگست ۱۹۳۶ء میں جن کریمانہ الفاظ میں اس ناچیز کی جانب توجہ فرمائی ہے اس کے لئے میں اُن کا ممنون ہوں۔ مکرم موصوف کے اس مضمون سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہم ایک دوسرے کے قریب ہوتے جاتے ہیں۔ اب دو امور میں اختلاف ہے۔ ایک وہ رائے ہے جو اقتباس بالا میں ظاہر کی گئی ہے۔ اس کے متعلق مکرمی جگر رقمطراز ہیں کہ:-

"جن اثرات کے تحت کہ اُردو کی ترقی ہوئی اُن کی وجہ سے یہ ضرور ہوا کہ خود ہندوؤں کی ادبیات ہندو تہذیب و تمدن کے آثار سے خالی رہیں لیکن اس سے یہ نتیجہ کیونکر نکالا جا سکتا ہے کہ ہندو مزدور اور نقال رہے؟"

میں سمجھتا ہوں کہ نقال اُس کو کہتے ہیں جسمیں اپنی انفرادیت کا نہیں بلکہ غیر کی انفرادیت کا اظہار ہوتا ہے، کسی قوم کی انفرادیت اُس کی تہذیب و تمدن سے عیاں ہوتی ہے۔ اس لئے جب کسی کا کلام ان باتوں سے مبرا ہو اور اُن چیزوں کو پیش کرے جو غیروں کی انفرادیت کے مظہر ہیں تو میری دانست میں تو نقالی ہی کہا جائے گا۔ میں مانتا ہوں کہ یہ لفظ بہت نامطبوع ہے اور اگر اس سے مکرمی جگر و دیگر ہندو بزرگوں کو تکلیف پہونچتی ہے تو میں تہ دل سے معافی کا خواستگار ہوں۔

دوسرا اختلافی امر مدیر جگر کے حسب ذیل الفاظ سے ظاہر ہوگا۔

"یہ استدلال میری سمجھ سے بالاتر ہے کہ چونکہ اُردو ادبیات میں ہندوانی تہذیب و تمدن کا فقدان ہے اس لئے ہندوؤں کی ادبی حیثیت بھی پست و فروتر ہے۔"

اس کے متعلق میرا معروضہ یہ ہے کہ زبان جذبات، خیالات، تصورات وغیرہ کے اظہار کا ذریعہ ہے جب اس اظہار میں سلاست، زور اور خوبصورتی پیدا ہوتی ہے تو اُس کو ادبی حیثیت حاصل ہوجاتی ہے ظاہر ہے کہ انسان کے جذبات میں زور، خیالات میں تحریک اور تصورات میں تنوع اور خوبصورتی جسقدر ان چیزوں سے پیدا ہوسکتی ہے جن کا اپنی تہذیب اور تمدن سے تعلق ہے اُس قدر اُن چیزوں سے نہیں ہوسکتی جن کا تعلق غیر تہذیب اور تمدن سے ہو۔ مسلمان مصنفین اُردو میں جن جذبات و خیالات کے اظہار میں طبع آزمائی کرتے ہیں وہ اُس تہذیب و تمدن سے متعلق ہیں جو اُن کی خاص ہے جو صورت ہماری نہیں ہے۔ لہذا ظاہر ہے کہ اُردو کی حد تک مسلمانوں کی ادبی حیثیت ہم سے برتر و بالا ہوگی۔

اس کے علاوہ میرے اس خیال کی تائید میں ایک اور دلیل ہے جو میں نے اپنے ابتدائی مضمون مطبوعہ زمانہ بابتہ اکتوبر ۳۸ء میں پیش کی تھی۔ وہ یہ کہ ہماری دیویوں کے مذہبی جذبہ کا ہمارے گھر کے اندرونی ماحول پر یہ اثر ہے کہ وہ اُردو اور فارسی اور دوسرے غیر ہندو اثرات سے بہت کچھ محفوظ ہے اور چونکہ ہنوز ہم ہندو ہیں خواہ نام نہاد میں سہی۔ اس لئے ہمارا تعلق پنڈتوں، مذہبی رسم و رواج اور تیج تیوہاروں سے اس طرح ہوجاتا ہے کہ یہاں ہماری زبان سنسکرت کی طرف جھک جاتی ہے جس کی وجہ سے ہماری زبان پر گھر میں کچھ اور تاثرات رہتے ہیں اور باہر کچھ اور اس طرح تسلسل اور یکسانیت کے قائم نہ رہنے سے ہماری اُردو میں وہ سلاست، وہ روانی، وتصنع سے بری، قدرتی رونق نہیں رہتی جو مسلمان بھائیوں کی زبان میں ہوتی ہے اس لئے کہ وہاں گھر اور باہر ایک ہی اثر کام کرتا رہتا ہے۔ کوئی غیر چیز خلل انداز نہیں ہوتی۔

میں مکرمی جگر بریلوی کے اس نظریہ کو قبول کرنے سے بھی قاصر ہوں کہ:۔

"اردو کی ساخت اور اجزائے ترکیبی میں دونوں قوموں کے دل و دماغ اور انفرادی خصوصیتوں کے نشوونما کے امکانات اور صلاحیتیں موجود ہیں۔"

اگر ایسے امکانات اور صلاحیتیں اسمیں موجود ہوتیں تو اُردو کے ذریعہ ہماری قومی زندگی میں بھی اصلاحی اور رو بہ ترقی انقلاب پیدا کرنے والے ادیب پیدا ہوتے۔ جیسا حالی، اکبر، اقبال وغیرہ مسلمان بھائیوں کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ پنڈت کیفی جی نے حالی کی مسدس (شکوۂ ہند) کا جواب لکھا اور خوب زور طبع

دکھلایا لیکن حالی کے کلام کی طرح وہ گھر گھر کا چرچا نہ بن سکا بلکہ اُردو ادب کے شائقین کے لئے محض ایک دماغی چٹخارہ سا ہو کر رہ گیا۔ یہی صورت سرور، چکبست، محروم وغیرہ کی ہوئی جنھوں نے ہندو تہذیب و تمدن سے متعلق چیزوں کو اُردو میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ غالباً یہی وجہ تھی جس سے منشی پریم چند بالآخر ہندی کی جانب رجوع ہونے پر مجبور ہوئے۔

اس ضمن میں میں یہ حقیقت آشکار واقعہ پیش کرنا چاہتا ہوں کہ نظیر اکبرآبادی جب مہادیوجی کے بیاہ یا کرشن کنھیا کے بالپن کا تذکرہ فرماتے ہیں تو اُن کی زبان اس زبان سے بالکل مختلف ہوتی ہے جو وہ اسلامی اعتقادات یا تمدن سے متعلق نظموں یا غزل گوئی وغیرہ میں استعمال فرماتے ہیں۔ مثال کے طور پر میں یہاں چند اشعار دیتا ہوں:۔

پہلے تو حمدِ خالقِ ارض و سما لکھوں	جد اس کے پھر نعت شہ انبیاء لکھوں
گر عمر بھر میں اسکو لکھوں بھی تو کیا لکھوں	بے انتہا وہ ہے تو غرض تا کجا لکھوں
سحر اس جھمک سے آیا نظر اک نگار رعنا	کہ خود اس کے حُسنِ رُخ کو لگا تکنے ذرہ آسا
خد و خال خوبی آگیں لب لعل پان سے رنگیں	نظر آفت دل و دیں مژہ صد مضرت افزا

ملاحظہ ہو ان اشعار میں عربی اور فارسی الفاظ کی کیسی کچھ بھرمار ہے اور ترکیبوں میں کیسی فارسیت بھری ہے۔ یہ چُنے ہوئے چند اشعار نہیں ہیں۔ ایسے اشعار نظیر کے کلام کا خاصہ جزو ہیں۔ اب اس کے مقابلہ میں انھیں کا کلام دوسرے رنگ میں ملاحظہ ہو:۔

پہلے ناؤں گنیش کو لیجئے سیس نوائے	جا سے کارج سدھ ہوں سدا مہورت لائے
بول بچن آنند کے پریم پیت اور چاہ	سُن لو یارو دھیان دھر مہادیو کا بیاہ
بھیجے بیٹھا تھا جو کنس کے من وہ بھر کر نیند نہ سوتا تھا	کچھ بات سہائی نا اُس کو نت اپنی پلک بھگوتا تھا
اُس مندر میں اُن دونوں کے جب کوئی بالک ہوتا تھا	کنس آن اسے جھپ مارے تھا من ماتا پتا کا روتا تھا

ملاحظہ ہو کہ ان دونوں زبانوں میں کس قدر فرق ہے صاف ایک اُردو ہے تو دوسری ہندی۔ نظیر کے کلام کے دیکھنے کے بعد میں تو اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ جس حقیقت کو ہم یا ہمارے بزرگ سمجھ نہیں سکتے تھے میاں نظیر کی نکتہ رس نظر خوب دیکھتی تھی کہ ہندو تہذیب و تمدن کا اظہار ہندی ہی کے ذریعہ ہو سکتا ہے اُردو کے ذریعہ ممکن نہیں۔

جناب جگر صاحب کے تمام مضامین ہندوؤں کی مسلمان بھائیوں سے ناقدری اور کس مپرسی، اُردو سے ہندوانی عناصر کے اخراج، ہندوؤں کی تصنیفات کو غیر حقیقی معیار سے جانچنے اور تعصب کی نظر سے

دیکھنے وغیرہ کی شکایات سے پُر ہیں۔ یہ شکایت خود اس بات کی دلیل ہے کہ اس زبان کے مالک ہم نہیں ہیں۔ اسی لئے مالکوں سے ناقدردانی کی شکایت کر رہے ہیں۔ اگر اردو زبان ہماری ہوتی تو ہم اپنی خوبیوں کی داد کے لئے دوسروں کا ممنون نہ ہوتے جیسا مسلمان ہماری داد کے محتاج نہیں ہیں۔

ہندوستان کی زبانوں میں کسی صوبہ کی زبان لے لیجئے۔ خاص تمدن اور مذہب ہے۔ اور زمانہ جدید کی ترقیوں یا تبدیلیوں کے ساتھ اپنے آپ کو قدم رکھتے ہوئے ترقی کے راستہ پر برابر گامزن ہے۔ بنگالی زبان کی تو یہ کیفیت ہے کہ جدید ترین علوم میں بھی کوئی ایسا نہیں ہے جو اس کے ذریعہ حاصل نہ ہو سکے۔ ان زبانوں میں ہندو اس بات کے محتاج نہیں ہیں کہ برادرانِ وطن ان کی حوصلہ افزائی کریں اور سند دیں تب وہ آگے بڑھیں۔

اردو میں ہمارا انتہائی کمال یہ ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ مسلمان اساتذہ کے قریب تک پہونچتے ہیں۔ اُن پر سبقت کبھی حاصل نہ کر سکے۔ اردو میں ہندی یعنی ہندوستانی الفاظ کی صورت بگاڑی گئی۔ انھیں مفرس اور معرب بنایا گیا۔ اور ہم نہ صرف صورت دیکھا کئے بلکہ ہم نے اُسی مفرس اور معرب طریقہ کی پیروی کی۔ کوئی ہندی یعنی ملکی خصوصیت پیدا نہ کر سکے جیسا ہندی کے شعراء تلسی داس جی کبیر داس جی سور داس جی وغیرہ نے کی تھی کہ اپنی چیز کو اپنے ڈھنگ پر رکھیں۔ لیکن جب کبھی عربی فارسی کا لفظ استعمال کیا تو اُس کو پہلے اپنایعنی ہندی بنا کر کیا یہ حقیقت کہ "اردو میں خود ہندوؤں کے ادبیات' ہندوؤں کی تہذیب و تمدن کے اثر سے خالی رہیں' ہماری آنکھیں کھولنے کے لیئے کافی نہیں ہے؟ جب ہم خود اس زبان میں وہ عناصر پیدا نہ کر سکے جو ہندو تہذیب و تمدن کے مظہر ہوتے تو بیچارے مسلمانوں سے کیا شکایت ہو سکتی ہے؟ ضرورت ہے کہ ہم اس حقیقت کو سمجھیں جو نظیر کا کلام اسقدر وضاحت اور صراحت سے ہمیں سمجھاتا ہے۔

مکرمی جگر بریلوی ہندو شعراء کے اردو کلام کا مسلمان شعراء کے کلام سے مقابلہ اور موازنہ کرنا چاہتے ہیں تو شوق سے کریں اور جب اُن کی وہ معرکۃ الآرا کتاب شائع ہو جائے گی تو ہم بھی دیکھ کر خوش ہولیں گے مگر ہم اُمید کرتے ہیں کہ جناب جگر اس سے بھی بحث کریں گے کہ اس زبان کا مزاج ابتدا ہی سے کیسا واقع ہوا ہے؟ اسمیں ہندو پن کو کہاں تک دخل تھا اور اسمیں وہ کون سے زبردست ہندووانی عناصر تھے۔ جن کو رفتہ رفتہ مسلمانوں کے تعصب نے خارج کر دیا؟ اور ہندو دیکھا رصورت دیکھا کئے۔ میں یہ بھی توقع کرتا ہوں کہ ممدوح اپنی اُس کتاب میں اردو کے کم از کم دو ایک ہندو شاعر ایسے بھی بتلائیں گے جو سور داس، کبیر داس، تلسی داس وغیرہ کے پلہ کے ہوں یعنی جن کے کلام نے ہندوؤں کو اُسی پیمانہ پر متاثر کیا ہو جس پیمانہ پر کہ ان

ہندی مشاہیر کے کلام نے کیا ہے یا جس پیمانہ پر کہ اُردو کے مسلّم اساتذہ کے کلام نے مسلمانوں کو متاثر کیا ہے۔ مکرمی جگر نے اپنے ایک مضمون میں اس فکر کا بھی اظہار فرمایا ہے کہ اگر ہندو اُردو سے دست بردار ہو جائیں تو ہمارے بزرگوں کی بڑی بھاری کمائی لُٹ جائے گی۔ میں عرض کرتا ہوں کہ اس کے پیچھے ہماری ہستی ہی نہ لٹ جائے۔ برادرانِ وطن اس مسئلہ کو بڑی گہری نظر سے دیکھتے ہیں اور اُردو سے بہت گہرے مقاصد وابستہ رکھتے ہیں۔ حیدرآباد دکن میں جن نام نہاد اصلاحات کا حال میں اعلان ہوا ہے۔ انہیں یہ معلوم کر کے مکرمی جگر کو یقیناً حیرت ہو گی کہ اُردو کو رزرو ڈ سبجکٹ رکھا گیا ہے۔ یعنی اُردو کو ذریعۂ تعلیم تو قرار دیا ہی تھا جس سے وہاں کی رعایا کا پچاسی فیصدی سے زائد حصہ جس کی مادری زبان مرہٹی، تلنگی، کنٹری یا ہندی ہے، تمام علوم و فنون اُردو ہی کے ذریعہ سیکھنے پر مجبور کر دیا گیا ہے اب اس مسئلہ پر غور و خوض اور احتجاج کا حق بھی ساقط کر دیا گیا ہے۔ مسلمانوں کی ایک بڑی حکومت کا جس کی رواداری کے آئے دن گیت گائے جاتے ہیں، یہ طرزِ عمل مسلمان بھائیوں کی ذہنیت کا پتہ دیتا ہے، اور ہماری آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہے۔

عزیز اللغات[1]

یہ لغت لکھنؤ کے نامور شاعر اور مشہور ادیب مرزا محمد ہادی صاحب عزیز مرحوم کی یادگار ہے جو انھوں نے اپنی زندگی میں کمال محنت و عرق ریزی سے مرتب فرمائی تھی۔ اس لغت کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں لفظوں کے علاوہ اُردو جملوں، محاورات اور ضرب المثلوں کی تشریح بھی کر دی گئی ہے۔ لکھنؤ کی خاص ٹکسالی زبان سیکھنا ہو تو اس لغت سے فائدہ اٹھایا جائے۔ طلبا کے لئے نہایت کارآمد چیز ہے اس کی لکھائی، چھپائی صاف ہے۔ حجم چھوٹی تقطیع کے ۴۷۰ صفحات۔ قیمت تین روپیہ

اکبر الہ آبادی[1]

اُردو کے مشہور اہلِ قلم حضرت طالب الہ آبادی نے حضرت اکبر مرحوم کی مفصل سوانحعمری تصنیف کی ہے، جسکی ترتیب و تدوین میں دیگر ذرائع کے علاوہ حضرت اکبر مرحوم کے خطوط سے بھی بہت کچھ کام لیا گیا ہے۔ کتاب بہت دلچسپ اور سبق آموز ہے۔ کلام اکبر پر مفصل تنقید بھی کی گئی ہے اور حضرت اکبر کے دلچسپ کلام کا بہت سا حصہ بھی اس میں آگیا ہے۔ واقعی طالب صاحب کی محنت و جانکاہی قابلِ داد ہے۔ بہر حال کتاب دلچسپ اور پرائیویٹ و پبلک لائبریریوں میں رکھنے کے قابل ہے۔ لکھائی، چھپائی، کاغذ عمدہ۔ بڑی تقطیع کے ۲۸۴ صفحات ضخامت۔ کتاب مجلد ہے اور اس کی قیمت پانچ روپیہ۔

Reserved Subject. [a] [1] دونوں کتابوں کے ملنے کا پتہ:- مطبع انوار احمدی الہ آباد

رفتارِ زمانہ

ہندوستانی مسائل

کانگریس ورکنگ کمیٹی کے مطالبے کے جواب میں ہز ایکسلنسی لارڈ لنلتھگو وائسرائے ہند نے ملک کے چھوٹے بڑے پچاس سے زائد معززین سے تبادلۂ خیالات کرنے کے بعد برٹش گورنمنٹ کی طرف سے جو جواب ۱۷ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو شائع کیا۔ اس سے ملک کے کسی طبقہ کی تسلی نہیں ہوئی۔ کانگریس نے مقاصد جنگ کی تشریح چاہی تھی اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کی تھی کہ جمہوریت و آزادی کے جن اصولوں کی اس شدومد کے ساتھ یوروپ میں حمایت کیجارہی ہے جنگ کے خاتمے کے بعد ہندوستان میں بھی اُن پر عملدرآمد ہوگا یا نہیں؟ کانگریس کو اس پر بھی اعتراض تھا کہ شرکت جنگ کے متعلق برطانیہ نے نوآبادیوں سے تو مشورہ کیا لیکن ہندوستان سے استصواب رائے کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی۔ یہ بات قومی خودداری کے خلاف تھی۔ اسلئے کانگریس کو ناگوار ہوئی۔

حضور وائسرائے نے اپنے طول طویل بیان میں اُن صاف و صریح سوالات کا کوئی اطمینان بخش جواب تو نہیں دیا لیکن اُنھوں نے دو باتوں پر گورنمنٹ کی آمادگی ضرور واضح کردی۔ اول یہ کہ جنگ کے بعد برٹش گورنمنٹ ہندوستان کے مختلف طبقوں کے مشورہ اور اتفاق رائے سے موجودہ آئین کی ترمیم پر غور کرنے کو تیار رہیگی۔ دوسرے جنگی انتظامات کے متعلق فوراً ہی ایک مجلس شوریٰ قائم کیجائے گی جسکے ذریعہ مختلف لیڈرانِ ملک سے وقتاً فوقتاً صلاح و مشورہ لیا جائے گا۔

ہندوستان کو نوآبادیوں کا درجہ دینے کی بابت ہز ایکسلنسی نے سابق وزیر ہند کے اس بیان کا حوالہ دیا ہے جو ۶ فروری ۱۹۳۵ء کو دارالعوام برطانیہ میں ملک معظم کی حکومت کی طرف سے دیا گیا تھا۔ اس بیان میں ایکٹ گورنمنٹ ہند ۱۹۱۹ء کے تمہیدی نوٹ کی طرف اشارہ کیا گیا تھا اور یہ بتایا گیا تھا کہ برٹش گورنمنٹ اپنے وعدہ سے ہرگز انحراف کرنا نہیں چاہتی ہے بلکہ جو وعدہ لارڈ اِروِن سابق وائسرائے ہند نے دُہرایا تھا اُس کی پوری تصدیق کرتی ہے۔ کیونکہ موصوف نے یہ اعلان حکومت وقت کی طرف سے پوری ذمہ داری کے ساتھ کیا تھا۔ اس بیان میں یہ بات بھی واضح کردی گئی تھی کہ ایکٹ ۱۹۱۹ء کے تمہیدی نوٹ کے مطابق ہندوستان کی آئینی ترقی کا قدرتی نتیجہ درجہ نوآبادی کے طرز کی حکومت کا قائم ہونا ہے۔ رہنمایانِ ملک کو اس اعلان میں سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ اوّل تو اسمیں نوآبادیوں کا درجہ حاصل ہونے کی کوئی میعاد مقرر نہیں کی گئی ہے، دوسرے یہ بات بھی صاف کہدی گئی ہے کہ ہندوستان کو یہ درجہ یکلخت نہیں بلکہ رفتہ رفتہ حاصل ہوگا۔ اس وقت بھی لارڈ لنلتھگو نے

اس وعدہ کو عملی جامہ پہنانے کی بابت صرف اسقدر ارشاد فرمایا ہے کہ:-

"اسوقت مجھے ملک معظم کی حکومت نے یہ کہنے کا اختیار دیا ہے کہ اس جنگ کے خاتمے پر جو ردوبدل ضروری مناسب ہوگا اس کی ترتیب و تدوین میں امداد و مشورہ حاصل کرنے کیلئے حکومت بخوشی خاطر ہندوستان کی مختلف جماعتوں، پارٹیوں، مفادات اور دیسی ریاستوں کے نمایندوں سے گفتگو کرے گی"

اس کے معنی یہ ہوئے کہ مزید آئینی اصلاح کے لئے ایک دوسری گول میز کانفرنس کی جائے گی۔ یعنی ایک مرتبہ پھر ہندوستانیوں کے نفاق باہمی کا دلشکن نظارہ دنیا کے سامنے پیش کیا جائے گا۔

مہاتما گاندھی نے اس تجویز سے یہی نتیجہ نکالا ہے کہ برٹش گورنمنٹ آیندہ بھی باہمی نفاق باہمی سے فائدہ اُٹھاکر حکمرانی کرنے کی پرانی پالیسی بدستور قائم رکھنا چاہتی ہے۔ بقول مہاتما جی "کانگریس نے روٹی کا سوال کیا تھا مگر اس کا جواب پتھر سے دیا گیا۔ چنانچہ اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں تک برطانیہ کا اختیار ہوگا، ہندوستان میں جمہوری طرز کی حکومت قائم نہ ہوسکیگی۔ اسلئے کانگریس کو اپنا مدعا حاصل کرنیکے لئے ایک مرتبہ پھر صحرا نوردی اختیار کرنا پڑیگی"

ملک کی تمام سیاسی جماعتوں نے جنگ کے متعلق جو ریزولیوشن پاس کئے ہیں۔ اُنمیں مرکزی حکومت میں ذمہ داری کا عنصر داخل کرنے کا فوری مطالبہ کیا گیا تھا مگر اس کا کوئی جواب نہیں دیا گیا۔ البتہ والیسرائے ہند نے اپنی صدارت میں ایک مشاورتی کمیٹی قائم کرنے کا ارادہ ضرور ظاہر کیا۔ جس میں ملک کی بڑی بڑی پارٹیوں اور ریاستوں کے نمایندے شریک ہوں گے۔ لیکن اس کے جلسے والیسرائے کی مرضی سے منعقد ہونگے۔ اور ممبران کا انتخاب بھی اس طرح ہوگا کہ مختلف پارٹیاں اپنے اپنے نمایندوں کی فہرستیں بنادیں گی اور والیسرائے اس فہرست سے اپنی پسند کے مطابق نامزد کرینگے اور اس کمیٹی کے ذریعہ جنگ کے متعلق جملہ کارروائیوں کو ہندوستان کی رائے سے وابستہ رکھنے کا اہتمام کریں گے۔ غرض اس کمیٹی کے نہ تو ممبران ہی مستقل ہونگے اور نہ اس کے اجلاس منعقد کرنے کی والیسرائے پر کوئی پابندی ہوگی اور نہ اسے کوئی اختیارات حاصل ہوں گے۔ یعنی اسے مشورہ دینے کا حق ہوگا مگر اس پر عمل کرنیکی کوئی پابندی نہ ہوگی۔

بہرحال کانگریس نے اس اعلان اور مشاورتی کمیٹی کی تجویز کو قابل التفات نہیں سمجھا اور تمام ملک نے ایک آواز سے اس کی مخالفت کی۔ حتیٰ کہ لبرل فیڈریشن نے بھی ڈیڑھ دن کے غور و خوض کے بعد اس اعلان کو غیر تسلی بخش قرار دیا۔ اُن کی رائے میں بھی والیسرائے نے اپنے اعلان میں یہ بات صاف نہیں کی کہ ہندوستان کے آیندہ نظام حکومت کی وہی شکل ہوگی جو خود مختار نوآبادیات برطانیہ کی ہے۔ لبرل فیڈریشن نے اس بات کی بھی شکایت کی ہے کہ جنگ شروع ہوجانیکے باوجود ابھی تک ہندوستان کی فوجی پالیسی میں کوئی ترمیم نہیں کی گئی اور نہ اس کا کوئی ذکر ہی والیسرائے کے اعلان میں ہے۔ فیڈریشن نے اسکو بھی واضح کردیا کہ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ گورنمنٹ ہند کے متعلق یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ اتفاق رائے پر مبنی تھا۔ ہاں برطانوی مدبر اور برطانوی ڈیلیگیٹ ضرور اس پر متفق تھے۔

ورنہ اگر ہندوستانیوں کے متفقہ مشوروں کا خیال کیا جاتا تو سر آغا خان کی یادداشت کو جس سے ہندوستان کے سب ملکی لیڈر متفق تھے، ردی کی ٹوکری میں نہ ڈال دیا جاتا۔ حال میں ایک قابلِ ذکر بات یہ بھی ہوئی کہ پارلیمنٹ نے تھوڑی بہت جو صوبجاتی آزادی دے رکھی تھی، اُسمیں بھی اُس نے وزیروں سے رائے لئے بغیر فوری طور پر تخفیف کردی ہے۔

مسلم لیگ نے جو اپنے سابقہ ریزولیوشن میں ہندوستان میں جمہوری طرز کی حکومت قائم کرنے کی مخالفت کرکے برٹش گورنمنٹ کے پرانے مطلق العنان طریقہ حکمرانی کو قابلِ ترجیح قرار دے چکی ہے اِس اعلان کے بعض حصوں پر اظہارِ اطمینان کیا ہے اور بعض دوسرے حصوں کے مزید توضیح کی درخواست کی ہے اور مسٹر جناح کو اِس بات کا اختیار دیدیا ہے کہ اگر وہ اِن امور کے متعلق مطمئن ہوجائیں تو مسلمانوں کی طرف سے برطانیہ سے جنگی امداد دینے کا وعدہ کردیں۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی نے اپنی بیزاری کا اظہار ضروری سمجھکر کانگریسی وزارتوں کو حکومت سے مستعفی ہوجانے کی ہدایت دی۔ لیکن چونکہ اسس وقت وہ اپنی طرف سے برطانیہ کی مشکلات میں خواہ مخواہ اضافہ بھی کرنا نہیں چاہتی ہے۔ اُس نے کسی کانگریسمین کو ذاتی حیثیت سے کوئی براہ راست کارروائی کرنے کی اجازت نہیں دی۔ چنانچہ اس ہدایت کے بموجب آٹھ صوبوں کی کانگریسی وزارتوں نے اپنی اپنی قانونی اسمبلیوں میں لڑائی کی بابت ایک خاص ریزولیوشن پاس کرکے یکے بعد دیگرے استعفے دیدے ہیں ابتک صوبہ آسام کے سوا کسی دوسرے صوبے میں کوئی وزارت قائم نہیں ہوسکی۔ اِس لئے گورنر صاحبوں کو بادلِ ناخواستہ آئینی حکومت کو معطل کرکے کل نظم و نسق کو اپنے ہاتھ میں لینا پڑا۔ انھوں نے کہیں تین اور کہیں دو سرکاری افسران کو مشیر سلطنت بنا کر حکومت کا کام جاری رکھا ہے۔ پہلے خیال تھا کہ شاید مخالف پارٹی کے ممبران یا بعض دیگر رسوخ یافتہ اصحاب کو وزیر بنا کر کچھ دنوں تک کام چلایا جائے یا غیر سرکاری معززین کو سرکاری مشیر نامزد کرکے حکومت کیجائے مگر یہ دونوں صورتیں اختیار نہیں کی گئیں اور یہ بہت ہی اچھا ہوا کہ سرکاری افسران ہی حکومت کے مشیر مقرر کئے گئے۔ ہمارے صوبہ متحدہ میں مسٹر مارش سینئر ممبر بورڈ آف ریونیو، مسٹر سلوان کمشنر میرٹھ اور مسٹر پنا لال چیف سکرٹری صوبہ جیسے قابل اور آزمودہ کار افسران مشیرانِ سلطنت مقرر کئے گئے ہیں چنانچہ ہز ایکسیلنسی گورنر کا انتخاب ہر حیثیت سے پسند کیا گیا ہے۔

ہز ایکسیلنسی نے یہ بھی اعلان کیا ہے کہ جس طرح کانگریس وزارت صوبہ کا نظم و نسق چلا رہی تھی اسمیں فی الحال کوئی اہم تبدیلی نہ کیجائیگی۔ بات یہ ہے کہ ان استعفوں کے بعد سے ابتک برٹش گورنمنٹ اور حضور وائسرائے ہند کانگریس سے سمجھوتہ کرنیکی کوشش کررہے ہیں۔ اوّل ہفتہ نومبر میں دہلی میں لارڈ لنلتھگو نے مہاتما گاندھی، صدرِ کانگریس ڈاکٹر راجندر پرشاد صاحب اور مسٹر جناح سے پھر ملاقات کی۔ اس اثنا میں پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں بھی کئی مرتبہ اس مسئلہ پر مباحثے ہوئے اور لارڈ زیٹلینڈ وزیر ہند، اُن کے نائب اور مسٹر سیموئل ہور لارڈ پریسیڈنٹ گورنمنٹ برطانیہ کی طرف سے سرکاری منشا اور ارادوں کی مکرر سہ کرر توضیح کرچکے ہیں۔ مسٹر ویجووڈ بین کی تقریر سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ۱۹۱۹ء کا اعلان انگلستان کی تمام سیاسی پارٹیوں سے مشورہ کرکے تیار کیا گیا تھا لیکن اس مرتبہ گورنمنٹ نے ...

وائسرائے کے اعلان کے بارہ میں لیبر یا لبرل پارٹی سے کوئی مشورہ نہیں کیا۔ مسٹر موصوف نے بھی وائسرائے کے
اعلان کو بالکل غیر تسلی بخش قرار دیا ہے۔ سر سیموئیل ہور نے پارلیمنٹ کے مباحثہ کا جواب دیتے ہوئے کہا ہے کہ ہندوستان کا
مقصد درجہ نوآبادیات کا حاصل کرنا ہے مگر یہ درجہ جنگی امداد کے انعام کی حیثیت سے نہیں دیا جاسکتا ہے۔ دراصل
ابھی تک اسمیں جو رکاوٹ ہے اُسکی تمامتر ذمہ داری سر سیموئیل ہور گورنمنٹ برطانیہ پر نہیں بلکہ ہمارے نفاق باہمی پر
ڈالتے ہیں۔ ورنہ بقول اُن کے برطانیہ ہندوستان کو ہرگز غلام رکھنا نہیں چاہتا۔ بلکہ اس کے برعکس وہ جمہوریت
قائم کرنے میں ہر طرح سے اُسکی مدد کر رہا ہے۔ لارڈ زٹلینڈ نے بھی دارالامراء میں لارڈ اسنیل اور لارڈ سیموئیل کی
معرکۃ الآرا تقریروں کے جواب میں وائسرائے کی انتظامی کونسل کی توسیع کے مسئلہ پر غور کرنے کا وعدہ کیا۔ اس سلسلہ
میں معلوم ہوا ہے کہ لارڈ لنلتھگو اپنی انتظامی کونسل میں چھ زائد ممبر مقرر کرنے کو تیار ہیں جنمیں چار نشستیں کانگریس
کو اور دو نشستیں مسلم لیگ کو دینے کا خیال ہے بشرطیکہ صوبجاتی حکومت چلانے کے متعلق کانگریس و مسلم لیگ میں
کوئی عملی سمجھوتہ ہو جائے۔ کانگریس کی طرف سے مہاتما جی، پنڈت جواہر لال نہرو اور خود ڈاکٹر راجیندر پرشاد صدر کانگریس
بار بار یہی کہہ رہے ہیں کہ کانگریس ہندو، مسلمان، عیسائی، سکھ سب کی یکساں نمایندگی کرتی ہے اور اُسے سب جماعتوں
کے فلاح و بہبود کی یکساں فکر ہے۔ اُنکی رائے میں ہندو مسلمانوں کا اختلاف خود برطانیہ کا پیدا کردہ ایک خانگی مسئلہ ہے جسکی
بنیاد پر آزادی کا مطالبہ رد نہیں کیا جاسکتا۔ مہاتما جی نے فی الحال سول نافرمانی کی تحریک کو پس پشت ڈالدیا ہے اور وہ
برٹش گورنمنٹ کیلئے سمجھوتہ کا دروازہ کھلا رکھے ہوئے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی کانگریس ہندو مسلم اتفاق کیلئے بھی انتہائی
کوشش کر رہی ہے۔ ۱۹ لغایت ۲۲ نومبر تک کانگریس ورکنگ کمیٹی کا جو اجلاس الہ آباد میں ہوا اسمیں بھی بڑے غور و خوض کے بعد
اس قسم کا ریزولیوشن پاس ہوا ہے جسمیں اس بات کی پوری گنجائش رکھی گئی ہے کہ برطانیہ چاہے تو اب بھی کانگریس کے سیاسی
مطالبہ کو منظور کر کے جنگ میں ہندوستان کا مکمل تعاون حاصل کرلے۔ کمیٹی نے اس بات کو بھی واضح کر دیا ہے کہ کانگریس کسی
اقلیت یا جماعت کی حق تلفی روا رکھنا نہیں چاہتی۔ نئے آئین حکومت مرتب کرنے کیلئے جس قسم کی نمایندہ اسمبلی وہ طلب کرنا
چاہتی ہے اسمیں کسی جماعت کو شکایت کی گنجائش باقی نہ رہے گی۔ کانگریس کمیٹی نے یہ بھی طے کر دیا ہے کہ اس میں مسلمان
اہل وطن چاہیں تو اپنے نمایندے انتخاب جداگانہ کے ذریعہ منتخب کریں۔ اس توضیح و ترمیم کے بعد نمایندہ اسمبلی کا مسئلہ
ایسا دشوار نہیں رہتا جیسا کہ پہلے معلوم ہوتا تھا۔ اور اسمیں برطانیہ کے غیر سرکاری نمایندوں کیلئے بھی گنجائش نکل سکتی ہے۔
بلکہ سرکاری افسران بھی بہ حیثیت مشیر شریک ہو سکتے ہیں لیکن صاحبزادہ لیاقت علی خانصاحب نے مسلمانوں کیلئے جداگانہ
انتخاب کے علاوہ تعداد سے زائد نیابت کا بھی مطالبہ کیا ہے حالانکہ کانگریس ہر بالغ شخص کو نمایندگی کا حق دے رہی ہے جس کے
بعد زائد نیابت کا سوال باقی نہیں رہتا ہے۔ اگر مسلم لیگ نے واقعی زائد نیابت پر زور دیا تو اس مسئلہ میں نئی اور شاید
ناقابل حل مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ مگر سر سکندر حیات خان وزیر اعظم پنجاب اور بعض دیگر خیر خواہان ملک کو بھروسہ ہے کہ

مسٹر جناح اور پنڈت جواہر لال نہرو جب کبھی آیندہ ملینگے تو فرقہ وارانہ مسائل کا کوئی نہ کوئی حل نکال ہی لیں گے۔ خدا کرے ایسا ہی ہو لیکن مسٹر جناح کا منانا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اُن کی قابلیت میں کسی کو کبھی شبہ نہیں رہا۔ لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ مہاتما گاندھی اور کانگریس کے ساتھ اُنھیں شاید نادانستہ طور پر کسی وجہ سے ایسی کد ہوگئی ہے کہ اکثر اُنسے بہت چھوٹی چھوٹی باتیں ظہور میں آجاتی ہیں۔ مثلاً آج تک وہ اس مسئلہ پر گفتگو کرنے کیلئے کانگریس کی دعوت پر کبھی لیڈران کے مقرر کردہ وقت و مقام پر نہیں گئے اور جب کبھی ضرورت ہوئی تو مہاتما گاندھی، پنڈت نہرو یا سبھاش بابو کو خود ہی اُن کی خدمت میں حاضر ہونا پڑا۔ ہند کے بجائے خود یہ ایسی چھوٹی بات ہے کہ اس کا ذکر بھی کانوں کو بھلا نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن بعض اوقات چھوٹی چھوٹی باتوں ہی سے دلی رجحان کا پتہ چلتا ہے۔ اسوقت بھی کانگریس ہی کی طرف سے پنڈت نہرو کو اُن سے بات چیت شروع کرنے کی درخواست کرنا پڑی ہے۔ یہی مسٹر جناح ہیں کہ چند سال ہوئے مسلمانان بمبئی نے انھیں ایک مسلم جلسہ میں محض اس وجہ سے بولنے نہیں دیا تھا کہ وہ شرع اسلام کے بموجب داڑھی نہیں رکھاتے ہیں۔

یہ مسٹر جناح ہی کی قابلیت ہے کہ سادہ رو ہونیکے باوجود وہ مسلم لیگ کے مستقل صدر اور مسلمانانِ ہند کے واحد ڈکٹیٹر بن گئے ہیں۔ لارڈ برکن ہیڈ وزیر ہند نے لارڈ ارون وائسرائے ہند کو سائمن کمیشن آنے کے وقت یہ ہدایت کی تھی کہ مسٹر جناح کو خشک و تنہا چھوڑ کر دوسرے مسلمان معززین سے بات چیت کرکے اُن کی حوصلہ افزائی کیجائے۔ چنانچہ پہلی گول میز کانفرنس کے بعد مسٹر جناح کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا۔ اور مسلمانانِ ہند یا اُن کے لیڈروں نے اس کا مطلق کوئی نوٹس نہیں لیا۔ دو سال پہلے مسلم لیگ ایک سست و غیر منظم جماعت تھی۔ مگر کانگریسی وزارتوں کے قائم ہوتے ہی مخالف لیڈروں کو فرقہ وارانہ جذبات اُبھارنے اور مسلم لیگ کی مخالفانہ روش کو مضبوط کرنے کا بہت اچھا موقعہ مل گیا۔ ہندو مخالفین نے مہاسبھا کا آسرا لیا۔ اور کبھی کبھی زمینداروں کی تنظیم کے نام سے مشترکہ مخالفت کی پارٹیاں بھی بنیں لیکن یہ سرسبز نہ ہوئیں۔ مگر مسلم لیگ پر مسٹر جناح کا جادو چل گیا اور ہر صوبے کے مخالف لیڈران اُن کے جھنڈے تلے جمع ہوگئے۔

کانگریس کی غلطی یہ ہوئی کہ اس نے اصولوں کی دُھن میں بعض ایسے مسلمان لیڈروں کو بھی جو ہر طرح سے کانگریس پروگرام کے حامی تھے پارلیمنٹری کمیٹیوں اور وزارتی حلقوں میں شامل کرنے سے انکار کر دیا۔ کانگریس سے مسٹر جناح کی ناراضگی کا راز بھی وہی ہے جس کی بدولت مولانا محمد علی مرحوم کا پنڈت موتی لال نہرو سے بگاڑ ہوگیا تھا۔ خیر وجہ کوئی ہو اس وقت جس طرح سے بنے کانگریس کو مسٹر جناح اور مسلمانوں کو راضی کرنا ہے۔ مسٹر جناح کے ذاتی رسوخ کا اصلی راز اُن کی پبلک لائف کی بے لوثی ہے۔ ذاتی اہمیت کے خیال سے اس درجہ متاثر ہونیکے باوجود وہ اپنے لئے کسی اعزاز، عہدہ یا نفع کے خواستگار نہیں ہیں۔ چنانچہ اسوقت بھی جب یہ خبر ہے کہ وائسرائے اپنی ایگزیکیٹو کونسل میں مسلم لیگ کے دو نمایندے لینا چاہتے ہیں، اُنھوں نے سُنا جاتا ہے کہ صاحبزادہ لیاقت علی خان اور سر عزیز [illegible] پٹنہ کو انتخاب کیا ہے اب سُنا جاتا ہے کہ عنقریب ہی پنڈت جواہر لال نہرو مسٹر جناح سے اس مسئلہ پر سلسلۂ جُنبانی کرینگے۔ مسٹر ممدوح بھی حال ہی میں کہہ چکے ہیں کہ جب روس اور جرمنی میں اتفاق و اتحاد ہوگیا تو ہندو مسلمانوں میں اتفاق ہونا کیا مشکل ہے۔ خدا کرے ایسا ہی ہو۔ کیونکہ اسوقت مُلک کی آیندہ ترقی اسی مسئلہ کے حل پر منحصر ہے۔ کانگریس کمیٹی کے پچھلے جلسہ الہ آباد میں مولانا ابوالکلام صاحب آزاد نے اس ذیل میں ایک نئی اور مفصل اسکیم تیار کی ہے۔ جس کی رو سے ہر ضلع، ہر تحصیل اور ہر گاؤں کے کانگریسیوں کو ہدایت کی جائے گی کہ وہ اپنے اپنے علاقہ میں ہندو مسلمانوں کی صلح و صفائی کی کوشش کرنے میں اپنی طرف سے کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھیں۔ ہماری رائے میں کانگریس کو سال دو سال تک صرف اسی مسئلہ پر اپنی تمام تر توجہ مبذول کر دینا چاہیے۔ اسوقت کانگریس نے عملی طور پر مہاتما گاندھی کو اپنا ہادی و رہنما مقرر کر رکھا ہے اور انھوں نے ابھی تک ہر حیثیت سے اپنا رویہ انتہائی مصالحانہ رکھا ہے۔ اسی وجہ سے کانگریس کمیٹی سے صرف ایام گذاری کا ریزولیوشن پاس ہوا ہے۔ مہاتما جی نے ممبران و حامیان کانگریس کو تعمیری کام کرنے کی ہدایت دی ہے۔ وہ خود آیندہ ستیہ گرہ کی کوئی نئی اسکیم

سوچ رہے ہیں۔ خبر ہے کہ اگر برٹش گورنمنٹ سے سمجھوتہ نہ ہوا تو اس دفعہ لیڈران ملک ایسا زبردست ستیہ گرہ کرینگے جو تمام پچھلی تحریکات کو مات کر دیگا اور جس کے ماتحت لیڈران اپنا بقیہ عمر جب تک حکومت خود اختیاری حاصل نہ ہو جائے گی جیلخانوں میں بسر کر دینگے۔ غیر ممالک میں بھی زور و شور سے پروپیگنڈا کیا جائے گا۔ جس کے لئے سنا جاتا ہے کہ کئی امریکن معززین نے اپنی آمادگی ظاہر کی ہے۔ مہاتما گاندھی اس سے بھی مطمئن ہو جائیں گے کہ گورنمنٹ برطانیہ ہندوستان کی خود مختاری کا اعلان کر دے اور آئندہ نظام حکومت طے کرنے کے لئے فرقہ وارانہ اتفاق کی شرط لازمی قرار دیدے۔ مہاتما جی کا یہ خیال صحیح ہے کہ جب تک برطانیہ قلیل تعداد والی جماعتوں کی بیجا و بیجا حمایت کا دم بھرتی رہے گی اور جب تک ان جماعتوں کو یہ خیال رہیگا کہ وہ کثیر تعداد جماعت سے بگاڑ کر کے برطانیہ سے الگ سودا کر سکتے ہیں اس وقت تک یہ اہم مسئلہ طے نہ ہوگا۔ اس لئے اگر گورنمنٹ واقعی ہندوستان میں اتفاق باہمی کی خواہشمند ہے تو اسے اس معاملہ کو اہل ملک کی رائے پر چھوڑ دینا چاہیئے۔

(جنگ یوروپ)

یوروپ کی موجودہ جنگ کو شروع ہوئے بارہ ہفتے ہو چکے ہیں ان تین مہینوں میں ہونے کو تو سب کچھ ہوا لیکن نتیجہ کے اعتبار سے پولینڈ کی فوری تباہی کے علاوہ ابھی کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔

موجودہ جنگ مختلف صورتیں اختیار کئے ہوئے ہے یعنی بری، بحری، اقتصادی، ہوائی اور بادہوائی یعنی پروپیگنڈا مغربی محاذ پر ایک طرف جرمنی اور دوسری طرف اتحادیوں (یعنی فرانس و برطانیہ) کی فوجیں ایک دوسرے کے مقابلے پر موجود ہیں۔ مگر سیگفریڈ لائن (جرمن خط جنگ) اور میجنو لائن (فرانسیسی خط جنگ) کے زمین دوز قلعوں میں اس طرح چھپی ہوئی ہیں کہ ایک دوسرے کو نظر نہیں آتیں۔ درمیان دونوں خطوں کے درمیان دو میل سے لیکر دس میل تک چوڑا زمین کا طویل ٹکڑا ہے جسے "علاقہ غیر مقبوضہ" یا "No Man's Land" کہتے ہیں۔

دونوں لائنیں ایک دوسرے کے مقابل سوئزرلینڈ کے سرحدی شہر باسلے سے لیکر دریائے رائن کے کنارہ کنارہ شہر لاٹربرگ اور وہاں سے لکسمبرگ کی سرحد تک چلی گئی ہیں۔ پہلے تو فرانسیسی فوجوں نے وقتاً فوقتاً پیشقدمی کر کے غیر مقبوضہ علاقہ میں تقریباً پانسو مربع میل رقبہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ مگر جاڑے کے موسم کے ساتھ برسات بھی شروع ہو گئی اور دریاؤں اور چشموں میں سیلاب آگیا اور نقل و حرکت اور رسد رسانی کی دقتیں بڑھ گئیں تو فرانسیسی جرنیلوں نے سیلاب زدہ علاقہ سے اپنی فوجیں پیچھے ہٹا کر محفوظ مقامات پر قائم کر دیں چنانچہ اب بھی بعض بڑھی ہوئی فوجی چوکیوں کے سوا تمام اتحادی فوجیں محفوظ مقامات پر موجود ہیں۔ فریقین کے توپخانے کبھی کبھی سرگرمی دکھاتے ہیں اور بعض اوقات مقامی حملے بھی ہوتے رہتے ہیں اور ہوائی جہاز اڑ کر دشمن کی دیکھ بھال کر کے پھر واپس چلے آتے ہیں۔ اس سے زیادہ ابھی تک کوئی قابل ذکر بات نہیں ہوئی ہے۔ جاڑا، برفباری اور بارش کی وجہ سے کسی طرف سے حملہ نہیں ہو رہا ہے۔ غالباً تین مہینے تک یہی حالت رہیگی۔

جرمنی کی بہت سی سپاہ پورے سازوسامان کے ساتھ ہالینڈ اور بلجیم کی سرحد پر بھی جمع ہے۔ اس لئے گمان تھا کہ شاید ہالینڈ، بلجیم یا سوئزرلینڈ سے ہو کر فرانس پر حملہ کیا جائے لیکن جرمنی نے اسکی باضابطہ تردید کر دی ہے۔ جرمنی برطانیہ اور فرانس پر ہوائی اور بحری حملے بھی کر رہا ہے۔ چنانچہ جرمن طیارے متعدد بار جزائر شیٹلینڈ، مشرقی اسکاٹ لینڈ اور شرقی انگلینڈ کے شہروں اور بندرگاہوں پر حملے کر چکے ہیں۔ مگر برطانوی طیارہ شکن توپوں کی آتشباری اور برطانوی ہوائی جہازوں نے ان حملوں کو کامیاب نہیں ہونے دیا۔ برطانیہ و فرانس کے متعدد جہازوں کو نقصان پہونچا ہے۔ غیر جانبدار ملکوں کے بھی کئی جہاز غرق ہو چکے ہیں لیکن اس کے باوجود ابتک جسقدر نقصان دشمن کا ہوا ہے اتنا اتحادیوں کا نہیں ہوا۔ ان کے جنگی بیڑوں نے تمام کھلے سمندروں کو جرمنی کیلئے بند سا کر رکھا ہے۔ جرمنی کی بہت سی آبدوز کشتیاں بھی غرق کر دی ہیں لیکن جرمنی کے دو تین چھوٹے چھوٹے جنگی جہاز اب بھی کھلے سمندروں میں ادھر ادھر پھر رہے ہیں۔ حال میں جرمنی نے

ایسا نہیں ہو سکتا۔ دوسری حرکت یہ کی ہے کہ چونکہ رودبارِ انگلستان جو انگلینڈ، فرانس، ہالینڈ اور بلجیم کے درمیان واقع ہے، سمندر کا ایک تنگ راستہ ہے۔ جس میں ہو کر ہر قسم کے جہازوں کی بکثرت آمد و رفت ہوتی ہے۔ اس لئے جرمنوں نے ۲۰ و ۲۲ نومبر کی رات کو اتحادیوں کو پریشان کرنے اور ان کے جہازوں کو نقصان پہونچانے کیلئے اس تنگ سمندری راستہ میں ہلکی ہلکی بحری سرنگوں کا ایک زبردست جال ہوائی جہازوں کے ذریعہ بچھا دیا جس سے انگلینڈ و فرانس کے علاوہ ہالینڈ، اٹلی اور یونان کے متعدد جہاز غرق ہو چکے ہیں۔ اس طرح چند ہی روز کے اندر متعدد بڑے بڑے جہازوں کو صدمہ پہونچ چکا ہے۔ جرمنی کی یہ حرکت بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی ہے۔ اسلئے انگلستان نے اسکے جواب میں غیر جانبداروں کا وہ سب مال ضبط کرنے کا فیصلہ کیا ہے جو اسوقت جرمنی کو جا رہا ہے۔ ساتھ ہی سرنگیں دور کرنیوالے جہاز بھی (Mine Sweepers.) مصروفِ کار ہیں۔ اُمید کیجاتی ہے کہ انکی مدد اور بعض دوسری تدبیروں سے جن پر عنقریب عمل ہونیوالا ہے یہ خطرہ بھی جلد ہی دور ہو جائے گا۔

یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ جرمنی نے ایک نئے قسم کے طیارے بنائے ہیں جو ہوا میں اُڑنے کے علاوہ سمندر میں بھی تیر سکتے ہیں وہ رات کی تاریکی میں آتے ہیں اور سمندر میں اُتر کر سرنگیں بچھا جاتے ہیں۔ یہ سرنگیں بہت ہلکی ہوتی ہیں لیکن ان کے اندر بھک سے اُڑ جانے والا مادہ اسقدر سخت بھرا ہوتا ہے کہ بڑے سے بڑا جہاز بھی اُن سے ٹکرا کر سلامت نہیں رہ سکتا۔

جنگ کا اقتصادی پہلو توپ و تفنگ سے بھی زیادہ کارگر ثابت ہو رہا ہے۔ پہلی جنگ عظیم میں بھی جرمنی کو اسی وجہ سے شکست نصیب ہوئی تھی اور اس جنگ میں بھی یہی حربہ جلد یا دیر میں جرمنی کو نیچا دکھائے گا۔ اقتصادی جنگ میں دشمن کی ہر طرف سے ایسی ناکہ بندی کر دیگئی ہے کہ ضرورت کی چیزیں بھی اس کے پاس نہ پہونچ سکیں۔ چنانچہ گو جنگ میں کام آنے والی چیزیں (پٹرول، کوئلہ، ربڑ، لوہا، ایلومنیم، تانبہ، شورا، گندھک وغیرہ) جرمنی اور اُس کے مقبوضہ علاقوں میں موجود ہیں۔ تاہم اُسے بہت سی چیزیں دوسرے ملکوں سے بھی منگانا پڑتی ہیں۔ مثلاً امریکہ۔ پولینڈ، رومانیہ اور روس سے جرمنی کو بہت سا پٹرول پہونچ سکتا ہے جس پر جرمنی طیاروں اور آبدوز کشتیوں کی تمام سرگرمیوں کا دار و مدار ہے لیکن پچھلے دنوں رومانیہ نے پٹرول دینے سے انکار کر دیا ہے۔ پولینڈ میں تیل کی مقدار بھی کافی نہیں ہے۔ اور روس اتنا تیل نہیں دے سکتا۔ جتنا جرمنی کو درکار ہے۔ اب صرف امریکہ باقی رہ گیا۔ لیکن ناکہ بندی کی وجہ سے امریکہ سے مال لانے میں بڑی قباحت ہے۔ اسلئے جرمنی نے یہ طریقہ نکالا ہے کہ بلقان کی ریاستوں سے معدنیات خرید کر جنوبی امریکہ کی کسی ریاست کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے اور اُسکے عوض ایسی چیز خریدتا ہے جس کی شمالی امریکہ کو ضرورت ہے اور اُس کی قیمت سے میکسیکو وغیرہ سے پٹرول خریدتا ہے۔ جسے سویڈن کے جہاز جرمنی تک پہونچا دیتے ہیں۔ مگر اب اتحادیوں نے اُن جہازوں کو (خواہ وہ غیر جانبدار ملکوں ہی کے کیوں نہ ہوں) گرفتار کرنا طے کر لیا ہے جنمیں جرمنی کو جانے یا وہاں سے آنیوالا مال بھرا ہوگا۔ ہالینڈ اور بلجیم نے اس کی پُرزور مخالفت کی ہے لیکن انگلستان اور فرانس اس کی پروا نہیں کر رہے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ غیر جانبدار سلطنتیں کیا صورت اختیار کرتی ہیں، اتحادیوں کے شریک ہوتی ہیں یا کھلم کھلا جرمنی کا ساتھ دیتی ہیں۔

امریکہ نے قانون غیر جانبداری میں حال میں ترمیم کی ہے اُس سے بھی اتحادیوں کو بڑی مدد ملی ہے۔

پروپیگنڈا کی جنگ بھی اس وقت خوب شد و مد سے جاری ہے۔ پچھلے دنوں میونخ کے ایک بیر گودام میں "وقتی بم" لگا کر ہٹلر کو قتل کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ مگر یہ کوشش کامیاب نہیں ہوئی۔ جرمنی نے اس حادثہ کو انگریزوں کی ریشہ دوانیوں پر محمول کیا ہے لیکن انگلستان کی طرف سے اس الزام کی پُرزور تردید ہو گئی ہے۔ جرمنی اور بھی بہت سی غلط خبریں اتحادیوں کے خلاف اپنے ریڈیو اسٹیشنوں سے بھیجتا رہتا ہے لیکن سمجھنے والے سمجھ سکتے ہیں کہ جرمنی کی اس وقت کیا حالت ہو رہی ہے اور اس کی کامیابی روز بروز مشکل ہوتی جاتی ہے

رنگین تصویر } اس ماہ کی رنگین تصویر جو نمازِ مغرب کی تیاری کا ایک دلآویز نقشہ پیش کرتی ہے ایک ہندو مصور کے کمالِ فن کا نمونہ ہے۔

ممیرہ اور سچے موتیوں کا سفید سرمہ

مصدقہ جناب نامی گرامی ڈاکٹر آر۔ کراپر صاحب بہادر ایف۔ سی۔ آر۔ ایس فیلو آف کیمسٹری لندن

جس کی بابت لندن۔ کلکتہ۔ پنجاب۔ آگرہ میڈیکل کالج کے سندیافتہ ڈاکٹروں، نوابوں اور راجاؤں و معزز حکما رصاحبان ڈپٹی کلکٹران و معزز یوروپین انگریزوں نے بعد تجربہ لکھا ہے کہ "ممیرہ اور سچے موتیوں کا سفید سرمہ آنکھوں کی بیماری اور ترقیِ روشنی کے واسطے مفید ہے اور سب سے زود اثر دوا ہے۔"

ملک روس و افریقہ کے معزز ڈاکٹروں اور ہندوستان کے حکیموں اور ویدوں نے آنکھوں کی بیماری میں اور دوا کو چھوڑ کر اس سرمہ کو استعمال کیا ہے۔

ہمارے سرمہ کا امتحان اور اسمیں کامیابی

نگاہ ناپ کر سرمہ لگائیے۔ دو ہفتہ میں روشنی بڑھ جائے گی اور جملہ نقائص دور ہو جائیں گے۔ عینک کی ضرورت نہیں رہتی۔ دھند۔ ڈھلکا۔ آنسو بہنا، سوزش۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا۔ پلکوں کے اندر کی سرخی، کونی دور ہو جاتی ہے۔ کمزور نگاہ سے سوئی میں تاگا بہت جلد ڈال لیجیے۔ پربال۔ سبل۔ پھولا۔ جالا، ناخونہ ابتدائی موتیابند، آنکھوں کے سامنے اندھیرا، ڈورا سا آنا بند ہو جاتا ہے۔ لکھنے پڑھنے سے آنکھوں کی تکان اور سرخی بہت جلد صاف کرتا ہے اور امراضِ چشم سے محفوظ رکھتا ہے۔ قیمت فی تولہ تین روپیہ محصولڈاک ۔ نمونہ ایک روپیہ سے کم قیمت پر نہیں ملتا۔ ملنے کا پتہ:۔ **منیجر نگم کمپنی۔ نیا چوک، کانپور**

ہاف ٹون عکسی تصاویر

ملک معظم جارج پنجم۔ شہنشاہ جارج ششم مع ملکہ الزبتھ۔ سابق شاہ ایڈورڈ ہشتم۔ لارڈ اربن۔ لارڈ لنلتھگو۔ رابندر ناتھ ٹیگور۔ سر صاحب جی مہاراج۔ سر علی امام۔ سر سی۔ وی۔ رمن۔ مسٹر سچدانند سنہا۔ سوامی دیویکانند، مولانا محمد علی۔ ایشور چند ودیا ساگر۔ سوامی شردھانند۔ ٹیپو سلطان۔ شہنشاہ اکبر۔ شہنشاہ حبش۔ نادر شاہ۔ راجہ مان سنگھ۔ سور داس۔ عبدالرحیم خانخاناں۔ شیواجی۔ رام داس گرو۔ وقتِ نزاع۔ غسل کی تیاری۔ شیر محمد قوال بھکارنی۔ لیلیٰ مجنوں۔ ہمدردی۔ سچ اور کانٹوں کا تاج۔ ذبح عظیم۔ عشق و زندگی تخیل ہڑتالی مزدور۔ کثرت میں وحدت۔ ماگھ، بھاگن وغیرہ موسمی تصاویر۔ قیمت فی تصویر ۸ر ملنے کا پتہ:۔ **زمانہ بک ایجنسی کانپور**

یورپ کی حکومتیں

(مصنفہ)

نجم الدین جعفری بی۔اے، ایل ایل ٹی و مظہر انصاری بی۔اے (آنرز)

ہندوستان میں سیاسی بیداری بڑی تیزی سے پھیل رہی ہے اور خواص و عوام ایسے سیاسی لٹریچر کی تلاش میں رہتے ہیں جو اُن کی سیاسی تربیت کر سکیں۔ صوبجاتی خود اختیاری اور فیڈریشن اسکیم سامنے ہوتے ہوئے ہندوستانیوں کو یوروپ کی حکومتوں کے طرز حکمرانی سے باخبر ہونے کی سخت ضرورت ہے۔

اس کتاب میں برطانیہ، فرانس، اٹلی، سوئزرلینڈ اور جرمنی کے نظام حکومت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ ہر ملک میں حکومت کے مختلف شعبے کس طرح فرائض حکمرانی سے عہدہ برآ ہوتے ہیں۔ ہر ملک کے تذکرہ حالات سے پہلے اُس کی سیاسی ارتقائی تاریخ بھی بیان کر دی گئی ہے۔

ضخامت ۲۲۵ صفحات، قیمت مجلد ایک روپیہ ۸؍

صدر دفتر:- مکتبہ جامعہ نئی دہلی

شاخیں:- جامع مسجد دہلی۔ لوہاری دروازہ لاہور۔ امین آباد لکھنؤ
پرنسس بلڈنگ نزد جے۔ جے اسپتال بمبئی ۳

The ZAMANA, December 1939, Regd. No. A 311

زمانہ

مرتبہ:- دیا نراین نگم بی-اے

نمبر ۶	دسمبر سنہ ۱۹۳۹ء	جلد ۷۴

فہرست

تصاویر:- آنکھ مچولی (رنگین)، حضرت آخر لکھنوی، و حضرت منور لکھنوی

قیمت سالانہ پانچ روپیہ عہ
زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا
نمونہ سات آنہ
ممالک غیر سے آٹھ روپیہ

یادگار پریم چند
مشہور رسالہ "زمانہ" کانپور
کا
"پریم چند نمبر"
(جس میں)
منشی پریم چند کے پرانے دوستوں اور اردو
کے بہترین انشاپردازوں اور شاعروں کے
چونتیس مضامین نثر اور تیرہ نظمیں ہیں،
منشی پریم چند کی زندگی اور ادبی کارناموں کا
ایک جامع اور مکمل مرقع پیش کیا گیا ہے،
منشی جی کی تصانیف کی فہرست انکا عکس تحریر
اور مختلف اوقات کی آٹھ ہاف ٹون تصاویر
بھی ہدیہ ناظرین کی گئی ہیں،
حجم خالص مضامین ۲۵۶ صفحات
تصاویر و ٹائیٹل علاوہ
زمانہ کے پرانے فائل
دفتر ہذا میں سے پرانے فائل موجود ہیں
کے قدردان ادب خوب واقف ہیں کہ
قدیم ترین اور مشہور رسالہ چونتیس سال سے اردو
ادب کی کسقدر انہماک و سرگرمی سے خدمت کر
اس کے نقادانہ مضامین اور گرانمایہ نظمیں ملک
بڑے بڑے نقادوں سے خراج تحسین حاصل کر
زمانہ کے پرانے فائل لائبریریوں میں رکھنے کے
چیز ہیں۔ صرف چند فائلیں باقی رہ گئی ہیں۔ خریدار
حسب ذیل رعایت کی جائے گی۔
۱۔ بارہ سال کے مکمل سٹ کے خریدار سے تیس
۲۔ چار سال کے خریدار سے تین روپیہ فی فائل
۳۔ ایک سال کے خریدار سے محصول علاوہ
نوٹ:۔ آرڈر کے ہمراہ چوتھائی قیمت پیشگی بھیج
فائل میں جوبلی نمبر باقی نہیں ہے۔
میں ستمبر کا پرچہ موجود نہیں۔
مختلف پرچے بھی آرڈر آنے سے مل سکتے ہیں۔
منیجر زمانہ کانپور سے طلب فرمایئے
واردات
منشی پریم چند مرحوم کے

راک فیلر کا انسان پرور ادارہ

بہت جلد کرۂ ارض پر ایک مقام بھی نہ رہے گا۔ جہاں راک فیلر فنڈ کو لوگ نہ جانتے ہوں۔ اور یہ اس لئے کہ شاندار ادارے کا مقصد جو جان ڈی راک فیلر جیسے انسان پرور کمپنی کا تیار کردہ ہے۔ اُن سو قوموں پر پہنچانا ہے۔ جہاں سائنس اور معاشرتی و تمدنی ترقیاں خطرے میں ہوں یا حفظانِ صحت کا سوال درپیش ہو۔ اس فنڈ کے بارے میں جو اتنے اعلیٰ مقاصد کے مدنظر کام کر رہا ہے۔ ایک امر واقعہ ہے جو یقینی طور پر مشہور بھی نہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ گذشتہ دس سال کے دوران میں اس فنڈ سے ۶ کروڑ ۴۰ لاکھ ڈالر سے امریکہ کے باہر مختلف ممالک میں فن طب کی ترقیوں پر صرف ہو چکے ہیں۔ اس تخمینے میں میڈیکل کالج اور ترتیب کے اخراجات بھی شامل ہیں۔ گذشتہ چند سال سے اس فنڈ میں ایک نیا شعبہ کھولا گیا ہے۔ جس سے ملیریا کے مٹانے پر کافی رقم خرچ کی جا سکے۔

اس اصول کے مطابق کہ کسی برائی کو اگر دور کرنا ہو تو پہلے اُس کی جڑ کاٹ دو۔ ضروری ہے کہ ہم کو اس بیماری (ملیریا) کے ایک جگہ سے دوسری جگہ لیجانیوالے ایجنٹ "انوفلی" (مچھر کی ایک قسم) کے متعلق کافی معلومات حاصل ہوں۔ کانفرنس اور سینما کے فلموں وغیرہ کے ذریعہ لوگوں کی توجہ "مچھروں" کے خطرے کی طرف مبذول کرائی گئی ہے۔ ہم راک فیلر فنڈ کی اس کارگذاری کا ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتے جو اس فنڈ نے کونین کی اشاعت میں پیش کی ہے۔ "کونین" وہ دوا ہے۔ جس کے فوائد سے ہر کوئی واقف ہے۔ مجلس بین الاقوام نے ملیریا کے دفعیہ کے لئے کونین کی مناسب خوراک ۶ گرین مقرر کی ہے۔ مذکورہ فنڈ نے اس دوا کے استعمال کی ترکیبوں کے ضمن میں بھی بہت نمایاں کام انجام دیئے ہیں۔ اور "دفعیہ شفا سے بہتر ہے" کے اصول پر عمل کرتے ہوئے ملیریا کے خلاف کونین سے جنگ میں بھی نمایاں حصّہ لیا ہے۔ اسی طرح اس فنڈ نے اور جنگوں میں بھی عملی حصہ لیا ہے جس سے مقصود اُن بیماریوں کا استیصال تھا جو انسانیت کو پریشان کرتی ہیں۔ ملیریا کمیشن نے ملیریا زدہ مریضوں کے علاج کے لئے ۱۵ سے ۲۰ گرین تک کونین کی خوراک ۵ دن سے ۷ دن تک روزانہ استعمال کرنے کی ہدایت کی ہے۔

کلیاتِ بحری

قاضی محمود بحری، ہندوستان کے اُن قدیم ترشاعروں میں سے تھے۔ جن کے سامنے زبان اُردو کی داغ بیل بھی پورے طور سے نہیں پڑی تھی۔ مگر پھر بھی جسقدر الفاظ رائج ہوگئے۔ اُنھوں نے اپنی سعی و کوشش سے اُنھیں اُردو زبان کا جامہ پہنا کر اُسی میں صوفیانہ اور عارفانہ و عاشقانہ خیالات کو نہایت عمدگی سے ادا کیا ہے۔ یہ مجموعہ بالکل نایاب اور ناپید تھا۔ جو جناب ڈاکٹر حفیظ۔ سید صاحب ایم۔اے لکچرار الہ آباد یونیورسٹی کو دستیاب ہوا۔ اور موصوف نے مدتوں کی محنت اور عرق ریزی کے بعد اسکی شرح فرماکر مطبع ہذا کو عنایت فرمایا۔ اور مطبع نے اُسکو نہایت صحت و اہتمام سے شائع کیا۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ زبان کے صحیح انقلابات دیکھیں، تو ضرور اس کتاب کو ملاحظہ فرمایئے، ریسرچ کیلئے اس سے بہتر کوئی کتاب دستیاب نہ ہوگی قیمت ۳ روپیہ

ملنے کا پتہ:۔ منیجر بکڈپو۔ مطبع نولکشور۔ لکھنؤ

کائناتِ دل

بھگوت گیتا منظوم موسومہ "نسیمِ عرفان" کے مشہور مصنف منشی بشیشور پرشاد منور لکھنوی کی بہترین نظموں کا مجموعہ

کائناتِ دل

اُردو علم و ادب میں ایک گرانقدر اضافہ ہے،
کائناتِ دل کی ہر نظم حسنِ بندش، لطفِ زبان، جدتِ تخیل اور شعریت کے لحاظ سے سحرِ سامری کا کام کرتی ہے
اور اُس کا افادی پہلو مزید برآں ہے۔

تمام ملک کے ذمہ دار رسالجات اور اخبارات میں
کائناتِ دل کی تعریف کی گئی ہے،
اور
اُس کے مقدمہ نگاروں میں علامہ عصر پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی بی۔اے دہلوی۔ ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ ایم۔اے، پی۔ایچ۔ڈی ڈی لٹ لکچرار پنجاب یونیورسٹی لاہور۔ مسٹر آصف علی بیرسٹر ایٹ لا، ایم۔ایل۔اے نیز منشی گوپی ناتھ امن جائنٹ ایڈیٹر روزنامہ "تیج" دہلی جیسے بلند پایہ نقاد اور انشاپرداز ہیں۔
قیمت مجلد ۱۲؍ ۔ غیر مجلد ۸؍ ۔ علاوہ محصول ڈاک۔

ملنے کا پتہ:۔ زمانہ بک ایجنسی۔ کانپور

"جدید اُردو کلکتہ" کا سالنامہ (بنگال نمبر)

مرتبہ:۔ احسن احمد اشک بی۔اے آنرز، سید منیر الدین بی۔اے

یہ سالنامہ بنگالی ادب، بنگالی مصوری اور بنگالی رومان کا مرقع ہونے کے علاوہ ملک کے بہترین اہل قلم حضرات کے رشحاتِ قلم سے آراستہ ہوگا۔ یہ نمبر بنگال سے اُردو زبان میں نکلنے والے واحد ماہانہ رسالہ کا پہلا سالنامہ ہوگا اُردو نواز حضرات سے التماس ہے کہ وہ رسالہ کی خریداری قبول فرماکر بنگال میں اُردو زبان کی توسیع اشاعت میں ہمارا ہاتھ بٹا کر اپنا اہم فرض انجام دیں۔

سالانہ چندہ ڈیڑھ روپے۔ قیمت فی پرچہ تین آنہ، قیمت سالنامہ بارہ آنہ

جو حضرات دسمبر ۳۹ء کے آخری ہفتہ تک رسالہ کا سالانہ چندہ بھیجکر خریداری قبول فرمائیں گے۔ اُنکی خدمت میں سالنامہ مفت پیش کیا جائیگا۔

ملنے کا پتہ:۔ منیجر "جدید اُردو" ۲۶ مارسڈن اسٹریٹ، ڈاکخانہ پارک اسٹریٹ۔ کلکتہ

ادکیہ سچوفی

زمانہ

جلد ۷۳ — دسمبر ۱۹۳۹ء — نمبر ۶

افسانہ حکایت و ناول

(از منشی جگیشور ناتھ ورما بیتاب بریلوی، بی۔ اے، ایل ایل۔ بی)

افسانہ دنیا کا قدیم ترین فن ہے، غالباً روز ازل ہی سے فطرت نے انسانی طبائع کو افسانے کی لطافتوں سے روشناس کر دیا تھا۔ یونانی حکماء کے قول کے مطابق یہ وہ ادبی کارنامہ ہے جو دیگر فنون لطیفہ کی دیوتاؤں کے نزول سے بھی پہلے عالمِ وجود میں آیا۔ اس لحاظ سے قیاس کیا جاتا ہے کہ افسانہ کی پہل وہی انسانی قوتِ گویائی کے ساتھ ہوئی، یعنی اُسے اظہار خیال کا سلیقہ آتے ہی قصہ کہانیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

یہ امر مسلمہ ہے کہ آدمی کے خیالات پر اس کے ماحول کا براہ راست اثر پڑتا ہے، چنانچہ وہ قدیم قصے جو فطری زبان کے بیش بہا سرمایہ ہیں، اور سینہ بسینہ ہم تک پہونچے ہیں اس حقیقت کا آئینہ ہیں کہ خدا کی ساری خدائی حضرتِ انسان کی مطیع و رہنما ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بنی نوع انسان کی نسل اوّلین نے فطرت کے اس راز کو ابتدا ہی سے اچھی طرح ذہن نشین کر لیا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی تاریک زندگی کے ابتدائی مراحل میں نباتات و جمادات سے لیکر وحوش و طیور تک کو اپنا رفیق و رہبر بنایا اور ان کے ذریعہ سے فطرت کے بہت سے راز سربستہ کے انکشاف کرنے کی کوشش کی۔

نئی دُنیا کے نامحرم انسان موسمی تغیرات، گرمی جاڑے اور برسات سے خائف ہو کر ان تبدیلیوں کے اسباب و علل سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کرتے اور اپنی نادانی و بے بضاعتی کے باعث انواع و اقسام کے مضحکہ خیز اوہام کی بھول بھلیاں میں پھنسکر ہر انقلاب کو کسی نہ کسی مافوق الفطرت ہستی کے قہر و مہر

کی جانب منسوب کر دیتے۔ جب کبھی مطلع ابر آلود ہوتا یا وسیع کائنات پر کہرے کی چادر مسلط ہو جاتی تو وہ کسی بیرونی و بعید از فہم ہستی کی بے پایاں جلالی طاقت کا تصور کر کے اس تبدیلی کو اس کے غیض و غضب سے تعبیر کر کے دل ہی دل میں لرزنے لگتے۔

انھیں تصورات کو انھوں نے جن بھوت اور دیو وغیرہ کا نام دے رکھا تھا۔ اور اپنے ذہن میں اُن کی مہیب جسامت و کریہہ شباہت کی عجیب و غریب شکلیں بنا لی تھیں۔ لیکن اس کے برعکس جب کبھی موسم بہار میں چودھویں کا چاند اپنے جلوؤں کے ساتھ بادل کے چھوٹے چھوٹے نورانی ٹکڑوں کے ساتھ اٹکھیلیاں کرتا نظر آتا تو اُن کے عقائد و دلائل میں ہیجان انگیز تضاد پیدا ہو جاتا، اور ان کا ذہن رسا معًا نازک خیالی کی عظیم الشان رفعتوں کو عبور کر کے دامنِ فکر کو گلہائے رنگا رنگ سے لبریز کر دیتا۔ اور تخئیل پہلے مجسموں کی ضد اِن کی آنکھوں کے سامنے لاکھڑی کرتی جو اُن کے نزدیک حور و پری کی مترادف ہوتی۔ چنانچہ جن، دیو اور بھوت پریت وغیرہ کے ساتھ ساتھ حور و پریوں کی بھی عجیب و غریب داستانیں مترتب ہوئیں۔

آہستہ آہستہ وہ وقت بھی آیا جب لوگ موسمی انقلابات کے عادی ہو گئے اور رفتہ رفتہ ان کا ڈر نکل گیا تو اُن کی قوت مدرکہ نے پاؤں پھیلائے جس کی وجہ سے وہ خارجی و مرئی اشیاء کا جائزہ لینے اور اپنی ہمسایہ اشرف مخلوق کو صحیح صحیح سمجھنے کی کوشش میں مصروف ہوئے۔ اب چرند و پرندان کے ہمدرد و رہنما تھے۔ جو آنے والے انقلابات سے انھیں قبل از وقت ہی مطلع کر دیتے تھے، اور ایسے کڑے وقت میں اُن کی دست گیری کرتے تھے، جب وہ اپنی عقل سے بعض گتھیاں سلجھا نہیں سکتے تھے۔

چکوی چکوے اور طوطا مینا وغیرہ کی بے شمار داستانیں اسی عہد کہنہ کی یادگار اور اسی ہمہ گیر صداقت کی علمبردار ہیں کہ انسان و حیوان سب ایک ہی لافانی محبت کے رشتہ میں منسلک ہیں۔ اس کے علاوہ اِن پارینہ داستانوں سے اس حقیقت کا بھی انکشاف ہوتا ہے کہ ان کے خالق و موجد جانوروں کی زبان سے نابلد نہ تھے۔ اور اپنے تجربات و مشاہدات کو آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ رکھنے کے متمنی تھے یہ وہ زمانہ تھا جب انسان اپنی زندگی بالکل فطرت کے مطابق بسر کرتا تھا، اور اس کی فطری قوتیں اس کے رنج و راحت میں برابر کی شریک تھیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ جب طولانی داستانوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا گیا اور اُن کا ازبر کرنا دوبھر ہو گیا تو پند و نصائح اور برسوں کے تجربات کے نچوڑ کو دوسروں تک پہنچانے کے لئے حکایات کی بنیاد ڈالی گئی۔ اس کے بعد انسان کی فکر رسا افسانہ کی طرف رجوع ہوئی۔ اور چھیلی بھٹیاری اور اسی قماش کے افسانے وجود میں آئے جس میں پاکبازوں ٹھگوں، لٹیروں، تماش بینوں اور طوائفوں وغیرہ کے حالات بیان کرنے کی کوشش کی گئی لیکن چونکہ ابھی تک

داستانوں کا رنگ عام طبائع پر غالب تھا۔ اس لئے یہ قصے بھی ایک نئی قسم کی معجون مرکب بن کر رہ گئے بالآخر انگریزی علم ادب کے اثرات نے اس آئینہ پر جلا کی اور اسے واقعیت سے ہمدوش کرکے "افسانہ" کی حدود میں داخل کر دیا۔

دنیا کی تقریباً تمام زبانوں میں افسانوں کو جتنا فروغ حاصل ہوا ہے وہ کسی دوسری چیز کو حشر تک نصیب ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔ اس اعتبار سے مغرب میں جس طرح روسی اور فرانسیسی زبانوں کا پایہ بلند ہے اسی طرح ہمارے یہاں اولیت کا سہرا بنگلہ زبان کے سر ہے اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ مغربی تمدن اور علم ادب سب سے پہلے بنگال ہی پر اثر انداز ہوئے۔

یہ بتانا مشکل ہے کہ کہانیاں لکھنے کا آغاز کب اور کس طرح ہوا۔ تاہم یہ یقینی ہے کہ اس کی ابتدا سنسکرت زبان ہی سے ہوئی ہے۔ جہاں سب سے پہلے دنت کتھاؤں (दन्त कथाओं) کا رواج شروع ہوا۔ چنانچہ پرانوں (पुराणों) میں اس قسم کی بیشمار کہانیاں مدفون ہیں جنھیں ہم اس فن لطیف کے اولین نقوش کہہ سکتے ہیں۔ یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ چکی ہے کہ یونان اور روما میں بھی (Mythological Tales) ہی سے کہانیاں لکھنے کی ابتدا ہوئی ہے۔ فن کے اعتبار سے یہ کہانیاں مختصر افسانوں کے ذیل میں نہیں آسکتیں۔ زیادہ سے زیادہ ہم انھیں داستانوں کے تحت میں رکھ سکتے ہیں مگر جیسا کہ آگے آئیگا داستان اور افسانوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

غالباً دنت کتھاؤں کی تصنیف سے تفریح و تفنن کے ساتھ ساتھ تکوین عالم کے اسباب کا تخئیلی منظر پیش کرنا بھی مقصود تھا۔ مگر یہ داستانیں اپنی تمام جدتوں اور رنگینیوں کے باوجود بہت طویل و غیر مربوط تھیں اور ان میں کوئی اصلاحی پہلو نہ ہوتا تھا۔ اس لئے چھوٹے چھوٹے درشٹانت لکھے جانے لگے جن کے لئے ہندوستان کا روحانی ماحول خاص طور پر موزوں ثابت ہوا۔ اہل ہند کی دیکھا دیکھی مغربی دنیا میں بھی حکایات (Tales) کا رواج شروع ہوا۔

اس کے بعد زمانہ نے دوسری کروٹ لی۔ چنانچہ ہندوستان میں منظوم افسانوں کا دور شروع ہوا۔ رامائن اور مہابھارت اس عہد کی سنہری یادگار ہیں۔ ان قابل قدر تصانیف کی تاریخی اہمیت سے قطع نظر کی جائے تو واضح ہوگا کہ ان میں داستانوں کے علاوہ ناول ناٹک اور مختصر افسانوں کا مواد بھی بکثرت موجود ہے۔ اس حیثیت سے ہم سنسکرت نظم کو اکثر اصناف ادب کا ماخذ قرار دے سکتے ہیں۔ اور کسی حد تک یہ کہنا بھی صحیح ہوگا کہ یہ نظمیں قدیم افسانوی ادب کے تمام ارتقائی مدارج کے آئینہ دار ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سنسکرت میں غالباً اس طرح کی کہانیاں لکھنے کی براہ راست کوئی کوشش نہیں کی گئی جو اصطلاحی نقطۂ نظر سے ہمارے

زمانہ کے ناول وافسانہ کے مقابلہ میں رکھی جاسکیں۔ قدیم سنسکرت میں افسانہ لکھنے میں جو پابندیاں مدِ نظر رکھی جاتی تھیں، اُن سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔

اُردو ادب میں افسانہ ایک جدید صنفِ ادب ہے جس کی ابتداء داستانوں حکایتوں اور منظوم افسانوں سے ہوئی ہے۔

غالباً خود شناسی کی اُمنگ ہی جدید افسانہ کی اپج کی محرک ہے۔ حیات اور کشمکش حیات کے لطیف سے لطیف پہلو کو نمایاں کرنا افسانہ کی ادنیٰ کرامات ہے۔ افسانہ فی الحقیقت گدیہ کادیہ (गद्य काव्य) یا نثر شاعری کا ایک اہم جزو ہے۔ افسانہ ایک مختصر کہانی تو ہوسکتا ہے لیکن ہر مختصر کہانی افسانہ نہیں ہوسکتی۔ ورنہ یوں تو دنیا اور اس کی ہر چیز بجائے خود ایک افسانہ ہی ہے۔ ٹھیک اسی طرح ناول کو بھی طویل افسانہ نہیں کہا جاسکتا ہم افسانہ کو داستان اور حکایت کجا خود ناول کا خلاصہ بھی نہیں کہہ سکتے۔ ناول میں جو پھیلاؤ اور اہتمام اور طوالت ہوتی ہے اس کی افسانہ میں کہاں گنجائش ہوسکتی ہے۔ لیکن ہر طویل افسانے میں ناول کی خصوصیات کا موجود ہونا بھی ضروری نہیں ہے۔ اس کے علاوہ یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ ناول متعدد افسانوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ واقعات کی ترتیب ایک مختصر افسانہ کو طول دے سکتی ہے لیکن اس میں ناول کا رنگ بھرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔

افسانہ کی ماہیت ذہن نشین کرنے کے لئے ہمیں یہ جان لینا ضروری ہے کہ اس کی کونسی خصوصیات اُسے ناول داستان یا حکایت کے زمرہ سے خارج کرتی ہیں۔

جہاں تک داستان کا تعلق ہے اس پر طویل یا مختصر ہونے کی کوئی پابندی نہیں ہے۔ اور نہ اس کا فطری ہونا یا حقیقت کے مطابق ہونا لازمی ہے۔ داستان کے لئے یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ وہ ایک خاص نتیجہ پر پہنچکر ختم ہو یا ناظرین کا معیارِ زندگی بلند کرنے میں مدد دے۔ داستان محض تفریح وتفنن کا سامان فراہم کرسکتی ہے۔ لیکن اس میں کوئی شئے موجود نہیں ہے جو نشاطِ روح کی کفیل اور دماغی غذا کی ضامن ہو۔ کردار نگاری سے داستان کا دُور کا بھی واسطہ نہیں ہے لیکن اس کے برخلاف کردار نگاری ہی افسانہ کی جان ہوتی ہے اور اس کی امتیازی خصوصیت اس کا غیر معمولی اختصار ہے۔ افسانہ ہمیشہ حقائق وواقعات کا آئینہ ہوتا ہے جس میں زندگی کا ایک نہ ایک روشن ومعیاری پہلو بخوبی نظر آتا ہے۔ اور جو براہ راست دل ودماغ پر اثرانداز ہوکر وسعت نگاہ و بالغ نظری کا باعث ہوتا ہے۔

افسانہ پر سرتاسر شعریت چھائی رہتی ہے۔ لیکن داستان کی طرح حکایت بھی اس سے قطعاً خارج ہوتی ہے۔ جس طرح داستان کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ ہمیشہ انسانی زندگی ہی سے متعلق ہو اسی طرح

حکایت کے لئے بھی اِس قسم کی کوئی قید نہیں لگائی جاسکتی۔ حکایت بالعموم افسانہ سے بھی زیادہ مختصر ہوتی ہے اور پند و نصائح کی وجہ سے داستان کی طرح لغو بھی نہیں ہوتی۔ اس کے ساتھ ہی وہ وعظ کی طرح خشک و بے کیف ہوتی ہے، اور اس کا انداز بیان افسانہ کی طرح شاعرانہ نہیں ہوتا۔ حکایت میں واقعیت ہوسکتی ہے۔ لیکن اُس میں رنگ و بُو کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ داستان کا انداز بیان شوخی و رنگینی سے آشنا ہوتے ہوئے بھی ناول یا افسانہ کی طرح جمالیاتی و نفسیاتی موشگافیوں سے معرا ہوتا ہے۔ حکایت میں بھی یہی کمی رہتی ہے اسی لئے حکایت اور داستان کا اثر بالکل عارضی اور فانی ہوتا ہے لیکن افسانہ اور ناول کا اثر مستقل اور دیرپا ہوتا ہے۔ غالباً اسی لحاظ سے داستان اور حکایت کا مرتبہ دیگر اصنافِ ادب میں اس قدر پست ہے کہ بعض اہل الرائے انھیں اپنے ادبیات میں کوئی جگہ دینے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

ناول اور افسانہ کا بنیادی فرق یہ ہے کہ ناول میں زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بیک وقت روشنی ڈالی جاسکتی ہے، اور ہر پہلو کو بالتفصیل پیش کیا جاسکتا ہے۔ لیکن افسانہ میں یہ وسعت و طوالت نہیں ہوتی اور اس کا میدان عمل تصویر کے کسی خاص رخ کی نقاب کشائی تک محدود ہوتا ہے۔ ناول کی طرح اس کی ضخامت و طوالت لامحدود نہیں ہوتی اور نہ اس میں اِس قدر گنجائش ہوتی ہے کہ متعدد و متضاد کرداروں کو پیش کرکے زندگی کے مختلف مسائل پر شرح و بسط کے ساتھ بحث کی جاسکے۔ ناول میں اس کے لئے ایک وسیع میدان موجود ہے۔ اسی لئے اس میں افسانہ کی بہ نسبت کردار نگاری کے بھی اچھے مواقع بکثرت ملتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ افسانہ ناول کی کمی کو پورا کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ ناول میں طوالت کے ساتھ ساتھ واقعات کا پھیلاؤ بھی ممکن ہے۔ لیکن افسانے میں اس کی بھی بندش ہے۔ افسانہ میں ناٹک کی طرح صرف اشارہ و کنایہ سے کام لینا پڑتا ہے۔ ناولوں میں بال کی کھال کھینچی جاسکتی ہے۔

تاریخ گذشتہ واقعات کی روشنی میں اقوامِ عالم کے عروج و اقبال، زوال و ادبار کے اسباب سے بحث کرتی ہے۔ لیکن افسانہ افراد کی زندگی کی بعض عالمگیر حقیقتوں اور صداقتوں پر مبنی ہوتا ہے۔ جن واقعات پر افسانہ کی بنیاد رکھی جاتی ہے وہ اس کی تخلیق سے پہلے عرصۂ ظہور میں آچکتے ہیں۔ بہرحال ان کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ ناممکن الوقوع نہ ہوں۔ ہرچند تاریخ کی طرح افسانے کا انحصار بھی واقعات ہی پر ہوتا ہے لیکن محض واقعات و حقائق ہی کا نام شاعری نہیں ہے افسانہ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے شاعری کی ایک خاص صنف ہے اور تاریخ و شاعری میں بعد مشرقین ہے۔ چنانچہ تاریخی افسانے بھی تخیلی کہانیوں

کی ہمسری نہیں کر سکتے تاہم تاریخ اور تاریخی افسانوں کے مطالعہ سے یہ تفریق بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے اس کے علاوہ تاریخ میں جن واقعات کا ذکر ہوتا ہے وہ نام و مقام کے علاوہ سب کے سب درست ہی نہیں ہوا کرتے، لیکن افسانے میں نام و مقام فرضی ہوتے ہوئے بھی باقی تمام باتیں زندگی کی ہمہ گیر صداقتوں سے سرروش ہوتی ہیں۔ اور اُن پر مکان و زمان کی قیود کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

کہانی کا موضوع ایسا ہونا چاہیئے جس کی مکمل توضیح و تشریح اس کے محدود حلقہ میں آسانی سے ہو سکے اور اس میں مزید اضافہ یا پھیلاؤ کی گنجائش باقی نہ رہے۔ افسانے میں غیر ضروری عناصر کا داخل کرنا ممنوع ہے۔ تاہم اس سے ایسے نتائج مترتب ہونا چاہیئے جن کی صداقت عہد و عصر اور محل و مقام کے لامحدود اثرات سے متزلزل نہ ہو سکے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کہانی میں صرف ایک ایسے مختصر واقعہ کا ذکر ہو جو صرف چند لمحات پر حاوی ہو۔ بلکہ اس میں زندگی کے مختلف پہلوؤں پر اس انداز سے روشنی ڈالی جائے جو مستقل ادب کی تعمیر میں معاون ہو۔ کہانی کی کامیابی کا بہت کچھ انحصار مصنف کے زورِ قلم اور قوتِ بیان پر ہے۔ اس کے لئے طرزِ بیان کا شگفتہ سادہ اور اچھوتا ہونا لازمی ہے۔ زبان کی رنگینی تو معیوب نہیں ہے، لیکن شوخی پست مذاقی کی دلیل ہے۔ مغرب کے تمام نقاد اس بارے میں متفق الرائے ہیں کہ پلاٹ کی ندرت ہی افسانے کی حقیقی دلکشی کی ضامن ہوتی ہے۔

افسانے کی زبان کے متعلق کوئی سخت پابندی عاید کرنا ضروری نہیں۔ لیکن محض زبان کی خاطر افسانہ لکھنا ناقابلِ معافی حماقت ہے۔ زبان خیال کا لباس ہے اور لباس کی سادگی ہی دلکشی کا باعث ہے۔ اس لئے زبان کی پیچیدگیوں میں خیال کی ندرت و لطافت کو محو کر دینے سے اصل مدعا کے فوت ہو جانے کا احتمال رہتا ہے۔ غیر معمولی تکلف و تصنع سے ذاتی محاسن پھیکے پڑ جاتے ہیں جس کی وجہ سے پیاسی نگاہوں کی تسکین نہیں ہوتی۔ پھر قبائے گل کو گل بوٹے کی ضرورت ہی کہاں ہے؟ ہر فوق الیبڑک پس منظر اصلی نقوش کی دلچسپیوں کو پس پشت ڈال دیتا ہے جس سے تصویر کی خوبیاں آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی ہیں یہ عالمگیر صداقت افسانہ اور اس کے اسلوب بیان پر بھی صادق آتی ہے۔ اس لئے زبان کے معاملہ میں اعتدال ایک نہایت ضروری چیز ہے۔

کہانی محسوسات اور اطوار و کردار کی ایک دنیا ہوتی ہے۔ لیکن اس میں احساس یا کردار کے کسی ایک پہلو سے بھی بخوبی بحث کی جاسکتی ہے۔ اور اس اعتبار سے اس میں اتنی کثیر التعداد اور ہمہ گیر حقیقتوں کی وضاحت کی جاسکتی ہے، جو طویل سے طویل ناول میں بھی نہیں سما سکتیں لیکن اگر مختصر کہانی میں کسی کریکٹر کی ساری زندگی کے تمام واقعات بھرنے کی کوشش کی جائے تو بجو

کامیابی نصیب نہیں ہو سکتی۔

افسانے کا حلقۂ اثر اہل الرائے کی نگاہ میں بہت وسیع ہے۔ ہنسانا، رُلانا، حیرت میں ڈالنا اور طوب لوگوں کو سراپا ہمدردی بنا دینا افسانے کا ادنیٰ معجزہ ہے۔ ایسے ہنگامی افسانے جو پست جذبات کے محرک ہوں لغویات میں شمار ہوتے ہیں۔ نفرت و حقارت و تعصب پھیلانے والے افسانے محبت و رواداری کی علمبردار کہانیوں کے مقابلے میں بہت کم مقبول ہوتے ہیں۔ ہر کہانی جس میں مستقبل کو روشن و بہتر بنانے کی تلقین کی جائے اور جو لوگوں کو نا اُمید ہونے کی بجائے آئندہ اصلاح کی جانب راغب کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو اس فن کا نادر نمونہ سمجھی جائیگی۔

افسانے کی غایت یہ ہے کہ اس کے آلۂ کار اور انجام میں توازن اور ہم رنگی ہو۔ کہانی کی غایت صرف ایک ہی ہوتی ہے، جسے تنوع کے ساتھ آخر تک نباہا جاتا ہے، اور ایک خاص نتیجہ پر پہنچکر اس کی تکمیل کردی جاتی ہے۔ اس طرح کوئی مخصوص و مطلوب نتیجہ اخذ کرکے معینہ انجام تک نہ پہنچا سکنا ناکامی کی دلیل ہے۔ اس کے برعکس افسانہ کی غایت اور اس کے انجام کی یکسانیت اس کی کامیابی کا بیّن ثبوت ہے۔

افسانہ کا آغاز اور انجام دونوں بڑے معرکہ کی چیزیں ہیں۔ ساری کہانی میں صرف انھیں دو مقامات میں مصنف کا کمال فن ظاہر ہوتا ہے، جس طرح کسی لمبی تمہید سے کہانی کا افتتاح کرنا معیوب ہے، اُسی طرح انجام کا بھی مختصر و جامع ہونا ضروری ہے۔ بعض مبصرین کا قول ہے کہ کہانی کے آغاز اور انجام پر نظر ڈالنے کے بعد ہی اس کا مرتبہ قائم کیا جاسکتا ہے۔ اس لئے افسانے کی ابتدا ہمیشہ کسی ایسے مقام سے ہونا چاہیئے جس سے اس کی دلکشی میں اضافہ ہو سکے اور کہانی بھی واقعات کے تسلسل کے لحاظ سے نامکمل و تشنہ نہ رہے۔ یہی خوبی اس کے اختتام میں بھی بدرجۂ اتم موجود رہنا چاہیئے۔

پہلے کہا جاچکا ہے کہ ہر افسانے کا مختصر ہونا اس کی بنیادی خصوصیت ہے، یہی وجہ ہے کہ علمائے افسانہ نگاری کے لئے بہت سی شرطیں لگادی ہیں۔ ایک مغربی نقاد کا قول ہے کہ کہانی میں کوئی ایک حرف بھی لغو اور غیر ضروری نہ ہونا چاہیئے۔ اس احتیاط کے باوجود اس کا مکمل ہونا شرط ہے۔ مختصر یہ کہ اس کا کوئی ضروری جزو اختصار کی نذر نہ ہونے پائے۔ تاکہ اس میں کسی چیز کا نقصان محسوس نہ ہو۔ اس سے ظاہر ہے کہ افسانے کے لئے پلاٹ یا کتھانک کی تشکیل کس قدر مشکل کام ہے۔ ہر وہ واقعہ یا مجموعۂ واقعات پلاٹ ہے جس سے ایک خاص مقصد کے تحت کردار کی تخلیق اور اس کے انجام کو واضح کرنے میں مدد مل سکے۔ اس لئے ضروری ہے کہ افسانہ نگار اپنے اغراض و مقاصد کو پیش نظر رکھکر واقعات کو اس طرح ترتیب دے کہ ایک محدود دائرے میں افراد کی زندگی کا مختصر سا خاکہ پیش ہوجائے اور حقائق زندگی اور

لوگوں کے کردار روشن ہو جائیں اور اس کے ساتھ ساتھ واقعات میں اول سے آخر تک جدت، تنوع اور تسلسل بھی قائم و برقرار رہے۔

مگر افسانے میں ناول کی طرح تسلسل اور تضاد دونوں کی کوئی گنجایش نہیں ہوتی اس لئے افسانہ نگار کے لئے غیر ضروری تفصیلات سے اجتناب کرنا ضروری ہے۔ افسانے کے ماحول کو اس ڈھنگ سے نمایاں کرنا چاہیئے جس سے جزو میں کل کی حقیقت منکشف ہو جائے۔

ہر چیز جو حقیقت کی آئینہ دار ہو کہانی کا موضوع بن سکتی ہے، بشرطیکہ اس میں کردار نگاری کی گنجایش ہو۔ افسانہ محض اسکیچ اور سیرت نگاری تک ہی محدود نہیں ہوتا۔ کہانی میں افراد کی شکل و شبہات اور عادات و اطوار کا اجمالی تذکرہ بھی اس انداز سے کیا جاتا ہے کہ واقعات کے تسلسل میں کوئی خلل واقع نہ ہو۔ اس لحاظ سے اسکیچ اور سیرت نگاری کہانی ہی کا ایک "جزو" قرار پاتے ہیں۔

وہ افسانے جن کا نصب العین بلند و رفیع ہوتا ہے۔ اور جو انسان کے لطیف جذبات کے حامل ہوتے ہوئے انبساط روح اور ترقی دماغ کا سامان فراہم کرتے ہیں صف اول میں جگہ پانے کے مستحق ہیں۔

تیس سال پہلے

حضرت اکبر مرحوم الہ آبادی زمانہ کے خاص قدردانوں میں تھے، چنانچہ ایک عرصہ تک اخبارات و رسائل کی مضمون نگاری سے کنارہ کش ہو جانے کے باوجود آپ نے سب سے پہلے ایڈیٹر زمانہ کی تحریک پر رسالہ زمانہ کو اپنا کلام نظم و نثر بھیجنا شروع کیا اور آخر عمر تک اپنے قلمی احسانات کا سلسلہ جاری رکھا۔ تیس سال پہلے دسمبر ۱۹۰۹ء کے رسالہ زمانہ میں کلام اکبر ہدیۂ ناظرین ہوا تھا۔ اسی سے چند اشعار موجودہ ناظرین رسالہ کے تفنن طبع کے لئے درج ذیل ہیں۔ بعض باتیں ملک کے موجودہ حالات پر بھی صادق آتی ہیں:۔

سب اسی میں مصروف ہیں حاصل کی نہ پوچھو | مغرب کے خضر ساتھ ہیں منزل کی نہ پوچھو

ہے بحر مباحث میں رواں کشتی امید | لہروں کی لپک دیکھ لو ساحل کی نہ پوچھو

ملک پر تاثیر چشم یار طاری ہو گئی | صفت شیخ و برہمن میں فوجداری ہو گئی

وہ نہ سمجھے گا جو ایسے معنے سے بیگانہ ہے | دیر میں بھی کعبہ ہے اکعبہ میں بھی بت خانہ ہے

اُڑے جاتے ہیں ہم خود اپنی نظروں سے ستم یہ ہے | بدل جاتے تو کچھ رہتے، مٹے جاتے ہیں غم یہ ہے

نہ کوئی تکیہ باہمی ہے نہ پیار باقی ہے اب دلوں میں | یہ صرف تحریر میں ڈیر سر ہے، یا جناب مکرمی ہے

کہاں کے مسلم کہاں کے ہندو بھلائی ہیں سب نے اگلی رسمیں | ہر اک کو کرسمس کی فکر میں ہے نہ گیارھویں ہے نہ اشٹمی ہے

وادیٔ نیپال

(از پرنسپل رام پرشاد کھوسلہ ناشاد ایم اے)

اک ہماچل کے پہاڑوں میں نہاں وادی ہے گھر جوانمردوں کا ہے مسکنِ آزادی ہے
شیرِ خونخوار گرجتے ہیں جہاں غاروں میں ناچتے کبک وری رہتے ہیں کہساروں میں
جھولتی رات دن آزادی ہے گہواروں میں
سُورسیروں کی جہاں دیر سے آبادی ہے

ہے مناسب جو اسے وادیٔ ایمن کہیئے یا اسے راحتِ جاوید کا مسکن کہیئے
سبز اشجار کہیں وجد میں لہراتے ہیں کہیں دھانوں کے ہرے کھیت نظر آتے ہیں
کہیں مرغانِ چمن حمدِ خدا گاتے ہیں
ہے بجا گر اسے فردوس کا گلشن کہیئے

لطف دیتی ہیں کہیں باگمتی کی لہریں کہیں چشمے ہیں رواں جیسے عروضی بحریں
کون سا راگ ہے جو اس کی نواؤں میں نہیں کون سا رنگ ہے جو اس کی فضاؤں میں نہیں
کون سا ناز ہے جو اس کی اداؤں میں نہیں
ہر طرف بہتی ہیں موجوں سے ہوا کی نہریں

دامنِ کوہ میں اک گوشۂ تنہائی ہے کہ جہاں خلق کو قدرت سے شناسائی ہے
شور و ہنگامۂ عالم سے بہت دُور ہے وہ نظرِ دہر سے رُوپوش ہے مستور ہے وہ
پردۂ حسن میں لپٹی ہوئی اک حُور ہے وہ
حُسنِ قدرت کی وہاں انجمن آرائی ہے

یہ وہ گلشن ہے جہاں غنچۂ دل کھلتا ہے قلب کو سرد ہواؤں سے سکوں ملتا ہے
یہ وہ وادی ہے جہاں بزمِ طرب بہتی ہے اپنے اسرار جہاں قدرتِ حق کہتی ہے
جہاں بل کھاتی ہوئی موجِ صبا بہتی ہے
ان ہواؤں میں مسرت کا فسوں ملتا ہے

اِسی وادی میں کبھی للتا پٹن بستا تھا اِسی وادی میں نواڑوں کا چمن بستا تھا
اِسی وادی میں اشوکا کا گذر ہوتا تھا اِس کے ہی پاس مہابیر کا گھر ہوتا تھا
کبھی پرچار اہنسا کا ادھر ہوتا تھا
اِسی وادی میں کبھی باغ عدن بستا تھا

یہ وہ گلشن ہے فقط گُل ہوں جہاں خار نہ ہو یہ وہ خرمن ہے جہاں برقِ شرر بار نہ ہو
اس چمن سے اثرِ بادِ خزاں دُور رہے بادۂ رحمتِ باری سے یہ مخمور رہے
خوش و خرّم رہے خنداں رہے مسرور رہے
گردشِ دَورِ زماں سے یہ کبھی خوار نہ ہو

وید کا قومی گیت

(از جناب فضل اللہ لبمل سیتاپور)

(۱)

اے مادرِ وطن! یہ پہاڑوں کی چوٹیاں شرما رہا ہے جن کی بُلندی سے آسماں
جھیلوں کا وہ عُمق کہ گُہر کا قیام ہے میداں کی وسعتوں کا تخیّل غلام ہے
یہ جھومنا درختوں کا، سو مستیاں لئے جیسے بھگت ہوں جھومتے، یادِ خدا لئے
یہ بادلوں کا سایہ، یہ برسات کی فضا پُرکیف، سبز سبز سے کھیتوں کی ہر ادا
اے ماں! ہمارے واسطے راحت فزا ہوں یہ!
بارش ہو شانتی کی، مسرت فزا ہوں یہ!

(۲)

یوں ندیاں رواں ہوئیں، جیسے کہ بحرِ حُسن ہے ساحلوں کی گود میں تاثیرِ سحرِ حُسن
یہ جوئبار اور یہ نکھری ہوئی فضا یہ خنکیِ لطیف، یہ گاتی ہوئی فضا
یہ پھُول اور پھل، یہ ہوا اور یہ بہار چشموں کے میٹھے گیت، یہ سبزہ، یہ مرغزار
سُکھ اور شانتی کے سہارے لئے رہیں!
ہم ان کے واسطے، یہ ہمارے لئے رہیں!

شاعری کی عظمت کا معیار

از حضرت وصل بلگرامی

شاعری اور حسنِ فطرت کے یہ دو ایسے کارنامے ہیں جن کی تعریف دنیا کے بڑے بڑے لوگوں نے کی ہے لیکن باوجود ان تمام کوششوں کے اب تک ہم کسی تعریف پر نہیں پہونچے جس کو ہم مکمل کہہ سکیں۔

اگر ہم سے کوئی سوال کر بیٹھے کہ شعر یا حسن کس کو کہتے ہیں تو شاید ہم کو سینٹ آگسٹائن کے الفاظ دہرانا پڑیں جو دوسرے معاملات کی نسبت کہا کرتا تھا کہ:۔

"اگر مجھ سے دریافت نہ کیا جائے تو میں سب کچھ جانتا ہوں لیکن اگر مجھ سے پوچھا جائے، تو میں کچھ نہیں جانتا"

حقیقت تو یہ ہے کہ جس شخص کو حسن و شعر سے ذرا سا بھی لگاؤ ہوگا (میں یہاں یہ اتنا اور کہے دیتا ہوں کہ حسن و شعر سے لگاؤ ہونا اور انسان ہونا کوئی دو باتیں نہیں) وہ یہ ضرور سمجھتا ہوگا کہ میں اس شے کی بابت بہت کچھ جانتا ہوں، لیکن اس علم کو الفاظ کی شکل میں پیش کرنا ذرا مشکل ہے۔

ہمارے سامنے شعر کی ہزاروں تعریفیں ہیں۔ مختصر بھی اور طویل بھی۔ لیکن جب ہم غور کرتے ہیں، تو ان سے کوئی مدد ملتی نظر نہیں آتی۔

یہاں تک تو شعر کا تعلق ہے اب شعر کی عظمت و خوبی پر غور کیجئے۔ ابھی میں عرض کر چکا ہوں کہ حسن و شعر کی تعریف دنیا کے بڑے بڑے لوگوں نے کی۔ لیکن وہ سب تعریفیں نامکمل رہیں۔ اب ان دونوں کو ایک کر دیجئے اور ایک حسین شعر کی تعریف کیجئے۔ آپ کہیں گے اب تو اور بھی مشکل کا سامنا ہے لیکن آپ اس امر سے بھی انکار نہیں کر سکتے کہ آپ بعض اشعار کو اچھا دوسرے لفظوں میں حسین اور بعض کو برا کہتے ہیں۔ یہ کیوں؟ پھر اچھے اور برے میں بھی درجے پائے جاتے ہیں۔ آپ کہیں گے کہ جو شعر ہم کو اچھا معلوم ہوتا ہے وہ اچھا ہوتا ہے اور جسے ہم پسند نہیں کرتے وہ برا ہوتا ہے۔ لیکن میں آپ سے سوال کروں گا کہ آخر آپکے اچھے سمجھنے کا معیار کیا ہے؟

اچھا آیئے، ان باتوں کا جواب ہم سب سے پہلے ارسطو سے پوچھیں، وہ کہتا ہے کہ:۔

"شاعری کی ابتدا دو وجوں سے ہوئی ہے، جنھیں سے ہر وجہ انسانی فطرت کا جزو ہے۔ انسان..."

نقل کرنے کا مادہ بچپن سے ہوتا ہے اور انسان کو جو فوقیت دوسرے جانوروں پر حاصل ہے۔ وہ یہ کہ وہ سب سے زیادہ نقال جانور ہے اور نقل ہی سے وہ علم بھی حاصل کرتا ہے اور نقل کو دیکھ کر خوش ہونا یہ بھی انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ ہمارا تجربہ دوسرے امر کی شہادت دیتا ہے خواہ وہ چیزیں کتنی ہی دردناک ہوں۔ لیکن ہم اُن کو اصل کے مطابق دیکھنا چاہتے ہیں۔ ایک دوسری بات سے بھی یہ امر واضح ہوجاتا ہے کہ کسی چیز کی بابت معلومات حاصل کرنا ایک فلسفی ہی کے لئے نہیں، بلکہ ہر انسان کے لئے سب سے بڑی خوشی ہے۔ اس خوشی کی وجہ یہ ہے کہ وہ ساتھ ہی ساتھ معلومات بھی حاصل کرتا ہے، یہی نقالی کا ملکہ بڑھ کر شعر کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔"

ارسطو ان الفاظ میں شعر کی پیدائش کا ذکر کرتا ہے، گویا اُس کے نزدیک فطرت کی نقل کا نام شعر ہے، جس کا منطقی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فطرت کا سب سے بڑا نقال سب سے بڑا شاعر ہے۔ اور فطرت کی عمدہ نقل عمدہ شعر ہے۔ اچھا مومن کا ایک شعر سُنئے ؎

پیہم سجود پائے صنم پر دم وداع مومن خدا کو بھول گئے اضطراب میں

فطرت کی کتنی اچھی نقل ہے۔ بُت کافر کے قدموں پر بار بار سجدہ کرنا، اور پھر خدا یاد آجانا کیسی پتے کی بات ہے۔ لیکن سچ بتائے کہ آپ نے اس شعر کو سُن کر کبھی یہ بھی خیال کیا ہے کہ چونکہ یہ فطرت کی نقل ہے اس لئے اس کو ہم شعر کہتے ہیں، اور پھر چونکہ اچھی نقل ہے اس لئے اچھا شعر ہے، یا مثلاً ذیل کے اشعار ؎

زمانہ برسرِ آزار تھا، مگر فانیؔ تڑپ کے ہم نے بھی تڑپا دیا زمانے کو

قفس کی یاد میں جی چاہتا ہے اب تو جگرؔ لگا کے آگ نکل جاؤں آشیانے کو

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

تیرا ان نیم باز آنکھوں میں ساری مستی شراب کی سی ہے

کیفیتِ چشم اُس کی مجھے یاد ہے سوداؔ ساغر کو مرے ہاتھ سے لیناکہ چلا میں

ان کو سُن کر کون کہے گا کہ فطرت کی عمدہ نقالی ان اشعار کی عظمت و خوبی کی اصل وجہ ہے۔ ممکن ہے کہ ایسا ہو لیکن ہم کو کبھی ایسا خیال کیوں نہیں پیدا ہوتا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاید کچھ اور باتیں بھی ہوتی ہوں گی جو شعر کو عمدہ بنادیتی ہیں۔

آئیے اب دوسرے لوگوں کو ٹٹولیں۔ ڈاکٹر جانسن انگریزی ادبی دنیا کا زبردست نقاد سمجھا جاتا ہے، شعر کی تعریف یوں کرتا ہے:۔

" شعر موزوں عبارت کا نام ہے، یہ ایک فن ہے، حقیقت و مسرت کو یکجا کردینے کا۔ جہاں

عقل کے ساتھ تخئیل بھی بڑا کام کرتی ہے"

شعر کی یہ تعریف بڑی لمبی ہے۔ سب سے پہلی بات جو ہم کو یہاں ملتی ہے، وہ لفظ "موزوں" ہے۔ جس کا دوسرا نام ہم نے موسیقیت رکھا ہے اور اسمیں کوئی شک بھی نہیں کہ موسیقیت شعر کا ایک بڑا جزو ہے جس کے بغیر ہم شعر کو شعر نہیں کہتے۔ غالب کا ایک شعر ہے ؎

کہتے ہو نہ دینگے ہم، دل اگر پڑا پایا دل کہاں کہ گم کیجئے، ہم نے مدعا پایا

اسمیں آپ محسوس کریں گے کہ موسیقیت کے احساس سے پیشتر پہلے مصرع کا چلبلاپن دل میں چٹکیاں لینے لگتا ہے اور اس شعر میں ؎

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیر نیم کش کو یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

موسیقیت بہت ہے، اور میں تو یہ کہوں گا کہ موسیقیت نہیں بلکہ یہ اور کوئی نشتر ہے جو دل میں چبھ جاتا ہے۔

جانسن کی تعریف کا دوسرا حصہ ارسطو کے الفاظ کا اُلٹ پھیر ہے۔ وہ کہتا ہے :۔

"نقل سے ہم کو خوشی اس وجہ سے بھی ہوتی ہے کہ اس سے ہم معلومات حاصل کرتے ہیں"

جانسن کہتا ہے کہ :۔

"حقیقت و مسرت کو یکجا کر دینے کے فن کا نام شاعری ہے"

لیکن تیسرا جزو ذرا تشریح طلب اور اہم ہے۔ وہ کہتا ہے کہ :۔

"یہاں عقل و تخئیل دونوں مل کر کام کرتی ہیں"۔

یعنی جو بات ہم کہیں وہ ایسی بے سر و پا نہ ہو کہ اُسے عقل سے کوئی علاقہ بھی نہ ہو اور ایسی بھی نہ ہو کہ جس میں جدت ہی نہ ہو۔ یعنی تخئیل کی رنگ آمیزی نہ ہو جس کی وجہ سے وہ عامیانہ ہو جائے۔ مثلاً کوئی دو اور دو چار والی بات کہے، تو ہم اُسے شاعری نہ کہیں گے۔ لیکن حالی کے دو تین شعر آپ کو سناتا ہوں ؎

کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بلبل کل نہ پہچان سکے گی گلِ تر کی صورت

تذکرہ دلّی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ نہ سنا جائے گا تجھ سے یہ فسانہ ہرگز

آ رہی ہے چاہِ یوسف سے صدا دوست یاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت

سچ کہئے کیا یہ دو اور دو چار والی باتیں نہیں ہیں۔ لیکن کتنی اثر میں ڈوبی ہوئی، کون کہہ سکتا ہے، کہ یہ شاعری نہیں، اور شاعری بھی وہ جس کو بلند پایہ کہا جا سکتا ہے۔

انگلستان کا ایک بڑا فلسفی جان اسٹوارٹ مل لکھتا ہے کہ :۔

"شاعری اُن خیالات اور الفاظ کا نام ہے، جنمیں برجستہ جذبات کا اظہار کیا جائے"۔

مکالے لکھتا ہے کہ :-

"شاعر الفاظ سے وہ کام لیتا ہے جو مصور رنگوں سے لیتا ہے۔"

مِل کے الفاظ یہاں تک درست معلوم ہوتے ہیں کہ شعر جذبات کے اظہار کا نام ہے۔ لیکن وہ اظہار کس انداز میں ہوگا۔ یہ وہ نہیں بتاتا۔ مکالے کے خیال میں شاعری بھی ایک قسم کی مصوری ہے۔ یہ خیال ارسطو سے لیا گیا ہے۔ جس چیز کو مکالے مصوری کہتا ہے۔ ارسطو اس کو نقل کہتا ہے۔

اسی طرح سیکڑوں اور ہزاروں تعریفیں ہیں جنمیں سے کوئی بھی ہم کو کسی خاص نقطہ پر نہیں پہونچاتی نہ اُن میں کوئی ایسی بات معلوم ہوتی ہے کہ فلاں جزو زیادہ ہو جانے سے شعر اچھا ہو جاتا ہے۔ اچھا اب تعریفوں کو چھوڑ کر ایک ذرا آسان بات یعنی شاعری کی خصوصیات پر غور کریں۔

ہم جانتے ہیں کہ ادب زندگی کی ترجمانی کا نام ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اُس ترجمانی کا وہ خاص جزو کیا ہے جس کو ہم شاعرانہ کہتے ہیں۔ اگر ہم لفظ شاعرانہ کے معنی سمجھ جائیں۔ تو شاید ہمیں کوئی دقت نہ ہو۔ شاعرانہ (چیز) ہم اُس کو کہتے ہیں جو بیک وقت جذباتی اور تخیلی ہو۔ اسلئے شاعری زندگی کی اُس ترجمانی کا نام ہے۔ جسمیں اُن واقعات، تجربات اور مسائل کا ذکر کیا گیا ہو۔ جنمیں تخیلی اور جذباتی عنصر غالب ہو۔ گویا شاعری کی ایک خصوصیت یہ ہوئی کہ اسمیں زندگی کے جس پہلو پر نظر ڈالی گئی ہو وہ اس طرح روشن ہو کہ سارے محسوسات اور جذبات کو چھیڑ دے اور اُسی وقت ہمیں بتا پردہ ڈالکر حقیقت کو افسانہ اور افسانہ کو حقیقت بنادے۔

جس وقت ہم جذبات اور تخیل کا ذکر کرتے ہیں تو یہ سمجھتے ہیں کہ گویا یہ چیزیں زندگی کی شاعرانہ ترجمانی کی خصوصیتیں ہیں۔ لیکن ہم یہ کبھی نہیں کہتے کہ صرف انھیں دو چیزوں کی موجودگی (خواہ وہ انتہائی نقطۂ کمال ہی پر کیوں نہ ہو) زندگی کی ترجمانی کو شاعرانہ بنانے کے لئے کافی ہے۔ ہم یہ ضرور سمجھتے ہیں کہ جس چیز کو ہم شاعرانہ کہتے ہیں وہ بغیر ان کے وجود میں نہیں آتی۔

غالب کے خطوط میں یہ تمام عناصر موجود ہیں۔ لیکن ہم اُنکو شعر نہیں کہتے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ تخیل اور جذبات کے ساتھ ایک خاص طرز ادا کی بھی ضرورت ہے جس کو ہم وزن یا دوسرے لفظوں میں عروض کہتے ہیں جس کے بغیر شعر کی روح تو رہ سکتی ہے لیکن شعر وجود میں نہیں آسکتا۔ گویا اِن تینوں اجزا کے شیر و شکر ہو جانے کا نام شاعری ہوا۔ اور یہ اجزا جتنے اچھے طریقے سے یکجا ہوں گے اسی قدر شاعری کو بہتر کہا جائے گا۔

یہاں ایک اور بات ہم کو ذہن نشین کرنا پڑے گی۔ وہ یہ کہ شعر اور زندگی میں ایک نازک اور لطیف تعلق ہے اور شاعری کی ایک زبردست خصوصیت یہ ہے کہ وہ حقیقت کو ہمارے سامنے بے پردہ کرکے لے آتی ہے جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ شعریت ہر انسانی دماغ کی ایک فطری خصوصیت ہے لیکن حقیقی شاعر وہ ہے

جسمیں احساسات اور جذبات دوسرے لوگوں سے زیادہ قوی ہوں۔ جو فطرت کے حسین مرقعوں کی ترجمانی کرنے میں عام لوگوں سے زیادہ ملکہ رکھتا ہو۔ جو زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈال کر اُن کو ہمارے سامنے زیادہ حسین بناکر پیش کرتا ہے۔ اور جو کچھ وہ دیکھتا اور محسوس کرتا ہے اُس کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ سننے والے کے دل میں وہ تمام باتیں اس طرح اُتری چلی جاتی ہیں گویا یہ جذبات کسی غیر کے نہیں خود سننے والے کے ہیں۔ ہم آنکھیں رکھتے ہیں مگر نہیں دیکھتے۔ ہم کان رکھتے ہیں لیکن نہیں سنتے۔ دل رکھتے ہیں لیکن محسوس نہیں کرتے شاعر ہمارے حواس کو قوی اور ہماری احساس کرنے والی قوتوں کو تیز کر دیتا ہے۔ یہاں مجھے انیسویں صدی کے مشہور شاعر براؤننگ کے الفاظ یاد آئے۔ جو شاعروں کو حقیقتِ فطرت دکھانے والا کہتا ہے۔

پس شاعری کو ہماری روزمرہ کی زندگی سے ایک گہرا تعلق ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ شاعر جس چیز پر نظر ڈالتا ہے۔ اُسمیں اُس کو شعریت نظر آتی ہے، خواہ عام نگاہوں میں وہ کتنی بدنما اور عامیانہ کیوں نہ ہو۔ شاعری کا کام ایک یہ بھی ہے کہ وہ بدنما چیزوں کو حسین بناکر ہمارے سامنے پیش کرے اور حسین کو شاعری کی امداد کبھی نہ فنا ہونے والا بنا دیتی ہے۔ تو پھر اگر شاعری تخیل اور جذبات کے پردے میں زندگی کی ترجمانی کا نام ہے تو بہترین شاعری کا معیار یہ ٹھہرا کہ جن قوتوں کی امداد سے شاعر زندگی کی تفسیر کرتا ہے وہی قوتیں جتنی کسی شخص میں بڑھی ہوئی ہوں گی، اُتنی ہی شاعرانہ عظمت اُسے حاصل ہوگی اور جتنی زیادہ قوی ترجمانی کسی شعر میں ہوگی اُتنی ہی عظمت شعر میں بڑھ جائے گی۔

لیکن ہم کو یہ بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ شاعری ایک فن ہے اسمیں بہت سی باتیں ایسی بھی ہونا لازمی ہیں۔ جن کا تعلق براہِ راست فن سے ہے اور اس سے بھی ہم کو انکار نہیں ہوسکتا کہ شاعری کا مقصد یہ ہے کہ ہم مسرت اور حیرت کے طوفان میں ڈوب جائیں اور شاعر جو تصویر ہمارے سامنے پیش کرے وہ اتنی عجیب اور نرالی ہو کہ طبیعت خود بخود اُدھر راغب ہوجائے۔ وہ تصویر اتنی نئی ہو کہ ہم اُس کو دیکھنے کے لئے اسی شوق سے بڑھیں جس طرح تاج محل کو پہلی مرتبہ دیکھنے والا شوق کی نگاہوں کو سیر کرنے کے لئے آگے بڑھنے پر مجبور ہوتا ہے تاج کو اکثر یہ کہا گیا ہے کہ وہ ایک ایسی یادگار ہے جو شعر میں تبدیل کر دی گئی ہے۔ اور یہ سچ بھی ہے کیونکہ جتنی مرتبہ ہم اُسے دیکھتے ہیں ہم کو ایک نئی مسرت اور ایک نئی حیرت ہوتی ہے جو خصوصیت ایک شعر کی ہے

یہاں پہونچکر شاعری کی ایک زبردست خصوصیت ہم کو نظر آتی ہے کہ شاعری کبھی پرانی نہیں ہوتی، ہم ایک شعر کو بار بار پڑھتے ہیں۔ لیکن ہر مرتبہ وہ ہم کو زیادہ سے زیادہ لطف دیتا ہے۔ انیس کا ایک شعر ہے ؎

روئے ہیں فرقتِ شہِ عالی جناب میں　　نرگس کے پھول تیر رہے ہیں گلاب میں

اس کو خواہ جتنی مرتبہ پڑھئے۔ اس کی مسرت بخش قوت کبھی ختم نہ ہوگی۔ کیونکہ یہاں حُسن کو غیر محمولی بناکر

پیش کیا گیا ہے، تو گویا شعر کی عظمت و خوبی کے لئے طرزِ ادا کی بھی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی فطرت کی ترجمانی کی
اب شعر کی تعریف ہم یوں کریں گے کہ شعر وہ ہے جسمیں جذبات اور محسوسات کی ترجمانی ایک نئے انداز سے کیگئی ہو
اور یہ نیا انداز جتنا حسین اور اعلیٰ ہوگا اتنا شعر بھی بلند پایہ کہا جائیگا۔ لیکن اس نئے انداز کی وسعت کو
بتانا اور اس کے حدود مقرر کرنا یہ بھی صرف شاعر کا کام ہے۔ وزن، قافیہ، طرزِ ادا، جدتِ تخئیل، موسیقیت
اور بھی کچھ اس دائرے میں آجاتا ہے۔ غالب کہتا ہے ؎

نظر لگے نہ کہیں اُن کے دست و بازو کو — یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بیوفا سہی — جس کو ہو دین و دل عزیز اُسکی گلی میں جائے کیوں

ان اشعار میں بہت سی باتیں ایسی ہیں۔ جن کی بنا پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شعر اس وجہ سے اچھا ہوگیا۔ لیکن
ان باتوں کے ناموں کو بتانا، یہ ہمارے بس کی بات نہیں۔ ہاں محسوسات کی ترجمانی کا نیا انداز ضرور ہے۔
تو پھر اس مبہم سی تعریف ہی کو کیوں نہ لے لیا جائے۔ اور ہم یہی کہہ دیں کہ جتنا یہ انداز نرالا اور حسین ہوگا
اتنی ہی شاعری بھی بڑے مرتبہ کی ہوگی۔

لیکن یہاں میں آپ سے ایک بات پوچھتا ہوں کہ آپ جس شاعر کو پسند کرتے ہوں اگر اُس کی عظمت کا
معیار صرف یہی نیا انداز رہ جائے۔ تو مجھے یہ کہنے میں تامل نہ ہوگا کہ آپ نہ مانیں گے۔ میں کہتا ہوں کہ انیس کا
اندازِ بیان بہت اچھا ہے، اس لئے انیس کی شاعری اُردو ادب میں بلند درجہ رکھتی ہوگی۔ لیکن شاید کوئی بھی اس
بات کو ماننے کیلئے تیار نہ ہوگا کہ یہی بات اُس کو اتنا بڑا شاعر بنائے ہوئے ہے۔ اور عظمت کا معیار اگر یہی ہوتا
تو پھر ہر شاعر کی نئی خصوصیت کیوں ہوتی۔ میر و سودا، مومن و غالب، انیس و دبیر، اقبال و جوش اور جگر و فانی
کی شاعری کو ہم مختلف پہلوؤں سے کیوں دیکھتے ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اندازِ بیان تو حقیقتاً سب کا نرالا اور
مسرت و حیرت کے طوفان میں ڈال دینے والا ہے، لیکن یہ ضروری نہیں کہ یہ نیا انداز سب کے یہاں ایک ہی سا ہو،
جس طرح ہر پھول کی خوشبو اور ہر موسیقی کی آواز جدا جدا ہے، اسی طرح ہر شعر اور ہر شاعر کی خصوصیت الگ الگ ہے۔

شاعری کے مختلف حصوں پر روشنی ڈالنے کے بعد شاید آپ یہ سمجھے ہونگے کہ اب ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہر شعر کی عظمت یا
خوبی کا معیار یہ ہے۔ لیکن میں آپ سے کہوں گا کہ باوجود اس تمام کوشش کے وہ چیز جس کو اطمینان کہتے ہم کو نصیب
نہیں ہوئی۔ اور ہم یہ کہنے پر مجبور ہوتے ہیں ع وہ اور چیز ہے کرتی ہے دل کو جو تسخیر
جس طرح ایک حسین شے کی مجموعی کیفیت اور اُس کی ناگہانی جھلک دل پر بجلی گرا دیتی ہے۔ اُسی طرح شعر بحیثیت
ایک مکمل شعر کے دل میں چٹکیاں لیتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ ہم یہ بتانے کی کوشش کریں کہ اچھے شعر میں فلاں فلاں بات
ہونا ضروری ہے۔ لیکن ہم معترض کو اُسوقت تک لاجواب نہیں کر سکتے۔ جب تک اپنے دلائل کی امداد کیلئے ایک
عمدہ شعر بھی پیش نہ کر دیں۔ اور یہ کہہ کر خاموش نہ ہو جائیں کہ ایسی چیز کو ہم اچھا کہتے ہیں۔

موت اور محبّت

از خان بہادر مرزا جعفر علی خاں صاحب اثر۔ او۔ بی۔ ای۔ ڈپٹی کمشنر سیتا پور

پچھلے دنوں ایڈیٹر زمانہ پر جو خانگی مصائب نازل ہوئے، اُن سے اکثر ہمدرد احباب متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے۔ چنانچہ محب محترم حضرت اثر کی یہ نظم ان دردناک واقعات سے بے تعلق نہیں ہے۔ اس کے ساتھ جو محبت نامہ آیا ہے اس میں آپ لکھتے ہیں کہ "حال ہی میں میں نے یہ نظم کہی ہے۔ دل و دماغ نامعلوم طریقے پر آپ کے واقعہ سے متاثر تھے۔ غالباً جذبۂ شعر نے عمل کرکے یہ نظم پیش کر دی۔" مدیر

ہر گل تازہ ہے اک تازہ حکایت تیری   پتی پتی میں بسی پاتا ہوں نکہت تیری
مہ و انجم کی ہے چشمک میں اشارت تیری   میری آنکھوں میں پھرا کرتی ہے صورت تیری
موت نے چھین لیا تجکو تو کیا ہوتا ہے؟

پھول جب کھلتے ہیں اور فصل بہار آتی ہے   عطر میں ڈوبی ہوئی گُل بکنار آتی ہے
بدھیاں پہنے، لپیٹے ہوئے ہار آتی ہے   تیری ہی طرح کئے سولہ سنگار آتی ہے
موت نے چھین لیا تجکو تو کیا ہوتا ہے؟

دستِ گستاخ سے دامن وہ بچانا تیرا   شوقِ بیتاب کو آنکھیں وہ دکھانا تیرا
یاد ہے، یاد ہے، منہ پھیر کے جانا تیرا   عذر خواہی کے لئے آپ سے آنا تیرا
موت نے چھین لیا تجکو تو کیا ہوتا ہے؟

جس طرح تیری حیا تھی کبھی غماز تری   راز کہتی تھی ترے چشم سخن ساز تری
دل کے دھڑکن میں سنا کرتا ہوں آواز تری   خود خموشی ہے مجھے انجمنِ ناز تری
موت نے چھین لیا تجکو تو کیا ہوتا ہے؟

تیرے ہونٹوں پہ نہ آیا تھا مرا نام ابھی   آنکھوں ہی آنکھوں میں تھا نامہ و پیغام ابھی
مستی صہبا سے چھلکتا ہے مرا جام ابھی   شفق آلودِ تبسم ہے مری شام ابھی
موت نے چھین لیا تجکو تو کیا ہوتا ہے؟

عشق اگر پاک خیالات کا گلدستہ ہے — دل گرفتہ ہے زمانہ و جگر خستہ ہے
ہجر میں وصل ہے اور وصل بھی پیوستہ ہے — رشتۂ روح تری روح سے وابستہ ہے
موت نے چھین لیا تجکو تو کیا ہوتا ہے؟

(سانٹ از حضرت شایق وارثی)

Show the hours one by one,
In midnights footsteps creep.
Lovers who lie alone,
Soon wake to weep. (D.S. Blunt)

ظلمتِ شب ہے فضاؤں پر محیط
چھا رہی ہیں ہر طرف خاموشیاں
یہ سیاہی اور پہنائے بسیط
آہ! یہ بڑھتی ہوئیں مدہوشیاں

ایک بیکس بسترِ آلام پر
اشک افشاں ہے کسی کے واسطے
بیکسی ہر سمت آتی ہے نظر
آہ! یہ مایوس لمحے رات کے

بیکسی، بیچارگی، افسردگی
نا اُمیدی، یاس، حسرت، اضطراب
اُف! کسی مجبور کی یہ زندگی
بے سکون و تلخ اور ناکامیاب

اس قرارِ شب میں کوئی بے قرار
ہے کسی کی یاد میں زار و نزار

ہوش و خرد کی دوکان

(از پروفیسر حامد حسن قادری ایم۔ اے)

میرے کتب خانہ کے پرانے کاغذات میں دو نظمیں نکلی ہیں جو ۱۲۹۹ھ میں (اب سے نصف صدی پہلے) چھپی ہیں۔ میں نے اور کہیں ان کو مطبوعہ یا غیر مطبوعہ دیکھا سنا نہیں۔ ان میں سے بالفعل ایک نظم (ہوش و خرد کی دوکان) ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں۔ یہ ایک قطعہ ہے مصنفۂ ابوالمحمود سید کفایت علی صاحب علوی باپوڑی تلمیذ حکیم سید منور علی خاں صاحب آشفتہ دہلوی وکیل راج الور؛ اور اسی پر تخمیس ہے مصنفۂ مولوی محمد عبدالحی صاحب بیخود بدایونی شاگرد حضرت داغ دہلوی۔ اس کو مولوی علی احمد خاں صاحب اسیر بدایونی (سابق پروفیسر فارسی سینٹ جانس کالج آگرہ) نے شائع کیا ہے۔ حکیم آشفتہ دہلوی کے خلف رشید حکیم سید محمد حسن صاحب حسن دہلوی نے تقریظ لکھوائی ہے اور حضرت بیخود سے دیباچہ۔

یہ سب نظم و نثر قدیم رنگ سخن اور اسلوب و مذاق کے دلچسپ نمونے ہیں، اور یہ چاروں حضرات (علوی۔ بیخود۔ آشفتہ۔ اسیر) اپنی اپنی جگہ باکمال ہیں، اگرچہ بعض مشہور ہیں بعض گمنام، اس لئے میں پہلے ان بزرگوں کا مختصر تعارف کراتا ہوں:-

(۱) **علوی**۔ تخلص لفظاً قومی کے وزن و اعراب کے مطابق ہے علی سے منسوب نہیں۔ عُلوی ستارہ کو کہتے ہیں۔ مولوی کفایت علی علوی کا زیادہ حال دریافت نہیں ہو سکا۔ صرف اتنا معلوم ہوا کہ ریاست الور میں ملازم اور قصبہ باپوڑ ضلع میرٹھ کے رہنے والے تھے۔ میرے بزرگوں سے ان کے خاص تعلقات محبت تھے۔ بڑے ذہین، خوش فکر، شوخ طبع، نکتہ رس تھے۔ ان کے بعض دلچسپ ادبی خطوط میرے خاندان میں محفوظ ہیں۔ انہوں نے ایک کتاب میلاد شریف مولوی غلام امام شہید کی مشہور تصنیف کے جواب میں لکھی تھی جس میں شہید کی ہر رباعی و قطعہ و غزل کے مقابلے میں ویسی ہی چیزیں نظم کر کے شامل کی ہیں۔ یہ کتاب چھپ گئی ہے علوی کی کوئی غزل اس وقت دستیاب نہیں ہوئی۔ صرف دو شعر ملے ہیں وہ پیش کرتا ہوں:-

گم کرو دل سے کسی دھیان میں ہے جب تم مجھکو　　　چاہئے اس وقت سے اللہ نہ کرے گم مجھکو
خندۂ گل پہ نظر بھی ہو تو آنکھیں پھوڑوں　　　یاد ہے یاد ہے وہ طرزِ تبسم مجھکو

(۲) **آشفتہ دہلوی** کا حال "خمخانۂ جاوید" میں صرف اتنا لکھا ہے کہ فن طب میں حکیم غلام حیدر خاں کے شاگرد

اور فنِ شعر میں حکیم مومن خاں اور نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ مرحوم سے مستفید تھے، مزاج میں خلقی میبا کی تھی، کچھ دنوں میرٹھ کی عدالت میں ڈگری نویس رہے۔ نہایت ذکی و فہیم تھے اور فنِ سخن سے قدرتی مناسبت رکھتے تھے ۱۸۸۱ء میں چالیس سال کے قریب عمر تھی۔ اس نظم زیرِ بحث سے معلوم ہوتا ہے کہ بعد کو ریاست الور میں وکیل ہو گئے تھے۔ "خمخانۂ جاوید" سے چند شعر بطور نمونہ درج کئے جاتے ہیں:-

اجل تو نے کیا کیسا مجھے شرمندہ قاتل سے — تماشا تھا اُسے میرے تڑپنے کی اذیت کا

عاشق کو لطف ہے بے فزوں لطف جور میں — یہ غیر کی سزا ہے، ہماری سزا نہیں

جو نامہ بر گیا، وہ گیا جان سے وہاں — اب جی میں ہے رقیب کو ہم نامہ بر کریں

اللہ رے یاوریِ طالع — ٹھکرا کے چلے وہ میرے سر کو

(۳) **بیخود بدایونی**۔ مشہور آدمی ہیں، خمخانہ میں ان کا مفصل حال درج ہے۔ پہلے مولانا حالی کے شاگرد ہوئے۔ پھر جب حضرت داغ کا پہلا دیوان گلزارِ داغ شائع ہوا تو اُس کو دیکھکر رامپور گئے اور داغ کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہوئے۔ سنبھل میں وکالت کی۔ پھر ریاست سروہی میں جوڈیشل افسر ہو گئے چند شعر خمخانہ سے نقل کئے جاتے ہیں:-

ہاں سچ ہے میرے سینے میں کیا ہے دھرا ہوا — اک داغِ ہجر، وہ بھی تمھارا دیا ہوا

دل بھی عزیز ہے، مجھے غم بھی عزیز ہے — یہ نعمتِ خدا، وہ بتوں کا دیا ہوا

وہ کہتے ہیں نہیں یہ نام کچھ خدا کا نام — ہمارے سامنے کیوں لے کوئی وفا کا نام

کہا جب اس سے کسی نے کہ مر گیا بیخود — ملا جواب "ہمیشہ رہے خدا کا نام"

میکشوں کا خم نے توڑ دیا زاہد نے — یا خدا بوند نہ اب چشمۂ زمزم میں رہے

راہ پر ناصحِ مشفق کو لگا لو رندو — یہ بھی کچھ لطف ہے، ہم سا نہ اور ہم میں رہے

دعا کو نہیں راہ ملتی فلک کی — کچھ ایسا ہجوم بلا ہو رہا ہے

وہی جنت ہے جہاں چین ملے دل بہلے — جس پہ دل آئے وہی حور ہے انساں کے لئے

(۴) **اسیر بدایونی**، ان کا حال خمخانہ میں تو صرف اتنا لکھا ہے کہ "گو ان کا اصل وطن بریلی ہے۔ مگر بدایوں میں رہتے ہیں، اور حضرت مذاق (شاہ دلدار علی صاحب رحمتہ اللہ علیہ) کے شاگردوں میں ہیں" اور صرف تین شعر درج کئے ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے:-

ادائیں نہ کیوں چشم کی ہوں پسند اُٹھاتے ہیں سب ناز بیمار کے

لیکن میں مولانا علی احمد خاں صاحب آسیر سے ذاتی طور پر واقف ہوں، عربی و فارسی کے عالم متبحر تھے شعر و سخن میں اُستادانہ کمال رکھتے تھے بعض مختصر مثنویاں نعت شریف میں مطبوعہ موجود ہیں جن میں حضرت محسن کاکوروی کا رنگ ہے یہ اس وقت میرے پاس موجود نہیں ہیں، حاصل ہو گئیں تو ان کے متعلق مستقل مضمون لکھونگا۔ مولانا آسیر ایک مدت تک سینٹ جانس کالج آگرہ میں پروفیسر رہے۔ بڑے صاحب دل اور درویش کامل تھے۔ اُن بزرگوں میں تھے جن کے دیدار و صحبت سے خدا یاد آتا ہے اور جن کی نگاہ سے دل کو تسکین ہوتی ہے۔ لیکن مولانا تعلیم و تعلم اور شعر و شاعری میں اپنا احوالِ باطن چھپائے رکھتے تھے۔ جولائی ۱۹۲۰ء میں مدینہ منورہ میں وصال پایا۔ یہ سفر حجاز اور سفر آخرت دونوں مولانا آسیر کے والہانہ عشق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مظاہر تھے۔ مولانا نہایت سن رسیدہ اور بیمار و ضعیف تھے۔ جب آخر جون ۱۹۲۰ء میں حج و زیارت کے لئے تشریف لے گئے۔ مکہ معظمہ پہونچکر ایسے بیمار ہو گئے کہ مدینہ طیبہ کی حاضری دشوار ہو گئی۔ وہاں اپنے ہم وطن مولوی اسمٰعیل ذبیح بدایوانی کے مہمان ہوئے، جو ملک الحجاز ابن سعود کی طرف سے کعبہ شریف کی برقی روشنی کے انجینئر و منتظم ہیں۔ مولانا نے اپنے میزبان سے اصرار کیا کہ جس طرح ہو مجھے مدینہ پہونچا دو نہ پہونچ سکونگا تو راستے ہی میں ختم ہونا چاہتا ہوں، چنانچہ مولانا اسمٰعیل ذبیح نے خاص طور پر موٹر کا انتظام کیا، اور مولانا آسیر دیارِ محبوب کو روانہ ہوئے۔ راستے بھر اپنا ایک شعر پڑھتے جاتے تھے، اسی کا مضمون سچ ہو گیا اور راستے ہی میں وصل دوام حاصل ہو گیا، شعر یہ تھا:-

اُٹھ کر رہ گیا میں وادیِ طیبہ کے کانٹوں میں مجھے پہونچا دیا ہے ضعفِ تن نے منزلِ جاں تک

مولانا علی احمد خاں صاحب آسیر کی کچھ نثر و نظم دوسری نظم کے سلسلے میں شائع ہوئی ہے وہ انشاء اللہ آئندہ اُسی نظم کے ساتھ پیش کرونگا۔

اب اس نظم (ہوش وخرد کی دکان) کا حال سنئے، نام کے اوپر مصرع درج ہے:-

"ایک دل بیچتے ہیں، ہے کوئی لینے والا"

پھر سب سے پہلے حضرت بیخود بدایونی صاحب مخمس کا یہ دیباچہ ہے:-

دیباچہ از حضرت بیخود

تحفے برد از دل گندہ ہر کہ زبیشتم من قاش فروشِ دلِ صد پارۂ خویشم

صاحبو! مجکو نہ شعر و شاعری سے مَس ہے، نہ لکھنے پڑھنے سے سروکار، نہ بحور و قوافی کی حس ہے نہ میں نظم و نثر سے خبردار۔ نہ اُستادی کی گوں ہوں، نہ شاگردی کے لائق، نہ کسی چیز ... ہوں نہ

نہ کسی بات کا شائق، مردہ دل، پژمردہ طبع، افسردہ خاطر، زندہ درگور، صدموں پر صدمے اُٹھائے ہوئے مصیبتوں پر مصیبتیں جھیلے ہوئے، حُسن و عشق کو خیرباد کہے، سب جھگڑوں کو القط، سارے بکھیڑوں کو ڈال دئے۔ عاشقی و معشوقی سے جان بچائے کبھی کبھی کو خیر منائے بیٹھا ہوں، بھلا من کجا و ذوقِ سخن کجا۔ مگر میرے مخدوم جاں نواز یعنی علوی شیوا بیان نے زہرہ وشوں کو مشتری بنانے کے لئے بساطِ خانہ کی ایک دُکان کھولی، اور اس دُکان نے کچھ ایسی شہرت پائی کہ جس نے سُنا یا دیکھا وہ ہزار جان سے گاہک[1] ہوگیا، جب نوبت تا بہ ایں جا رسید کہ خود بانی خود فروش بھی ان کے سودے کے خریدار او مطلوب روزگار بھی اس کے طلبگار بن گئے۔ تو یہاں بھی شوق کا دریا اُمڈا اور بے اختیار جی چاہا کہ کوئی ایسا ہی بہروپ کا بھیئے۔ اور اسی طرح اچھے اچھے مجموں اور مزے مزے کے جلسوں میں پہونچئے، لیکن اس خیال نے ہمت سرد کردی کہ ایک چلتی ہوئی دُکان کے سامنے نئی دُکان کا فروغ مشکل ہے۔

قصہ مختصر، جب اس خیال کی صدائے دور باش نے اس ولولے کو فرو کردیا، تو چالاکی سے اُسی مکرم سراپا اکرام یعنی علوی اپنا کلام کو دم حیا نئے میں لیکر اُسی چلتی ہوئی دُکان میں ساجھا ملا دیا اور ساجھا بھی کیسا! کہ اُن کی دو پائی تو اپنے تین حصے، بارے الحمد للہ کہ وہ شرکت بے سود نہ ہوئی یعنی خریداروں نے ہر جنس کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور قدردانوں نے ہر چیز کو پسند کیا۔

غرض جب یہ سب کچھ ہوچکا تو یہ خیال آیا کہ آجکل ہر کارخانہ اپنے موجودہ مال واسباب کے اشتہار چھپوا کر اپنی شہرت و منفعت کو بڑھاتا ہے، اور چوگنے نفعے اُٹھاتا ہے، تو ہم کیوں درگذر کریں مگر صدمات و تفکرات پے درپے کے متواتر حملوں نے دل و دماغ کو اس قابل بھی نہ رکھا تھا کہ تفصیل اور ترتیب کے ساتھ سب جنسوں اور ہر ایک مال و اسباب کی کیفیت اور وضع تحریر ہو سکے۔ ناچار مخدومی و مخدوم زمن جناب حکیم سید محمد حسن صاحب حسن، خلف الرشید حضرت حکیم سید منور علی خاں صاحب آشفتہ ارشد تلامذہ حضرت مومن دہلوی سے تقریظ کے پیرایہ میں سب مال و اسباب کا اشتہار لکھوایا اور تضمین کے لباس میں دُکان کا فوٹو لیکر اس اشتہار کے ساتھ شامل کردیا۔

دعا یہ ہے کہ سودا بکے یا نہ بکے، کچھ منافع ہاتھ لگے یا نہ لگے، مگر یہ چند اوراق مشتریانِ جنسِ سخن کی نگاہوں تک ضرور پہونچ جائیں، اور التجا یہ ہے کہ جو صاحب کسی شے کو ناپسند فرمائیں یا کسی

---

[1] گاہک کا یہی املا لکھا ہوا ہے۔ اس نئے میں نے مع نون نقل کردیا کہ یہ تغیر یادگار رہے، ورنہ اور الفاظ میں املا درست کردیا گیا ہے۔ مثلاً اُس۔ اُٹھانا۔ دُکان میں ایک ایک واؤ کا اضافہ تھا۔

چیز کی ترتیب میں غلطی پائیں، وہ پردہ پوشی و اصلاح کوشی کو کام میں لائیں۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی حبیبہ سید المرسلین وشفیع المذنبین وعلیٰ آلہ الطیبین واصحابہ الطاہرین واولیاء اُمتہ اجمعین۔

اب حضرت بیخودؔ کی تضمین ملاحظہ ہو۔

تضمین قطعۂ علوی

ہوش و خرد کی دُکان

بسکہ الفت میں حسینوں کے سہے لاکھوں جور	کوچہ گردی کے سوا شغل نہ رکھا کچھ اور
اب یہ سنیئے کہ ہر اک سمت کو کرتے ہوئے غور	کل نکلتے تھے ہم اک کوچے سے لیکن اس طور

سر پہ اک بستۂ غم، دوش پہ بارِ حرماں

رفتہ رفتہ جو ہوا ایک جگہ اپنا گذر	ہو گیا حالِ دلِ حسن طلب نوعِ دگر
الغرض پاؤں بڑھاتے ہی اٹھاتے ہی نظر	ناگہاں دیکھتے کیا ہیں کہ وہیں کوٹھے پہ

جلوہ فرما ہے کوئی بادلہ پوش آفتِ جاں

محوِ حیرت ہوئے ہم دیکھ کر اس کے جلوے	عقل جاتی رہی اور ہوش ٹھکانے نہ رہے
چشمِ مخمور نے کچھ اس نے اشارے جو کئے	پھر تو جی میں یہی آئی کہ یہیں دم لیجئے

اور ڈرے بھی کہ نہ لوگوں کو ہو کچھ اور گماں

شوق بولا کہ کرو عرضِ تمنا دل کی	حسن کے رعب سے پر کہنے کی ہمت نہ ہوئی
یہی حالت دلِ مضطر کی تھی سینے میں ابھی	اتنے میں خود ہی پکارا کہ میاں پردیسی

تم کدھر جاتے ہو اور کون ہو رہتے ہو کہاں

ہم نہ پوچھے سے ہے، سر پہ یہ رکھا کیا ہے	ہم بھی مشتاق ہیں، دیکھیں تو سہی کیا کیا ہے
نقشِ حیرت ہوئے کیوں، کہئے تو نقشا کیا ہے	اور اس گانٹھ میں فرمائیے سودا کیا ہے

کچھ پسند آیا تو لے لیں گے، اٹھا لاؤ یہاں

ہم کو اک عمر سے ہے شوق خریداری کا	مال اچھا ہو تو قیمت کی نہیں کچھ پروا
خوف کھاؤ نہ یہاں آنے سے جی میں اصلا	اتنی سنتے ہی یہاں کون ٹھہرتا تھا بھلا

پہونچے جھٹ پٹ وہیں، وہ ماہِ دو ہفتہ تھا جہاں

بسکہ خود ہم کو نہ پایا تھا، نہ تھا کچھ وسواس
دل میں کہتے تھے کہ ہم آئے ہیں کس شوخ کے پاس
گو نہ تھا خوف و خطر اور نہ کچھ بیم و ہراس
پر وہاں جاتے ہی جاتے رہے سب ہوش و حواس

بے طرح صورت دل کش نے بنایا حیراں

پاس سے دیکھا جو اُس شوخ کا حسنِ نیکو
طائرِ عقل بنا قیدیِ دامِ گیسو
تن نہ باقی رہا اور نہ دل پر قابو
دیکھکر مجھ کو وہ بولے کہ دِوانا ہے تو

ہوش میں آ، ارے منہ تکنے کو آیا ہے یہاں

پاس ہو جنس جو ایسی وہ ہمیں دکھلا دے
واجبی دام جو ایمان سے ہوں ہم سے لے لے
شکل کیا کہتا ہے، چلتا ہو جو میزاں نہ چلے
سُن کے یہ بات کہا تھام کے دل کو میں نے

کہ سُن اے رشکِ قمر، غیرتِ ماہِ کنعاں

تو ہے یوسف، تو مہیا ہے غلامی ہیں ہم
خاص بندے ہیں کوئی اور نہ عامی ہیں ہم
بے تماشا ہیں نہ بہت اور نہ گرامی ہیں ہم
نہ دِوانے ہیں، نہ سوداگر نامی ہیں ہم

نہ جنوں ہے ہمیں زنہار، نہ ہرگز خفقاں

ہم نہیں جانتے کیا چیز ہیں کفر و اسلام
بے ہمہ یا ہمہ، دن زیست کے کرتے ہیں تمام
بتکدے کو جو ہے آداب، تو مسجد کو سلام
کوئی رندوں سے غرض ہمکو، نہ زہاد سے کام

عشق ہے مذہب و دیں، حسن پرستی ایماں

نہ دوا اور نہ دوش، رکھتے ہیں تھوڑی سی بساط
کچھ نہ کاوش نہ خلش، رکھتے ہیں تھوڑی سی بساط
شان ہے کچھ نہ منش، رکھتے ہیں تھوڑی سی بساط
پھیری والوں کی روش، رکھتے ہیں تھوڑی سی بساط

نہ کہیں اپنی دکاں ہے، نہ کہیں اپنا مکاں

نفع کی ہم کو تمنا، نہ ضرر سے سروکار
کسی گاہک سے کبھی کی نہیں ہم نے تکرار
مال وہ رکھتے ہیں، تم لوگ کرو جس سے سنگھار
ہیں غرض پاس ہمارے یہی سودے دو چار

شانۂ ہوش و خرد، سرمۂ دین و ایماں

پیش و پس بیع و شریٰ میں کسے یاں آتا ہے
بخت سودائی میں جو نفع ہے وہ پاتا ہے
ہر جگہ کب دلِ نادان کھٹی کھاتا ہے
کوئی تم سا ہی خریدار جو مل جاتا ہے

ـہ اس لفظ پر یہ حاشیہ درج ہے: اگرچہ اب لفظ دِوانا متروک ہے مگر اس مصرعہ میں قول معشوق بیان کیا گیا ہے اور وہ لوگ ابتک دوانا ہی بولتے ہیں کما لایخفی۔

ـہ اس پر یہ حاشیہ ہے: چونکہ معشوق کی زبان سے دوانا ہی نکلا تھا اس لئے عاشق نے بھی دوانا ہی کہا ہے۔

دیکھ کر بھاؤ کو دیدیتے ہیں ارزاں کہ گراں

جنسِ ہستی ہے خدا، ساتھ ملے گر سونا — درم داغ کو حاضر ہے کلیجا اپنا
ساتھ ہے سر کے کسی زلفِ سیہ کا سودا — اور یہ مال کُھلے مول سے بکتا ہے سدا

نگہِ ناز کو دل، عشوہ وُ انداز کو جاں

کہہ چکا: تو نگہِ تیور سے دیکھا مجھ کو — نئے تیور سے، نئے طور سے دیکھا مجھکو
بات آہستہ تو کی اَور سے، دیکھا مجھ کو — سُن کے یہ بات ذرا غور سے دیکھا مجھکو

پھر تو اک طیش میں آ کھینچ کے منھ پر داماں

مجھ سے کہنے لگے، اوسان گئے، بس خاموش — ہم تری چال کو اب مان گئے، بس خاموش
میں جو بولا، مجھے کیا جان گئے، بس خاموش — بولے غصہ سے کہ پہچان گئے، بس خاموش

تو وہی غلوی ہے، ہاں آیئو کوئی درباں

گو کہ جی بھر کے نہ دیکھا تھا ابھی دلبر کو — ڈر سے قابو میں نہ پایا جو دلِ مضطر کو
خرد و ہوش سے کہتے ہوئے سر کو سر کو — نام درباں کا ہم سنتے ہی سیدھے گھر کو

دل کو انٹی میں دبا کر ہوئے ایسے پرّاں

کہ نہ دن ہی ہمیں معلوم ہوا اور نہ شب — کہیں رکھا تو کہیں پاؤں پڑا ہائے غضب
کیا بیاں کیجئے بیخود، رہی پونجی کیا اب — کہ وہیں چھوڑ اٹھے وحشت و جلدی کے سبب

جامۂ صبر و سکوں، پارچۂ تاب و تواں

اس کے بعد منشی محمد حسن صاحب حسن کی تقریظ نثر میں ہے، اور دیباچۂ بیخود کے طرز میں بلکہ اس سے شوخ تر لکھی گئی ہے۔ لیکن اس کا آخری صفحہ غائب ہے اس لئے ناتمام ہے۔ اس کو چھوڑتا ہوں۔

اس کے ساتھ حضرت امیر نے دوسری نظم کا اعلان ان الفاظ میں کیا ہے:

"مژگاں سے دل بچا تو نگہ نے لپک لیا"

ابھی اہلِ نظر اپنے دامنِ شوق کو پھیلائے رکھیں، ایک اور بہار کا بادل امنڈنے والا ہے، وہ وہ تازہ پھول کھلیں گے کہ جن سے چشم و دماغ کو نور و سرور ہو، اور نگہِ ناز کے جگر فگار اپنے اپنے کلیجے کو مضبوط تھامے رہیں، حیا دوئے چشم کے پردہ میں دزد و دزدیدہ نظر کا کچھ ایسا تماشا ہوگا کہ دیکھنے والوں کے دل و جان ہاتھ سے جاتے رہیں گے۔ یعنی دوسرا قطعہ مصنفہ جناب مولوی افتخار حسین صاحب مضطر خیرآبادی تلمیذ رشید حضرت امیر مینائی لکھنوی برادرِ خورد جناب مولوی محمد حسین صاحب بسمل وکیل ریاست عالیہ ٹونک

متعینہ اگلیجنسی راجپوتانہ مع تخمیس جناب مولوی عبدالحی صاحب نجود بدایونی جوڈیشل افیسر دربار ریاست الیہ سردہی شاگرد حضرت داغ دہلوی "صبر و شکیب کی لوٹ" کے نام سے تیار ہے۔ وما علینا الا البلاغ

المشتہر، فقیر علی احمد اسیر

ان پھولوں کے لئے ناظرین زمانہ کسی آئندہ اشاعت تک اپنے دامن شوق کو پھیلائے رکھیں۔

تیرا خیال

(سانٹ)

(نتیجۂ فکر منشی شانتی سروپ کیفؔ)

کون لیتا ہے تصور میں مرے انگڑائیاں
چھیڑتا ہے سازِ نغمات شبابِ زندگی
روح کو میری پلاتا ہے شرابِ زندگی
انجمن آرا ہیں کس کے حسن کی رعنائیاں

لوٹ آئی ہے چمن زارِ محبت میں بہار
دل بنا ہے محشرِ ہنگامہ ہائے آرزو
کھلکھلا کر ہنس رہی ہے کائناتِ رنگ و بو
پھر ابھر آئے ہیں سب کھوئے ہوئے نقش و نگار

آ گیا ہے پھر معاذ اللہ مجھے کس کا خیال
یادِ الفت کی ہوا ان راتوں کی پھر تازہ ہوئی
حسن کی لذت بھری باتوں کی پھر تازہ ہوئی
پھر نظر کے سامنے ہے وہ جنوں پرور جمال
ہم سخن صبح و مسا رہتا ہوں اس کی یاد سے
حالِ دل کہتا ہوں اپنے ہی دلِ ناشاد سے

فردوسِ تصوّر

(از حضرت کیفی اعظمی)

(۱)

جہاں کی شام "پرشامِ اودھ" کی مستیاں صدقے جہاں کی صبح "پر صبحِ بنارس" کا سماں صدقے
جہاں کے ذرّے ذرّے پر بساطِ کہکشاں صدقے
اُسی دنیا میں ہم تم بیخود و مخمور رہتے ہیں نگاہیں مست سی رہتی ہیں دل مسرور رہتے ہیں

(۲)

جہاں موجِ صبا پر بھی چراغِ شوق جلتے ہیں جہاں ذرّوں سے چشمے کامرانی کے اُبلتے ہیں
جہاں جلوے برستے ہیں جہاں نغمے اُچھلتے ہیں
اُسی دنیا میں ہم تم بیخود و مخمور رہتے ہیں نگاہیں مست سی رہتی ہیں دل مسرور رہتے ہیں

(۳)

جہاں زرّیں کرن خورشید کی سونا بچھاتی ہے جہاں ٹھنڈی ہوا الفت کے میٹھے گیت گاتی ہے
جہاں رنگیں دھنک جھک کر ہمیں جھولا جھلاتی ہے
اُسی دنیا میں ہم تم بیخود و مخمور رہتے ہیں نگاہیں مست سی رہتی ہیں دل مسرور رہتے ہیں

(۴)

جہاں اک زعفرانی بھاپ جلووں کو بھگوتی ہے جہاں ہر شے خوشی میں مست، سکھ کی نیند سوتی ہے
جہاں کی چاندنی دلکش سہانی دھوپ ہوتی ہے
اُسی دنیا میں ہم تم بیخود و مخمور رہتے ہیں نگاہیں مست سی رہتی ہیں دل مسرور رہتے ہیں

(۵)

جہاں قوسِ قزح کا رنگ اُڑتا ہے فضاؤں میں جہاں رہتی ہے رقصاں روحِ بیخانہ ہواؤں میں
بجا کرتا ہے گھنگرو سا جہاں اُودی گھٹاؤں میں
اُسی دنیا میں ہم تم بیخود و مسرور رہتے ہیں نگاہیں مست سی رہتی ہیں دل مسرور رہتے ہیں

(۶)

جہاں اک خواب کی سی کیفیت دن رات ہوتی ہے　　جہاں کچھ جاگتی ہے اور کچھ ہر چیز سوتی ہے
جہاں رنگینیوں میں روح کو الفت ڈبوتی ہے
اُسی دنیا میں ہم تم بیخود و مخمور رہتے ہیں　　نگاہیں مست سی رہتی ہیں دل مسرور رہتے ہیں

(۷)

جہاں رعنائیاں ہیں حسن کی جلوہ نمائی ہے　　جہاں کے ایک اک ذرے میں شانِ دلربائی ہے
جہاں کیفی سے شوریدہ طبیعت کی خدائی ہے
اُسی دنیا میں ہم تم بیخود و مخمور رہتے ہیں　　نگاہیں مست سی رہتی ہیں دل مسرور رہتے ہیں

جذباتِ جذب

مُدعا ہوں عشقِ ناقسِ جام کا　　آدمی ہو کر نہیں ہوں کام کا
شام میں مضمر ہیں آثارِ سحر　　زور ہے کیا ابلقِ ایام کا
فیض بخشی ہو نہ گل کی روش　　اس چمن میں تنگدل کس کام کا
اک نہ اک گردش میں رہتے ہیں مدام　　سلسلہ جب سے ہے صبح و شام کا
رُخ پہ کیا لہرا گئی زلفِ سیہ　　صبح نے جلوہ دکھایا شام کا
اختلاطِ باہمی جب کشف ہو　　درمیاں میں دخل کیا پیغام کا
امتیازِ جیب و داماں اور جنوں　　کیا ٹھکانا ہے خیالِ خام کا
نام ہی سُنتے رہے ہم عمر بھر　　ذکر کیسا راحت و آرام کا
بھول جائے اپنا بل شاخِ غزال　　پیچ ہے وہ زلفِ عنبر فام کا
گاہ ذکرِ رخ کبھی تذکیرِ زلف　　وِرد ہے اپنا یہ صبح و شام کا
اپنے ہاتھوں جب ہیں گردش میں اسیر　　پھر گلہ کیا گردشِ ایام کا
کلفتِ آفاق جس سے دُور ہو　　ایک قطرہ اس مئے گلفام کا

تا دمِ آخر نہ افشا راز ہو
جذب ہے منشا بتِ خود کام کا

[illegible] جذب

ہندو مسلمانوں کی باہمی منافرت کا تاریخی راز

(از حضرت کوثر چاند پوری)

قوموں کے بگاڑنے سنوارنے اور اُن کے لڑانے ملانے میں تاریخ کو بہت بڑا دخل رہتا ہے۔ ہندوستان کے اندر ہی اس کا ثبوت ملتا ہے۔ اجنبی قوم نے ہندوستان میں اپنی حکومت کو مضبوط کرنے کے لئے تاریخ کے اینٹ گارے سے کافی امداد لی ہے، اور ہر جگہ اس نکتہ کو ملحوظ رکھا ہے۔

ہندوستان میں مختلف خیال اور عقیدے کی اقوام آباد ہیں، جن میں دو بڑے مذہبی گروہ ہندو اور مسلمانوں کے ہیں۔ انھیں دونوں کے اتحاد اور نفاق، میل اور بگاڑ سے ہندوستان کا حال اور مستقبل وابستہ ہے۔ سرزمینِ ہند پر بیرونی قوموں کا برسرِ اقتدار آنے سے پہلے ماضی قریب میں یہاں مسلمانوں کی حکومت تھی جن کو مغلوب کرنے کے بعد سات سمندر پار کے انگریزوں کا یہاں تسلط ہوا، سیاسی اور حاکمانہ چالوں کا تقاضا تھا کہ سلطنت کا جو پودا حال ہی میں بھارت ورش کی موتی اُگلنے والی زمین پر بویا گیا ہے اُس کی جڑوں کو اچھی طرح زمین میں پیوست کر کے مضبوط کیا جائے۔ اس منصوبے کو پورا کرنے کے لئے ہزار ہا قسم کے سیاسی کھاد تیار کئے گئے۔ انھیں میں تاریخ کا مرتب کرنے کا کام بھی شامل تھا چنانچہ وہ بھی ہاتھ میں لیا گیا، اور واقعات کو اس طرح اکٹھا کر کے مواد جمع کیا گیا اور اُسے تعلیمی نصاب میں داخل کیا گیا۔

اُس وقت خاص طور پر مسلمانوں کو کمزور کرنا مقصود تھا، ان سے ابھی ابھی سلطنت چھنی تھی، اُن کے دل دُکھے ہوئے تھے اور دماغوں میں حکمرانی کا نشہ موجود تھا۔ ایسی صورت میں اِن سے اقتدارِ شاہی کو صدمہ پہونچنے کا اندیشہ تھا، اس لئے ملک کے اندر ہی دوسری طاقتوں سے ٹکرا کر مستقل طور پر اُن کے زور کو توڑنے کا بندوبست کیا گیا۔ لیکن یورپ کے سیاست داں جب کوئی قدم اُٹھاتے ہیں تو اس میں اپنے بہت سے فائدوں کو مدِنظر رکھتے ہیں، مقصد تو مسلمانوں کو کمزور کرنا تھا لیکن ضمنی طور پر اُنھوں نے یہاں کی ہر قابلِ ذکر قوم کی قوت اس ذریعہ سے توڑ کر رکھ دی، اور جہاں جہاں تاریخ میں موقع ملا ایسا شوشہ چھوڑ دیا جو مختلف اقوامِ ہند کو ایک دوسرے سے بدظن کر دے۔ یہ انتظام مؤثر ہونے کے باوجود بالکل غیر محسوس طریقے پر کیا گیا۔ جب کوئی تیسرا آدمی دو آدمیوں کے خانگی جھگڑوں میں کسی ایک کا ساتھ دیتا ہے تو ایک

فریق اس سے ضرور خوش ہوجاتا ہے، اور یہ نہیں سوچتا کہ اس طرزِ عمل سے وہ اپنی کیا اغراض حاصل کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ اس وقت کسی کے ذہن میں بھی یہ بات نہ آئی کہ مدرسوں میں جو کتابیں بچوں کو پڑھائی جارہی ہیں یا تاریخ کے جو ذخیرے یورپ کے عینک پوش مورخ جمع کر کر کے الماریاں بھر رہے ہیں، اُن کا ہماری موجودہ یا آئندہ زندگی پر کیا اثر پڑے گا۔ لیکن پوشیدہ اور نامعلوم طور پر یہ زہر پھیلتا رہا، اور ہندو مسلمانوں کی باہمی نفرت آہستہ آہستہ بڑھتی رہی جس سے حکومت کی جڑیں مضبوط ہوتی رہیں۔ مورخین نے اپنا نصب العین یہ قرار دے لیا تھا کہ جہاں مسلمان بادشاہوں کا ذکر کیا جائے وہاں معمولی طور پر یہ بات بھی کہہ دی جائے کہ وہ مذہب کے معاملہ میں متعصب، ظالم اور سنگدل تھے، ہندوؤں سے انھیں بیر تھا، وہ انھیں کافر سمجھتے تھے، اُن کی عبادت گاہوں کو مسمار اور برباد کرنا ثواب جانتے تھے۔ اس سلسلے میں بہت سی جھوٹی اور مصنوعی باتیں بھی لکھی گئیں، کہ اگر اب اُن کو تاریخ کی کسوٹی پر پرکھا جائے تو سخت تعجب اور افسوس ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف ہندوؤں کو مسلمانوں سے نفرت ہوگئی اور وہ انھیں ظالم، سخت گیر اور ہٹ دھرم سمجھنے لگے، بلکہ خود مسلمان بھی اِن جھوٹے واقعات پر اترانے لگے، اور انھوں نے اِن کو فخریہ دُہرانا اپنا شعار بنالیا۔ یہ ایک اور زہر تھا جس سے بھائی بھائی مسموم ہوگیا۔

یوروپین مورخین نے ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کی تاریخ لکھنے میں یہ التزام کیا ہے کہ جن بادشاہوں کو مذہب سے بغاوت یا بے اعتنائی برتنے کے باعث سخت قسم کے مذہبی مسلمان اچھا نہیں سمجھتے، اُن کی تعریف و توصیف کی جائے، اور جن کو مسلمان پکّا مذہبی سمجھتے ہوں اُن کی دل کھول کر بُرائی کی جائے۔ اس میں یہ بھی راز تھا کہ پہلی قسم کے بادشاہوں کا زمانہ بہت دُور کا تھا اور دوسری قسم کے سلاطین کا عہد حکومت قریب ہی گزر چکا تھا، اس لیئے ان کی برائی سے یہ بھی خیال تھا کہ مسلمان زیادہ ناراض اور ہندو زیادہ خوش ہونگے۔ اور اُن واقعات کی روشنی میں جب موجودہ انتظامات اور عدل و انصاف پر نظر کی جائے گی تو ہر شخص کے دل میں تعاون کا جذبہ پیدا ہوگا۔ دوسرا راز یہ تھا کہ مسلمان بادشاہوں نے جو مظالم کئے اُن کا تعلق اُن کی شخصیت سے نہیں بلکہ مذہب کی تعلیم سے بتایا گیا، لہٰذا محض شخصی عداوت نہیں بلکہ مذہبی منافرت پیدا ہوگئی۔ اور دلوں میں یہ خیال جاگزیں ہونے لگا کہ اسلام ہندوؤں کا دشمن ہے جو اپنے پیرووں کو اُن کے مقابلہ میں سخت اور خلاف انسانیت برتاؤ کرنے پر مجبور کرتا ہے مگر جن بادشاہوں پر اسلام کا گہرا رنگ نہ تھا وہ ہندوؤں کے ساتھ رواداری اور انصاف کا برتاؤ کرتے تھے۔ یہ رنگ ذرا گہرا تھا وہ تعصب اور تنگ نظری کے پتلے تھے۔ حقیقت میں یہ بڑی گہری

چال تھی، جس کا اثر دونوں جانب برابر کا ہوتا تھا۔ ایک طرف ہندو مسلمان کو اپنا دشمن سمجھنے لگے، دوسری طرف مسلمانوں نے ہندوؤں کو اپنا بیری خیال کیا۔ اور یہ عداوت شخصی نہیں تھی بلکہ مذہبی تھی ظاہر ہے کہ شخصی عداوتیں مٹ جاتی ہیں اور کبھی نہ کبھی اتحاد ہو جاتا ہے، مگر مذہب کے نام پر ایک مرتبہ جو خلیج بنادی جاتی ہے وہ بڑی مشکل سے پٹتی ہے۔ مغربی مدبرین اور مورخین کو یہ راز معلوم تھا، چنانچہ انھوں نے اس سے خوب خوب فائدہ اٹھایا۔ اگرچہ ان بے حقیقت الزامات کی بار بار تردید کی جا چکی ہے اور ثابت کیا جا چکا ہے کہ مسلمان بادشاہوں کے خلاف ان الزامات کی کوئی اصلیت نہیں ہے۔ اور جب تاریخ کی روشنی میں ان کو دیکھا جاتا ہے تو نہ صرف یہ کہ ان کی صداقت ہی مشتبہ ہو جاتی ہے بلکہ مورخ کی بدنیتی بھی صاف طور پر واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ لیکن صفائی کے کارگر ہونے کے لئے جس فضا کی ضرورت تھی وہ موجود نہ تھی۔ اس کا وقت ہی گذر چکا تھا۔ ضد اور ہٹ دھرمی پیدا ہو چکی تھی، جس کے جوش میں معقول باتیں نہیں سُنی جایا کرتیں۔ جب آنکھوں اور دماغ کے درمیان تعصب و عداوت کی سیاہی پیدا ہو جاتی ہے تو آدمی دماغ کو بھی دھوکہ دینے لگتا ہے اور آنکھ سے جو کچھ دیکھتا ہے دماغ سے اُسے سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا۔ یہی سلوک ہندوستانی مورخین کی پیش کی ہوئی شہادتوں کا ہوا۔ اسے کڑوا سمجھکر کسی نے قبول نہ کیا، اور اُسے شربت سمجھکر سب پی گئے۔ پھر فضا مسموم تھی، زہر کے ذخیرے کتابوں کی شکل میں موجود تھے، سچ اور جھوٹ کو پرکھنے کی ضرورت تھی اور نہ سچائی کو تلاش کرنے کا شوق۔ اسی لئے سچائی کا دیا بجھا نہیں تو اُس کی لَو ضرور کم ہو گئی، اور جھوٹ کی تاریکی برابر بڑھتی رہی۔ اگرچہ سب جانتے ہیں کہ گھر کی بات سے گھر کا آدمی ہی خوب واقف ہوتا ہے لیکن بدنصیب ہندوستانیوں نے اپنی بدقسمتی سے اس پر بھی التفات نہ کیا۔ انھوں نے اپنے گھر کی اچھی بُری باتیں بھی یورپ ہی کے افسانہ طراز اور داستان گو مورخ سے سنیں، اور ہندوستان کی ایسی تاریخوں کو جس میں چشم دید حالات لکھے گئے تھے جن کے لکھنے والے ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی انھیں تو جھوٹ سمجھا گیا اور باہر کے مصنفوں نے جو سُنی سُنائی بے سروپا باتیں لکھدیں اُن پر یقین کر لیا گیا۔ ایسا ہونا بھی چاہیئے تھا کیونکہ یہ مورخ بات کرتے تھے وقت کے اقتضا اور انسان کی فطرت کو دیکھکر وہ سمجھتے تھے کہ سچی بات سے کوئی ہنگامہ پیدا نہیں ہوا کرتا جبکہ ذرا سا جھوٹ قیامت برپا کر دیتا ہے، پھر اس جھوٹ کو پھیلانے کے لئے ان کے پاس کافی ذرائع موجود تھے مدرسوں کا ایک وسیع جال ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلا ہوا تھا جو اس مقصد میں خاطر خواہ امداد دے رہا تھا، اور ہندوستان کے سادہ لوح باشندے اس فریب میں مبتلا ہو رہے تھے، وہ گھر کی سچی باتوں کے مقابلے میں باہر کی جھوٹی باتوں کو زیادہ توجہ اور دلچسپی سے سُن رہے تھے، حالانکہ اُن کے گھر کی تاریخوں

میں مسلمان فرمانرواؤں کے ہزارہا واقعات اس قسم کے مل سکتے تھے جن سے ہندوؤں کے مقابلے میں ان کی رواداری نہ رکھتا ... کا ثبوت مل سکتا تھا۔ یورپی مدبرین نے توانھیں دانستہ نظرانداز کردیا، کیونکہ ان کو روشنی میں لانے سے ان کے مقاصد کو نقصان پہونچتا تھا لیکن ہندوستانی چاہتے تو ان سے حقیقت کا سراغ لگا سکتے تھے۔

واقعہ یہ ہے کہ مسلمان بادشاہوں نے کسی وقت بھی امورِ سلطنت میں تعصب کو دخل نہیں دیا، انھوں نے ہر موقعہ پر اپنی غیر مسلم رعایا کے آرام و آسائش کا خیال رکھا، یہی نہیں بلکہ انھیں اپنی دفتری زبان کی تعلیم دے کر کاروبارِ حکومت میں شریک کیا۔ سلطان سکندر لودی کے زمانے تک ہندو شاہی زبان یعنی فارسی سے ناواقف ہونے کے باعث دفتری ملازمت سے محروم تھے۔ اگرچہ فوج وغیرہ میں ہندوؤں کی کافی تعداد تھی مگر ملکی و مالی عہدے انھیں حاصل نہ تھے۔ سلطان سکندر نے ہندوؤں کی اس حق تلفی کا سدِباب کرنے کی غرض سے سب سے پہلے اس ضرورت کو محسوس کرکے ہندوؤں کو فارسی زبان سیکھنے پر متوجہ کیا تاکہ وہ ملازمتوں میں اپنا حصہ لے سکیں اور سلطنت کے کاموں میں شریک رہیں۔ جب سلطان سکندر نے دیکھا کہ اہلکاران و عہدیداران میں ہندو نظر نہیں آتے تو اس نے ہندوؤں کو ان کا یہ حق دینا چاہا۔ مگر معلوم ہوا کہ ہندو فارسی زبان سے بالکل ناواقف ہیں، اور اس وقت کوئی ہندو بھی ایسا نہیں جو فارسی جانتا ہو۔ چنانچہ سلطان نے سب سے پہلے برہمنوں کو بلاکر ان سے فارسی پڑھنے کو کہا۔ انھوں نے اپنی مذہبی ضروریات اور مصروفیتوں کے پیش نظر انکار کردیا۔ پھر چھتریوں سے کہا گیا، مگر یہ فوجی زندگی ہی کو اپنے لئے سربلندی کا ذریعہ خیال کرتے تھے، انھوں نے بھی اظہارِ مجبوری کیا۔ ویش قوم کے لوگ تجارت سے زیادہ دلچسپی رکھتے تھے، یہ خدمت مذہبًا ان پر فرض تھی، وہ بھی اس ذمہ داری کو قبول نہ کرسکے۔ اعلیٰ قوموں میں کایستھوں نے فارسی کو اپنے عروج کا ذریعہ بنایا اور فارسی پڑھنے پر آمادہ ہوئے۔ چنانچہ انھوں نے فارسی زبان سیکھ کر مسلمانوں کے عہدِ سلطنت میں زبردست عروج حاصل کیا۔ اور بڑے بڑے عہدوں پر مامور ہوئے۔ انھوں نے مسلمانوں کے علوم میں اتنی دستگاہ بہم پہونچائی کہ ان علوم کا درس دینے لگے، فارسی میں بے تکلف شعر کہتے تھے۔ پنڈت ڈونگرمل کا یہ مطلع آج بھی داد حاصل کئے بغیر نہ رہیگا۔

دل خوں نہ شدے چشم تو خنجر نہ شدے گر
رہ گم نہ شدے زلف تو ابتر نہ شدے گر

سلطان سکندر لودی ہی نے امرگرمہا ویدک کا ترجمہ سنسکرت سے فارسی زبان میں کرایا اور خراسان و ہندوستان کے طبیبوں کو جمع کرکے فنِ طب میں ایک کتاب "طبِ سکندری" کے نام سے تصنیف کرائی جس میں یونانی اور ویدک کے مسائل کو سمو کر دونوں کو ایک کر دیا ہے، اور اس علمی اتحاد سے قومی اتحاد کی بنیاد قائم کی ہے

دکن کے نامور بادشاہ علاؤالدین حسن گانگوی نے محض اس وجہ سے لفظ "گانگوئی" کو اپنے نام کا جزو بنا لیا تھا کہ اُس کے آقا کا نام "گنگو" تھا جو قوم کا برہمن تھا۔ اس واقعہ کو سیاست اور ڈپلومیسی سے دُور کا بھی تعلق نہیں ہے بلکہ اس کی بنیاد دوستانہ تعلقات اور اُن مخلصانہ روابط پر ہے جو ایک آقا اور وفادار ملازم کے درمیان ہوا کرتے ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ دولت و سلطنت پا کر انسان کا پہچاننا کیسا کٹھن کام ہے۔

شیر شاہ سوری کے حالات میں اس کے عدل و انصاف کے متعلق ایک واقعہ ملتا ہے جس میں ملزم شیر شاہ کا بڑا بیٹا اور ولیعہد سلطنت عادل خاں ہے اور مستغیث ایک معمولی بنیا مگر شیر شاہ نے عدالت کے وقت اس فرق کو مطلق نظر انداز کر دیا۔ اور بغیر کسی رورعایت کے بیٹے کے خلاف فیصلہ صادر کیا حالانکہ اس فیصلے سے خود ناموس شاہی کو صدمہ پہونچتا تھا۔ اور عادل خاں کی بیوی کی بے پردگی ہوتی تھی۔ مگر انصاف کے آگے اِن چیزوں کی کوئی وقعت نہ تھی جیسی کرنی ویسی بھرتی۔

یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے بلکہ اس سے عہد شیر شاہی کے متعلق بہت سی باتوں اور حُسن انتظام وغیرہ کا انکشاف ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیر شاہ کے دور حکومت میں رعایا اس کے انصاف اور عدل گستری سے اتنی مطمئن تھی کہ معمولی بنیا یہ جانتے ہوئے بھی کہ ملزم بادشاہزادہ ہے اُس کے خلاف استغاثہ دائر کرنے میں پس و پیش نہیں کرتا۔ باپ کی عدالت میں بیٹے کے خلاف مقدمہ کا پیش ہونا اس امر کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ اُس وقت انصاف حاصل کرنے میں کوئی چیز مانع نہیں ہو سکتی تھی اور ہر شخص کو کامل آزادی تھی کہ اپنی تکالیف کا بادشاہ کے سامنے اظہار کرے۔ ہندو مسلمان کا تو سوال ہی کیا ہے بھائی اور بیٹے کی تمیز بھی نہ تھی۔

عبدالرحیم خان خاناں اکبری عہد کا زبردست جرنیل تھا۔ وہ سنسکرت پر کامل عبور رکھتا تھا، بھاشا میں نہایت شائستہ اور دلچسپ اشعار کہتا تھا جس طرح فارسی کے مسلمان شعرا اُس کے دست کرم سے فیضیاب ہوتے تھے اُسی طرح نغمہ سنجانِ ہندی کو انعامات اور صلے دیئے جاتے تھے۔ بلکہ صاحب مآثر رحیمی کا بیان ہے کہ جتنے انعامات اُس نے فارسی شعرا کو دیئے ہیں اُس سے دس گنا روپیہ ہندی کے شاعروں کو بخشا ہے۔

ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں میں شاہجہاں اور عالمگیر بہت بدنام ہیں۔ یورپ کے مورخین نے ان دونوں کو دل کھول کے رُسوا کیا ہے۔ خدا شاہد ہے کہ ان کی زیادتیوں کو چھپانا ہمارا مقصود نہیں ہمیں معلوم ہے کہ ان میں کمزوریاں تھیں جیسی ہر انسان میں ہوا کرتی ہیں۔ مگر یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ وہ جو کام کرتے تھے مذہب کے حکم سے کرتے تھے۔ شاہجہاں کے متعلق سب جانتے ہیں کہ اُس نے اپنے حقیقی بھتیجوں کو قتل کر کے تخت سلطنت پر قبضہ کیا تھا۔ کیا اُس کے مذہب نے جو صلۂ رحمی کو بہت ضروری قرار دیتا ہے

اس خونریزی کی تعلیم دی تھی؟ ہرگز نہیں یہ جذبہ اس لئے دل میں تخت وتاج کی اندھی حرص نے پیدا کیا تھا۔ آگے چلکر خواہ وہ کیسا ہی اچھا حکمراں ثابت ہوا ہو مگر اس کا دامن ظلم کے اس دھبے سے صاف نہیں ہو سکے گا ہندوؤں کے مقابلہ میں اس بادشاہ کا طرز عمل بہت اچھا تھا۔ شاہجہاں نے اپنے عہد سلطنت میں ہندوؤں کو ہر قسم کی مذہبی اور تمدنی آزادی دے رکھی تھی، بلکہ آج اس آزادی کو شاہجہاں کی کمزوری پر محمول کیا جائے گا۔ شاہجہاں کی رواداری کی حد یہ ہے کہ اس کے دور حکمرانی میں ہندوؤں نے مسجدوں کو مندروں کی شکل میں منتقل کرنا شروع کر دیا تھا۔ شاہجہاں کو اطلاع ہوئی تو اُس نے کوئی سخت کارروائی نہیں کی صرف وہ مسجدیں مسلمانوں کو واپس دلادیں۔ شاہجہاں کا بڑا اور چہیتا بیٹا دارا شکوہ جب باپ کا شریک حکمرانی ہوا تو اُس نے ہندوؤں کی کافی رعایت ملحوظ رکھی۔ بڑے بڑے عہدوں پر ہندو مامور ہوئے۔

شاہجہاں کا وزیر نواب سعداللہ خاں جو اپنی مذہبیت اور خدا پرستی کے لحاظ سے شاہجہاں اور اورنگ زیب دونوں سے ممتاز تھا۔ اس کی بے تعصبی اور رواداری کا یہ عالم تھا کہ رگھناتھ اُس کا پیشکار تھا۔ خالصہ وتن کی پیشکاری اس سے متعلق تھی۔ سعداللہ خاں نے اس کی اتنی عمدہ تربیت کی تھی کہ سعداللہ کے بعد ہی اس کا عارضی انچارج ہوا۔ شاہجہاں کے دربار سے اس کو رائے رایاں کا خطاب عطا ہوا تھا۔ اسی زمانہ میں ایک اور ہندو چندربھان دارالانشا کی خدمت پر متعین تھا اور رائے چندربھان مشہور تھا۔ ان کے علاوہ بھی بہت سے ہندو سرکاری عہدوں پر فائز تھے۔ فوجی عہدے بھی ہندوؤں کو حاصل تھے۔ اورنگ زیب کی تاریخ یورپین مورخین کی ستم ظریفانہ توجہات سے اور زیادہ تاریک ہے۔ اس کو ہندوؤں کے مقابلے میں نہایت سرگرم مجاہد ظاہر کرکے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اس کا مقصد ہی ہندوستان سے ہندوؤں کی بیخکنی کرنا تھا۔ سیواجی کے مقابلے میں اس کی لشکرکشی کو ہندوکشی کا سب سے بڑا ثبوت بیان کیا گیا ہے۔ حالانکہ جن لوگوں نے اورنگ زیب کے سوانح حیات کو تعصب اور تنگ نظری سے الگ ہو کر مطالعہ کیا ہے وہ ضرور اس کی شہادت دیں گے کہ وہ ہندوؤں ہی کے بالمقابل سخت نہ تھا۔ خود مسلمانوں سے بھی اسی قسم کا برتاؤ کرتا تھا۔ اس کے سیاسی کارناموں کو مذہبی تنگ نظری پر محمول کرنا تاریخ کو مسخ کرنا ہے۔ حقیقت میں اورنگ زیب ملک گیری اور سلطنت کی وسعت کا دلدادہ تھا اور اسی کو مقصد حیات جانتا تھا۔ اس راستے میں جو چیز اس کے سامنے حائل ہوتی تھی وہ ارادے کی پختگی اور طاقت کے پورے جوش کے ساتھ اُسے ہٹانے کی سعی کرتا تھا۔ سب سے پہلے دارا شکوہ کو اور پھر شجاع کو راستے سے ہٹاکر اورنگ زیب نے اپنی بادشاہت کے لئے میدان صاف کیا۔ آخر میں مراد بخش جو دارا شکوہ کی لڑائی میں اس کا دست راست تھا اور اس لڑائی کی فتح

میں اُس کا حصہ اورنگ زیب سے کچھ زیادہ ہی تھا۔ جب اورنگ زیب کی فرمانروائی میں روڑے اٹکانے لگا تو اورنگ زیب نے اُسے بھی گرفتار کر کے قید میں ڈال دیا۔ اور اس پر بھی یہ کانٹا اس کے پہلو میں چبھتا رہا تو نہایت بیدردانہ طریقہ پر مرادبخش کی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔ اس کے بعد دکن کی سلطنتوں میں وہ جس جوش و خروش سے لڑا اور خود اپنے بیٹوں کے ساتھ جو جارحانہ رویہ رہا اس سے تاریخ کے طالب علم اچھی طرح واقف ہیں۔ ایسی صورت میں کون کہہ سکتا ہے کہ اورنگ زیب صرف ہندوؤں ہی کے ساتھ سختی کرتا تھا۔ اور اُس نے جس قسم کا برتاؤ شیواجی کے مقابلے میں کیا ہے وہی دارا شکوہ۔ شجاع۔ مراد اور دکن کے تاجدار ابوالحسن کے مقابلے میں نہیں کیا، اور بیجاپور کے محاصرے میں اُس نے اُسی جوش و خروش کا اظہار نہیں کیا اور نگ زیب کے عہدِ حکومت میں ستائیس ہندو بڑے بڑے عہدوں اور منصبوں پر فائز تھے اگر عام عہدیداران اور فوجی افسروں کا شمار کیا جائے تو یہ سلسلہ ہزاروں تک پہونچ سکتا ہے۔ اورنگ زیب بت شکنی کے معاملہ پر نہایت شہرت رکھتا ہے۔ لیکن بدامنی اور شورش کے زمانہ میں اُس نے بہت مجبور ہو کر سیاسی و ملکی ضرورت سے ایسا کرنے کی جراُت کی۔ اور اُسی صورت میں جبکہ انھیں فوجی مرکز بنا دیا گیا تھا۔ عام حالات اور امن وسکون کے وقت اُس نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ اورنگ زیب نے پچیس[۲۵] سال دکن میں قیام کیا مگر وہاں کے کسی بتخانے کو نہیں چھوا۔ اگر اُسے اُن سے دشمنی ہوتی تو دکن کے ہزاروں مندروں پر بھی غصہ کی نگاہیں ڈالتا، لیکن اُس نے کبھی اس قسم کا ارادہ تک نہیں کیا۔

لیکن مصیبت یہ ہے کہ تاریخ کے طالب علم ہندو ہوں یا مسلمان، اورنگ زیب کو محض ایک بت شکن کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ انھیں اول سے آخر تک یہی بتایا گیا ہے، اور یہی ذہنیت لے کر وہ اسکول اور کالجوں سے نکلتے ہیں۔ اگر انھیں بھی سچی تاریخ پڑھائی جائے تو ہندو مسلمانوں کی بہت سی عداوتیں دُور ہو جائیں، اِن میں محبت، ہمدردی اور رواداری کے جذبات پیدا ہوں، قومی حکومتوں اور قومی کارکنوں کو جو مسئلۂ تعلیم یا ہندو مسلم اتحاد سے دلچسپی رکھتے ہیں فوراً اس اہم ضرورت کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے۔ اور تاریخی کتابوں سے جو آجکل مدارس میں پڑھائی جا رہی ہیں، ایسے فاسد اور تباہ کن عنصر کو فوراً خارج کر دینا چاہیئے جو دونوں قوموں میں منافرت و عداوت، دشمنی اور تنگ دلی کی خلیج کو بڑھا رہا ہے۔

(از نتیجۂ فکر ڈاکٹر جگدیشور چندر قیسیؔ بیرنی)

زمانہ میری ہستی کو مٹا سکتا ہے؟ ناممکن
چراغِ زندگی میرا بجھا سکتا ہے؟ ناممکن

مکمّل زندگی ہوں، میں مجسّم کامرانی ہوں
قدم پیچھے مرا کوئی ہٹا سکتا ہے؟ ناممکن

کوئی حد ہی نہیں ہے میرے پروازِ تخیّل کی
مرے جذبات کو کوئی دبا سکتا ہے؟ ناممکن

میں وہ ہوں ایک دنیا جسکے آگے سر جھکاتی ہے
زمانہ میری گردن کو جھکا سکتا ہے؟ ناممکن

چراغِ دیر و کعبہ دونوں میرے دم سے روشن ہیں
انھیں اک کرمکِ ناداں بجھا سکتا ہے؟ ناممکن

جہاں کو درس دیتا ہوں میں آئینِ محبت کا
کوئی دنیا محبّت کی مٹا سکتا ہے؟ ناممکن

میں دنیائے محبت کے لئے اک خضرِ منزل ہوں
مرے دعوے پہ کوئی حرف لا سکتا ہے؟ ناممکن

مری قوت کا لوہا مانتا سارا زمانہ ہے
میں شاعر ہوں مرا اک کھیل دنیا کو بنانا ہے

غزل

ہم اُن کی جب نگاہِ فتنہ ساماں دیکھ لیتے ہیں
حقیقت ہی بتوں میں شانِ یزداں دیکھ لیتے ہیں

کبھی ہم اُن کو ہر ذرّے میں پنہاں دیکھ لیتے ہیں
کبھی ہر شکل میں اُن کو نمایاں دیکھ لیتے ہیں

قفس میں یاد آجاتی ہیں وہ آزادیاں پچھلی
کسی کو باغ میں جب گل بداماں دیکھ لیتے ہیں

اگرچہ لاکھ دیوانے ہیں اتنا ہوش رکھتے ہیں
بہار آنے سے پہلے اپنا داماں دیکھ لیتے ہیں

ہمیں بے ساز و سامانی پہ اپنی شرم آتی ہے
جنوں میں جب کبھی سوئے گریباں دیکھ لیتے ہیں

ہمیں اچھا سمجھتے ہیں یہ رازِ عشق اے واعظ
کہ ہر سجدے سے پہلے اپنا ایماں دیکھ لیتے ہیں

صنم خانہ ہو میخانہ ہو یا کعبہ ہو اے قیسیؔ
ہم اپنا جذبِ ایماں تا بہ امکاں دیکھ لیتے ہیں

عہدِ جدید

(از شائق ہندو)

(۱)

نذرِ اشک و ہدیۂ لختِ جگر دیتا ہوں میں　　مفت بالکل دولتِ لعل و گہر دیتا ہوں میں

ساکنانِ ارضِ مشرق اپنا رتبہ پوچھ لیں　　ہر کسی کو اس کی قسمت کی خبر دیتا ہوں میں

ہندیوں کے حق میں ہوں پیغمبرِ انسانیت　　خاک کے پتلوں کو جذباتِ بشر دیتا ہوں میں

گلشنِ ہندوستاں کو ہو نویدِ نوبہار　　لالہ و گل کو پر و بالِ شرر دیتا ہوں میں

اے خدا ہاں بھیج اب خطراتِ تازہ تو بہ تو　　حضرتِ انسان کو ذوقِ صد خطر دیتا ہوں میں

(۲)

بارگاہِ حق سے حکمِ کن فکاں ہونے کو ہے　　یہ جہانِ کاف و نوں پھر سے جواں ہونے کو ہے

از سرِ نو ہوگی تکوینِ قوانینِ حیات　　شیوۂ پارینہ بے نام و نشاں ہونے کو ہے

امتیازِ خواجگی و بندگی مٹ جائے گا　　گرم بازارِ مساواتِ جہاں ہونے کو ہے

شیوہ ہائے سبحہ و زنار ہوں گے برطرف　　پھر سے تازہ سنتِ تیغ و سناں ہونے کو ہے

شعلہائے لالہ و گل پائیں گے سوزِ دروں　　بندوبست دستبردِ باغباں ہونے کو ہے

صفحۂ عالم بنے گا خوانِ یغما سر بسر　　عام اتنی نعمتِ ہر دو جہاں ہونے کو ہے

(۳)

بندیِ ناعاقبت اندیش و نافرجام سن　　آ ادھر آ، سن رجائیت کا یہ پیغام سن

کب تلک سنتا رہے گا وعظِ شیخ و برہمن　　کام کی باتیں بھی اے سرگشتۂ اوہام سن

ایک دھوکا ہے حدیثِ شہرِ بیت اللہ دیکھ　　ایک جلوہ ہے فروغِ صورتِ اصنام سن

ہو رہی ہیں سبھی اقوامِ عالم فیض یاب　　ہے ورودِ رحمتِ باری کا یہ ہنگام سن

چار سوئے دہر میں بیدار ہے روحِ عمل　　ہے یہی موقع و محلِ ہمت و اقدام سن

وقت فرصت ہے جو کرنا ہو وہ کر لے جلد جلد　　کچھ نہیں ہے اعتبارِ گردشِ ایام سن

چِتا کے انگارے

ایک قصہ

(شری امرناتھ چوہدری بی اے الہ آباد یونیورسٹی)

(۱)

شفق کی سُرخی اناساگر جھیل کے خاموش پانی کو طرح طرح کے رنگوں میں تبدیل کر رہی تھی سامنے دُور تک پہاڑوں اور ٹیلوں کے دلآویز سلسلے سورج کی آخری شعاعوں میں چمک رہے تھے۔ پیڑوں کے سائے آہستہ آہستہ نیچے ہوتے جا رہے تھے۔ کبھی کبھی کسی چڑیا کا چہچہانا سنائی دیتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا قدرت کی ناؤ تاریکی کے اتھاہ سمندر میں ہچکولے کھا رہی تھی اور فضا انتشارِ زندگی کا روپ بھر رہی تھی۔

گلاب کے پھول کے مانند دو بچے ابھی تک جھیل کے کنارے کھیل رہے تھے۔ دونوں عمر کے اُس حصے سے گذر رہے تھے جب دنیا کے جذبات کا تھوڑا تھوڑا علم ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اور ایک عجیب قسم کی برقی قوت کا احساس ہونے لگتا ہے۔ کشور کی عمر تقریباً تیرہ چودہ سال کی تھی۔ سروج کی گیارہ کے قریب۔ دونوں نے دنیا میں آنکھ کھولتے ہی ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔ زندگی کے آفتاب کی پہلی سنہری کرنوں کی گنگا میں دونوں گانٹھ جوڑ کر نہائے تھے۔ وہ زمانہ بھی کتنا مبارک تھا۔ نفس کی آلائشوں سے پاک، زندگی کی ڈراونی حقیقتوں سے دُور۔ دونوں نے شاید کبھی ایک دوسرے کو اپنے سے الگ نہ دیکھا تھا۔

مگر یہ خواب فانی تھا، سماج کے تنگ دائرے میں جہاں ہر وقت زندگی اور موت کی بازیاں لگی رہتی ہیں ان باتوں کے لئے جگہ نہ تھی۔ زندگی کے قانون و قواعد ان بچوں پر بھی نافذ ہونے لگے۔ اور آج اسی بات کو سوچ کر دونوں متفکر تھے۔ سروج کو حکم ملا تھا کہ اُسے اب گھر سے باہر نہ نکلنا چاہیئے، کیونکہ اب وہ بڑی ہو گئی ہے۔ کشور کو تنبیہ کی گئی تھی کہ اب کھیل کود چھوڑ کر اُسے پڑھنے لکھنے کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے۔

یہ بات دونوں نہ سمجھ سکے، مگر اُن کے سمجھنے کے لئے تھوڑے ہی کہی گئی تھی؟

سروج نے کاغذ پھاڑتے ہوئے کہا "اب میں کبھی ناؤ نہ بناؤں گی" اور چپ چاپ کشور کے پاس آ بیٹھی۔

کشور کیا کہتا۔ حسرت سے سروج کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ اُس کا بس چلتا تو وہ زندگی بھر سروج

کے ساتھ کاغذ کی ناؤ بنا کر کھیلنا۔ کچھ سوچکر اُس نے کہا "سروج! تم جب کہیں اور چلی جاؤ گی تو مجھے بالکل ہی بھول جاؤ گی"

سروج نے تجاہلِ عارفانہ کے ساتھ کہا "کہاں چلی جاؤنگی؟"

کشور نے اُس کے جذبات پڑھنے کی کوشش کی اور کہا "تم اتنا بھی نہیں جانتیں سروج!"

"ہموں" اُس نے کہا "میں کہیں نہیں جاؤنگی" اور ہنسکر کشور کے ہاتھ پکڑ لئے "تم بڑے شریر ہو جو ایسی باتیں کہتے ہو"

اور اپنی آنکھوں میں سو سو بوتلوں کا نشہ لئے ہوئے وہ کشور کی طرف دیکھکر ہنس پڑی۔ دیوتا مسکرا دئیے

(۲)

سروج کے رخساروں پر سولہ بہاروں کی لالی چمکنے لگی۔ دنیا اور دنیا کی فضا بدل گئی۔ سروج "اب بڑی ہوگئی" بچپن کی باتیں بھی ہوا ہوگئیں۔

اِس عرصہ میں اُس نے ایک مرتبہ بھی کشور کو نہ دیکھا۔ کشور کی محبت اُس کے سینے میں دفن ہوگئی اور وہ پورے انہماک کے ساتھ دنیا کے کاموں میں لگ گئی تھی۔

ایک دن اُس نے سُنا کہ اُس کی شادی ہو رہی ہے۔ گھر میں چہل پہل شروع ہوگئی۔ ڈور دور نیوتے جانے لگے۔ سب کے چہروں پر خوشی و مسرت کے آثار نمایاں تھے، بھائیوں اور بہنوں کی خوشی کا کیا کہنا گویا انہیں کا بیاہ رچایا جا رہا تھا۔

لیکن سروج کو یہ دھوم دھام پسند نہ آئی "بیاہ ہوگا" "کس کے ساتھ؟" "کیوں؟" "آخر ایسی جلدی کیا ہے!" "اور پھر کشور؟"

اب نہ معلوم کدھر سے کشور کی یاد چور کی طرح آگئی۔ جس بات کو وہ پانچ برس کے عرصہ میں بھول گئی تھی، وہ پھر ایسی تازہ ہوگئی گویا کل ہی کی بات ہے۔ سروج سوچتی کہ یہ کیا بات ہے؟ اس کے دل میں سیکڑوں سوالات اُٹھتے تھے سیکڑوں بھولی ہوئی باتیں یاد آتی تھیں۔ اب اُسے کشور اور اپنی ماں اور بہنیں سب کو چھوڑنا ہوگا۔ اُس نے سوچا کہ میں وہاں کیسے رہ سکونگی۔ اُس کی نظر میں شادی موت کے مانند معلوم ہو رہی تھی، مگر اس کی وجہ کیا ہے؟ اسے وہ نہ سمجھ سکی۔

اور کشور اُس سے ملنے کیوں نہیں آیا، وہ جا رہی ہے۔ اتنا بڑا دکھ سہہ رہی ہے۔ پھر بھی کسی کو اس پر رحم نہیں آتا۔ ماں شادی کی تیاریوں میں مصروف ہے۔ سہیلیاں مذاق اُڑاتی ہیں، کشور کہاں گیا جس سے سب باتیں کہکر وہ اپنے جی کے بوجھ کو ہلکا کرتی، لیکن وہ کہاں تھا؟

آنے والی جدائی کے خیال نے اس میں کشور کے لئے اور بھی محبت پیدا کر دی۔ تکلیف کے وقت ہم اپنے دشمن سے بھی محبت کرنے لگتے ہیں لیکن سروج نے سوچا کہ وہ کشور کو بھول جائیگی اس سے صرف ظاہری تعلق رکھیگی اور اگر کبھی شوہر آئیگا تو وہ منہ چھپا کر بھاگ جائیگی۔ اس خیال نے اس کے دل میں ایک قسم کی قوت ارادی پیدا کی اور اس قوتِ ارادی کے ساتھ ساتھ محبت سے کھیلنے کے منصوبے۔ اس وقت وہ یہ نہ سمجھ سکی کہ یہ منصوبے اُسکی قوتِ ارادی کو جلا کر راکھ کر دیں گے، مگر راکھ اور مٹی سے ہی تو مورتیاں بنتی ہیں!

(۳)

وہ خاوند کے گھر آئی، دنیا کے رنگین خوابوں کی رانی بنکر، کسی بہشتی حور کی مانند آنکھوں کو چکا چوند کرنیوالی روشنی میں ناچتی ہوئی۔ اور اس کے ساتھ ہی جذبات کا ایک ناپیدا کنار سمندر اس کے دل کی گہرائیوں میں ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اس کے دماغ میں امیدوں خواہشوں اور ارمانوں کے ختم نہ ہونے والے ہنگامے برپا تھے، مگر اُس نے ان سب کو اپنے خاوند کے چرنوں میں ڈال دیا۔ اور خود ایک گنہگار قیدی کی طرح اس کی آنکھوں میں سما گئی۔

اُس کا خاوند شیام بھی کالج کا طالب علم تھا۔ اس نے بھی ادب کا مطالعہ کیا تھا۔ اور ناولوں کی ہیروئنوں کو اپنی محبت کا معیار بنایا تھا۔ اُس ملاح کی مانند جو دن بھر سمندر کا سفر کر کے شام کو ساحلِ زمین پر قدم رکھتا ہے تو اپنے کو دنیا کا سب سے زیادہ خوش نصیب آدمی تصور کرتا ہے۔ شیام بھی اپنے دلی ارمانوں کو سروج کی صورت میں مجسم دیکھکر مست ہو گیا۔ اُس نے سمجھا اُس کی فتح ہوئی ایک وارفتہ مزاج بندۂ عشق کی طرح اُس نے اپنا سب کچھ سروج کو دے دیا۔ لیکن سروج اُسے منظور نہ کر سکی۔ وہ تو اپنا سب کچھ پہلے ہی کشور کو نذر کر چکی تھی۔

شادی کے بعد کچھ مہینے بڑے آنند سے گذرے۔ شیام نے ہر طرح سے سروج کو خوش رکھنے کی کوشش کی لیکن جتنی اُس کی محبت بڑھتی گئی اُتنی ہی سروج پیچھے ہٹتی گئی۔ اپنی غلطی اور نا قابلیت کا اُسے تھوڑا سا تجربہ ہوا۔ اُسے معلوم ہوا کہ خاوند کی محبت سانپ بن کر اُسے ڈس لے گی۔ اور پتھر کی چٹان بن کر اُسے کچل دے گی۔

اُسے اپنے اوپر غصہ آیا۔ شیام کی محبت دیکھکر اُس کے دل کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے لگتے۔ وہ سوچتی کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ وہ کیوں مجھ سے اتنی محبت کرتے ہیں؟ میرا جسم تو اُن کا ہو ہی چکا، مگر دل .... آخر وہ دل کے اتنے طلبگار بھی کیوں ہیں؟

شیام ایک آدرش نوجوان تھا۔ اپنی نیک چلنی، خوش اخلاقی اور اعلیٰ ذہانت کی وجہ سے وہ کالج کا ایک مشہور و نیکنام طالب علم تھا۔ اس نے ہندی لی تھی، اُسے کتب بینی کا اس قدر شوق تھا کہ ہر وقت ہندی ادب

کی خوشہ چینی کرتا رہتا تھا۔ ان کتابوں کے علاوہ اسے اور کسی چیز کا شوق نہ تھا۔ وہ فرسٹ ڈویژن میں بی۔اے پاس ہوا۔

اُسے دیکھکر سروج کے قلب مضطر میں طوفانی جذبات کا تلاطم برپا ہونے لگتا۔ ہائے وہ کتنا نیک ہے دنیا کے کسی مکر و فریب اور جھوٹ کو جانتا ہی نہیں ہے۔ ندی کی لہروں کی طرح نرمل اتپائے ہوئے سونے کی طرح کندن لیکن اس پر بھی وہ اس سے محبت نہ کر سکی، دغا دے سکتی تھی، مگر یہ بھی نہ دے سکی۔ اس کا جی چاہتا تھا سر پھوڑ کر جان دیدے۔

اس خیال نے دماغ میں جاگزیں ہوکر سروج کی زندگی تلخ کردی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں اُس کی تندرستی بگڑنے لگی، چہرہ پیلا پڑنے لگا۔ پاگلوں کی طرح وہ اکثر اوقات سارے واقعات بھول جاتی تھی۔ تھوڑے ہی دنوں میں شیام کو معلوم ہو گیا کہ اس کی بیوی تپ دق کے آخری درجے سے گذر رہی ہے۔ شیام نے سر پیٹ لیا۔

۴

اجمیر کالج سے اعزاز کے ساتھ بی۔ ایس۔ سی کی ڈگری لیکر کشور نے الہ آباد یونیورسٹی میں ایم۔ ایس۔ سی کلاس میں نام لکھایا۔ جن دنوں وہ اجمیر میں پڑھتا تھا اُس کے دل میں کئی مرتبہ سروج سے ملنے کی خواہش ہوئی لیکن وہ ایسا نہ کر سکتا تھا۔ شیام اُس کا دوست تھا، اور گو اُس نے اُسے کئی بار بلایا پھر بھی سروج سے ملنے کی ہمت نہ ہوئی، اُس کا دل ٹوٹ چکا تھا۔ جس وقت سروج کی شادی ہو رہی تھی اُس وقت کشور اناساگر جھیل کے کنارے بیٹھا ہوا سوچ رہا تھا کہ آج میری دنیا سونی ہو گئی۔ آج سے میرے سارے ارمان ہمیشہ کے لئے ٹوٹ گئے۔

اس درمیان میں بہت سی باتیں ہوئیں، بڑی بڑی تبدیلیاں ہوئیں، گردش روزگار نے شیام کا بھی پیچھا نہ چھوڑا، شہر میں اُس کے جو مکانات تھے نذر آتش ہو گئے، اور اُسے مالی مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑا۔ مگر اس عرصہ میں پوشیدہ طور سے اس کے پاس ہر مہینہ روپئے آجاتے تھے، اُسے تعجب کے ساتھ ساتھ ندامت بھی ہوتی تھی مگر وہ اس کا تدارک نہ کر سکا۔ بعض لوگ اس بات سے واقف تھے، صرف شیام ہی نہیں جانتے تھے۔

جب سروج کی سہیلی نے ایک دن اُس سے سارا حال کہا تو اُس کی گردن بار احسان سے جھک گئی۔ برسوں کے بھولے ہوئے جذبات اُبل پڑے۔ کشور کی صورت آنکھوں میں پھرنے لگی، اور ایک رات کو دنیا کے تمام اُصولوں کے خلاف ورزی کر کے، سماج کو ٹھکرا کے اُس نے کشور کو خط لکھ ہی دیا۔

خط دیکھکر کشور کا دل خوشی سے بیتاب ہو گیا۔ اوہ، سروج اب اتنا اچھا لکھنے لگی ہے۔ اُس کے پاس سروج کے بچپن کی ایک کاپی رکھی تھی۔ اُس کو اُس نے نکال کر دیکھا اور ایک بار وہ پھر وقت کے اس بحر بے پایاں

کو پار کرتے آناساگر جھیل کے کنارے پہونچ گیا۔ سروج نے اپنے خط میں کشور کو بلایا تھا۔

اس مرتبہ جب گرمیوں کی چھٹی میں شیام نے اُسے منصوری بلایا تو وہ انکار نہ کر سکا۔ شیام نے لکھا تھا کہ "سروج کی حالت بہت خراب ہے، ہم لوگ یہاں اکیلے ہیں، اگر تم آجاؤ تو اچھا ہے۔"

(۵)

سروج کی چارپائی کے پاس کرسی پر بیٹھتے ہوئے جس وقت کشور نے کہا "سروج تم کب سے بیمار ہو؟" اُس وقت سروج آنکھ بند کئے چپ چاپ پڑی تھی۔

کشور کی آواز سن کر چونک پڑی، گویا خواب سے جاگی۔ پھر کشور کی طرف ٹکٹکی لگا کر دیکھنے لگی، بولی "کیا تم سچ مچ آگئے؟ میں نے تو تم سے ملنے کی امید ہی چھوڑ دی تھی۔ اچھی طرح ہو؟"

شیام اُس وقت ڈاکٹر صاحب کو بلانے گئے تھے۔

سروج کا سوال سنکر کشور کے دل میں برچھی سی چبھی، ایسا معلوم ہوا کہ سیکڑوں بچھوؤں نے کاٹ کھایا اپنی بے پروائی اور خود غرضی پر افسوس ہوا۔ آنکھوں میں آنسو جل کر راکھ ہو گئے۔

سنبھل کر بولا "تم کب سے بیمار ہو سروج؟ مجھے اطلاع کیوں نہ دی؟"

سروج ہنس پڑی، ہڈیوں کے ڈھانچہ میں موتی چمک اٹھے۔

کشور نے لمحہ بھر کے لئے آنکھیں بند کرلیں، ہائے سروج کا وہ رنگ وروپ کہاں گیا؟ پھر کسی نے دل کو مسوس کر کہا۔ کشور اس کے لئے تمھیں گنہگار ہو، تمھیں نے سروج کی یہ حالت بنادی ہے۔ کشور کا سر خود بخود ندامت سے جھک گیا۔

سروج نے کہا "سچ کہتی ہوں کشور، اگر تم ہماری مدد نہ کرتے تو میں نہیں کہہ سکتی......"

کشور نے اُسے روکتے ہوئے کہا، اِن باتوں کو چھوڑو، یہ بتاؤ کس کی دوا کر رہی ہو؟

جم دوت کی،

ٹھیک اسی وقت شیام اور ڈاکٹر کمرہ میں داخل ہوئے۔

(۶)

تین مہینے کی دن رات خدمت کا نتیجہ یہ ہوا کہ سروج اچھی ہو چلی، اب وہ تھوڑا تھوڑا گھوم پھر بھی آتی تھی، تھوڑا بہت پڑھنے بھی لگی تھی۔ کشور اُسے نئی نئی کہانیاں سناتا، اخبار وغیرہ کی خبریں بھی بتادیتا۔ یہ تین مہینے پھر ایک دوسرے کو نزدیک لے آئے

ایک دن سروج گھوم کر آئی تو کشور کھڑکی کے پاس بیٹھا تھا، شاید کچھ سوچ رہا تھا، اُس روز سروج

کچھ تھکی ہوئی سی تھی۔ آتے ہی پلنگ پر لیٹ گئی کچھ اداس بھی تھی بولی تم آج باہر نہیں گئے"؟
کشور اس وقت قدرتی نظارہ دیکھنے میں اتنا منہمک تھا کہ اس نے سروج کا سوال سنا ہی نہیں،
پھر یکایک چونک کر اٹھ بیٹھا بولا "تم کب آ گئیں، مجھے تو معلوم بھی نہیں ہوا!"
سروج نے کچھ سوچکر کہا۔ اب تو تعطیل ختم ہو رہی ہے، تم کالج نہ جاؤ گے؟
اس خیال کے آتے ہی اس کی آنکھیں پُرنم ہو گئیں، وہ کشور کی طرف دیکھ نہ سکی۔
کشور نے کہا "چلا جاؤں گا" پھر اس کی طرف ایک نگاہِ ترحم سے دیکھکر بولا "تو ایسی کیا جلدی ہے"
"میرے لئے اپنا ہرج کیوں کرتے ہو؟"
"میں یہ سوچ رہا تھا سروج کہ گھر میں تو تمھارا علاج ٹھیک طرح نہ ہو سکے گا۔۔۔ میرے کالج کی تم
پروا نہ کرو۔۔۔۔۔"
"تب؟"
اور شیام کا جانا بھی ضروری ہے، اب اُن کی بھی چھٹیاں ختم ہو گئیں۔۔۔۔۔ میری رائے یہ ہے
۔۔۔۔ کہ۔۔۔۔۔ اگر تم یہیں کچھ دن بنی رہو۔۔۔۔۔ تو۔۔۔۔۔"
"یہ کیسے ہو سکتا ہے کشور؟"
شیام بھی اسی وقت آ گئے، بولے "گھر سے خط آیا ہے۔۔۔۔۔" مگر سروج کی طرف دیکھکر چونک پڑے
بولے "آج تو تم بہت تھکی ہوئی معلوم ہوتی ہو۔۔۔۔۔"
پھر کشور کی طرف دیکھکر بولے "کشور بھیّا تمھارا یہ احسان میں زندگی بھر نہ بھولوں گا تمھیں نے مجھے
جیون دان دیا ہے۔ تم نے سروج کی جتنی سیوا کی ہے، اُتنی کوئی سگا بھائی بھی نہیں کر سکتا تھا، میں تمھارا قرض
کئی جنم تک نہ چکا سکوں گا۔"
اس نے اتنا کہا اور فرطِ عقیدت سے اُن کی آنکھیں بھر آئیں۔
منصوری چھوڑنے سے ایک دن پہلے سروج نے کہا "کشور! نہ جانے پچھلے جنم میں میں نے کون سے
پاپ کئے تھے جن کا ڈنڈ مجھے یہاں بھوگنا پڑا۔ کھوٹی قسمت لے کر آئی تھی تبھی تو کسی کو سکھ نہ دے سکی۔"
کشور نے کہا "ایسا نہ کہو سروج۔۔۔۔۔"
لیکن سروج نہ مانی، آج وہ سب کچھ کہہ ڈالے گی، زندگی میں آہ پھر کبھی موقع ملا یا نہ ملا۔
بولی "اگر تم نہ آتے تو میں زندہ بھی نہ بچتی۔ اس میں مجھے شک ہے۔۔۔۔۔ ایک بات پوچھوں، بتاؤ گے؟"
"پوچھو!"

"تم مجھے بالکل بھول گئے تھے؟ پانچ برس ہو گئے تم نے ایک دفعہ بھی خبر نہ لی۔"

کشور سر جھکائے کھڑا تھا، سروج نے کہا "خیر، اس بات کو جانے دو، مگر یہ تو بتاؤ کشور کہ کیا تم نے مجھ سے کبھی پریم کیا تھا؟"

"تم اس کو کیوں پوچھتی ہو سروج؟ کیا تم نہیں جانتیں؟"

"جانتی ہوں، تب ہی پوچھ رہی ہوں، سنو کشور، تم مجھے بھول جاؤ، ہمیشہ کے لئے میری محبت دل سے نکال کر پھینک دو، سمجھ لو کہ میں کبھی تھی ہی نہیں...... میرے لئے اتنا کرو کشور!"

کشور کا گلا خشک ہو گیا، جسم میں عجیب قسم کی سنسناہٹ محسوس ہوئی۔ آخر بڑی دقت سے بولا، "ایسا کیوں کروں سروج؟" اور پھر مسکرانے کی کوشش کی۔

سروج بولی "اس لئے کہ تم دیوتا ہو اور میں پاپن ہوں۔ میں نہیں چاہتی کہ تمھاری ساری سیوا اور تپسیا کو ضائع کر دوں۔ کشور اس بیماری میں جس لگن سے تم نے میری سیوا کی ہے اور جس آتمک پریم کو نباہا ہے کیا میں اسے نشٹ ہونے دونگی، مر جاؤنگی پر ایسا نہ ہونے پائے گا۔"

کشور نے سروج کے چہرے کو غور سے دیکھنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کے استقلال اور نفس کشی کی چمک کے سامنے کشور کی آنکھیں نہ اٹھ سکیں، جذبات کو دباتا ہوا بولا... "سروج......!"

سروج اٹھ کھڑی ہوئی اور ہاتھ جوڑتی ہوئی بولی "تم دیوتا ہو، میں تمھاری پوجا کرونگی، آرادھنا کرونگی، لیکن پریم نہ کر سکوں گی۔"

کشور حیرت سے سروج کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ صرف اتنا ہی کہا "تمھارا حکم سر آنکھوں پر" اور دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھک کر دوسرے کمرے میں ایک آرام کرسی پر گر پڑا۔

دوسرے دن وہ الہ آباد چلا آیا۔

پانچ مہینہ بعد ——

سب کچھ ختم ہو چکا تھا، سروج کی زندگی کی چنگاری بجھ چکی تھی...... سروج کی چتا پھونک کر وہ کھڑا ہوا تھا، سامنے اناساگر جھیل کا پانی خاموشی سے بہہ رہا تھا، کچھ چنگاریاں چمک چمک کر انسانی زندگی کا مذاق اڑا رہی تھیں....

کشور سوچنے لگا، اور ماضی کا پردہ اس کے سامنے سے ہٹ گیا... اس نے دیکھا... اناساگر جھیل کے کنارے دو بچے کھیل رہے تھے، سروج نے کاغذ پھاڑتے ہوئے کہا۔ اب

میں کبھی نا ؤ نہ بنا ؤنگی.....

اُس نے کہا " سروج، تم جب کہیں اور چلی جاؤ گی تب تو مجھ بالکل ہی بھول جاؤ گی...."

سروج نے کہا " کہاں چلی جاؤنگی ؟"

اُس نے کہا " تم اتنا بھی نہیں جانتیں سروج ؟"

" ہش " اُس نے جواب دیا " میں کہیں نہ جاؤنگی ... تم بڑے شریر ہو، ایسی باتیں کہتے ہو...."

چتا کے انگارے اُس وقت بھی ہنس رہے تھے

جذباتِ اختر

آرزوئے وصل رسم عام ہے — جاں نثاروں کو وفا سے کام ہے
حُسن کی فتنہ نگاہی کم نہیں — عشق ہی پر کیوں یہ سب الزام ہے
ذرہ ذرہ میں یہ جوشِ انقلاب — اُس نگاہِ عشوہ گر کا کام ہے
صاحبِ ذوقِ نظر تو ہو کوئی — ہم نے مانا تیرا جلوہ عام ہے
آپ بھی ہیں میری بربادی پہ خوش — کیا محبت کا یہی انجام ہے
جنتوں کا ذکر کیوں ہے بار بار — چاہنے والوں کو تجھ سے کام ہے
دیکھکر تیور ترے بدلے ہوئے — ذرہ ذرہ لرزہ بر اندام ہے
انقلابِ دہر کا اعجاز دیکھ — عاصیوں پر لُطف ہے انعام ہے
خونِ ناحق سے ہو جس کے رخ پہ رنگ — ایسی دنیا سے مجھے کیا کام ہے
ہے وہ اِک تخئیلِ رنگیں کی بہار — واعظوں میں جس کا جنت نام ہے
دیکھکر دار و رسن ہمت نہ ہار — منزلِ مقصود بس دو گام ہے

اُس کی بے مہری پہ یہ شکوے گلے!
عاشقی اختر اسی کا نام ہے؟

ہندو یونیورسٹی لائبریری بنارس

از مولوی فاضل منشی مہیشر پرشاد پروفیسر ہندو یونیورسٹی

ہندو یونیورسٹی کی اہمیت جہاں اور باتوں کی وجہ سے ہے وہاں اسکی لائبریری بھی قابل ذکر ہے۔ یہ لائبریری درحقیقت سنٹرل ہندو کالج کی بنیاد کیساتھ یعنی ۱۸۹۸ء میں وجود میں آئی تھی۔ اُس کے بعد جب پروفیسر تیلنگ مرحوم نے اپنے والد ماجد کی یادگار میں بہت سی کتابیں لائبریری کو دیں تو اسمیں ایک قابل قدر اضافہ ہوگیا۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ ڈاکٹر اینی بسنٹ مرحومہ کی سرپرستی میں لائبریری کی حیثیت بہت ہی اچھی ہوگئی۔

۱۹۱۷ء میں جب ہندو یونیورسٹی کی بنیاد پڑی تو سنٹرل ہندو کالج کے ساتھ ہی ساتھ لائبریری بھی ہندو یونیورسٹی کے تحت میں آگئی۔ تو اس کا انتظام ایک کمیٹی کے سپرد ہوا جسمیں وائس چانسلر۔ پرو وائس چانسلر۔ رجسٹرار۔ لائبریرین اور بیشتر دیگر اصحاب ممبر منتخب ہوئے۔ سرجادو ناتھ سرکار جو اسوقت ہندو یونیورسٹی میں پروفیسر تھے۔ اس لائبریری کے سب سے پہلے لائبریرین مقرر ہوئے۔

چونکہ یونیورسٹی کی وجہ سے لائبریری کی مزید ترقی و تکمیل کی ضرورت تھی۔ اس لئے تقریباً ایک لاکھ روپیہ ضروری کتب و رسائل وغیرہ کی خریداری کیلئے منظور کیا گیا۔ اس کے علاوہ یو۔پی گورنمنٹ اور بعض دیگر علم دوست و فیاض حضرات کے گراں بہا عطیات نے لائبریری کی اہمیت اور بھی بڑھادی۔

یو۔پی گورنمنٹ نے پچاس ہزار روپیہ عطا کیا۔ ملک کے نامور لیڈر سیٹھ جمنا لال بجاج نے اپنے دادا سیٹھ بچھراج جی (وردھا) کے نام پر پچاس ہزار روپیہ دیئے۔ بیکانیر ریاست کے سیٹھ بھیروں داس ایشور چندجی نے دس ہزار روپے ریسرچ کے لئے سائنٹفک رسائل اور عمدہ عمدہ کتابیں خریدنے کے لئے عطا کئے کلکتہ کے سیٹھ رور مل گوینکا نے تقریباً چالیس ہزار قیمت کی نادر و نایاب سنسکرت کتابوں کا ذخیرہ عطا کردیا۔ ہندو یونیورسٹی کے پہلے وائس چانسلر سر سندر لال کے بھائی پنڈت بلدیو رام صاحب داوے نے بھی اپنی قانونی کتابوں کا گراں مایہ ذخیرہ عطا کیا۔ حیدرآباد دکن کے راجے بیج ناتھ صاحب نے اپنا ذخیرہ عنایت کیا۔ جسمیں قانونی کتب کا عنصر غالب تھا۔ فخر قوم پنڈت موتی لال نہرو جی کے ذخیرہ نے قانونی سرمایہ کی اہمیت بہت ہی زیادہ بڑھادی۔

کلکتہ کے نامور جج سر آسوتوش چودھری نے پانچ ہزار جلدیں اپنے والد ماجد بابو درگا داس جی کے نام نامی پر عطا کیں۔ سر آسوتوش کے بھائی مسٹر پرمتھ ناتھ چودھری نے فرانسیسی زبان کی مستند مصنفین کی پندرہ سو تصنیفات مرحمت فرمائیں۔ فرانسیسی زبان کا ایسا گراں بہا سرمایہ غالباً ہندوستان کی کسی اور لائبریری میں نہیں ہے۔ بمبئی کے شہری پرسوتم وسرام ماوجی کی چھ ہزار کتابیں بھی اس لائبریری کو مل گئی ہیں۔ انھیں بعض کتابیں خاص طور پر قابل دید ہیں۔ اس سرمایہ میں رباعیات عمر خیام کے بائیس سو پرانے نسخے بھی ہیں۔

صاحب خمخانۂ جاوید مرحوم لالہ سری رام صاحب ایم۔ اے کا عربی، فارسی اردو کتب و رسائل کا بیش قیمتی ذخیرہ بھی اسی لائبریری کو ملا۔ اس قیمتی ذخیرے میں بہت سی قلمی کتابیں اور بعض نایاب مطبوعات ہیں۔ مثلاً:-

مہر نیمروز از مرزا غالب دہلوی مطبوعہ دہلی (ایڈیشن اول) ۱۲۷۱ھ/۱۸۵۴ء

مثنوی ابر گہربار از مرزا غالب دہلوی مطبوعہ دہلی (ایڈیشن اول) ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۴ء

رسالہ گلدستہ نتیجۂ سخن کلکتہ ۱۸۸۴ء کے پرچے وغیرہ وغیرہ

کتابوں کے علاوہ عمدہ عمدہ تصاویر کا جو ذخیرہ جناب لالہ سری رام صاحب نے عنایت فرمایا ہے اس کی وجہ سے لائبریری کے میوزیم کی قدر و قیمت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ یہ تصاویر مغل و راجپوتی آرٹ کے فن لطیف کی جیتی جاگتی مورتیں ہیں۔

ملک کے مشہور تاریخ داں اور عالم بابو کاشی پرشاد صاحب جیسوال مرحوم بیرسٹر پٹنہ نے اپنی تمام کتابیں لائبریری کو عطا کر دی ہیں۔

ان کے علاوہ تھوڑی تعداد میں کتابیں عطا کرنیوالے قدر دانوں کا تو کوئی شمار ہی نہیں کیا جا سکتا۔ ان عطیات کی بدولت بھی بہت سی اہم کتابیں مل گئی ہیں۔ چنانچہ کنور راج رگھو نندن سنگھ طاہر صاحب متوطن کناری بازار دہلی کی عنایت سے ہندو یونیورسٹی لائبریری کو دیوان غالب اردو کا وہ نسخہ مل گیا ہے، جو غالب کی زندگی میں نظامی پریس کانپور سے ۱۲۸۹ھ/۱۸۶۲ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ مطبوعہ نسخہ بہت کمیاب اور قابل قدر ہے۔ کیونکہ مرزا نے جس نسخے کی خود تصحیح کی تھی اسی سے یہ دیوان طبع ہوا تھا۔

لکھنؤ کے منشی مہادیو پرشاد صاحب کی بدولت اردو میں ناولوں کا سیلاب امنڈ رہا تھا انھوں نے اپنا تمام مال و متاع ہندو یونیورسٹی کے حق میں وصیت کیا تھا۔ چنانچہ اس وصیت کی بدولت لائبریری کی کتابوں میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔

کتب و تصاویر کے علاوہ لائبریری کو قدیم سکوں کا بہت اچھا مجموعہ بھی بنارس کے رئیس جناب

بالو درگا پرشاد صاحب کی فیاضی سے مل گیا ہے۔

اسی سلسلے میں اس امر کا بیان کر دینا بھی ضروری ہے کہ ہندوستان اور ممالک غیر کی بعض مطبوعات یونیورسٹی کو مفت ملی ہیں مثلاً گورنمنٹ آف انڈیا کی مطبوعات، عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کی مطبوعات ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کی مطبوعات، لیگ آف نیشن کی مطبوعات، کارنیگی انسٹیٹیوٹ امریکہ کی مطبوعات۔

غرض اسوقت اس لائبریری میں تقریباً ایک لاکھ کتابیں ہیں اور ہر سال تقریباً پچیس ہزار روپوں کی کتب کا اضافہ ہوا کرتا ہے۔

برٹش میوزیم لنڈن، باڈلین لائبریری آکسفورڈ اور کنگس کالج لائبریری کیمبرج میں فارسی گیتا کے جو نسخے ہیں ۱۹۳۵ء میں اُن کے عکس بھی ہندو یونیورسٹی کے لئے منگائے گئے ہیں۔

مرحوم مہاراجہ صاحب بڑودہ نے ۱۹۲۷ء میں ڈیڑھ لاکھ روپیہ ہندو یونیورسٹی کو لائبریری کے لئے عطا فرمایا تھا۔ چنانچہ اُن کے نام نامی پر لائبریری کی عمارت کا سنگِ بنیاد سن مذکور ہی میں ہز ایکسیلنسی لارڈ اروِن گورنر جنرل و وائسرائے ہند نے رکھا تھا۔ اب اِس عمارت کا بیشتر حصہ پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا ہے چنانچہ ۱۶ ستمبر کو یونیورسٹی کے بانی مبانی فخر ملک وملت پنڈت مدن موہن مالویہ جی مہاراج نے لائبریری میں ایک ریڈنگ روم کی رسم افتتاحی ادا کی ہے۔ اب لائبریری رات کے وقت ۸ بجے تک کھلی رہا کرے گی اور معلم و متعلم دونوں اس سے پہلے سے بھی زیادہ فائدہ اُٹھا سکیں گے۔

خیالات زرّین

غلطی کرنا نادان رہنے سے کہیں بہتر ہے۔

سیدھے راستہ پر چل کر کوئی گمراہ نہیں ہو سکتا۔

وقت گذرتے دیر نہیں لگتی۔

زندگی کا منزل مقصود خوشی و مسرت نہیں بلکہ نیک اعمال ہے

ہر کام میں خدا کی یاد رکھنا۔ یہی اصل مذہب ہے۔

(ماخوذ) سمن تکم

منشی بشیشور پرشاد منور لکھنوی

خان بہادر مرزا جعفرعلیخاں اثر لکھنوی

تنقید کتب

بہاراں[1]

ناظرین زمانہ خان بہادر مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی ڈپٹی کمشنر سیتاپور کے نام نامی سے بخوبی واقف ہیں۔ آپ ایک نامور ادیب زمانہ کے قلمی معاون اور ہمارے دیرینہ کرمفرما ہیں۔ پُرگو، کہنہ مشق اور نازک خیال سخنور ہونیکے علاوہ آپ اعلیٰ درجہ کے سخن سنج اور نقاد بھی ہیں۔ آپ کا دیوان "اثرستان" کے نام سے شائع ہوکر مقبول عام ہو چکا ہے لیکن اُس کو کئی سال ہو گئے۔ اس لئے قدر دانان سخن یہ سُن کر خوش ہوں گے کہ حال ہی میں آپ کے کلام معجز نظام کا ایک مکمل دیوان خاص اہتمام سے طبع ہوا ہے۔ اسمیں آپ کی تازہ ترین غزلیں، پرانے کلام کا انتخاب، متفرق اشعار اور فارسی کلام سب کچھ یکجا کر دیا گیا ہے۔

کسی شاعرانہ کلام کی تنقید کرنا در اصل "عالم رنگ و بو" کے تجزیہ و تحلیل کے بمنزلہ ہے۔ ایک پھول اپنے خاص ماحول، مخصوص فضا اور اپنی ظاہری حیثیت میں جتنا خوشنما معلوم ہوتا ہے۔ اتنی دلفریبی اور دلکشی اُسوقت باقی نہیں رہتی، جب یہ بتایا جائے۔ کہ اُس میں ہائیڈروجن یا نائٹروجن کی کتنی مقدار ہے یا کاربن کا کتنا جزو ہے۔ اسی طرح اثر صاحب کے کلام کا جو لطف اُس کے پڑھنے اور اُس سے لطف اٹھانے میں ہے وہ اِس تنقید کرنے میں نہیں۔ اس لئے ہم صرف اتنا ہی عرض کریں گے کہ یہ مجموعۂ کلام قدیم و جدید لکھنوی اسکول کی شاعری کا ایک دلکش مجموعہ ہے۔ جس کا اندازہ اشعار ذیل سے ہو سکتا ہے جو اِس دلچسپ مجموعہ سے لیئے گئے ہیں۔

پردہ اگر اٹھے نگہِ امتیاز کا　　آئینہ منھ تکا کرے آئینہ ساز کا

ہوش کس کو ہے تیرے ذوقِ طلبگاری میں　　خواب سب دیکھتے ہیں عالم بیداری میں

دل سلامت ہے تو اک روز دکھا ہی دینگے　　یہ جو اک شان خودی ہے ابھی خودداری میں

لو اُن کے التفات پہ بھولا ہوا ہے دل　　ایسے اجل گرفتہ کو ہشیار کیا کریں؟

ہے ہے وہ منتیں نگہِ نیم مست کی　　اب اس کے بعد شوق کا اظہار کیا کریں؟

میں مرگ و زیست اس کے سوا جانتا نہیں　　آیا تیری پناہ میں، تیری پناہ سے

---

[1] حجم ۴۸۰ صفحات۔ قیمت تین روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ نظامی پریس لکھنؤ۔

دیکھا مآلِ عرضِ تمنا دلِ خراب! — محروم ہو گئے نگہِ گاہ گاہ سے

نکلے بھی تو یوں "آہ" دلِ تنگ سے نکلے — جس طرح کہ نغمہ کی صدا چنگ سے نکلے
بس تیری بزم تماشا نہیں ورنہ — وہ جلوۂ بیرنگ ہر اک رنگ سے نکلے

میں نے ہر آرزوئے دل پہ کیا دل کو شعلہ — شوق کو لغزشِ مستانہ سکھانے کے لئے
تجھ کو اپنی ہی دلآزاری پیہم کی قسم — لطف کی ایک نظر ہوش میں لانے کے لئے

محرمِ شوخیِ جلوہ نہیں آنکھیں ورنہ — کبھی پنہاں وہ ہوا تھا کہ نمایاں نہ ہوا!
ہے یہی کفر محبت کے پرستاروں میں — عشق اگر عشق کی عصمت کا نگہباں نہ ہوا

غم نہیں تو لذتِ شادی نہیں — بے اسیری لطفِ آزادی نہیں

تجھ کو دیکھا ہی نہیں چشمِ تماشائی نے — کام دل کا بھی دیا ہے کہیں بینائی نے
بے نقاب اب تو نظر آ کہ بہت دیکھا ہے — پردے پردے میں تجھے چشمِ تماشائی نے

یہی اک قطرہ خونِ جگر سرمایہ مژگاں — ٹپک جائے سرِ دامن تو سازو برگ طوفاں ہے
اسے اے کارسازِ عشق تحتِ سن میں لکھ دے — وہ اک نقطہ وفا جو داستانِ دل کا عنواں ہے

بزمِ امکاں جلوۂ جانانہ سے معمور ہے — آنکھ ہو تو ہر طرف روشن چراغِ طور ہے
مل گئی ہیں گو مکان و لامکاں کی سرحدیں — جس کا میں جویا ہوں اے ہمت وہ منزل دور ہے

بہم خلوص تھا آپس میں دوستانہ تھا — نفاق تھا نہ کدورت تھی کیا زمانہ تھا
اثر تھا رندِ سیہ مست و معصیت آلود — مگر کلام کا انداز عارفانہ تھا

غرض یہ "بہاراں" اسی قسم کے خوش رنگ اور خوش بو پھولوں کا ایک آراستہ و پیراستہ چمن ہے جسکی روح پرور نکہتوں سے مذاقِ سلیم کا مشامِ جان معطر ہو جاتا ہے۔ اس مجموعہ کا نام "بہاراں" بھی خوب تجویز کیا گیا ہے۔ سرنامہ پر میر کے یہ اشعار درج ہیں:

چلتے ہو تو چمن کو چلئے — کہتے ہیں کہ بہاراں ہے
پات ہرے ہیں پھول کھلے ہیں — کم کم باد و باراں ہے

کوئی شک نہیں اثر صاحب نے اکثر غزلوں میں میر کی زبان کی بڑی کامیابی سے پیروی کی ہے یہ مجموعہ ظاہری محاسن سے بھی آراستہ پیراستہ ہے۔ لکھائی چھپائی نہایت نفیس۔ کاغذ بیز۔ جلد خوشنما۔

کائناتِ دل

یہ ایک دوسرا نفیس مجموعہ مکرمی منشی بشیشور پرشاد منور لکھنوی کا شائع ہوا ہے۔ منور صاحب کا خاندان

ہمیشہ علم و فضل کیلئے مشہور رہا ہے۔ چنانچہ آپ کے والد حضرت افق مرحوم، اور چچا حضرت تمنا لکھنوی نے اُردو ادب کی تمام عمر خدمت کی۔ منور صاحب کے خسر جناب صدر مرحوم کو بھی فن تاریخ گوئی میں کمال حاصل تھا خاندانی بزرگوں کے علاوہ منور صاحب کو حضرت نظر لکھنوی سے فیض حاصل کرنے کا بھی موقع مل چکا ہے غرض منور صاحب نے شعر و سخن کے گہوارہ میں پرورش پائی ہے۔ یوں بھی لکھنؤ کی فضا موسیقی اور شعریت سے معمور رہی ہے۔ منور صاحب جن کا کلام زمانہ اور ملک کے دوسرے رسالوں میں شائع ہوتا رہتا ہے "نسیم عرفاں" کے نام سے "شری بھگوت گیتا" کو اُردو نظم میں منتقل کر چکے ہیں، جو مقبول عام ہو چکا ہے۔ اور اب "کائناتِ دل" میں آپ نے اپنی سب نظمیں یکجا کر دی ہیں۔ اُن کی تعداد ڈیڑھ سو کے قریب ہے اور یہ مختلف مضامین پر لکھی گئی ہیں۔ چنانچہ ہر شخص کو اپنے دلچسپی کے مطابق اسمیں کافی نظمیں مل جائیں گی۔ بہت سی نظمیں ذاتی اعتقادات سے متعلق ہیں۔ باقی میں قومی جذبات کے مختلف پہلوؤں پر دلچسپ و دل نشین انداز بیان میں اظہار خیالات کیا گیا ہے۔ متعدد نوحے اور بیس پچیس ترجمے بھی اس مجموعے میں شامل ہیں یہ نظمیں سب کی سب بلند پایہ اور دلکش ہیں۔ اسلئے اگر قدردانانِ سخن منور صاحب کی "کائناتِ دل" کا سرسری طور پر بھی مطالعہ کریں گے تو انھیں یہ فتویٰ دینا پڑے گا کہ منور صاحب کی شاعری ہندوستان کی موجودہ شاعری کا ایک پسندیدہ نمونہ ہے۔ آپ نے حسن فطرت کی نقاشی کے ساتھ ساتھ قومی جذبات کی بھی بوجہ احسن ترجمانی فرمائی ہے۔ بعض نظموں کے شعر نمونتاً درج کئے جاتے ہیں، جن سے ناظرین زمانہ خود اُن کی دلچسپی کا اندازہ کریں گے۔ "محبت کا مذہب" نامی نظم میں کہتے ہیں ؎

نہ دقت ہے راہِ طریقت کی اِس میں　　　نہ جدت ہے اہلِ شریعت کی اِس میں
ضرورت نہ شغل و ریاضت کی اِس میں　　　نہ حاجت کسی کی اطاعت کی اِس میں

طریقِ پرستش یہ اعلیٰ ہے سب سے
محبت کا مذہب نرالا ہے سب سے

اسی ایک مشرب میں اصلی خوشی ہے　　　یہی ایک مسلک ہے جو قدرتی ہے
جو سمجھو تو یہ بات ایمان کی ہے　　　یہی دین ایک قابلِ پیروی ہے

طریقِ پرستش یہ اعلیٰ ہے سب سے
محبت کا مذہب نرالا ہے سب سے

آگے چلکر یوں درسِ عمل دیتے ہیں ؎

یہ تفریق و تمیز دل سے مٹا دیں　　　اب آؤ یہ دُنیا کے جھگڑے چکا دیں

محبت کے مذہب کا سکّہ چلادیں　　سرورِ حقیقی کی لذت چکھادیں

....

نہ کوئی یہودی، نہ کوئی نصارا　　ہو بس ایک مذہب ہمارا تمھارا
محبت کی تنویر ہو عالم آرا　　دکھائے یہ وحدت کا ہم کو نظارا

....

برسات کے ترانے میں جو منظر کشی کی گئی ہے ملاحظہ ہو ؎

طرب خیز کیسا ہے منظر فلک پر　　گھٹاؤں نے پھیلائے ہیں پر فلک پر
رواں ہے یم آب کوثر فلک پر　　اُمڈ آیا ہے شاید سمندر فلک پر
ہیں آئینہ قدرت کے جوہر فلک پر

کبھی موسلا دھار بارش کا عالم　　کبھی بوندیاں ننھی ننھی ہیں کم کم
اُمڈتے ہیں رہ رہ کے جذبات پیہم　　برستا ہے جس وقت پانی جھما جھم
سماں ہے سہانا، ہے دلچسپ موسم

منوّر صاحب کی اکثر نظموں میں قوم پرستی اور دیش بھگتی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ وہ کیسے قوم پرست اور کیسے دیش بھگت ہیں۔ ذیل کے اشعار سے اندازہ فرمائیے ؎

حُبِ وطن کے اِک الاپے جو ہر نفس　　یارب زباں ملے وہ، دہن وہ ملے مجھے
جس کا ہر ایک تار ہو سر رشتۂ وفا　　مرنے پہ اوڑھنے کو کفن وہ ملے مجھے
جس میں نہ غیر ملک کی مٹی کا جزو ہو　　جسمیں ہو خاک ہند کی تن وہ ملے مجھے
پیراہن وطن کی ہو زینت پہ جس کو ناز　　اے ضامن لباسِ بدن وہ ملے مجھے
سینہ ہو جس کا چاک وطن کے فراق میں　　بحر جہاں میں درِ عدن وہ ملے مجھے
بلبل صفت ہوں جس کی محبت میں بیقرار　　رہنے کو بوستاں، وہ چمن وہ ملے مجھے
دی جائے جو محبِ وطن کی زبان سے　　میں چاہتا ہوں داد سخن وہ ملے مجھے

کتاب کے شروع میں نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی، جناب فراقی دریا بادی، حضرت جوش ملسیانی، جناب ساحر دہلوی اور جگر صاحب بریلوی کی منظوم تقریظیں ہیں، اسکے بعد پنڈت برجموہن دتاتریہ صاحب کیفی، ڈاکٹر موہن سنگھ صاحب دیوانہ اور مسٹر آصف علی بیرسٹر دہلی کی فاضلانہ تقریریں ہیں، اور انکے بعد مسٹر گوپی ناتھ امن لکھنوی کا مقدمہ اور مسٹر گیان پرکاش اختر بریلوی کی تنقید درج ہے۔ اس دلکش مجموعہ کلام میں منوّر صاحب

کی طرف ٹون تصویر بھی ہے جس کے نیچے اُن کا یہ شعر درج ہے ؎

میرے کلام سے خونِ جگر ٹپکتا ہے قبولِ عام کی پھر بھی سند نہیں ملتی

غالباً ہر خادم اُردو کو یہی شکایت ہے مگر جس جوش و مسرت سے معزز ین ملک نے کلام شوؔر کی تقریب و تعارف میں حصہ لیا ہے اس کے بعد اُن کو اپنے معاصرین سے بے قدری کی شکایت تو نہ ہونا چاہیے۔

شوؔر صاحب نے اپنے مجموعہ کلام کو اپنی ماں کے نام معنون کیا ہے۔ اس چھوٹی سی بات سے بھی شوؔر صاحب کا اہل دل ہونا ثابت ہوتا ہے۔

کالیداس اور ودّیا[1]

پراچین ہندوستان کے مشہور ترین سخنور ملک الشعراء کالیداس، مہاراجہ بکرماجیت کے "نو رتن" میں تھے اُن کے ڈرامے "شکنتلا" - "میگھدوت" اور "وکرم اروسی" وغیرہ تمام دنیا میں مشہور ہیں اور قریب قریب ہر زبان میں ترجمہ ہو چکے ہیں۔ لیکن اس نامور شاعر کی نسبت یہ روایت مشہور ہے کہ ابتدا میں وہ قطعی جاہل اور ان پڑھ تھے۔ حسن اتفاق سے کالی داس کی شادی ایک عالی خاندان اور عالم فاضل بیوی سے ہو گئی۔ ایک روز اُن کی بیوی نے اُن کے اجڈپن سے تنگ آکر اُن کو دھکا دیدیا اور وہ بالاخانہ سے لڑھکتے ہوئے نیچے گرے۔ اتفاق دیکھئے جہاں وہ گرے کالی دیوی کا مندر تھا۔ کالیداس شدید زخمی ہو گئے اور زخموں سے خون بہنے لگا۔ جس پر کالی جی نے خوش ہو کر انھیں علم و فضل کا بردان دیا۔ چنانچہ اس کی شکرگذاری میں اُنھوں نے آیندہ کے لئے اپنا نام "کالی داس" یعنی کالی جی کا غلام رکھ لیا۔ یہ روایت صحیح ہو یا غلط مگر اسی روایت کو سنگِ بنیاد قرار دیکر پنڈت جگدیش چندر جوش انبالوی نے ایک دلچسپ ڈرامہ تیار کر ڈالا۔ یہ ڈرامہ دلچسپ ہونے کے علاوہ اصلاحی اور سبق آموز بھی ہے۔ زبان صاف اور عام فہم۔ پلاٹ بھی اچھا اور دلکش ہے۔ اس میں موٹے موٹے اور ثقیل الفاظ کے استعمال سے پرہیز کیا گیا ہے تاہم دو ایک نامانوس لفظ آگئے ہیں۔ بہر حال اس ڈرامہ میں اَن پڑھ بالغوں کو حصولِ علم کی ترغیب دی گئی ہے۔ جو ملک کیلئے بہت مفید بات ہے۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ سب پسندیدہ۔

انوکھے افسانے[2] (حصہ اول)

اس نام سے مولانا محمد نذر الاسلام صاحب فضلی کے افسانوں کا ایک مجموعہ شائع ہوا ہے۔ یہ سب سراغرسانی کے قصے ہیں۔ جنمیں پہلے چار تو ایک ہی کہانی کی مختلف کڑیاں ہیں۔ جس طرح مسٹر ظفر عمر کی مشہور ناول "نیلی چھتری" میں بہرام اور محمود سراغرسان کی نوک جھونک ہے۔ اسی طرح ان افسانوں میں کنورسین

[1] قیمت آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ:۔ ودّیا پبلشنگ ہاؤس انبالہ چھاؤنی [2] قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ حالی اکیڈیمی پانی پت۔

نامی ایک ہوشیار جرائم پیشہ عیار اور کپتان عباس علیخان کی دماغی زور آزمائی کا ساماں ہے۔ البتہ پانچواں افسانہ جداگانہ نوعیت کا ہے۔ سب افسانے دلچسپ اور پڑھنے کے قابل ہیں۔

بچوں کی کتابیں

حال ہیں جامعہ ملیہ دہلی نے چھوٹے بچوں کے پڑھنے کے لائق کئی کتابیں تیار کرائی ہیں۔ چنانچہ "جنگو کی بلی" کے نام سے مولانا عبدالواحد صاحب سندھی استاد جامعہ ملیہ دہلی نے سلیس اور عام فہم زبان میں ایک پر لطف کہانی لکھی ہے۔ اسمیں خیر آبادی دلو کا منتر بھی بہت پر لطف قصہ ہے۔

اس طرح کی دوسری کتاب "انعامی مقابلہ" ہے۔ جسمیں انعامی مقابلہ اور شرارت نامی دو چھوٹی کہانیاں درج ہیں۔ پہلی میں مختلف چڑیوں کے درمیان گھونسلا بنانے کا مقابلہ ہوا ہے اور دوسری کہانی میں ایک خرگوش نے لومڑی کے کان کاٹے ہیں۔ قصوں کے متعلق بہت سی تصویروں نے انکی دلچسپی میں بہت اضافہ کردیا ہے۔ یہ کہانیاں محمد حسین خاں ایڈیٹر "پیام تعلیم" نے بچوں کے لئے لکھی ہیں۔

ایک اور چھوٹی سی کتاب "پوری جو کڑھائی سے نکل بھاگی" نامی ہے۔ جسمیں رقیہ ریحانہ صاحبہ نے بچوں کی تفریح کے لئے دو دلچسپ کہانیاں لکھی ہیں۔ جنمیں ایک کا نام مندرجہ عنوان ہے اور دوسری کا نام "مرغی کا نرالا بچہ" ہے۔ دونوں کہانیاں دلچسپ اور مزیدار ہیں۔ بچے پڑھیں گے تو خوب ہنسیں گے، کتاب کی زبان بھی بچوں کے لئے سلیس بنائی گئی ہے یہ کتابیں دو دو آنہ میں جامعہ ملیہ دہلی سے مل سکتی ہیں۔

دستکاری کی کتابیں

تعلیم کے متعلق کانگریس نے جو وارد ھا اسکیم مرتب کی ہے اس کا یہی مقصد ہے کہ طلبا کو لکھنے پڑھنے کے ساتھ ساتھ کار آمد دستکاریاں اور ہنر بھی سکھائے جائیں۔ جن سے معاش پیدا کرنے میں مدد ملے۔ اسی خیال کو مدنظر رکھتے ہوئے عصمت بکڈپو دہلی نے مختلف دستکاریوں کے متعلق چھوٹی چھوٹی کتابیں شائع کی ہیں جنمیں سے ایک زیر نظر کتاب بھی ہے۔ تین جزو کی اس چھوٹی سی کتاب میں سید رضا احمد صاحب جعفری نے لکڑی کے تختہ میں جالی کا کام بنانے کا ہنر سکھانے کی کوشش کی ہے۔ جس کو انگریزی زبان میں Fret-work (کٹاؤ کا کام) کہتے ہیں۔ ماہر مصنف نے اوزاروں اور مشینوں کا حال اور اُن کے استعمال کرنیکے طریقے بیان کردیے ہیں۔ اس کے علاوہ ہر کام کیلئے موزوں لکڑی کی شناخت کرنے اور اُن کے خاکے اور فریم بنانے، صاف اور پالش کرنے وغیرہ وغیرہ کے طریقے بھی بیان کردیے ہیں۔ حسب ضرورت درجنوں نقشے اور تصویریں بھی دیدی گئیں ہیں۔ اسی طرح "وصلی کی دستکاری" کے نام سے سید رضا احمد صاحب جعفری نے وصلی یا دفتی (کارڈ بورڈ) کی مختلف چیزیں بنانیکی ترکیبیں بتائی ہیں۔ اور جابجا نقشے اور شکلیں دیکر مقصد کو سمجھانیکی کوشش کی ہے۔ دونوں کتابوں کی قیمت آٹھ آٹھ آنے،

تلقینِ صبر

(از جناب روحی، حلیم مسلم انٹر کالج کانپور)

اے مرے شفیق و ہمدم، اے پیکرِ علم و کمال
کیوں نہ تڑپائے مرے دل کو ترا رنج و ملال
کر دیا صدموں نے اے والا ہمم تجھ کو نڈھال
طاقتِ صبر و تحمل دے خدائے ذوالجلال
ہو گیا کیسا خزاں دیدہ وہ باغِ آرزو
جس کے دم سے آسماں پر تھا دماغِ آرزو

تیرے چہرے پر اداسی غم کی ہے چھائی ہوئی
ہے کلی افسوس تیرے دل کی مرجھائی ہوئی
ہے وفورِ رنج سے آواز تھرائی ہوئی
کیوں حریفِ دل نگاہِ چرخِ مینائی ہوئی
کتنی وحشتناک ہے اب شامِ تنہائی تری
آفریں صد آفریں شانِ شکیبائی تری

حیف تجھ پر یک بیک ٹوٹے ہیں دو کوہِ الم
تابِ ضبطِ غم کہاں تک؟ جب ستم پر ہو ستم
آہ یہ پیری کا عالم اور بارِ رنج و غم
تیری ہمت کی کمر کیونکر نہ پھر ہو جائے خم
موت نے بیوی کو، بیٹی کو، جدا تجھ سے کیا
دل، جگر کو اُس نے دو تیروں سے چھلنی کر دیا

کر گئی پرواز روحِ غمگسارِ زندگی
آہ رخصت ہو گئی تجھ سے بہارِ زندگی
اب نہیں دُنیا میں کوئی رازدارِ زندگی
ہو گئی قربان تجھ پر جاں نثارِ زندگی
تیری مایوسی کا عالم کتنا حسرت بار ہے
سچ ہے جب ہمدم نہ ہو تو زندگی بیکار ہے

غم نہ کر، دنیائے فانی کا یہی دستور ہے
امرِ خلاقِ دو عالم سے ہر اک مجبور ہے
یہ مقامِ بے بقا، آلام سے معمور ہے
یہ جہاں ظلمت کدہ ہے، وہ جہاں پُر نور ہے
دیکھ! دونوں سُرگ کی رنگینیوں میں کھو گئیں
یعنی جا کے گود میں پرماتما کے سو گئیں

قطعۂ تعزیت

(از حکیم سید محمد عباس صاحب رضوان رائے بریلی)

کسے ستانے کو بن گئے ہیں حوادثِ روزگار فطرت
بھلا فلک تجھ کو کیا پڑی ہے۔ جو دے کسی دردِ دل کو راحت

زمین کانپی، غبار اُٹھا، جو برق تڑپی تو ابر رویا
ستارے ٹوٹے، فلک جھک آیا، اُٹھی جو اِک باوقار میت

کسی کے جینے کا آسرا کیا، حیات پانی کا بلبلا ہے
مُسافر آئے گئے سدھارے، سرائے فانی ہے جائے عبرت

لگی جو ٹھیس آبلہ ہیں دل کے، ہر ایک رگ ہے شریکِ ماتم
لہو کی بوندیں ٹپک رہی ہیں۔ عجیب ہے چشمِ تر کی حالت

خروشِ فریاد و جوشِ غم سے یہ قول ہے قلبِ مضطرب کا
بہت ہی کم رہ گئی ہے اب تو زمین و افلاک کی مسافت

جہاں میں ہلچل مچی ہوئی ہے، زمانے بھر کی یہی دعا ہے
خدا عزیزوں کو صبر بھی دے جنھیں دیا ہے ملالِ فرقت

بھلائی کر کے گذرنے والی، وفا و الفت پہ مرنے والی
ہزار پردوں میں تو نہاں ہو، مگر نہ دل سے مٹے گی صورت

جہاں تھے اوصاف سب حمیدہ یہ تین باتیں تو منتخب تھیں
سلیقہ مندی۔ ہر اک سے نیکی۔ مزاجِ خاوند کی اطاعت

چمن کے اُس کے جو تازہ گل ہیں، تو ان میں اچھا وکیل کوئی
کوئی سشن جج کوئی ہے ڈپٹی[۱] ایم۔ کوئی ڈی۔ ایس۔ پی بجاہ و عزت

[۱] ڈپٹی مجسٹریٹ

یہ شوق دل میں بھرا ہوا تھا، تمام حالات کہہ گذاروں
زبان اچھی کہاں سے لاؤں، بیاں میں اتنی نہیں ہے وسعت

کیا جو رضواں نے سالِ رحلت طلب تو ہاتف نے یہ صدا دی
بجھا دی بادِ اجل نے واللہ دیا نراین کی شمعِ خلوت

سمبت ۱۹۹۶ بکرمی

رفتار زمانہ

جنگ یوروپ

حال ہی میں روس نے فنلینڈ پر حملہ کر دیا ہے اور وہاں وہ بالکل ہر ہٹلر کے نقش قدم پر چل رہا ہے۔ اس سلسلے میں "ہندوستان ٹائمز" نے ایک دلچسپ کارٹون شائع کیا ہے جسمیں ہٹلر کی مشہور کتاب "Mein Kamp" "میری جدوجہد" اسٹالین کے ہاتھ میں ہے اور وہ غم و غصہ سے اپنے نازی افسروں سے پوچھ رہا ہے "میری کتاب کون لے گیا ہے۔ بہرحال ستھونیا، اسٹونیہ اور لتھویہ کو دھمکا کر خاطر خواہ مراعات حاصل کر لینے کے بعد اسٹالین فنلینڈ سے بھی جبر و تشدد سے اپنا مدعا حاصل کرنا چاہتا ہے۔ فن لینڈ بعض امور میں دبنے کو تیار تھا لیکن روس کے اکثر مطالبات ایسے تھے جنھیں موجودہ حکمرانانِ فنلینڈ منظور نہیں کر سکتے اور انھوں نے روس کے احکام کی تعمیل کرنیسے معذوری کا اظہار کیا جس پر روس کی فوجوں نے سرحد کا ریلیا اور بحیرۂ بالٹک میں قوت کا مظاہرہ کرنا شروع کر دیا پچھلے نومبر میں روس کے وزیر خارجہ مولوٹوو۔ نے اس سلسلے میں ایک تقریر کی تھی اس سے یہ بخوبی ظاہر ہو گیا تھا کہ اگر روس کا منشا آسانی سے پورا نہ ہوا تو اس کو جنگی کارروائی کرنے میں کوئی پس و پیش نہ ہوگا۔ بہت لوگوں کا خیال ہے کہ روس نے محض اس وجہ سے کہ اب جرمنی مشرق میں بڑھ رہا ہے اس کو ضروری سمجھا کہ اپنے مغربی محاذ کی حفاظت کا خود ہی اہتمام کرے۔ اس لحاظ سے اس کیلئے پولینڈ کے ایک حصہ پر قبضہ کر لینا کافی نہیں ہوا بلکہ ریاستہائے بلقان سے بھی ضروری مراعات طلب کرنا لازمی ہو گیا ہے چنانچہ اس کو مجبوراً اپنی موجودہ پالسی پر عملدرآمد کرنا پڑا۔ بہرحال اس وقت روس کا بڑھتا ہوا اقتدار اتحادیوں کے علاوہ جرمنی کے مفاد کے بھی کہ صریحاً خلاف ہے۔ اسلئے بعض مدبروں کی رائے ہے اس وقت اتحادیوں کو جرمنی سے صلح و صفائی کی کوشش کر کے کوئی ایسا معاہدہ کر لینا چاہئے جس سے روس بالکل علیحدہ ہو جائے اس طریقے سے روس کی جارحانہ کارروائیاں بھی رک جائیں گی اور جرمنی بھی دھمکی دینے اور جبر و تشدد کی کارروائی کرنیکے قابل نہ رہ جائے گا۔ اگر ایسا نہ ہوا تو یوروپ بھر میں جنگ پھیل جائیگی۔

روس کی پیشقدمیوں کا اس کے سوا اور کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا ہے کہ جنگ کل یوروپ میں محیط ہونیکے علاوہ یوروپ کے باہر بھی پھیل جائے۔ فنلینڈ کے حملہ سے اسکینڈینیویا اور اسکینڈینیویا کے ساتھ کل مغربی یوروپ پر جنگ کا خطرہ طاری ہو گیا ہے۔ چنانچہ حال میں سوویٹ ہوائی جہازوں نے Tornea پر جو فنلینڈ اور سویڈن کے حدود پر واقع ہے، بمباری کی ہے اس سے بھی یہی اندیشہ پیدا ہوتا ہے کہ روس اپنا حملہ فن لینڈ تک محدود نہ رکھے گا۔

بظاہر روس کے بڑھتے ہوئے اقتدار کی وجہ سے بالٹک کی حیثیت سوویٹ جھیل کی ہو جائے گی جو جرمنی کے لئے ایک زبردست شکست کے برابر ہے، کیونکہ اس سے اقتصادی اور سیاسی دونوں لحاظ سے مشرقی یوروپ میں جرمنی کی پوزیشن دوسرے درجے کی ہو جائیگی اس پر بھی ایک طرح سے روس کی یہ کارروائی جرمنی کیلئے مفید ثابت ہو سکتی ہے

کیونکہ اسقدر اقتدار حاصل کرلینے کے بعد روس اپنا کچا مال جرمنی کو بہ آسانی اسٹونیہ اور لیٹویا کے بندرگاہوں کے ذریعے بھیج سکیگا۔ اسی طرح اگر روس کو جرمنی کی تائید حاصل رہی تو فنلینڈ کے تباہ کردینے اور اُس پر قبضہ حاصل کرلینے میں اُس کو کوئی مشکل درپیش نہ ہوگی۔ کیونکہ روس اپنی کثیر فوج کو اُس سمت روانہ کرسکیگا۔ ورنہ روس کو مشرق بعید کے علاوہ بالٹک اور بلقان کی سرحدوں پر بھی اپنی فوج کا ایک معقول حصہ جرمنی کے اندیشہ سے محفوظ رہنے کی غرض سے مقیم رکھنا پڑے گا۔ یہ بھی خبر ہے کہ جرمنی روس سے محفوظ و مامون رہنے کے خیال سے اپنی نئی سرحد پر ایک نئی حفاظتی لائن بنانے کا اہتمام کررہا ہے۔ پولینڈ لے لینے میں روس کو بالکل کوئی دقت نہیں ہوئی کیونکہ اُسکی طاقت جرمنی کے حملوں کی وجہ سے زائل ہوچکی تھی نیز وہاں زیادہ تر ناخواندہ کسان آباد ہیں مگر فنلینڈ کی آبادی خواندہ ہے۔ یہاں کے لوگ نہایت مہذب اور تربیت یافتہ ہیں اور تمام ملک صنعتی ہے اُس کی فوج بھی ایسی ہی منظم کہی جاتی ہے جیسی کہ جرمنی کی۔ اس لئے روس کا فنلینڈ کو شکست دینا اسقدر آسان نہ ہوگا جیسا کہ پولینڈ کی تسخیر کا معاملہ تھا۔ پھر بھی فنلینڈ روس کے مقابلہ میں ایک بہت ہی چھوٹی سی ریاست ہے اور ہم یہ توقع نہیں کرسکتے ہیں کہ وہ دیر تک تاب مقاومت لا سکے۔ بہرحال اسوقت وہ نہایت استقلال و پامردی کے ساتھ روس سے لڑ رہا ہے۔ اور موسم بھی تھوڑی بہت اسکی امداد کررہا ہے۔

جرمنی اور برطانیہ کی جنگ جو ابھی تک رُکی تھمی سی ہے بہت جلد کوئی اور صورت اختیار کرنیوالی ہے۔ ممکن ہے کہ جلد ہی جرمنی انگلستان پر ہوائی حملے کرنا شروع کردے اور انگلستان کو اتنی مہلت نہ دے کہ وہ نئے ہوائی جہاز جو امریکہ کے کارخانوں میں تیار ہورہے ہیں انگلستان پہونچ سکیں۔ مگر اس کارروائی کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہالینڈ پر حملہ کرکے بلجیم میں اپنا ہوائی مستقر قائم کرے یہی وجہ ہے کہ یہ دونوں ملک اپنی اپنی حفاظت کے خیال سے بے فکر نہیں ہیں۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ روس اور جرمنی دونوں کے دانت رومانیہ پر ہیں جس کا دارن جل گیا تو ہی رومانیہ ہڑپ کرلیگا یہ بھی ممکن ہے کہ جس طرح جرمنی اور روس دونوں نے مل کر پولینڈ کے حصے بخرے کرلئے۔ اُسی طرح اب پھر یہ دونوں رومانیہ کے حصے بخرے کرنے میں ایک دوسرے سے مل جائیں۔ ایک صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ٹرکی کی سرکردگی میں بلقانی ریاستوں اور اٹلی کا سمجھوتہ ہوجائے اور بحیرہ روم میں فرانس اور برطانیہ کی تائید سے معاملات استقامت حاصل کریں بہرحال اسوقت اٹلی کیلئے کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ کس کروٹ بیٹھے گا۔ پچھلی جنگ کی طرح اٹلی اس دفعہ پھر اتحادیوں سے مل سکتا ہے بشرطیکہ وہ اُن کا پلہ بھاری دیکھے۔ لیکن ابھی تو وہ یورپ میں امن و صلح کا خواہشمند ہے۔ البتہ اگر اُس کے مفاد کے خلاف کوئی کارروائی ہو تو اور بات ہے۔

جرمنی کی بحری سرنگوں اور آبدوز کشتیوں نے اب تک برطانیہ کے بہت سے جہاز ڈبوئے ہیں اُن کا نقصان بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ اگر برطانیہ کی بحری طاقت اسقدر عظیم الشان نہ ہوتی تو جرمنی کی یہ کارروائی ابتک بہت تباہ کن ثابت ہوچکی ہوتی۔ لیکن برطانی ملاحوں کی جانبازی کی جسقدر تعریف کی جائے کم ہے کہ وہ اس وقت بھی جان ہتھیلی پر رکھ کر بحری آمدورفت کا سلسلہ جاری کئے ہوئے ہیں۔ جرمنی کی سرنگوں سے اتحادیوں کے علاوہ غیر جانبدار ملکوں کے جہاز بھی تباہ ہورہے ہیں۔ جسکی وجہ سے بالآخر اُن ملکوں کا غم و غصہ بھی جرمنی پر نازل ہونا لازمی ہے۔ برطانیہ پہلے سے بھی زیادہ

تک وہ سمندری سے سمندروں کو سرنگوں سے صاف کرنے میں مصروف ہے۔ اُس نے جرمنی کی تشدد دانہ کاروائیوں کے جواب میں یہ اعلان کیا ہے کہ وہ جرمنی کو جانیوالے اور جرمنی سے باہر آنے والے مال کو ضبط کریگا۔ خواہ وہ غیر جانبدار ملکوں کے جہازوں ہی میں کیوں نہ آ جا رہا ہو۔ غیر جانبدار ملکوں نے اس اعلان پر اپنی ناراضگی کا اظہار کیا ہے لیکن اگر واقعی برطانیہ کو اس میں کامیابی ہوگئی تو جرمنی کو اپنی اقتصادی حالت برقرار رکھنے میں بڑی مصیبت کا سامنا ہوگا۔ درحقیقت جرمنی کو شکست دینے کا سب سے آسان طریقہ یہی ہے کہ اسکی درآمد اور برآمد کو قطعی مسدود کر دیا جائے جیسا کہ گذشتہ جنگ عظیم میں ہوا تھا۔

برطانیہ کے اس اعلان کے خلاف جاپان نے خاص طور پر اظہار ناراضگی کیا ہے۔ اور ملکوں نے بھی احتجاج کیا ہے۔ لیکن اس کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ چنانچہ مسٹر چیمبرلین نے اس بارہ میں معذوری ظاہر کرتے ہوئے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ اس طرح غیر جانبدار طاقتوں کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ضرور ہے لیکن برطانیہ کے لئے کوئی دوسرا چارہ کار بھی نہیں ہے۔ اسلئے اُنکے نزدیک اگر اس مقصد کے حاصل کرنے میں غیر جانبدار طاقتوں کو قربانی کرنا پڑے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ تاہم برطانیہ نے اس رعایت کا اعلان کر دیا ہے کہ اگر مال واقعی اسی قوم کا ثابت ہوگا جس کے جہاز میں لدا ہوا ہے تو اس بات کا پورا خیال رکھا جائے گا۔ چنانچہ ان کمیٹیوں کو جو جرمنی سے جانیوالے اور غیر ملکوں سے وہاں آنیوالے مال کی نگرانی کرنے کے لئے مقرر ہوئی ہیں غیر جانبدار ملکوں کے صحیح مفاد کا لحاظ رکھنے کی تاکید کر دی گئی ہے۔ برطانیہ یہ بھی کوشش کریگا کہ غیر جانبدار جہازوں کو کم سے کم تکلیف دی جائے۔

ملکی مسائل

کانگرسی وزارتوں کے مستعفی ہونے کے بعد سات صوبوں کے گورنر صاحبان نے مختلف صوبوں کا نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ اور گو وہ اسوقت ہمارے اہل ملک کے نہیں بلکہ صاحب گورنر جنرل ہند کے علاوہ صاحب وزیر ہند اور برٹش پارلیمنٹ کے جوابدہ ہیں اور سات صوبوں میں تیس سال پہلے کی سیاسی حالت یعنی مطلق العنان حکومت پھر از سر نو قائم ہوگئی ہے۔ لیکن برٹش گورنمنٹ کی پالیسی کی تعریف کرنا چاہئے کہ ابھی تک ہر جگہ گورنر صاحبان حتی المقدور اپنے سابق وزیروں کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ گورنمنٹ صوبہ متحدہ کی طرف سے اس کے متعلق ایک اعلان بھی شائع ہوا تھا اور گو حکومت کو بعض اصطلاحی وجوہ پر اس اعلان کی تردید کرنا پڑی ہے لیکن امر واقعہ یہی ہے کہ اسوقت رفاہ عام کے متعلق کانگرسی وزارت کی تمام اسکیمیں کم و بیش جاری ہیں۔ ان اسکیموں میں جہاں کہیں جزوی رد و بدل کیا گیا ہے وہ بوجہ مجبوری کیا گیا ہے ورنہ عام پالیسی یہی معلوم ہوتی ہے کہ حکومت کے تمام انتظامات جیوں کے تیوں چلتے رہیں۔ چنانچہ اسی خیال سے گورنر صاحبان صوبہ متحدہ، صوبہ متوسط، صوبہ بہار اور صوبہ بمبئی نے گورنمنٹ انڈیا ایکٹ کے ماتحت اختیارات حکومت لینے کا جو اعلان کیا تھا اسمیں اب ایک ضروری ترمیم کا اعلان کر دیا ہے جس کی رو سے وہ اُن قانونی مسودوں کو منظور کر سکیں گے جو سابقہ کانگرسی وزارت کے عہد میں صوبجاتی قانونی مجلسوں سے کثرت رائے سے پاس ہو چکے ہیں لیکن جن کی منظوری کی تصدیق گورنر صاحبان ابھی تک کسی وجہ سے نہیں کر سکے۔ پہلے اعلان کی وجہ سے یہ سب مسودے بالکل بیکار ہوگئے تھے مگر اس ترمیمی اعلان سے

گورنر صاحبان کو ان مجوزہ قوانین کے منظور کرنے کا حق و اختیار حاصل ہوگیا ہے۔ چنانچہ ہمارے صوبہ کے گورنر ہزایکسیلنسی سر ہیری ہیگ نے ۶ دسمبر کو نئے قانون مزارعین کو اپنی منظوری دیدی ہے۔ حالانکہ ذی اثر زمیندار و تعلقہ دار صاحبان کی آخر تک یہی کوشش رہی کہ یہ قانون جس کو کانگریسی وزارت نے پورے دو سال کی مسلسل جدوجہد کے بعد دونوں ایوان قانون ساز سے منظور کرایا تھا کھٹائی میں ڈال دیا جائے۔ مگر ہز ایکسیلنسی نے بہ مشورہ صاحب گورنر جنرل ہند و صاحب وزیر ہند اُسے منظور کرنا ہی مناسب سمجھا اِس قانون سے کسانوں کی حالت بہت کچھ سدھر جائے گی۔ سیاسی حیثیت سے اِس کارروائی سے یہ بات بالکل روشن ہوگئی ہے کہ برٹش گورنمنٹ عوام کے منتخب کردہ وزیروں کی پالیسی میں خواہ مخواہ دخل دینے کو تیار نہیں ہے بلکہ اپنے امکان بھر وہ اسوقت اہلِ ملک کے سیاسی جذبات کا پورا لحاظ رکھنا چاہتی ہے۔ شاید اسی لحاظ سے صوبہ متحدہ میں جنگی بورڈ قائم کرنے کا خیال بھی جس کے عملدرآمد سے جاہ طلب اصحاب کو خواہ مخواہ خودنمائی کا موقع ملتا، فی الحال ترک کر دیا گیا ہے۔ لیڈران ملک بھی اسوقت ایسی کوئی کارروائی نہیں کرنا چاہتے ہیں جس سے لڑائی کی امداد میں نقص یا رکاوٹ پڑے۔ اِس اثنا میں وزیر اعظم۔ وزیر ہند وغیرہ بڑے بڑے ارکانِ حکومت نے اِس بات کا بار بار اعلان کیا ہے کہ برٹش گورنمنٹ ہرگز امپیریلزم کی پالیسی پر عملدرآمد نہیں کرنا چاہتی؛ بلکہ وہ انصاف، آزادی اور عوام کو حقوق و اختیارات دِلانے کی خاطر ہی اِس جنگ کو جاری کئے ہوئے ہے، اور ہندوستان کو بھی وہ جنگ کے بعد سیاسی آزادی دینے کو تیار ہے بشرطیکہ ہندوستان کے مختلف فرقے آپس میں متفق و متحد ہوکر زندگی بسر کرنے کو تیار ہوں۔ کانگریس کی طرف سے برابر نمایندہ اسمبلی کا مطالبہ ہو رہا ہے۔ مہاتما جی، پنڈت جواہر لال نہرو اور دیگر لیڈران کانگریس اس کے دلدادہ ہیں اور اُن کا خیال اور یقین ہے کہ اسی ذریعہ سے ملک کی عام رائے کے مطابق سب فرقوں کے حسب دلخواہ کارروائی ہوسکتی ہے مسلم لیگ کے لیڈران کو اس میں بہت کچھ رد و کد ہے اور اس وقت اُنھوں نے کانگریس کے دعوؤں اور مطالبات کے خلاف قیامت کا شور برپا کر رکھا ہے۔ اِس تمام شور و غوغا کا اصل مدعا یہ معلوم ہوتا ہے کہ کانگریس کسی طرح صوبوں کی حکومت میں فرقہ وارانہ مسلم لیڈروں کو بھی اپنے ساتھ حکومت میں شامل کرنے پر رضامند ہوجائے چنانچہ اس وقت ہر طرف سے کانگریسی مظالم کا شور بلند کیا جارہا ہے؛ اور عام مسلمانوں کو کانگریس کی طرف سے بدظن کرنے کی انتہائی کوشش کی جا رہی ہے۔ کانگریس کی طرف سے جب کبھی تفصیلات دریافت کی گئیں تو ابھی حال تک بہ استثنائے چند عام اور مبہم شکایتوں کے جو ترنگے جھنڈے، بندے ماترم کے گیت، ودّیا مندر کی اسکیم اور ہندی کی ترویج وغیرہ کے متعلق ہیں اور کوئی خاص واقعات بیان نہیں کئے گئے۔ فرقہ وارانہ پروپیگنڈا کی بدولت اکثر مقامات میں نقصِ امن واقع ہوچکا ہے۔ لیکن اُن کا انتظام مقامی حکام نے اپنی ذمہ داری پر کیا اور جہاں تک ہم کو معلوم ہے کانگریسی وزرا نے ہر جگہ غیر مسلموں ہی کو دبانے کی کوشش کی۔ چنانچہ یہاں تک نرمی برتی گئی کہ جب کانپور میں آنریبل مسٹر محمد ابراہیم صاحب کے جلوس پر بے وجہ علانیہ حملہ کیا گیا تو بانیانِ فساد کے خلاف کوئی تعزیری کارروائی نہیں کی گئی۔ راستے میں صاحب موصوف پر قرولی کا حملہ ہوا۔ لیکن یہاں بھی ملزم بلا تعرض رہا کر دیا گیا۔ اسی طرح ہر جگہ کانگریس نے مسلمانوں کی دلجوئی کرنے کی کوشش کی۔ لیکن چونکہ بڑے بڑے لیڈروں کو حکومت صوبہ

میں کوئی دخل نہیں ملا۔ اس لئے مسلم حقوق کی پامالی کا نعرہ بلند کیا گیا اور اب اسکا زور وشور سے پروپیگنڈا ہو رہا ہے کہ
آج ملک کے ایک سرے سے لیکر دوسرے سرے تک اس کی گونج سنائی دے رہی ہے۔ ممبران مہاسبھا اور بعض
دوسری پارٹی کے لیڈران بھی جن کے وقار کو کانگریس کی بدولت دھکا پہونچا ہے اپنی اپنی جگہ کانگریس کو بدنام
کر رہے ہیں۔ لیکن مسلم لیگ کو اس بارے میں جو کامیابی ہوئی وہ اور کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔ بات یہ ہے کہ مسلمانوں
میں مذہبی تعصب کا مشتعل کردینا بہت ہی آسان بات ہے۔ اسی لئے "اسلام خطرہ میں ہے"۔ "مسلم کلچر خطرہ میں ہے"
یہ نعرے ملک ایک سرے سے لیکر دوسرے سرے تک بلند کردے گئے ہیں حالانکہ غور اور بے لوثی سے دیکھا
جائے تو کانگریس کا سب سے بڑا قصور یہی ہے کہ اس نے کسی کو کانگریس کا باقاعدہ ممبر ہوئے بغیر اپنی وزارت
میں شامل نہیں کیا حالانکہ انہیں کو بعض خاص اصحاب ہمہ تن کانگریس کی پالسی پر عملدرآمد کرنیکو تیار تھے
کانگریس وزارت نے اپنی طرف سے سلمانوں کا دل ہاتھ میں لینے کیلئے کئی ایسی کارروائیاں بھی کیں جن سے
دوسری قوموں کو خواہ مخواہ شکایت کا موقعہ ملا۔ اسی پالسی کے ماتحت مدح صحابہؓ کے جلوس کی اجازت دی گئی جس سے
لکھنؤ میں شیعہ حضرات کی دل شکنی ہوئی اور سنی جماعت نے اس نئی رعایت کی کوئی خاص قدر نہ کی۔ بہرحال اسوقت
سارا زور اسی پر ختم ہو رہا ہے کہ جس طرح ہوسکے حکومت سے عہدوں اور اعزازوں کی فرقہ وارانہ حیثیت سے
تقسیم کرالیجائے۔ اور اگر کانگریس اس پر تیار نہ ہو تو جمہوری طرز حکومت کی بنیادی حیثیت سے مخالفت کی جائے
بقول صاحب وزیر ہند اس تمام شور وشر کا صحیح علاج تو یہ ہے کہ پولٹیکل پارٹیاں مذہبی تفرقوں پر نہیں بلکہ سیاسی
اصولوں کی بنیاد پر قائم کی جائیں۔ لیکن تیس سال ہوئے خود برٹش گورنمنٹ نے جداگانہ نیابت کا طریقہ رائج کرکے
متحدہ قومیت کے جذبہ پر ضرب کاری لگائی تھی اور آج جو کچھ دیکھنے میں آرہا ہے اسی طریقہ نیابت کا نتیجہ ہے۔ اسوقت
مظالم کے جو طول طویل افسانے دہرائے جارہے ہیں۔ ان کا نتیجہ ملک کی فضا کو گندہ اور عوام کو بدظن کرنیکے
سوائے اور کچھ نہیں نکل سکتا - ہم یہ نہیں کہتے کہ کانگریسی وزارتوں سے کوئی غلطی نہیں ہوئی یا اُن کا ہر کام بجا و
درست تھا۔ لیکن ہم یہ ضرور کہتے ہیں کہ انھوں نے خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ بحیثیت مجموعی عوام کی خدمت کرنے
اور اُن کے مفاد کو بلا لحاظ مذہب و ملت ترقی دینے کی کوشش کی۔ حکومت کا ان کو پہلا سابقہ تھا۔ اسلئے کچھ تو
ناتجربہ کاری کچھ بعض خود غرض طبقوں کی مخالفت کے باعث اور کچھ آئینی مشکلات کی وجہ سے انھیں اپنے مقاصد
میں جتنی کامیابی ہونا چاہئے نہیں ہوئی۔ لیکن اگر کانگریس کو آیندہ کبھی اطمینان کے ساتھ کام کرنے کا موقعہ ملا، تو ہم کو
بھروسہ ہے کہ رفاہ عام کے بہت سے کام جو ابھی اُدھورے پڑے ہیں پورے ہوجائیں گے۔ مگر اسوقت مسٹر جناح کی اس
انوکھی تجویز نے کہ - کانگریسی وزارتوں کے استعفار پر شکرانہ کی نماز ادا کی جائے خوشی منائی جائے
ملک میں باہمی نفاق کی خلیج کو بہت زیادہ وسیع کردیا ہے۔ چنانچہ پنڈت جواہر لال نہرو کو صلح کی بات چیت

ملتوی کرنا پڑی۔ مسٹر جناح نے "متفرق مظالم" پر غور کرنے کے لئے ایک شاہی کمیشن کی تقرری کا بھی مطالبہ کیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ جب وہ اپنی شکائتیں حضور والیسرائے کے سپرد کر چکے ہیں اور صدر کانگریس بابو راجندر پرشاد نے اُن کے متعلق صاحب چیف جسٹس انڈیا کا فیصلہ منظور کرنے کی رضامندی دیدی ہے تو شاہی کمیشن کی تجویز پیش کر کے مسٹر جناح اس سارے معاملے کو کیوں اس قدر طول دے کر ملک کی رسوائی کا سامان کر رہے ہیں۔ اس سے پہلے پنڈت جواہر لال نہرو اور مسٹر فضل الحق وزیر اعظم بنگال کے درمیان بھی شکایات کی تحقیقات کے متعلق خط و کتابت ہو چکی ہے مگر اب مسٹر حق بھی روائل کمیشن کی آڑ لے کر تحقیقات کی زحمت سے بچ رہے ہیں۔ انھوں نے الزامات کی جو فہرست شائع کی ہے اسمیں تو بہت سی ایسی باتیں ہیں جو اتنے بڑے ملک میں ہر عہد حکومت میں آئے دن ہوتی رہتی ہیں سو کانگریسی وزارتوں پر ان معاملات کی ذمہ داری ڈالنا صریحاً زبردستی ہے۔ بہرحال کانگریس کو ان تمام واقعات کی بے لوثی سے جانچ کرا کر اپنا مفصل جواب شائع کرا دینا چاہئے۔ اس کے علاوہ اور کسی کارروائی کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی گورنران صوبہ کو قلیل تعداد والی جماعتوں کی دادرسی کے از روئے آئین خاص اختیارات حاصل ہیں اس لئے اگر کسی صوبہ کی وزارت سے اس بارے میں کوئی شدید غلطی سرزد ہوئی ہی تو گورنر صوبہ بطور خود اسکی اصلاح فرما سکتے ہیں۔ یہ واقعہ کہ کسی صوبہ کے گورنر کو اپنے وزرا کے نظم و نسق میں اس بنا پر دخل دینے کی ضرورت نہیں پڑی اس بات کا مکمل ثبوت ہے کہ وزرا نے صریحاً کسی کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی۔ کانپور کے فسادات کا جو انتظام ہوا اُس کے متعلق جہاں تک ہماری معلومات ہے آنریبل مسٹر پنت وزیر اعظم صوبہ نے جو کارروائی کی اُسمیں ہمیشہ وہ گورنر صوبہ سے مشورہ کر لیا کرتے تھے۔ دراصل آپ نے یہاں تک احتیاط برتی کہ خود جانے سے پہلے انھوں نے اپنے مسلم رفیقوں مسلم وزیروں اور مسلم پارلیمنٹری سکرٹریوں کو موقعہ واردات پر بھیجکر رپورٹ منگالی۔ آپ خود کسی ہندو ڈیپوٹیشن سے بھی علیحدہ نہیں ملے۔ اس سے زیادہ فرقہ وارانہ جذبات دبانے کیلئے وہ اور کیا کر سکتے تھے؟ اسمبلی ہال میں جب سُنّی نوجوانوں نے حملہ کیا۔ اُس وقت بھی اُنھوں نے انتہائی نرمی سے کام لیا۔ اُس پر بھی آج اُن پر اور کانگریس کی دوسری وزیروں پر مسلمانوں پر ناگفتی مظالم ڈھانیکا الزام عائد کیا جارہا ہے۔ مسٹر پٹیل صدر کانگریس پارلیمنٹری کمیٹی کا بیان ہے کہ گورنروں کو کبھی اپنے وزیروں سے فرقہ وارانہ طرفداری کی شکایت نہیں ہوئی۔ مسلم لیگ نے "بندے ماترم" پر اعتراض کیا۔ کانگریس نے مسلمانوں کے خوش کرنے کے لئے اُس کے کئی بند اُڑا دئے۔ لیگ نے قومی جھنڈے پر اعتراض کیا۔ اُس کے متعلق بھی کانگریس نے اپنے رویہ میں بہت کچھ تبدیلی کرلی۔ ودیا مندر کے متعلق جو اعتراضات ہوئے۔ اس کے بابت بھی مسٹر شوکلا وزیر اعظم صوبہ متوسط نے سکرٹری مسلم لیگ کی رائے اور مشورہ سے مسلمانوں کیلئے ضروری ترمیم و تنسیخ کردی۔ اب گورنر صاحب صوبہ متوسط نے کانگریس وزارت کے استعفار کے بعد ودیا مندر کا قانون منظور کرلیا ہے

سلہ۔ ہم معلوم ہوا ہے کہ مسٹر فضل الحق نے صوبہ متوسط کے "مظالم" کی فہرست شائع کی ہے ان کے ہمراہ سکرٹری صاحب مسلم لیگ

اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ یہ اسکیم کسی کے خلاف نہیں، ورنہ برطانیہ کے قائم مقام گورنرا سے کیوں منظور
کرتے ؟ یہ بات کہ گورنر صاحبان نے اپنی ذمہ داری محسوس کرکے ہی پاس شدہ قوانین کو منظور کیا ہے۔ اس سے بھی
ظاہر ہے کہ صوبہ متحدہ میں ملازمت ٹیکس کے ساتھ بالکل دوسرا برتاؤ کیا گیا اور اب اس کے متعلق گورنمنٹ ہو
گئے دیا پر پارلیمنٹ گورنمنٹ انڈیا ایکٹ میں ضروری ترمیم کر رہی ہے۔ جس کی رو سے صوبجاتی وزارتوں کو آیندہ
اس ٹیکس کے نام سے کسی شخص سے پچاس روپیہ سے زیادہ رقم وصول کرنے کا اختیار نہ ہوگا۔ اسی طرح گورنران
صوبہ کسی اور تجویز کے متعلق بھی کسی فرقہ یا طبقہ کی حق تلفی کا اندیشہ ہوتا، تو وہ اسمیں ضرور ہی دخل دیتے۔ خواہ
اس کا نتیجہ کچھ ہی کیوں نہ ہوتا۔ یہ سب باتیں مسٹر جناح کو بخوبی معلوم ہیں لیکن اسوقت اصل مقصد یہ ہے
کہ جس طرح ممکن ہو کانگریس کو بدنام کیا جائے۔ اس سلسلے میں یہ بات ضرور اطمینان بخش ہے کہ آزاد خیال مسلم لیڈران اور
متعدد اخبارات نے مسٹر جناح کی تجویز کی بہت مخالفت کی ہے۔ جس سے مسٹر موصوف بھی اتنا تو متاثر ہو ہی گئے ہیں
کہ اب انھوں نے اس بات کا اعلان کرنا ضروری سمجھا کہ اُن کی تجویز ہندوؤں کے خلاف نہیں ہے بلکہ وہ صرف
کانگریس سے برسر پیکار ہیں اور اُس کے خلاف ایک محاذ قائم کرنا چاہتے ہیں، غالباً اسی مخالفت کا اثر ہے کہ
مسٹر جناح نے نماز شکرانہ کے علاوہ کسی اشتعال انگیز مظاہرہ، جلوس یا ہڑتال وغیرہ کی ممانعت کر دی ہے۔
مسٹر جناح اپنی قوت بڑھانے کے لحاظ سے بعض دوسری اقلیتوں کو بھی اپنے ساتھ لینے کی فکر کر رہے ہیں لیکن
عیسائیوں اور سکھوں نے تو علانیہ کہدیا ہے کہ انھیں کانگریس سے کوئی شکایت نہیں ہے۔
صوبہ متحدہ میں کنور سر مہاراج سنگھ صاحب نے جو صوبہ کے ایک تجربہ کار افسر اعلیٰ اور مسیحی جماعت کے
رہنما ہیں، صاف کہدیا ہے کہ کانگریس گورنمنٹ نے دیدہ و دانستہ مسلمانوں کے ساتھ کوئی زیادتی یا تشدد نہیں کیا ہے
خیر حقیقت جو ہو مگر اسوقت ان باتوں سے ملک کی سیاسی فضا بہت مکدر کر دی ہے اور ہندوستان کے
آئینی مسئلہ کا حل دشوار سے دشوار تر ہو گیا ہے۔ آیندہ دیکھئے کیا ہوتا ہے؟

نیا سال

۱۹۳۹ء کا سال بھی آخر ختم ہو رہا ہے۔ ملک اور دنیا کیلئے یہ سال منحوس ہی ثابت ہوا۔ کیونکہ اسمیں جنگ یورپ چھڑ گئی ہے
جو کیا عجب ہے آگے چل کر عالمگیر جنگ ہو جائے۔ چھوٹے چھوٹے ملکوں کے حق میں تو یہ سال بہت ہی تباہ کن رہا۔
جہاں تک زمانہ کا تعلق ہے خانگی مصائب کے باوجود جس طرح ہو سکا اس کا کام حسب دستور جاری رکھا گیا اور آیندہ
بھی جب تک کارکنوں کے دم میں دم ہے ہمارا ناچیز خدمت کا سلسلہ اسی طرح قائم رکھا جائے گا۔ لیکن اب قدردانان رسالہ
کے لئے مستقبل کی فکر ضروری ہے کیونکہ چھتیس ۳۶ سال تک کی مسلسل خدمت کے بعد قدرتاً اس بات کی ضرورت محسوس
ہونے لگی ہے کہ رسالہ کی آیندہ زندگی کسی فرد واحد سے وابستہ نہ رہے بلکہ علم دوست و پرجوش احباب اگر اس ذمہ داری کو
پوری طرح اپنے سر نہ لے سکیں تو کم سے کم اس میں شریک تو ضرور رہیں۔ تمام ناظرین رسالہ کو بھی یہ بات ذہن نشین ہونا چاہئے
کہ رسالہ کے ذرائع آمدنی میں توسیع کی سخت ضرورت ہے اس لئے قدردانان رسالہ کو توسیع اشاعت پر اپنی فوری توجہ
مبذول کرنا چاہئے تاکہ قابل کارکنوں کی امداد سے یہ علمی خدمت بلا منت غیرے پوری قوت اور شوق و دلچسپی کیساتھ
جاری رہ سکے۔ بہرحال عرض کرنا ہمارا کام ہے توجہ دینا شائقین رسالہ کا فرض ہے۔

آیندہ سال زمانہ و ناظرین زمانہ کو مبارک ہو

ضروری اطلاع

جن صاحبوں کی خریداری جنوری نمبر سے شروع ہوتی ہے اُنکا حساب اِس نمبر سے ختم ہوگیا۔ اور اب آیندہ سال کی قیمت واجب الوصول ہوگئی ہے۔ اِس لئے اُن سب صاحبان سے درخواست کیجاتی ہے کہ براہِ کرم اِس نمبر کے پہونچنے کے پندرہ ۱۵ دن کے اندر زمانہ کا آیندہ سالانہ چندہ مبلغ پانچروپیہ (صہ) بذریعہ منی آرڈر ارسال فرمادیں۔ ورنہ جنوری ۱۹۴۰ء کا پرچہ سالانہ قیمت کیلئے بذریعہ قیمت طلب پیکٹ (.V.P.P) ارسال ہوگا۔

جن صاحبوں کا حساب جولائی یا دورانِ سال کے کسی دوسرے مہینہ سے شروع ہوتا ہے مگر کسی وجہ سے اُنکی قیمت وصول ہونیسے باقی رہ گئی ہے، وہ بھی براہِ عنایت ۱۰ر جنوری ۱۹۴۰ء تک رقم واجب الوصول بذریعہ منی آرڈر بھیج دیں۔ ورنہ اُن کی خدمت میں بھی جنوری ۱۹۴۰ء کا پرچہ سالانہ چندہ کے لئے وصول طلب پارسل (.V.P.P) سے روانہ ہوگا۔

جن صاحبان کو آیندہ خریداری جاری رکھنا منظور نہ ہو۔ وہ براہِ کرم اِس نمبر کے پہونچنے کے بعد فوراً ہی اطلاع دیدیں تاکہ اُنکی خدمت میں جنوری ۱۹۴۰ء کا رسالہ نہ بھیجا جائے اور وہ قیمت طلب پیکٹ کی واپسی کی زحمت سے اور دفتر زمانہ صرفہ ڈاک کے نقصان سے محفوظ رہے۔

باقیدار اصحاب جو آیندہ خریداری جاری نہ رکھنا چاہتے ہوں براہ خوش معاملگی اپنے ذمہ کی بقایا ادا فرماکر اپنے عندیہ سے مطلع فرمادیں۔

جنوری سے رسالہ کی نئی جلد شروع ہوتی ہے۔ اسلئے نئے خریداروں کو اسی نمبر سے خریداری شروع کرنا چاہیے

نوٹ

(۱) چونکہ قیمت طلب پیکٹ (.V.P.P) کے لئے رجسٹری ہونا ضروری ہے۔ اسلئے دو آنہ فیس منی آرڈر کے علاوہ تین آنہ رجسٹری فیس بھی ادا کرنا پڑتی ہے جس سے قیمت طلب پیکٹ میں لازمی طور پر پانچ آنہ کا صرفہ ہوتا ہے۔ منی آرڈر کے ذریعہ قیمت بھیجنے والے اصحاب کو تین آنہ کی کفایت ہوگی

(۲) قواعد ڈاکخانہ کی رو سے ویلیو پے ایبل پیکٹ ایک ہفتہ سے زائد ڈاکخانہ میں امانت نہیں رہ سکتے، اِس لئے استدعا ہے کہ جو صاحبان منی آرڈر کے ذریعہ قیمت نہ بھیجیں۔ وہ براہِ مہربانی جنوری نمبر کا قیمت طلب پیکٹ (.V.P.P) فوراً ہی وصول فرمالیں۔ ڈاکخانہ میں پڑا نہ رہنے دیں۔

(۳) منی آرڈر کے ذریعہ قیمت بھیجنے والے اصحاب کوپن میں اپنا پورا نام و پتہ مع نمبر خریداری صاف و خوشخط تحریر فرمائیں تاکہ رقم مرسلہ صحت کے ساتھ درج حساب ہوسکے۔

مینجر زمانہ کانپور

نور اللغات

ہماری اُردو زبان کی ترقی کے ساتھ ساتھ ایک مفصل اور مستند لغت کی ضرورت شدت
سے محسوس کیجارہی تھی۔ شکر ہے کہ ملک کے نامور ادیبوں نے اس طرف توجہ کی۔ امیر الشعراء حضرت
امیر مینائی کے بعد حضرت سید احمد دہلوی نے "فرہنگ آصفیہ" کے نام سے کئی جلدوں میں ایک مفصل
لغت لکھا۔ اس کے ایک عرصے کے بعد حضرت نیّر کاکوروی نے برسوں کی تلاش و تحقیق کے بعد
ایک نہایت ضخیم لغت تیار کیا ہے، جو چار حصوں پر مشتمل ہے۔ اسمیں اُردو زبان کے ایک ایک
حرف کے متعلق بہت خوبی اور خوش اسلوبی سے دادِ تحقیق دی گئی ہے۔ تعجب ہے کہ اتنا بڑا کام
ایسے اچھے پیمانے پر ایک فردِ واحد سے کیسے انجام پاگیا۔ بعض بعض جگہ ایک ایک لفظ کی تشریح و
تحقیق میں کئی کئی صفحے بھرے ہوئے ہیں۔ اندازِ بیان بہت سادہ لیکن عالمانہ اور حکیمانہ۔ غرضیکہ لغت
کے سلسلے میں اب تک یہ آخری اور مستند کوشش ہے اور حامیانِ اُردو کی قدر دانی کی مستحق۔

نور اللغات	جلد اول	الف-ب	صفحات	۲۱۴۷	قیمت	عہ
"	" دوم	پ سے خ	"	۵۱۴	"	ے
"	" سوم	د سے ق	"	۶۹۲	"	عہ
"	" چہارم	ک سے ی	"	۱۰۳۲	"	للعہ

ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ نئی دہلی

شاخیں:- دہلی - لاہور - لکھنؤ - بمبئی ۳

مرتبہ:- خواجہ عبدالوحید، [illegible]